اکتوبر 2014ء کے شمارے کی جھلک

برف کے آنسو	نازیہ کنول نازی کا خوبصورت مکمل ناول
موم کی محبت	راحت وفا کا نیا سلسلے وار ناول
ٹوٹا ہوا تارا	سمیرا شریف طور کا سلسلے وار ناول
مجھے ہے حکم اذاں	ام مریم کا خوبصورت ناولٹ
شکست آرزو	عتیقہ ملک کے قلم سے خوبصورت ناولٹ
تیرے اور میرے درمیان	نازیہ جمال کا خوبصورت ناولٹ
زمین پہ چاند اترا	صدف کا خوب صورت مکمل ناول

مستقل سلسلوں میں پڑھیے

آپ کی صحت، ڈش مقابلہ، بیوٹی گائیڈ، غزلیں
نظمیں، بیاض دل، دوست کے پیغام آئے ودیگر

women.magazine
womenmagazine
aanchalpk.com

نئے اُفق
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس
NAEYUFAQ
PUBLICATION
پاکستان (فی پرچہ)..........50روپے
پاکستان (سالانہ)..........500روپے
اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242
aanchalpk,com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk
مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
عمران احمد
مدیر معاون
اقبال بھٹی
مدیر خصوصی
طاہر احمد قریشی
منتظمین
نورالدین
جلد 38
شمارہ 11
اکتوبر 2014

ابتدائیہ

متفرق کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

سلسلے وار ناول

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 ایک ازمطبوعات نئے اُفق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

مملکت خداداد اسلامی کے ناخدا......!!

پاکستان واحد ملک ہے جو دین اسلام کے نام پر پرستاران توحید نے حاصل کیا۔ یہ مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان دنیا کے نقشے پر دوقومی نظریہ ہندو اور مسلمان کے تحت وجود میں آئی تاکہ حامیان اسلام اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر بلا روک ٹوک عمل کرسکیں۔ ہائے، ہائے آج ہمارے سیاسی تو سیاسی نام نہاد دینی رہنماؤں نے اپنے ذاتی مفادات واغراض کے ہاتھوں اس کا وہ حشر کیا جو اسلام دشمن قوتیں بھی شاید نہ کرتیں، پاکستان کی تاریخ میں 14 اگست کا دن بہت اہمیت کا حامل ہے یہ دن مبارک قیام پاکستان کا دن ہے اس کی حرمت کو اس کے پاسبان سیاست ہی پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں۔

14 اگست بروز جمعرات بعد نماز ظہر دو بڑے سیاسی نام نہاد مذہبی گروہ اپنے اپنے پیروکاروں پرستاروں کی ایک بڑی بھیڑ لے کر عازم اسلام آباد ہوئے کہ حکمرانوں کی چھٹی کرانی ہے، بدعنوانی، بے ایمانی کا خاتمہ کرنا ہے۔ ملک میں کرپشن سے پاک نظام لاکر دم لینا ہے اور دونوں گروہ 16 اگست کو اسلام آباد میں پڑاؤ ڈال کر بیٹھ چکے ہیں اور بڑے بڑے دعوے اور لن ترانیاں کررہے ہیں لیکن کسی بے شعور اور باشعور کو یہ ہوش نہیں کہ ہمیں اللہ کے احکام کا بھی پاس کرنا ہے اللہ نے جو فرض نماز ہر عاقل بالغ ہوش مند پر فرض کی اسے ادا بھی کرنا ہے 14 اگست سے لے کر آج تک وطن عزیز کے تمام ہی برقی ذرائع ابلاغ (ٹی وی) چینلز دونوں گروہوں کی ایک ایک حرکت کو اپنے کیمروں کے ذریعے دنیا تک پہنچانے کا فریضہ ادا کر رہے ہیں لیکن کسی بھی چینل نے بھولے سے ہی سہی کسی بھی گروہ کے افراد کو نماز ادا کرتے نہیں دیکھا میں نے اپنے ذاتی دوستوں سے جو اسلام آباد کے ہی رہائشی ہیں معلوم کیا کہ شاید کوئی برقی نہ سہی عینی شہادت مل جائے کہ لوگوں نے باجماعت یا انفرادی نماز ادا کی ہو کہنے کو تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ حالت سفر میں ہیں تو کیا اسلام نے حالتِ سفر میں نماز معاف کردی

ہے یا قصر کی گئی ہے۔ اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ احتجاجی گروہ کتنے مخلص اور دیانت دار ہیں ایک گروہ تو فلاحی سیاسی ہے ان کا دعویٰ بھی نظام اسلام کو رائج کرنے کا ہے۔ دین اسلام کی حمایت ہی انہیں راہ راست پر رکھ سکتی ہے عدل و انصاف، بدعنوانی کا خاتمہ، غربت کا خاتمہ یہ سب کے سب اسلام کے ہی زریں اصول واقوال ہیں۔ دوسرا گروہ تو ہے ہی خالص مذہبی گروہ وہ تو اسلام کا پرچم لے کر ہی جام شہادت نوش کرنے نکلا ہے اس عزم محکم کے ساتھ کہ اسلام کا نظام رائج کر کے گھر لوٹیں گے لیکن تمام تر خطابات اور للکاروں لشکروں کفتاروں کے نہ تو خود مولوی صاحب نے نماز کی تلقین کی اور نہ ہی انہیں نماز پڑھتے کسی کیمرے کی آنکھ دیکھ سکی جبکہ ان کا کہنا ہے کہ میرا مرنا میرا جینا اپنے پرستاروں مریدوں کے ساتھ ہے ان کے دعوے کے مطابق ان کا سونا جاگنا کھانا پینا اپنے گروہ کے ساتھ ہی ہے نہ تو انہوں نے بھولے سے ہی سہی اپنے گروہ کے لوگوں کو نماز کا حکم دیا جب اپنی ابتدائی احتجاجی سیاست میں وہ اپنے مذہب کے فریضہ اول کو بھول گئے ہیں تو اگر خدانخواستہ برسر اقتدار آ گئے تو آنکھوں پر کیسی چربی چڑھے گی شاید انہیں پھر اپنے یہ سنگی ساتھی بھی نظر آنا بند ہو جائیں۔ ان کی سیاسی ہلچل کے دوران جمعتہ المبارک کا دن بھی آیا چلو جمعہ کی نماز تو حالت سفر کی نذر ہوئی لیکن نماز ظہر کی قصر نماز تو معاف نہیں ہوئی تھی اسے تو ادا کرنا ہی تھا اس کے بعد مسلسل کئی روز کی نمازوں کا اور آنے والے دنوں کی نمازوں کا اللہ تعالیٰ حساب لے گا۔ حضرت مولانا صاحب یا ان کے مریدوں کا اللہ تعالیٰ سے بھی کوئی معاہدہ ہو چکا ہے کہ تم احتجاج میں لگے رہو تمہیں سب کچھ معاف ہے۔ اللہ ھو اکبر، اسلام کے دعوے دار ہی جب داغ دار ہوں تو پھر دین اسلام کا جو بھی حشر ہو وہ کم کم ہے۔ اللہ مسلمانان پاکستان پر رحم فرمائے اور ان جیسے نمائشی اور مفاد پرستوں سے ملک وقوم کی حفاظت فرمائے۔

عمران احمد

> ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا لیکن وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔'' (مسلم)

سانحہ ارتحال

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز کے دیرینہ تزئین کار نورالدین شہروز کے والد محترم عبدالمجید دل کا دورہ پڑھنے سے اللہ کو پیارے ہوگئے ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ہ'' ادارہ کے تمام ارکان اپنے ساتھی نورالدین شہروز کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

عزیزانِ محترم ...... سلامت باشد!

پراسرار کہانی نمبر دو کے ساتھ حاضر ہیں۔ صد شکر ہے اس رب تعالیٰ کا جس نے ہمیں اپنے قارئین کے سامنے سرخرو کیا۔ ہم بہت شکر گزار ہیں ان قارئین کے بھی جنہوں نے پراسرار نمبر کو پسندیدگی کی سند عطا کی اور ہماری کاوشوں کو سراہا۔ ہم اپنے لکھنے والوں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس حوالے سے اپنی تحریروں سے نوازا اور اب تک بھیج رہے ہیں۔ اس پسندیدگی نے ہی ہمیں یہ حوصلہ دیا ہے کہ ہم نے مختلف موضوعات پر سال میں کم از کم پانچ نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا آغاز جنوری 2015ء سے کیا جائے گا۔ جنوری میں دلچسپ کہانی نمبر شائع ہوگا آج کل سیاست بھی تجارت بن گئی ہے اور ایک مافیا ہے جو سیاست دان بن کر ملک پر مسلط ہے۔ اس حوالے سے مارچ میں سیاسی جرائم نمبر میں انہیں بے نقاب کیا جائے گا۔ مئی میں طنز و مزاح جولائی میں آپ بیتی نمبر ستمبر میں خوفناک اور پراسرار نمبر شائع ہوگا۔ قارئین اور قلم کار نوٹ کر لیں اور اس حوالے سے ابھی سے تیاری شروع کر دیں۔ اب چلتے ہیں آپ کے تلخ و شیریں محبت ناموں کی طرف۔

ریحانہ سعیدہ ...... لاہور۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد السلام علیکم! پاکستانی مسلمانوں کے لیے بڑا اہم مہینہ اور دن یعنی اگست کا مہینہ اور آزادی کا دن ہمارے گھٹیا اور خود غرض سیاستدانوں کی بھینٹ چڑھ گیا جہاں لوگ پاکستانی جھنڈے اور بیجز لگائے ملی نغمے گاتے نظر آتے تھے اب پی ٹی آئی اور پی اے ٹی کے جھنڈے اٹھائے رقص و سرود کی محفلیں سجائے ملک کے حالات کو سبوتاژ کرنے دارالحکومت میں دھرنا دے کر پاکستان کو باہر کے ملکوں میں تماشا بنائے ہوئے ہیں۔ اللہ ہمیں ایسے خود غرض لیڈروں سے بچائے۔ عمران صاحب ہم لاہور میں رہتے ہیں علاقہ غیر میں نہیں کہ ڈائجسٹ ہمیں اتنا لیٹ ملتا ہے اگر رسالہ جلدی ملے تو تبصرہ بھی ہو جائے۔ سرورق دیکھ کے پیاسا کوا یاد آ گیا لیکن جب زرا دور در دور نظر ڈالی تو احساس ہوا کہ اتنے کوے تو کسی ہارر سین کو کری ایٹ کر رہے ہیں چاند میں ہلکی ہلکی شبیہ ٹنڈ منڈ درخت پر سراسی عمارت اور خوفناک مجسمے مزے کا سرورق تھا۔ ارشد صاحب کی دید بان دلچسپ ہوتی جا رہی ہے لیکن انہوں نے بروج کی جو طاقت دکھائی ہے وہ بلکل فلمی ہے۔ ریاض حسین کی نقوشِ عبرت بس درمیانے درجے کی تھی راہِ انتقام خورشید صاحب کی اوٹ پٹانگ سی تھی روحوں کو بھی حقیقت پتہ نہ چلے یہ عجیب بات ہے خلیل

صاحب کی پر سرار خزانہ دلچسپ تھی جاوید احمد کی پراسرار بنگلہ کہانی کا نام کچھ اور ہونا چاہیے تھا کہانی نام کے ساتھ میچ نہیں کررہی تھی بہر حال نارمل کہانی تھی۔ قلندر ذات زبردست ہے، زرین قمر کی بد دعا بے تکی سی کہانی لگی عجیب رشتے اس کہانی میں دکھائے ہیں۔ ایک بہن کی شادی ہے اور دوسری اپنے کاموں میں مصروف اور وہی بہن اس کی جان بچانے کے لیے الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے اور اسی کے ہاتھوں ہی وہ مرتی ہے جبکہ ماں باپ کا خاموش کردار ہے۔ محمد سلیم کی مقدس درخت اگر اتنی مختصر نہ ہوتی تو زیادہ دلچسپ ہوتی۔ نقلی شہر آشوبہ مخدوم کی یوں تھی جیسے بچپن میں ایک دو روپے والی بچوں کی کہانی ہوتی ہے بلکل بچکانہ انداز کی چڑیلیں تھیں۔ نوشاد صاحب کی بدعقیدہ اخبار میں اتنی دفعہ یہ خبر پڑھی تھی کہ اب کہانی کے شروع میں اس کا انجام پتا تھا۔ عمران صاحب کوشش کیا کریں کہ خبروں پر کہانی نہ لکھی جائے۔ احمد صاحب کی بھیانک راستہ دلچسپ کہانی تھی کوئی بھی فقیر آپ سے ٹکرائے تو جناب فوراً اس سے معافی مانگ لیں ورنہ بابا جی ڈرا بھی سکتے ہیں۔ مجید صاحب کی خونی بیوی تو پاکستانی بیوی جیسی تھی جو پیچھا نہیں چھوڑتی اس سے تو بہتر تھا آپ پاکستانی بیوی پر کوئی کہانی لکھ لیتے ذرا مزہ نہیں آیا پڑھنے کا۔ شمیم صاحب اب جگت سنگھ کا اختتام کر دیں اور کوئی اور سلسلہ شروع کریں۔ ذوق، آگہی اور خوشبوئے سخن دونوں اپنی جگہ دلچسپ ہیں اب اجازت، اللہ حافظ۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ ستمبر 2014ء کا شمارہ اس بار 22 اگست کو ہی مل گیا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح منفرد رہا ہے اور ہمارا پیارا رسالہ ستاروں میں چاند کی طرح دمکتا نظر آیا۔ اس بار گفتگو میں محترم عمران احمد صاحب بڑے اچھے اور موثر پیرائے میں ہمارے حکمرانوں کے متعلق لکھ رہے ہیں۔ واقعی یہاں ہر کوئی اپنا اقتدار بچانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہے اور یہود و نصاریٰ کی بتائی ہوئی گائیڈ لائن پر چل رہا ہے۔ ہم اللہ بزرگ و برتر سے دعا گو ہیں کہ وہ باری تعالیٰ ہمارے پیارے ملک کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ پہلا خط ریاض حسین قمر بھائی کا ہے بھائی لفظوں کی مالا بنانا آپ کے اوپر ختم ہے۔ آپ نے خوب تبصرہ کیا ہے، ویل ڈن۔ میری کاوش جال وصیاد پسند کرنے کا بے حد شکریہ خدا آپ کو خوش رکھے۔ ادیب سمیع چمن جیسا کہ میں شروع میں تحریر کے احاطے میں لا چکا ہوں۔ ہمارے من پسند رسالے کا سرورق سب سے منفرد ہوتا ہے آپ نے بھی وہی بات تحریر کی ہے یہ آپ کی اعلیٰ ذوق کی مثال ہے ابن مقبول جاوید احمد صدیقی بھائی آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ابن صفی (مرحوم) (میرے روحانی استاد) ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں دلوں میں بستے تھے اور آج بھی بستے ہیں ان کا انداز جداگانہ تھا۔ وہ قارئین کو کوئی بات سمجھانے کے لیے بڑے بڑے کردار اپنی تحریروں میں پیش کرتے تھے۔ ''جاسوسی دنیا'' کے حمیدی، فریدی مجھے بھی بہت پسند تھے۔ شاہی نقارہ میں جمیلہ کا کردار بہت زبردست تھا بھائی میری کہانی جال وصیاد کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ بھائی میری کہانیاں جداگانہ ہوتی ہیں۔ ان کے مجرم وہ ہوتے ہیں جن کو حالات، معاشرتی ناہمواریاں مجرم بناتی ہیں۔ یہ چار دیواروں کے مجرم ہوتے ہیں اور میں لوگوں کو قانون کا احترام کرنے کی طرف راغب کرنے کی اپنی سی سعی کرتا ہوں اور خالد صاحب ایسے مجرموں کو اپنے دور میں سلاخوں کے پیچھے بھیجتے تھے۔ حسن اختر پریم آپ میری کہانیاں پسند کرتے ہیں، بہت شکریہ، آپ لوگوں کی دعاؤں اور پذیرائی کی وجہ سے میں دوبارہ لکھنے کے قابل ہوا ہوں، اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف، سب سے پہلے قسط وار کہانیوں کی بات ہو جائے اس بار تمام قسط وار کہانیاں تیزی سے آگے بڑھتی محسوس ہوئیں دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے؟ اس بار تقریباً تمام کہانیاں پراسرار ہیں ابھی تک میں صرف تین کہانیاں پڑھ سکا ہوں۔ پراسرار خزانہ (خلیل جبار) پراسرار بنگلہ (جاوید احمد صدیقی) اور راہ انتقام (خورشید پیرزادہ) سب نے کہانیوں کے ساتھ انصاف کیا ہے اور جو کچھ بتانا چاہا ہے اسے اچھے طریقے سے لفظوں کی زبان دی ہے۔ پراسرار کہانیوں کا سلسلہ وقتاً فوقتاً جاری رکھیں۔ محفل خوشبوئے سخن میں عمر فاروق ارشد، ریحانہ سعیدہ، قدیر رانا اور ریاض حسین قمر کی کاوشیں بہت اچھی ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، ذوق آگہی میں سب انتخاب لاجواب ہے اور پرچے کی شان

بڑھ رہا ہے۔ کترنیں بھی خوب ہیں ان کی تعداد اس بار قابل قبول تھی، اب اجازت۔

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ السلام علیکم، نیک دعاؤں اور خیر و عافیت کے ساتھ حاضر ہوں کافی عرصے بعد شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں بک اسٹال پر نئے افق سے ملاقات ہوگئی۔ سرورق پہلے سے زیادہ خوب صورت تھا اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے دل بہت خوش ہوا خط کافی عرصے بعد تحریر کر رہا ہوں، غزل شائع کرنے کا شکریہ آپ کا خلوص ہی ہمیں خط لکھنے پر مائل کرتا ہے۔ بے شک آپ ہم سے کافی دور ہیں مگر ہماری دھڑکنوں میں بستے ہیں۔ نئے افق کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ بہتر ہیں۔ اس بار ہر کہانی خوب سے خوب تر تھی۔ آج کل ہر طرف مہنگائی کا عالم ہے بجلی کی لوڈ شیڈنگ اور بے روزگاری سے ہر انسان پریشان ہے گرمی کی شدت آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے زندگی کی منزل کتنی دور ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے باتیں تو بہت سی کرنی تھی مگر وقت کی کمی کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ لائق صد احترام عمران احمد صاحب سلام شوق امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ پر اسرار ٹائٹل والا نئے افق ستمبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے جس گمبھیر مسئلے کا ذکر جس دردناک انداز میں فرمایا ہے اس سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جانا اور پاؤں تلے سے زمین نکل جانا قدرتی امر ہے۔ کاش ہم مسلمان دوسرے مسلمان بلکہ دوسرے انسان کے لیے اپنے دل میں ایسا جذبہ پیدا کریں جس سے اس کی مشکلات میں کمی واقع ہو نا کہ اس کو ایک دکھ کے بعد اس سے کئی گنا بڑے دکھ سے گزرنا پڑے، اے کاش ملک کی موجودہ صورت حال پیدا ہونے سے پہلے غالباً شمارہ چھپ گیا ہوگا ورنہ جناب قریشی صاحب جیسے دردمند پاکستانی خون کے آنسو روتے۔ آپ سب نے ٹی وی اسکرین پر جو کچھ دیکھا ہے وہ اسلامی فلاحی ریاست کے مکینوں کو زیب نہیں دیتا۔ میری مسلمان مائیں بہنیں اور بیٹیاں ٹی وی اسکرین پر رقص کر رہی ہیں بھنگڑے ڈال رہی ہیں اور سبھی ناچ کا مظاہرہ کر رہی ہیں یہ آزادی مارچ اور دھرنا ہے یہ سب کچھ ٹی وی چینلز کے اوپر کروڑوں ناظرین جن میں ہر مذہب اور گروہ کے لوگ شامل ہیں لطف اندوز ہو رہے ہیں واقعی آزادی اس کا نام ہے۔ ”ہم پنج تن پاک کے ادنیٰ غلام ہیں ان میں سے ایک تن خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہرہؓ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے وصال کے بعد میرا جنازہ رات کی تاریکی میں اٹھایا جائے تاکہ میرے کفن پر کسی غیر محرم کی نظر نہ پڑے۔ اس کے بعد میں اپنی قوم کی ان معزز خواتین کے بارے میں کچھ لکھ کر اپنا قلم آلودہ نہیں کرنا چاہتا خداوند کریم مسلمان خواتین کو اپنا مقام اور مرتبہ پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ گفتگو کے ابتدائیہ میں آپ نے جس حدیث پاک کا چناؤ کیا ہے لائق تحسین ہے ابتدائیہ میں آپ کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ قیمتی ہے لیکن کوئی اثر لے تو گفتگو میں جناب احمد سمیع چمن صاحب خط کا بہت خوب ہے انہوں نے ٹھیک لکھا ہے کہ گفتگو میں شامل قارئین جو سوال اٹھائیں ہر قاری اس کا جواب دے تاکہ اس کی ذہنی تسکین ہو اور آپس میں روابط بڑھیں انہوں نے محترمہ ناز سلوش ذشے کی بہت تعریف کی یہ بجا ہے کہ وہ بہت اچھی لکھاری ہیں اور خطوط نویسی کے فن سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ محترم بھائی ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب اپنے طویل پر مغز خط میں بہت سی خوب صورت باتیں لے کر تشریف لائے بھائی آپ کی آمد پر بے حد خوشی ہوتی ہے ہمارے پیارے بھائی سید عبداللہ شاہد صاحب غالباً ہم سے روٹھے ہوئے ہیں شاہ جی ایسا تو نہیں کرتے نا پلیز لوٹ آؤ کہ ہم سب بھائی آپ کے منتظر ہیں ابن مقبول جاوید احمد صدیقی بھائی غزل پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ۔ میرے بہت ہی پیارے بھائی جناب ریاض بٹ صاحب ایک دلکش خط کے ساتھ محفل میں تشریف لائے عزیز بھائی آپ کے مہروں کی تکلیف کا پڑھ کر دل کو تکلیف ہوئی رب العزت آپ کو اس تکلیف سے کلی نجات عطا فرمائے آمین۔ غزل پسند فرمانے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ اس بار آپ کی کہانی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی اچھے دوست

ذیشان ریاض نے اپنے مختصر خط میں بڑی پیاری باتیں لکھیں ذیشان ڈیئر آتے رہا کریں تاکہ محفل کی رونق دوبالا ہو۔ حسن اختر پریم صاحب آپ کا مختصر پیارا سا خط پسند آیا اس بار جناب عمر فاروق ارشد صاحب نجانے کس مجبوری کے تحت شریک محفل نہیں ہوئے لائق صد احترام جناب محمد بخش صابر لنگاہ صاحب نے اپنی خیر خیریت کی اطلاع نہیں دی خدا کرے وہ صحت یاب ہوں اور جلد محفل میں تشریف لے آئیں۔ اقرا میں جناب طاہر احمد قریشی صاحب نے ایفائے عہد کی اہمیت کو احادیث کی روشنی میں اجاگر کیا ہے خدائے پاک ان کی اس سعی پر اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔ خوش بوئے سخن میں ریحانہ سعیدہ صاحبہ کی نظم اور شجاع جعفری کا انتخاب اچھا تھا۔ غزلوں میں عمر فاروق ارشد جناب قدیر رانا، محترم سمیع جمال، نیر رضاوی اور محمد اسلم جاوید کا کلام بہت معیاری تھا اور ذوق آگہی میں انتخاب خوب تھا۔ تمام کہانیاں اپنی اپنی جگہ خوب تھیں اور مستقل سلسلے بھی خوب جاری ہیں۔

میاں کرامت...... جہلم۔ السلام علیکم عمران احمد قریشی صاحب۔ میں زندگی کی 70 بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ نئے افق کا پرانا قاری ہوں ''نیا رخ'' بھی پڑھا کرتا تھا نئے افق اب بھی پڑھتا ہوں 20 سال قبل خط لکھا کرتا تھا مگر اب اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ کچھ لکھ سکوں ہاں پرچہ البتہ پڑھ لیتا ہوں۔ آپ نئے افق کو بہتر انداز میں چلا رہے ہیں۔ میں باقاعدگی اور تنقیدی نظر سے پڑھتا ہوں۔ اب بھی خط نہ لکھتا مگر ستمبر کا پرچہ پڑھ کر مجبور ہو کر اپنی نواسی سے یہ خط لکھوا رہا ہوں۔ آپ نے پرچہ میں جو سچی اور پراسرار کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا ہے وہ اچھا ہے دو ماہ سے پراسرار نمبر کا شدت سے انتظار تھا، اب جبکہ ستمبر کا پرچہ پڑھ چکا ہوں تو بہت ہی مایوس ہوا ہوں۔ بس اسی وجہ سے یہ خط لکھ کر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ بہت شور تھا پراسرار نمبر کا مگر کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ گزشتہ دو سالوں سے آپ نے کہانیوں کے ساتھ اسکیچ لگانے چھوڑ دیے ہیں جس سے پرچے کا حسن ختم ہو گیا ہے۔ ایسی بھی کیا کنجوسی آپ پرچہ کی قیمت بڑھا دیں مگر اسکیچ ضرور لگائیں۔ کہانیوں کے بارے میں یہ کہوں گا کہ پرچہ کئی ماہ سے یکسانیت کا شکار ہے۔ مگر آج بات پراسرار نمبر کی کروں گا۔ سلسلہ وار کہانیوں میں ''جگت سنگھ'' شمیم نوید (مرحوم) کی شائع شدہ کہانی ہے لہٰذا اس کا تذکرہ کرنا ضروری نہیں۔ ''دیدبان'' بالکل متاثر نہیں کر رہی لہٰذا میں نے اسے پڑھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ البتہ ''قلندر ذات'' نے اپنی جگہ بنالی ہے۔ امجد جاوید کی کہانی پر گرفت مضبوط اور پرچہ کو سہارا دیے ہوئے ہے۔ متفرق کہانیوں میں نقوش عبرت قطعی متاثر نہیں کرسکی یہ مکافات عمل کی کہانی ہے یہ پراسرار نہیں تھی۔ مگر رائٹر نے جان بوجھ کر اس کو پراسرار بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ (ظالم کا ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آتی ہے) یہ اس کہانی کا جملہ ہے۔ جبار خان نے زہرہ اور اس کی بیٹی کا خون کیا تو اسے سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنی چاہیے تھی۔ رائٹر نے خوامخواہ چڑیلیں اور بندر ڈال کر اسے نقوش عبرت اور پراسرار بنانے کی کوشش کی ہے۔ سکینہ بی بی کو ہوس کا نشانہ بنانے کا انداز انتہائی گھٹیا اور فحش ہے۔ نجانے رائٹر کیا کہنا چاہتا ہے۔ راہِ انتقام ایک خوب صورت اور دل موہ لینے والی تحریر ہے رائٹر کو مبارکباد۔ پراسرار خزانہ من گھڑت تحریر ہے اور رائٹر کے ذہن کی اختراع ہے متاثر نہیں کرسکی۔ پراسرار بنگلہ سر سے گزر گئی نجانے رائٹر کیا کہنا چاہتا ہے بددعا بھی متاثر نہیں کرسکی۔ مقدس درخت کسی انگریزی کہانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے رائٹر کی گرفت مضبوط نہیں لگی اور کہانی ادھوری محسوس ہوئی۔ رائٹر محنت کرتا تو یہ ایک بہترین کہانی بن سکتی تھی۔ نقلی شہر گزارہ ہے، بدعقیدہ اچھی تحریر ہے رائٹر نے انصاف کیا ہے اپنے قلم سے۔ بھیانک راستہ اور چیختا سناٹا گزارہ ہے مگر یہ پراسرار نمبر کی کہانیاں نہیں ہیں یہ عام شماروں کی کہانیاں ہیں۔ خونی بیوی ایک فضول قسم کی تحریر ہے۔ اگلے ماہ پھر حاضری دوں گا اللہ حافظ۔

عبدالرحمن مانی...... صدر، کراچی۔ عمران بھائی تسلیمات! آپ کی محفل میں ایک بار پھر حاضر خدمت ہوں، میرا خط شائع کرنے کا شکریہ۔ سچ پوچھیں تو مجھے امید نہیں تھی کہ مجھے اتنی پذیرائی ملے گی، میرا خط پسند کرنے کا۔

آپ نے میرا خط شائع کر کے مجھے خرید لیا ہے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ جیسا کہ میں پہلے بھی اپنی آراء عمران صاحب کے گوش گزار کرتا آیا ہوں' ایک بار پھر اپنی تجویز دہراؤں گا کہ آپ ہر ماہ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کا کوئی نہ کوئی ناول ضرور شائع کریں۔ قارئین' رائٹرز حضرات اور شاعر کیسے مزاج ہیں سب کے؟ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ دستک میں مشتاق قریشی صاحب نے کیا خوب لکھا' گفتگو میں عمران صاحب سے ملاقات کرتے ہوئے طاہر قریشی کی اقراء پر دستک دی۔ سب سے ابن صفی کا ادبی نصب العین پڑھی' ابن صفی کے کیا ہی کہنے۔ بہت شاندار انداز میں محمد عارف اقبال نے پیش کیا۔ اب آتے ہیں متفرق کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے نقوش عبرت پڑھی' راہ انتقام اچھی تحریر تھی لیکن کچھ متاثر نہیں کرسکی۔ پراسرار خزانہ' خلیل جبار کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ کہانی اچھی لگی۔ بددعا' مقدس درخت' نقلی شہر' بدعقیدہ' بھیانک راستہ' خونی بیوی' چیختا سناٹا سبھی نے اچھا لکھا۔ میں بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں لیکن ابھی تک ایسا کچھ نہیں لکھ پایا جو نئے افق میں جگہ بنا سکے' امید ہے آپ لوگوں کی لکھی گئی کہانیوں پر تبصرہ کرتے کرتے میں بھی ایک اچھا لکھاری بن جاؤں گا' مجھے آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ سلسلے وار ناول بھی سبھی دلچسپ جا رہے ہیں۔ ذوق آگہی بہترین تھا' اللہ پاک نئے افق کے سب لکھاریوں کارکنان اور قارئین کو ہمیشہ خوش رکھے آمین۔

حسن اختر پریم ...... ناظم آباد، کراچی۔ محترم عمران احمد امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے تو اتنا اچھا پرچہ نکالنے پر میری طرف سے مبارک باد۔ آپ اور آپ کی پوری ٹیم جس محنت اور لگن سے کام کرتی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں گناہوں سے بچنے اور نیکیاں کرنے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔ آج کل ہر طرف بدامنی کا راج ہے بالخصوص کراچی میں روزانہ دس سے پندرہ افراد کا قتل معمولی بات ہوچکی ہے۔ ہر کوئی اپنے مفادات میں الجھا ہوا نظر آتا ہے' کسی کو عوام کی فکر نہیں' ایک افراتفری کا عالم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ اب آتے ہیں پرچے کی طرف تو سب سے پہلے مشتاق احمد قریشی کی ''دستک'' پڑھی۔ اس کے بعد اپنا پسندیدہ سلسلہ گفتگو میں داخل ہوگئے مگر صرف چند دوستوں سے ہی ملاقات ہوسکی۔ دن بہ دن نئے افق میں لکھنے والوں کی غیر حاضری بڑھتی جارہی ہے شاید سبھی آج کل کے حالات میں مصروف ہوگئے ہیں' دوستو نئے افق کے ذریعے ہم بھی ایک دوسرے کی خبر گیری کرتے ہیں' اس لیے تمام غیر حاضر دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ باقاعدگی سے حاضری لگوائیں۔ پھر سیدھے پہنچے ''ابن صفی کا ادبی نصیب العین'' پر کیا بات ہے جناب محمد عارف اقبال صاحب' کیا خوب لکھا آپ نے۔ گفتگو میں صدارتی کرسی ریاض حسین قمر کو دی گئی اس کے لیے انہیں مبارک باد پیش ہے' ان کا تبصرہ واقعی لاجواب تھا۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ اور سید عبداللہ شاہد کے کافی دنوں سے خطوط شامل نہیں ہورہے۔ آپ دونوں جلد از جلد حاضری لگوائیں۔ پھر اپنے پسندیدہ ناول ''جگت سنگھ'' کی طرف بڑھے۔ ناول تیزی سے رواں دواں ہے اتنا اچھا ناول لکھنے پر شمیم نوید کو مبارک باد۔ خورشید پیر زادہ صاحب کا ناول ''راہِ انتقام'' پسند آیا۔ امجد جاوید کی قلندر ذات کے تو کیا ہی کہنے ہیں' بہت اچھے طریقے سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ سچ بیانیوں میں تقریباً تمام ہی اچھی رہیں۔ مغرب سے دونوں انتخاب بہترین تھے۔ روحانی مسائل کے ذریعے دکھی انسانیت کی خدمت کا جو بیڑہ حافظ صاحب نے اٹھایا ہے اللہ اس کا اجر دے گا' اس کے ذریعے ہم بہت سے مسائل حل کرسکتے ہیں۔ ''خوشبوئے سخن'' کی تمام غزلیں بہترین تھیں مگر ریحانہ سعیدہ کی ''مجھے تم سے محبت ہے'' کے کیا ہی کہنے ہیں۔ ذوق آگہی میں سبھی کا انتخاب اچھا تھا۔ آخر میں تمام قارئین نئے افق کو سلام۔ اللہ بزرگ و برتر سے دعا ہے وہ اسلام کا بول بالا فرمائے' پاکستان اور اہالیان پاکستان بالخصوص اہالیان کراچی کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ والسلام

مبارک علی ...... چیچہ وطنی۔ محترم عمران احمد صاحب امید ہے بمع اسٹاف کے خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نئے افق کے اسٹاف' ریڈرز' رائٹرز کو اپنے حفظ وامان میں رکھے' ان کی مشکلات کو آسان

کرے۔ سردیوں کی آمد آمد ہونے والی ہے۔ موسم کی تبدیلی کے اثرات انسانی صحت پر بھی پڑ رہے ہیں متعدد لوگ فلو نزلہ زکام میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ڈینگی نے بھی ایک بار پھر سر اٹھالیا لوگ دوبارہ اس وائرس میں مبتلا ہونا شروع ہو گئے ہیں مگر کیا کہیے ہمارے اعلیٰ حکام کو۔ لوگ ڈینگی سے مریں یا بھوک سے ان کو صرف اپنی سیاست چمکانے سے غرض ہے۔ سرکاری اسپتالوں میں ڈینگی کی ویکسین ناپید ہے جس کے باعث مریضوں کو سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ صرف اسپتال ہی کیا ہر سرکاری محکمہ میں کرپشن عروج پر ہے۔ ہر کسی کو صرف اپنی جیب بھرنے سے غرض ہے۔ عوام کا کوئی پرسان حال نہیں۔ خیر' تمام قارئین کو ایک بار پھر نئے افق میں خوش آمدید' اب آتے ہیں پرچے کی جانب کی تو جناب سب سے پہلے تو مشتاق صاحب کی دستک پڑھی' مشتاق صاحب کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے' اللہ تعالیٰ مشتاق صاحب کو لمبی عمر اور صحت والی زندگی عطا فرمائے' ان کی تمام پریشانیاں دور کرے۔ محفل گفتگو میں صرف چند دوستوں سے ہی ملاقات ہوئی۔ کیوں بھئی' باقی سب کیا چھٹیوں پر گئے ہوئے ہیں؟ یا اسلام آباد میں انجوائے کرنے چلے گئے' دوستو نئے افق میں حاضری دینا ضروری ہے' ہم آپ سب کا انتظار کرتے ہیں' ''اقرأ'' میں محترم طاہر صاحب بہت خوب صورت تبصرہ لے کر آئے۔ آج تو دل خوش ہو گیا نئے افق میں ابن صفی صاحب کو دیکھ کر۔ محمد عارف اقبال صاحب کیا خوب کہنے آپ کے' اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ سلسلے وار ناولوں میں دیدبان اور قلندر ذات ابھی زیر مطالعہ ہیں' جگت سنگھ انتہائی برق رفتاری سے جاری ہے۔ مغرب سے انتخاب میں ''نقوش عبرت اور پراسرار خزانہ'' زیادہ بہتر لگی۔ روحانی مسائل میں حافظ صاحب کی خدمت قابل تحسین ہے اللہ تعالیٰ حافظ صاحب کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی میں تمام دوستوں کا انتخاب اچھا تھا۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت والسلام۔

زین الدین صدیقی...... کراچی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! ایس جناب ٹھنڈے ٹھار موسم میں تبصرے کا گرم گرما تو کرا اٹھائے محفل میں شرکت کے لیے ہم بھی پہنچ ہی گئے۔ ستمبر کا نئے افق توقع سے بہت پہلے ہاتھوں میں آ گیا۔ ٹائٹل کسی قبرستان کا عکاس ثابت ہوا' بہر حال اچھا لگا۔ دستک اور اقرا کی کرنوں سے فیض یاب ہوتے ہی سیدھا خطوط کا رخ کیا۔ ماشاءاللہ سے گفتگو کی محفل کافی ویران لگی' لگتا ہے سب لوگ ہمیں بھول گئے یا کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئے۔ کرسی صدارت پر غالباً ریاض حسین قمر نے ڈیرا جمایا ہوا ہے چلیں جی اپنی اپنی قسمت ان کا تبصرہ اچھا تھا۔ اگر لکھاری اپنی صفائیاں دینے بیٹھ جائیں تو یہ ان کی ناپختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ باقی ہم تو بس سادہ سے انداز میں ہی اصلاح کر سکتے ہیں۔ دوسرے ساتھیوں کے تبصرے اچھے تھے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف پراسرار خزانہ اس ماہ کی سب سے اچھی تحریر رہی۔ لکھاری تجسس اور دلچسپی آخر تک قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ ''بدعقیدہ'' اچھی تحریر تھی۔ پراسرار بنگلہ اور خونی بیوی دونوں تحریریں پراسراریت پیدا کرنے میں تقریباً کامیاب رہیں۔ اس دفعہ ریاض بٹ صاحب بھی غائب رہے۔ ریاض بھائی مجھے آپ کی کہانی نئے افق میں پڑھنے کی عادت ہو گئی ہے (ہاہاہا)' اللہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ جہاں تک سلسلے وار ناول کا تعلق ہے تو فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کو بہترین قرار دیا جائے ویسے جگت سنگھ زیادہ متاثر کر رہی ہے۔ امجد جاوید صاحب بھی پورے وزن کے ساتھ میدان میں موجود ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ خوش بو سخن میں ریحانہ سعیدہ نے بہت ہی عمدہ لکھا۔ اس کے علاوہ عمر فاروق ارشد اور قدیر رانا کا انداز غزل قابل ستائش ہے۔ بہت ہی اچھی غزل تھی ان کی۔ مجموعی طور پر شمارہ کامیاب کہلوانے کا حقدار ہے۔ عمران بھائی! ہم چند دوستوں کا گروپ نئے افق بہت شوق سے پڑھتا ہے' اس میں لکھنے والے رائٹرز بہت اچھے انداز میں کہانیاں پیش کرتے ہیں' خاص طور پر ریاض بٹ صاحب' ان کی ہر تحریر ہمیں پسند آتی ہے' ان کا لکھنے کا انداز بہت ہی اچھا ہے۔ آپ نے اس میں جو تبدیلی کی ہے ''پراسرار نمبر'' وہ ہمیں بہت پسند آیا' ہم نئے افق کو پھیلانا چاہتے ہیں' بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے خیر' آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم

اسلام کو کفر کی سازشوں سے محفوظ رکھے آمین والسلام۔

نجم حسن...... کراچی۔ محترم و مکرم عمران احمد صاحب سلام مسنون امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ آپ اور آپ کا مخلص عملہ اکتوبر کے شمارے کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف ہوں گے رب ذوالجلال آپ سب کو ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے آمین۔ ستمبر کا شمارہ پیش نظر ہے ٹائٹل بہت خوب صورت ہے اور اس کا منظر بہت کچھ پیش کر رہا تھا جو شاید بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مصور صاحب لائق مبارک باد ہیں۔ دستک میں محترم و مکرم مشتاق احمد قریشی صاحب کی درد مندی واضح ہے اللہ تعالیٰ مشتاق قریشی صاحب کو درازی عمر اور صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔ گفتگو کا آغاز حسب معمول ایک پیاری حدیث مبارک سے ہوا گفتگو شروع کرنے سے پہلے آپ نے مختصر بات میں بہت کچھ کہہ دیا ہے کاش کوئی اس کو سمجھ سکے۔ کرسی صدارت پر حسین قمر صاحب براجمان تھے مبارک باد کے حقدار ٹھہرے جناب ویل ڈن خلیل جبار صاحب! ''پراسرار خزانہ'' اچھی تحریر تھی۔ عمران بھائی اس بار گفتگو کے انداز میں تھوڑی سی بے توجہی ظاہر ہو رہی تھی خلاف توقع کل چھ قارئین کے خطوط شامل تھے محفل کا رنگ بہت حد تک پھیکا تھا۔ نئے افق میں گفتگو ایک ایسا حصہ ہے جس میں چاہتوں کے پھول کھلتے ہیں قارئین ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ روٹھتے ہیں اور مناتے ہیں مگر اس بار کی گفتگو میں ان باتوں کا فقدان تھا۔ پلیز کوشش کریں کہ گفتگو میں پرانا رنگ پھر بھر آئے۔ لگتا ہے قارئین بہت زیادہ مصروف رہنے لگے ہیں یار و مصروفیت تو زندگی بھر ساتھ رہے گی لیکن دوستوں کی محفل مہینے میں ایک دفعہ لگتی ہے شامل ہونا تو ضروری ہے کیوں جناب! کہانیاں سبھی اچھی تھیں لیکن کچھ ابھی زیر مطالعہ ہیں جس پر تبصرہ نہیں کروں گا۔ سلسلے وار ناولز بھی اچھے جا رہے ہیں خاص طور پر جگت سنگھ اور قلندر ذات۔ اس بار خوشبوئے سخن میں اچھی غزلیں تھیں ریحانہ سعید کی ''مجھے تم سے محبت ہے'' پسند آئی۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے پیارے پاکستان کی ہر پریشانی اور مشکلات کو آسان کر دے اس میں رہنے والے لوگوں میں پیار و محبت دے ایک دوسرے کو تکلیف دینے سے بچائے نئے افق کے اسٹاف کے لیے خصوصی دعا اللہ حافظ۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔ کوئی بھی تحریر نیلی یا سیاہ روشنائی سے تحریر کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجے جانے والے تمام انتخاب کے کتابی حوالے ضرور دیں
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ کہانیوں پر آپ کے تبصرے ادارہ کو ہر ماہ کی 2 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

ترتیب: طاہر قریشی

مؤلف: مشتاق احمد قریشی

اللہ

اللہ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے پاس اللہ تعالیٰ جو کامل و اکمل اور قائم و دائم ہے کی موجودگی کا کیا ثبوت ہے؟ جیسے انسان نے اللہ کہا اور جس کی موجودگی کا اظہار اُس کے ہر فعل سے ہو رہا ہے۔ کیا وہ فی الوقع ہے؟ کیا انسان اپنے علم و حکمت اپنے محسوسات و مدرکات، اپنی عقل و فکر اور وجدان کی بنا پر اس کا اقرار کرسکتا ہے؟ کیا انسانی فہم و ادراک یہ یقین کرسکتا ہے کہ انسان نے اللہ تعالیٰ کو مانا ہے، تو اس لیے نہیں کہ یہ اس کا عقیدہ ہے اور اس لیے بھی نہیں کہ یہ تسکین قلب کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ برعکس اس کے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ایمان و یقین کی تسلی صرف تصورات سے نہیں ہوگی۔ انسان کو حقیقت کی طلب ہے۔ مسئلہ علم کا ہے جاننے کا ہے۔ منطقی دلائل کا نہیں ہے۔

علم کی ابتدا حقائق ہی کے ادراک سے ہوتی ہے۔ حقائق ہی تجربہ اور مشاہدہ مسائل کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ مسائل ہی کو عقل و فکر کی بنا پر منطقی شکل دی جاتی ہے اور ذہنِ انسانی مجبور ہو جاتا ہے کہ اس پر حکم لگائے۔ ذاتِ الٰہی کے بارے میں جاننا حقیقتاً کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ بس اتنا ہی سمجھنا ہے کہ اللہ کون ہے؟ اس کے لیے انسان خود اپنی ذات کو اس کائنات کو اور کائنات کے اعمال و افعال کی طرح خود اپنے اعمال و افعال کا مطالعہ کرلیں جن کا شعور ہر انسان کو اپنے داخل اور خارج میں ہوتا ہے۔ یہی حقائق ہیں جن سے ذاتِ الٰہی کا سراغ ملتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ عالی ایک ایسی لافانی اور ٹھوس حقیقت ہے جو کائنات کے ذرّے ذرّے سے ظاہر ہو رہی ہے، انسان اگر تھوڑی سی بھی توجہ دے اور غور و فکر کرے تو اسے اپنے اردگرد پھیلی اللہ تعالیٰ کی لاکھوں نعمتیں نظر آرہی ہوتی ہیں جن پر وہ سوچتا تک نہیں۔ چھوٹی چھوٹی نعمتوں اور انعاماتِ الٰہی کے علاوہ خود انسانوں کا ایک عالم ہے جنوں کا ایک عالم ہے، حیوانات و نباتات کا اپنا ایک عالم ہے، جمادات و مائعات کا ایک عالم ہے، جن کی مختلف اقسام و خصوصیات ہیں جو اپنی جگہ مکمل دلیل کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ ایک بڑی اہم اور واضح حقیقت ہے کہ اس کائناتِ ارض و سماء کا وجود خود اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر جو ان سب کا خالق و مالک ہے گواہی دے رہا ہے۔ جو لوگ اپنے تجسس کے ہاتھوں یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں اللہ کون ہے؟ کیسا ہے اور کہاں ہے؟ انہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کی ذاتِ عالی وہ ذات ہے جو تمام کمالات اور علوم کا خزینہ ہی نہیں منبع و محور بھی ہے اسی ذاتِ عالی کو ہر چیز پر، ہر طرح سے پوری پوری قدرت حاصل ہے، وہی ذات ہر کام کرتی ہے، دیکھتی ہے اور اس کی پرورش کرتی ہے، ہر چیز کے ظاہر و باطن سے وہ پوری طرح باخبر اور آگاہ ہے، کل کائنات اسی نے تخلیق کی ہے وہی خالق و مالک اور پروردگار ہے، بلکہ ہماری ہر قسم کی عبادات و ریاضت کا حق دار بھی وہی ہے۔

ذیل میں وہ آیاتِ قرآنی جن سے ذاتِ الٰہی کا سراغ ملتا ہے۔ جن کا مطالعہ ذاتِ الٰہی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔
البقرۃ ۱۶۴۔ آل عمران ۱۹۱۔ الرعد ۲ تا ۱۷۔ الانعام ۹۸، ۹۹۔ الزمر ۲۱۔ النحل ۷۹۔ الروم ۲۱ تا ۲۴۔ حم السجدۃ ۷، ۳۷، ۸۔ الفرقان ۴۵۔ الدھر ۱۔ النبا ۸۔ طٰہٰ ۵۳۔ الذریت ۲۱۔

قرآنِ حکیم کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے، جو عربی زبان کی ہر قسم کی باریکیوں پر پورا عبور آج بھی رکھتے ہیں اور

ویسے بھی لفظ اللہ عربوں کے لئے نیا یا اجنبی لفظ نہیں تھا۔ زمانہ قدیم سے خالقِ کائنات کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا رہا ہے۔ عرب لفظ اللہ کا اطلاق اپنے معبودوں پر کبھی نہیں کرتے تھے۔

تفسیر کبیر میں لفظ اللہ اول آلھتہ سے مشتق ہے، جس کے معنی تسکین دینے کے ہیں۔ دوم لہٗ سے مشتق ہے جس کے معنی وارفتگی کے ہیں۔ سوم لہٗ الا سے مشتق ہے، جس کے معنی بلند شان کے ہیں، چہارم لأیلدہ سے مشتق ہے، جس کے معنی حجاب کے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں لفظ "اللہ" اسمِ ذات کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اسلام سے پہلے "الہ" کا لفظ معبود کے لئے استعمال ہوا ہے۔

"اللہ" واحد معبودِ حقیقی، خالق و مالک کائنات ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ جب ساری کائنات کا ایک ایک ذرہ جو اس خالق و مالک کی تخلیق ہے، فنا ہو جائے گا، مرجائے گا تب بھی وہ ذاتِ واحد زندہ اور موجود رہے گی۔ "اللہ" اس عظیم ترین ہستی کا نام ہے جو تمام عالموں کو پالنے والی، اس کی ہر طرح سے نگہداشت کرنے والی ہے اس کی ذاتِ عالی شان سے زمین و آسمان ہی نہیں بلکہ پوری کائنات منور ہے۔ قرآن حکیم میں لفظ اللہ جو اسم ذاتِ الٰہی ہے۔ ۲۶۹۷ مرتبہ آیا ہے اس لفظ "اللہ" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی حرف الگ کر دیا جائے تب بھی اسکے معنی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لفظ اللہ سے اگر حرف الف الگ کر دیا جائے گا تب بھی معنی میں فرق نہیں آئے گا اور الہ سے بھی اگر الف الگ کر دیا جائے تو "لہٗ" رہ جائے گا ان تمام حالتوں کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسمِ ذات میں اس کے نام کی پاکی اور اطلاع موجود رہتی ہے۔ یہ صرف اسی لفظ "اللہ" کی خصوصیت و خوبی ہے۔ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے۔ لفظ اللہ قرآن کریم میں جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ عرب میں اللہ کی ذات کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔

دنیا کی کسی بھی زبان میں اللہ کی ہستی کا مفہوم دینے والا ایسا کوئی لفظ نہیں ہے، عربی میں یہ لفظ کسی اور ہستی کے لئے استعمال نہیں ہوا۔ ایسے ہی کلمہ طیبہ کے پہلے حصے "لا الہ الا اللہ" کے تمام حروف اور الفاظ اسی لفظ اللہ سے نکلتے ہیں۔ یہ بھی اس لفظ کی خاصیت و جامعیت ہے۔

جب اہلِ علم نے اس لفظ اللہ کی معنوی دلالت پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ معنوی اعتبار سے اس غرض کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم میں یہ لفظ اس لئے بھی اختیار کیا کہ لغت کی مطابقت کا تقاضہ یہی تھا۔ کیونکہ اس میں جو معنوی موزونیت پوشیدہ و موجود ہے وہ کسی اور لفظ میں نہیں ہے۔

زبانوں کے ماہرین نے اپنے مطالعہ سے یہ معلوم کیا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہی معبودیت کے معنی میں مستعمل رہی ہے، دیگر تمام زبانوں میں عبرانی، سریانی، حمیری، کلدانی اور عربی میں اس کا لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ الف، لام، اور ہ کا مادہ ہے، کلدانی و سریانی میں "الاہیا" عبرانی میں "الوہ" اور عربی میں "الہ" یہی "الہ" حرف تعریف کے اضافے کے بعد "اللہ" ہوگیا ہے اور تعریف نے اسے صرف خالق کائنات کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔

لفظ "اللہ" "الہ" سے ہے اور "الہ" کے معنی تحیر اور درماندگی کے ہیں، اس اسم ذاتِ الٰہی کے بارے میں انسان جو کچھ جانتا ہے اور جان سکتا ہے وہ عقل کی حیرانی اور فہم و ادراک کی درماندگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انسان جس قدر اور جس طرح بھی اس ذاتِ عالی کے بارے میں غور و خوض کرتا ہے، اس کی عقل حیران و پریشان ہو کر رہ جاتی ہے اور اس کی حیرانی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ لفظ "اللہ" اسمِ ذات کے طور پر آیا ہے، یوں تو اللہ تعالیٰ کے بےشمار صفاتی نام ہیں جبکہ یہ نام تمام صفاتِ الٰہی پر حاوی ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کا تصور کسی صفتِ الٰہی کے ساتھ کیا جاتا ہے تو انسانی ذہن اسی خاص صفت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، لیکن جب "اللہ" کہا جاتا ہے تو فوراً ہی ذہن میں ایک ایسی ہستی کا تصور ابھرتا ہے جو تمام صفات و کمال سے آراستہ اور ہر چیز پر قادر اور مختارِ کل ہے، وہی خالق و مالک ہے، جس نے کل کائنات کو پیدا فرمایا ہے۔ اس کی طاقت و قوت کا اندازہ انسان قرآنِ حکیم سے بخوبی کر سکتا ہے۔

(جاری ہے)

حصہ اول

مستقبل ساز

خورشید پیرزادہ

انسان کو رب تعالیٰ نے اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر دنیا میں اتارا اسے عقل و شعور کے ہتھیار سے لیس کیا۔ پھر جس نے بھی ودیعت کردہ اس صلاحیت کو استعمال کیا اس نے کائنات کے سربستہ رازوں تک رسائی حاصل کرلی۔

وہ بھی اک ایسا ہی نوجوان تھا لیکن کوئی اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔

کمپیوٹر کی دنیا کے ماہر سائنس دان کا احوال، اس نے مستقبل کو اپنے تابع کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔

نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص ایک خوب صورت ناول جس کی ہر سطر آپ کو چونکا دے گی۔

کاشف سلیم نے کسمساتے ہوئے آنکھ کھولی اور جماہی لیتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظر ٹھیک سامنے لگے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر پڑی اور وہ بری طرح سے چونک پڑا اور اس کے حلق سے ایک عجیب سی گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی۔ بجلی کی سی تیزی سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پہنچے۔ وہ پھٹی ہوئی نگاہوں سے آئینے میں اپنے ہی عکس کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی اجنبی کا عکس دیکھ رہا ہو۔

''یا اللہ! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' اس کے منہ سے خود بخود یہ الفاظ نکلے اور وہ بستر سے کود کر آئینے کے پاس پہنچا۔ ''کک...... کیسے؟ رات ہی رات میں میرے بال اتنے لمبے کیسے ہوسکتے ہیں؟ یہ داڑھی مونچھ، یہ سر کے بال، ایک ہی رات میں اتنے لمبے کیسے ہوسکتے ہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا خود سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے اپنی داڑھی اور سر کے بال نوچنے کی کوشش کی اور اس کی چیخ سی نکل گئی کیونکہ بال اصلی تھے۔

اس نے بوکھلا کر کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ یہ کمرہ اسی کا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ رات کو بھلا چنگا اپنے بستر پر سویا تھا۔ اسے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے کل ہی شیو بنائی تھی۔ لیکن اس وقت تمام بال ایسے بڑھے ہوئے تھے جیسے کئی مہینوں سے انہیں تراشا ہی نہ گیا ہو۔

اس کی حالت پاگلوں کی سی ہورہی تھی۔ وہ حلق پھاڑ کے چلایا۔

''لالو! لالو''

❀❀❀❀

ڈبل روٹی کے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے چھری لالو کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے سائیں نے اسے پکارا ہو۔

''مگر کیسے، بھلا سائیں کیسے پکار سکتے ہیں؟ ان کا تو چار سالوں سے پتہ ہی نہیں تھا۔ جانے کہاں چلے گئے تھے؟ شاید میرے کان بجنے لگے ہیں۔''

وہ اپنا وہم سمجھ کر چھری اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ آواز پھر سے آئی۔

''لالو! ارے کہاں مرگئے تم؟''

اس بار یہ وہم نہیں تھا۔ آواز آئی تھی اور آواز سائیں ہی کی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا کچن سے نکلا اور کاشف سلیم کے بیڈ روم کی طرف دوڑا۔

یہ دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ بیڈ روم کا دروازہ روز ہی کی طرح نہ صرف بند تھا بلکہ اس پر تالا بھی لگا ہوا تھا اور یہ

تالا خود لالو نے ہی لگایا تھا۔
اندر سے کاشف سلیم کی آواز مسلسل آ رہی تھی اور اب تو وہ اندر سے دروازے کو کھٹکھٹا بھی رہا تھا۔
لالو حیران و پریشان دروازہ کو یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔
''آخر چار سال بعد سائیں اچانک کہاں سے لوٹ آئے؟ اور آئے تو آئے لیکن بند کمرے میں کیسے پہنچ گئے۔''
بات تھی بھی حیران کر دینے والی۔ کیونکہ صبح ہی اس نے روزانہ کی طرح بیڈروم کی صفائی کر کے اپنے ہاتھ سے تالا لگایا تھا۔ اس وقت تو اندر کوئی نہیں تھا۔ لالو بیچارہ ہکا بکا سا کھڑا اس پہیلی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تبھی دروازہ بہت زور سے بجایا گیا اور اندر سے سائیں کی آواز بھی سنائی دی۔
''ارے باہر سے دروازہ کیوں بند کیا ہوا ہے؟ لالو تم ہو کہاں؟''
''ہاں سائیں میں یہیں ہوں۔'' یہ الفاظ خود بخود لالو کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔
''تو دروازہ کیوں نہیں کھول رہا؟''
''ابھی کھولتا ہوں سائیں۔'' لالو نے بوکھلاہٹ میں سینٹر ٹیبل سے چابی اٹھائی اور تالے میں ڈال کر گھمائی اور کنڈی بھی کھول دی۔
اس کا سائیں کاشف سلیم اس کے سامنے کھڑا تھا۔
''کیا ہوا؟ تم نے کمرہ باہر سے بند کیوں کر دیا تھا۔ پاگل تو نہیں ہو گئے؟'' کاشف سلیم نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔
''سائیں میں تو روزانہ صفائی کے بعد باہر سے تالا لگا دیتا ہوں۔ لیکن آپ کمرے کے اندر کیسے آ گئے؟''
''کمرے کے اندر کہاں سے آ گیا۔ مطلب۔'' کاشف سلیم نے حیرانگی سے کہا۔
''میں تو روز ہی اس کمرے میں سوتا ہوں۔ بھول گیا کیا۔''
''بس سوتے تھے سائیں۔ لیکن پچھلے چار سالوں میں آپ یہاں کب سوئے ہیں؟''
لالو کے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ جو وہ دیکھ رہا تھا اس پر 008 سامنے ہونے کے باوجود یقین نہیں کر پا رہا تھا۔
''ایسے کیا دیکھ رہے ہو اور یہ تم نے کیا کہا کہ میں چار سالوں سے یہاں سویا ہی نہیں ہوں؟''
''آپ سونے کی بات کر رہے ہیں سائیں۔ چار سالوں سے آپ کسی کو نظر ہی کہاں آئے۔ آپ کے سب چاہنے والے۔''
''کیا بک رہے ہو تم؟'' کاشف سلیم نے غصے سے کہا۔
''اور یہ ایک ہی رات میں میرے بال اتنے بڑے کیسے ہو گئے؟''
''یا اللہ...... کیا آپ کو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ پچھلی ہی رات کو اس کمرے میں سوئے تھے اور اب جاگے ہیں؟''
''ہاں۔ لیکن اگر ایسا سوچ رہا ہوں تو اس میں غلط کیا ہے' اچھا آج تاریخ کیا ہے؟''
''14 مئی۔'' لالو نے جواب دیا۔
''تو' مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں 13 مئی کو سویا تھا۔''
لالو اپنے سائیں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ کر رہا ہو اور شبہے والی بات بھی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اسے کیسے جھٹلا سکتا تھا۔
''سال بھی تو پوچھ لیں سائیں' آپ تیرہ مئی 2008ء میں سوئے تھے اور آج چودہ مئی 2013ء ہے۔''
''2013ء' یہ کیا بک رہے ہو تم۔'' کاشف سلیم' لالو پر چڑھ دوڑا اور اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولا۔
''پاگل سمجھتے ہو مجھے' بھلا کوئی چار سال تک بھی سو سکتا ہے کیا۔'' کاشف سلیم نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کی نظر لالو کے پیچھے دیوار پر ٹنگے 2013ء کے کلینڈر پر پڑی اور اس نے لالو کا گریبان چھوڑ دیا۔

"چار سال بعد کا کیلنڈر کون چھاپے گا؟ یہ کیا معمہ ہے؟"

کاشف سلیم کی نظریں اس کیلنڈر پر ایسے ٹکی ہوئی تھیں جیسے اپنی ہی لاش دیکھ رہا ہو۔ اب اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔ ادھر لالو سے بھی کچھ کہتے نہیں بن پا رہا تھا۔

"یہ، یہ کیا چکر ہے لالو' کیا ہوا تھا' مجھے سب بتاؤ' ایک ایک بات۔" کاشف دھیرے سے بولا۔

"سائیں مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں پتہ کہ اس رات آپ عام راتوں کی طرح بارہ بجے کے بعد گھر آئے تھے۔ شاید دو بج رہے تھے۔ میں نے کھانے کے لیے پوچھا تو آپ نے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کھانا باہر سے کھا کر آئے ہیں۔ اس رات آپ نے معمول سے زیادہ شراب پی ہوئی تھی لیکن اتنے نشے میں بھی نہیں تھے کہ ہوش ہی نہ ہو۔ آپ اس رات بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ آپ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا کہ لالو مجھے پتہ ہے کہ تم میرے آنے سے پہلے کھانا نہیں کھاتے' اب تم کھانا کھا لو اور سو جاؤ میں کھا کر آیا ہوں۔ تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ ہر اچھے برے وقت میں تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ مگر اب تم فکر مت کرو۔ اب میرے دن پھرنے والے ہیں۔ اور آنے والے دنوں میں میرے ساتھ تمہیں بھی بہت فائدہ ہوگا۔ میں تمہاری خدمت اور ایمانداری کی پوری قیمت ادا کروں گا۔"

"میں نے یہ سب کہا تھا؟"

"جی سائیں۔"

"یاد کر کے بتاؤ۔ میں نے اور کیا کیا کہا تھا۔ شاید اسی سے سمجھ میں آئے کہ اس رات میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔"

"کچھ خاص تو نہیں ہوا تھا' آپ میرے ساتھ ضرورت سے زیادہ محبت جتا رہے تھے۔ میں نے سوچا شاید آج آپ کچھ زیادہ ہی پی کر آئے ہیں' اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے تھے۔ اسی کمرے میں جس سے آپ پورے چار سال بعد نکلے ہیں۔"

"تو اگلی صبح یعنی چودہ مئی 2008ء کی صبح میں تم کو کمرے میں نہیں ملا؟ کہاں چلا گیا تھا میں؟"

"سائیں۔ مجھے تو کیا کسی کو بھی نہیں معلوم۔ آپ ہی کو پتہ ہونا چاہئے کہ آپ ان چار سالوں میں کہاں رہے۔"

"کمال کی بات ہے۔ مجھے کچھ یاد ہی نہیں آ رہا' خیر صبح جب میں کمرے میں نہیں ملا تو تم نے کیا کیا...... کیا ہوا تھا؟" حیرت کی شدت سے کاشف سلیم کو اپنا سر پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"ہونا کیا تھا۔ میری تو ٹی گم ہو گئی تھی سائیں۔ آپ کا حکم تھا کہ آپ رات کو بھلے کتنی ہی دیر سے سوئیں لیکن میں صبح سات بجے بیڈ ٹی لے کر پہنچ جاؤں۔ وہی معمول اس صبح بھی تھا۔ لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ اس صبح آپ بیڈ پر نہیں تھے۔ لیکن اس بات نے مجھے زیادہ نہیں چونکایا' میں سمجھا آپ باتھ روم میں ہوں گے۔ میں بلند آواز میں چائے رکھنے کا کہہ کر جانے لگا تو میری نظر باتھ روم کے دروازے پر پڑی جو ہلکا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا لیکن آپ اندر ہوتے تو ملتے نا۔ اب تو میں پورے فلیٹ میں آپ کو آوازیں دیتا ہوا ڈھونڈنے لگا۔ فلیٹ ہے ہی کتنا بڑا۔ لیکن آپ کہیں نہیں ملے۔"

"پھر؟"

"پھر میری نظر اس کھڑکی پر پڑی جو پتلی گلی میں کھلتی ہے۔ وہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میں چونک گیا تھا کیونکہ آپ اس کھڑکی کو کبھی نہیں کھولتے تھے۔ ایک بار غلطی سے میں نے کھول دی تھی تو آپ بہت ناراض ہوئے تھے اور تاکید کی تھی کہ آئندہ نہ کھولوں' کیونکہ باہر سے بدبو کے بھبکے آتے ہیں۔ آپ ویسے بھی اے سی چلا کر سوتے تھے تو کھڑکی کھولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اس صبح بھی کمرے کا اے سی جوں کا توں چل رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے لگا کہ آپ کے ساتھ ضرور کوئی انہونی ہوئی ہے۔" لالو نے اس صبح کی پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد؟"

''جب میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو سب سے پہلے میں نے انیتا میم صاحب کو فون کیا۔''

''انیتا؟'' کاشف سلیم کے دماغ میں ایک دھما کا سا ہوا۔

''کیا آپ کو ان کے بارے میں بھی کچھ یاد نہیں؟ وہ آپ کی۔'' اس کی حیرت دیکھ کر لالو نے پوچھا۔

''یاد ہے۔ وہ سب یاد ہے مجھے۔ اس رات کی بھی سب باتیں یاد ہیں مجھے۔ خیر پہلے تم بتاؤ تمہارے فون کرنے کے بعد انیتا یہاں آئی تھی؟''

''کیا بات کر رہے ہیں آپ۔ ایسا بھلا ہو سکتا ہے کہ آپ کے بارے میں فون پر ایسی بات بتاتا اور وہ نہ آتی۔ اس بیچاری نے صبح کا شاور بھی نہیں لیا تھا آپ کے غائب ہونے کا سن کر جس حال میں تھی دوڑی چلی آئی۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ انہوں نے فوراً پولیس کو فون کیا۔ تفتیش کے بعد پولیس نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا کہ آپ خود ہی کھڑکی کے راستے کہیں چلے گئے ہیں۔ مگر یہ بات میرے حلق سے نہیں اتری' کیونکہ اگر آپ کو کہیں جانا ہوتا تو سامنے کے دروازے سے جاتے یوں چھپ کر جانے کی آپ کو کیا ضرورت تھی' یہاں آپ کو روکنے والا کون ہے اور پھر آپ وہ راستہ کیوں اختیار کرتے جس کی بدبو آپ کی برداشت سے باہر ہوتی ہے؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اپنی مرضی سے کہیں نہیں گیا تھا۔'' یہ کہہ کر کاشف سلیم نے اپنے دماغ کو کھنگالنے کی کوشش کی۔

''اس کا مطلب ہے آپ کو سب یاد آ رہا ہے؟''

''نہیں۔ سب تو نہیں۔ مگر اس رات کے کچھ لمحے ضرور یاد آ رہے ہیں۔''

''کیا یاد آ رہا ہے آپ کو؟''

کاشف سلیم نے جواب دینے کے لیے لب وا کیے مگر پھر یہ سوچ کر سختی سے بھینچ لیے کہ یہ باتیں لالو کی اوقات سے اوپر کی ہیں اور اب اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس کا منجمد دماغ اس طرح اچانک حرکت میں آنے لگا جیسے بند پڑی مشین کو ایک دم کرنٹ سپلائی ہو گیا ہو۔ چودہ مئی 2008ء کی اس رات کے ایک دو واقعات کی فلم اس کے ذہن کے پردے پر چل رہی تھی۔

❁❁❁❁

تھری اسٹار ہوٹل میں بنے بار میں روزانہ کی طرح کافی بھیڑ تھی۔ عام طور پر وہاں کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا۔ سب اپنی مستی میں مست رہتے تھے۔ مگر آج کی بات ذرا الگ ہی تھی۔ آج پاکستان اور بھارت کے درمیان کرکٹ میچ تھا۔ سب کی نظریں بڑی سی ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر کاشف سلیم کو تو جیسے اس بھیڑ یا کرکٹ میچ سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کی تنہائی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک کونے میں اکیلا بیٹھا وہسکی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ پکڑے جانے کا خوف اس لیے نہیں تھا کہ وہ بار باقاعدگی کے ساتھ پولیس کو بھتہ پہنچاتا تھا۔ اس لیے یہاں آنے والے بے خوف ہو کر ہر طرح کے نشے' سٹے اور عورتوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ وہ اپنے گلاس میں گم تھا کہ ایک لڑکی اس کے نزدیک آئی۔

لڑکی کیا تھی چلتا پھرتا شعلہ تھی' سراپا آگ تھی۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے والے کو جلانے کے لیے کافی تھی اور کسی لڑکی کی خوبصورتی کے لیے اس سے زیادہ تعریف شاید ہی دیگر الفاظ میں ہو سکتی ہو۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔'' کاشف سلیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ آواز ایسی تھی جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔ چست لباس میں اس کے بدن کا انگ انگ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ صاف جھلک رہا تھا۔

''آں۔'' کاشف سلیم کے منہ سے بس یہی ایک لفظ نکل پایا تھا۔ مچھلی سے زیادہ چکنی وہ لڑکی پہلی ہی نظر میں اس کے دل میں اتر گئی تھی۔

تب ہی لڑکی کے بالوں کی ایک لٹ باقی بالوں سے بغاوت کر کے دائیں گال پہ جھول گئی اور رہ رہ کر گال کو چومنے لگی۔

لٹ کیا تھی' کالی ناگن تھی جو رہ رہ کر کاشف سلیم کے

دل کو ڈس رہی تھی۔

لڑکی نے اپنی نیل پالش لگی انگلیوں سے اس لٹ کو اپنے کان کے پیچھے سیٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ سے یہاں بیٹھنے کی اجازت مانگی تھی۔“

اس کا دل تو چاہا کہ اجازت دے دے لیکن اس وقت وہ اپنے آس پاس کسی کی موجودگی نہیں چاہتا تھا۔ من ہی نہیں کر رہا تھا کسی سے بات کرنے کا۔ اسے تو خود میں ڈوب کر خود سے باتیں کرنے میں مزا آ رہا تھا۔

”سوری۔“ اس نے لڑکی کے سراپا سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

اس کا جواب سن کر لڑکی ہنس پڑی۔ ہنسنے سے اس کے گالوں پر ڈمپل پڑ گئے جو اس کے حسن میں مزید چاند جھلملا رہے تھے۔ وہ کچھ جھکتے ہوئے بولی۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے پہچان نہیں پائے۔ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔“

کاشف سلیم نے بڑے غور سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر بھی کچھ یاد نہیں آیا تو دوبارہ ”سوری۔“ کہہ دیا۔

”مجھے ایسے جواب کی امید تو نہیں تھی۔ انیتا نے تو کہا تھا کہ تم اس کے ایک اچھے اور سب سے پیارے دوست ہو۔“

”ہاں...... بے شک ہوں...... مگر۔“

”اور آپ اس کی دوست کو پہچان نہیں پا رہے ہیں۔ جبکہ۔“

”اوہ، کہیں تم وہ تو نہیں ہو جو اس رات، ہاں۔ میں اور انیتا سنے پلیکس سے مووی دیکھ کر نکل رہے تھے، تب تم ملی تھیں۔“

”شکر ہے کچھ یاد تو آیا۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”اب تو میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں نا۔ لوگ کہہ رہے ہیں بہت شاندار میچ ہو رہا ہے۔ لیکن یہاں آپ بھی تنہا ہیں اور میں بھی۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ انیتا نے آپ کے بارے میں کچھ کہا تھا، مجھے اسی بارے میں آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”ضروری بات۔“ اس نے گلاس سے ایک اور چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”سب سے پہلی بات تو یہ کہ حالات چاہے جتنے بھی مایوس کن ہوں، ایک باصلاحیت شخص کو ہمیشہ پرامید رہنا چاہئے۔ حالات کے چھوٹے موٹے تھپیڑوں میں الجھ کر کبھی خود کو ناکام انسان نہیں سمجھنا چاہئے۔“

”مطلب؟“ کاشف سلیم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”اس ملک کی حکومت اگر آپ کی صلاحیت کی قدر نہیں کر پا رہی ہے تو یہ آپ کی نہیں، بلکہ حکومت اور اس ملک کی بدقسمتی ہے۔“

یہ سنتے ہی کاشف سلیم چونک کر کافی دیر تک لڑکی کی طرف دیکھتا رہ گیا پھر بولا۔

”تم یہ بات کیسے جانتی ہو کہ میں نے حکومت کے سامنے کوئی منصوبہ رکھا ہے؟“

”آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ انیتا نے آپ کے بارے میں مجھ سے کافی باتیں کی ہیں مگر، کیا میں ایسے ہی کھڑے رہ کر آپ کے سوالوں کے جواب دیتی رہوں؟“

اب اسے کہنا ہی پڑا۔

”بیٹھیں۔“

”تھینک یو۔“ یہ کہہ کر وہ کاشف سلیم کے سامنے بیٹھ گئی۔ اب اس کی نظریں سیدھی لڑکی پر پڑیں تو اسے اعتراف کرنا پڑا کہ لڑکی واقعی میں بہت خوبصورت تھی۔ ایک طرح سے اس کی نظریں لڑکی کے سراپا میں کھو کر رہ گئی تھیں۔

وہ خود اس کے حسن کی کشش سے آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”اب کہو۔ انیتا میرے بارے میں تم سے......“

”مسٹر کاشف۔“ لڑکی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے آپ ضرورت سے زیادہ جلدی میں ہیں۔ ہوش مندی تو یہ کہتی ہے کہ ایسی بات کرنے سے پہلے آپ مجھ سے کم از کم میرا نام تو پوچھ لیں۔ کیونکہ میں محسوس کر رہی

ہوں کہ سنے پلیکس میں ہوئی ملاقات بھلے آپ کو یاد آ گئی لیکن میرا نام یاد نہیں آیا۔" اس بار لڑکی کے ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"سوری۔"

"الوینہ۔"

"اوہ ہاں' اچھا نام ہے۔ تمہاری ہی طرح خوبصورت۔ اب ہمیں۔"

ایک بار پھر الوینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنی جلدی میں کیوں ہیں۔ کیا میں اپنے لیے ایک ڈرنک منگوا لوں پھر آرام سے بات کریں گے۔" وہ کاشف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی ہوئی بولی۔ "فکرمند نہ ہوں' اس ڈرنک کی پیمنٹ میں خود ہی کروں گی۔"

اس بار کاشف نے کوئی جواب نہیں دیا' اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور الوینہ سے پوچھا۔

"کیا لوگی تم؟"

"ایپل جوس۔"

"ایک گلاس ایپل جوس۔" اس نے ویٹر کو آرڈر کیا اور میز سے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ نکال کے اپنے ہونٹوں سے لگائی اور لائٹر سے سگریٹ سلگا کر اس کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر دراز ہو گیا۔

دونوں ایک دوسرے کے بولنے کے انتظار میں چپ تھے۔ اتنے میں ویٹر ایپل جوس کا گلاس لے آیا اور جیسے ہی کاشف سلیم کی توجہ ویٹر کی جانب مبذول ہوئی تو وہ یہ نہیں دیکھ پایا کہ الوینہ نے دور کھڑے ایک شخص سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا بات کی۔

الوینہ نے گلاس اٹھا کہ منہ سے لگایا اور جب وہ کچھ جوس پی چکی تو کاشف نے پوچھا۔

"اب بتاؤ۔ انیتا نے تم کو میرے بارے میں اور کیا بتایا ہے؟"

"اس نے مجھ سے تمہارے پروجیکٹ کے بارے میں بات کی تھی۔"

"پپ...... پروجیکٹ کے بارے میں؟ کک...... کون سے پروجیکٹ کے بارے میں۔" وہ تو یہ سن کر اچھل ہی پڑا تھا۔

ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ لیے الوینہ بولی۔

"میرے خیال سے آپ کے کوئی دس بیس پروجیکٹ تو ہیں نہیں۔"

"نہیں' میں تمہاری اس بات پر یقین نہیں کر سکتا۔ انیتا کسی کو اس پروجیکٹ کے بارے میں......"

"میں "کسی" نہیں' اپنی بات کر رہی ہوں۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔" الوینہ نے کاشف کی بات کو پھر بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

کاشف ہکا بکا سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اگر الوینہ سچ کہہ رہی تھی تو اسے انیتا پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ اتنی بڑی بے وقوفی کیسے کر سکتی ہے؟

"اب آپ شاید دل ہی دل میں انیتا پر غصہ ہو رہے ہو۔ مگر آپ کو ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس پروجیکٹ کے بارے میں مجھ سے ذکر کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ہم دونوں اتنی ہی گہری دوست ہیں' جتنا کہ آپ دونوں۔ ہم لاہور میں روم میٹ رہ چکی ہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم وہاں کال سینٹر میں جاب کر رہی تھیں۔"

"اور دوسری وجہ۔" کاشف سلیم نے چڑ کر پوچھا۔

"اس دن جب ہم سنے پلیکس میں ملے تھے تو آپ کو یاد ہو گا کہ میرے ساتھ ایک انکل بھی تھے۔"

"ہاں' یاد ہے۔"

"وہ آئی ٹی ڈپارٹمنٹ میں بہت اونچی پوسٹ پر ہیں۔ میرے منہ سے سننے کے بعد ہی اس نے آپ کے پروجیکٹ کے بارے میں مجھ سے بات کی تھی' کہ شاید وہ آپ کی کچھ مدد کر دیں۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ انیتا نے کوئی بے وقوفی نہیں کی تھی۔ وہ آپ کی سچی دوست ہے' ہر حال میں آپ کا بھلا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی

بھی طرح آپ کا کام بن جائے۔"

"مجھے بالکل بھی یقین نہیں ہو رہا ہے۔ تو پھر اس نے اس بات کا مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"بھول گئی ہوگی۔" الوینہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"وہ ایسی بھولنے والی نہیں ہے اور وہ بھی ایسی بات جس میں اس نے میری بھلائی کی بات کی ہو۔"

"بھول گئی ہوگی جناب' کیونکہ بات وہیں پر ختم ہوگئی تھی۔ میرے انکل بہت کھڑوس آدمی ہیں۔ وہ کسی کی سفارش نہیں مانتے۔"

"مطلب بات شروع بھی ہوئی اور ختم بھی ہوگئی؟"

"ہاں۔ شاید اسی لیے انیتا نے اس کا ذکر نہیں کیا ہوگا۔ اس کی نظر میں تو بات ختم ہی ہو چکی تھی لیکن میری نظر سے نہیں۔" یہ کہہ کر الوینہ نے کاشف کا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگائی اور کاشف نے لائٹر جلا کر سگریٹ سے لگا دیا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"تھینک یو۔" الوینہ نے سگریٹ سلگانے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ میرے کام کے بندے ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"اس سے پہلے آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ میں بھی آپ کے کام کی ہوں یا نہیں۔"

"تو بتاؤ' تم میرے کس کام آ سکتی ہو۔"

"آپ اپنی زندگی میں کتنا پیسہ چاہتے ہیں؟" الوینہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسا سوال ہے؟" کاشف سلیم الجھ کر رہ گیا۔

"سوال سادہ اور سمپل سا ہے۔ ہر آدمی اپنی زندگی میں ایک ہی بات سوچتا ہے کہ کاش اس کے پاس اتنا پیسہ ہو جائے' جس سے اس کی باقی کی زندگی عیش و آرام سے گزر جائے۔ میں آپ سے وہی رقم پوچھ رہی ہوں۔"

الوینہ نے اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

کاشف سلیم نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹوں میں عجیب سی مسکان لیے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ وہ گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔

"محترمہ۔ شاید تم ایسا کھیل کھیل رہی ہو کہ میں تم میں نہ چاہتے ہوئے بھی دلچسپی لینے لگوں۔ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں' تمہاری باتیں بے پر کی اور بے تکی ہیں۔ میرے خیال سے تم کچھ زیادہ ہی اونچی اڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اب میرا موڈ خراب مت کرو اور پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو تو مہربانی ہوگی۔"

"یعنی آپ کو میری باتیں گپ لگ رہی ہیں؟"

"گپ ہے تو گپ ہی لگے گی۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں گپ نہیں بلکہ سچ کہہ رہی ہوں تو؟"

"دیکھیے محترمہ۔ یہ جال آپ کسی اور پر پھینکیں۔ تم کو مجھ سے زیادہ ہینڈسم نوجوان مل جائیں گے۔ میرا ٹائم ویسٹ مت کرو۔"

"کمال ہے۔ میں آپ کا ٹائم بنانے کی کوشش کر رہی ہوں اور آپ میری بات کو الٹا سمجھے جا رہے ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔" کاشف سلیم بھنا کر بولا۔

"کیا تم میری ساری خواہشیں پوری کر سکتی ہوں۔ تم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ میرے جیسے آدمی کے کیا خواب ہو سکتے ہیں؟"

"نہیں۔ مجھے وہ سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"مجھے صرف وہ رقم معلوم کرنی ہے جس سے آپ کی وہ سب خواہشیں پوری ہو جائیں۔"

"سو کروڑ۔ سو کروڑ میں پوری ہو سکتی ہیں میری خواہشیں۔" کاشف سلیم غصے سے بولا۔

"بولو۔ تم دے سکتی ہو مجھے؟"

"اوکے۔ ڈن ہے۔" الوینہ بولی۔

"میں آپ کو یہ رقم دلوا دوں گی۔"

''پھر وہی بے پر کی اڑا رہی ہو۔''

''نہیں۔ کاشف صاحب۔'' الوینہ کے لہجے میں غراہٹ صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

''آپ بار بار میری توہین نہیں کر سکتے۔ بلا یہ جانچے کہ سامنے والا اپنی کہی ہوئی بات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس بات پر لگا تار شک کرتے چلے جانا۔ کسی سمجھدار آدمی کا کام نہیں ہے۔''

کاشف سلیم اس کے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ شاید یہ لڑکی واقعی میں سنجیدہ ہے۔ وہ واقعی میں اپنی کہی ہوئی بات کو پورا کر سکتی ہے۔

لیکن سو کروڑ۔ کیا کسی کی حیثیت ہو سکتی ہے اتنی رقم دینے کی؟؟ کم از کم اس کی تو ہرگز نہیں ہے۔ اب وہ کچھ بھی کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

''سوری کاشف صاحب۔ مجھے آپ سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آپ واقعی میں یہ رقم کما سکتے ہیں۔''

''کما سکتا ہوں' مطلب؟''

''مطلب۔ میری اپنی تو اتنی حیثیت نہیں ہے لیکن اس کی ہے۔ جس کے لیے میں کام کرتی ہوں اور جس نے مجھے آپ سے بات کرنے کے لیے بھیجا ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' کاشف سلیم نے نہایت تجسس سے پوچھا۔

''بل گیٹس۔''

''ب بل گیٹس؟'' یہ نام سنتے ہی کاشف سلیم کا پورا بدن خوشی سے ناچ اٹھا تھا۔

''وہ ہی آپ کو سو کروڑ دیں گے۔ پہلے یہ بتائیں ان کی حیثیت ہے یا نہیں سو کروڑ دینے کی؟''

''ک ک کیا بات کر رہی ہو تم۔ وہ تو اس سے بھی کئی گنا دینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر بل گیٹس مجھے یہ رقم کیوں دے گا؟''

''یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔ کیا آپ ان سے ملنا چاہیں گے؟''

''ک ک کیسی بات کر رہی ہو تم۔'' ہیجان کی زیادتی کی وجہ سے کاشف سلیم کا برا حال تھا۔

''میرے جیسے آدمی کے لیے تو یہ سب ایک خواب کی طرح ہے۔ بلکہ صاف کہوں تو مجھ میں ان سے ملنے کا خواب دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہے اور تم ان سے بالمشافہ ملوانے کی بات کر رہی ہو۔''

اس کی حالت دیکھ کر الوینہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''اگر یہ کہا جائے کاشف صاحب کہ وہ خود آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہیں تو یقین مانیں غلط نہ ہوگا۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھلا وہ' کمپیوٹر کی دنیا کا بے تاج بادشاہ' مجھ جیسے چھوٹے سے آئی ٹی انجینئر سے کیوں ملنا چاہیں گے؟''

''کیونکہ وہ' صرف وہ ہی آپ کی صلاحیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں اس صلاحیت کی بات کر رہی ہو جس کے بارے میں انیتا نے مجھے بتایا تھا اور جسے یہاں کی حکومت سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم۔ صرف وہ ایک انسان ہی سمجھ سکتا ہے کہ میں کیا پروجیکٹ تیار کر چکا ہوں۔'' کاشف ہیجانی کیفیت میں کہتا چلا گیا۔

''حکومت میں تو سارے کوڑھ مغز بھرے پڑے ہیں۔ سچ' اگر بل گیٹس صاحب کا ہاتھ میرے سر پر ہوا تو میں یہ معجزہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

''گیٹس صاحب کو پوری امید ہے کہ آپ وہ کر سکتے ہو' جو آپ کہہ رہے ہو۔ تو چلیں بل گیٹس صاحب کے پاس۔''

''ک ک کہیں تم جھوٹ تو نہیں بول رہی ہو۔ کہیں کوئی خواب تو نہیں دکھا رہی ہو۔ کیا بل گیٹس پاکستان آئے ہوئے ہیں؟''

''ظاہر ہے۔ میں آپ کو امریکا تو لے جانے سے رہی۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں وہ؟''

"ساتھ چلیں۔ پتہ لگ جائے گا۔" وہ کاشف سلیم کی حالت سے پوری طرح محظوظ ہو رہی تھی۔

"پہلے اپنا گلاس تو خالی کرلیں۔"

"سوری۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں بچی ہوئی وہسکی اپنے حلق میں اتار دی۔

یہ سوچ کر ہی اس کی رگوں میں دوڑتا خون فوارے کے پانی کی طرح اچھلنے لگا تھا کہ وہ آئی ٹی کی دنیا کے بادشاہ بل گیٹس سے ملنے والا ہے۔

سڑک پر دوڑتی مرسڈیز میں بیٹھ کر منزل کی طرف جاتے ہوئے کاشف سلیم سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس وقت وہ خود کو کیسے سنبھالے گا؟ خود کو بے ہوش ہونے سے کیسے روک سکے گا؟

تب ہی"

مرسڈیز شیرٹن ہوٹل کے پورچ میں رکی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ احمقانہ سوال کر بیٹھا۔

"کیا بل گیٹس یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"ظاہر ہے۔" الوینہ نے فقط اتنا ہی کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

کاشف بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گیا یہ سوچتے ہوئے کہ ہاں بل گیٹس فائیو اسٹار ہوٹل میں ہی ٹھہر سکتے ہیں۔

کاشف نے سر جھٹکا اور خاموشی سے الوینہ کے ساتھ صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ الوینہ کے ساتھ ہوٹل کی بڑی سی لابی سے ہوتا ہوا اس کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گیا۔ الوینہ نے پانچویں فلور کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ سے اتر کے راہداری پار کرتے ہوئے کاشف کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے اسے جیتے جی کسی مقتل میں لے جایا جا رہا ہو۔ الوینہ نے ایک کمرے کے سامنے رک کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

دستک کے جواب میں دروازہ کھلا۔ کاشف دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے سامنے بل گیٹس کو دیکھنے کے لیے تڑپا جا رہا تھا۔ مگر دروازہ کھولنے والا بل گیٹس نہیں بلکہ کوئی اور ہی تھا۔ ورنہ بل گیٹس سے اس کی چاہے ملاقات نہ ہوئی ہو لیکن رسالوں اور نیٹ پر وہ اس کی سیکڑوں تصویریں اور ویڈیوز دیکھ چکا تھا۔

پھر اس نے خود ہی سے سوال کیا کہ ارے پاگل بھلا بل گیٹس صاحب خود دروازہ کھولنے آئیں گے کیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور الوینہ کاشف کو لے کر اندر داخل ہوگئی اور ایک شاندار سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ وہاں ایک اور شخص نظر آیا۔ کاشف نے سوچا یہ گیٹس صاحب کے اسٹاف کے لوگ ہوں گے۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یہ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے سجا ہوا بہت بڑا سوئیٹ تھا۔ شاید اس ہوٹل کا سب سے مہنگا سوئیٹ۔

وہاں موجود شخص نے نہایت ادب سے کہا۔

"آیئے بیٹھیے۔"

بیٹھنے کی بجائے کاشف نے الوینہ سے پوچھا۔

"گیٹس صاحب کہاں ہیں؟"

"آتے ہیں۔" وہ بولی۔

"آپ بیٹھیں تو سہی۔"

کاشف کی نظر ایک دروازے پر پڑی جو شاید اس سوئیٹ کے بیڈروم کا دروازہ تھا۔ وہ یہ سوچتے ہوئے مخملیں صوفے پر بیٹھ گیا کہ شاید وہ اسی کمرے میں ہوں گے۔

پھر ایک شخص نے اس کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔ وہ بل گیٹس تو نہیں تھا۔ مگر اتنی رعب دار شخصیت کا مالک تھا کہ کاشف سلیم بے ساختہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں موجود دونوں آدمی بھی اسے دیکھ کر باادب اور احترام سے کھڑے ہو گئے، جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان کا مالک ہے۔ اس کی گردن غرور سے اکڑی ہوئی تھی۔

اس شخص کی عمر پینتالیس برس کے قریب رہی ہوگی۔ چھ فٹ کی قامت پر براؤن کلر کی قیمتی پینٹ اور سفید شرٹ اور ٹائی جس پر ہیرے جڑی پن لگی ہوئی تھی اور چمچماتے براؤن اٹالین جوتے۔ اس کی سرخ و سپید رنگت کو

مزید جاذب نظر بنا رہے تھے۔
کاشف کو یہ سمجھنے میں عار نہیں تھا کہ اپنے رکھ رکھاؤ سے وہ بہت زیادہ دولت مند نظر آ رہا تھا۔
کاشف کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا گورا مضبوط ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''امیر جان، ملک امیر جان کہتے ہیں ہمیں۔''
اس کی شخصیت میں ایسا جادو تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی کاشف کا ہاتھ خود بخود آگے بڑھ گیا۔
نہ چاہتے ہوئے۔ اس لیے کہ اب اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے یہاں جھوٹ بول کر لایا گیا ہے۔ یہاں کوئی بل گیٹس موجود نہیں تھا۔ اس کا نام تو صرف بہانے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔
کاشف نے ملک امیر کے فولادی ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔
''گیٹس صاحب کہاں ہیں؟''
''تمہیں گیٹس نے نہیں۔ ہم نے بلوایا ہے۔'' یہ سن کر کاشف کو اپنے دماغ کا فیوز اڑتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک ہی جھٹکے میں وہ الوینہ کی طرف مڑ کر دہاڑا۔
''یہ کیا بکواس ہے؟ تم نے تو کہا تھا کہ......''
''اس نے وہی کہا جو ہم نے کہنے کے لیے بولا تھا۔''
ملک امیر جان نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔
''تم کون ہوتے ہو مجھے یہاں دھوکے سے بلانے والے۔'' یہ کہتے ہی وہ ملک امیر جان پر جھپٹ پڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ملک امیر جان تک پہنچتا۔ کمرے موجود دونوں کارندوں نے اسے کبوتر کی طرح دونوں بازوؤں سے دبوچ لیا۔ کاشف چیختا چلاتا ان کے چنگل سے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔
اس کی چیخم دہاڑ سے بے پروا ملک امیر جان نے کوٹ کی جیب سے ایک قیمتی سگار نکالا اور ہیرے جڑے لائٹر سے سلگا کر صوفے پر ایسے آرام سے بیٹھ گیا جیسے اسے پتہ ہی نہ ہو کہ کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ بڑے سکون سے سگار کے کش لگاتا رہا۔ یہاں تک تھک ہار کر کاشف خود ہی چپ ہو گیا۔
ملک امیر جان شاید اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ وہ صوفے سے اٹھا اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے بولا۔
''جھٹکا تو لگا ہے تمہارے دماغ کو۔ لیکن اتنا بوکھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ غنڈے موالی نہیں ہیں۔''
''یہ غنڈے موالیوں والی حرکت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ مجھے بل گیٹس کے نام پر یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔''
''کیا تم بل گیٹس کا نام استعمال کیے بغیر الوینہ کے ساتھ یہاں اتنے آرام سے آ جاتے؟''
''کسی قیمت پر نہیں۔''
''بس۔ اسی لیے ہمیں بل گیٹس کا نام استعمال کرنا پڑا۔''
''اور تم اسے شریفوں والی حرکت کہتے ہو؟''
''شریفوں والی نہیں ہے تو غنڈوں جیسی بھی نہیں ہے۔ موالیوں کو اگر کسی کو کہیں لے جانا ہوتا ہے تو اچھی طرح مار پیٹ کر لے جاتے ہیں۔''
''تمہارے یہ دونوں باڈی گارڈز بھی کسی غنڈے سے کم نہیں لگ رہے۔''
''انہوں نے تم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بلکہ صرف پکڑ رکھا ہے تاکہ تم اپنی شرافت کے جامے سے مزید باہر نہ آ سکو۔ دیکھو مسٹر کاشف سلیم، غنڈے موالیوں والی حرکت ہم نہیں، تم کر رہے ہو۔''
''تم چاہتے کیا ہو؟''
''وہی بتانے کے لیے تو تمہیں یہاں بلایا ہے لیکن اس طرح نہیں۔ بات ٹھنڈے دماغ اور آرام سے بیٹھ کر ہوگی۔''
کاشف خاموش رہا اور ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تب امیر جان حکم جاری کیا۔
''اسے چھوڑ دو۔'' اور اس کا حکم سنتے ہی دونوں باڈی گارڈ کاشف کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔
''بیٹھ جاؤ مسٹر کاشف۔''
''تو، تم دے سکتے ہو مجھے اتنی رقم؟ تم کیا سمجھتے ہو، کیا

میں تمہارے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام اس ہیرے جڑے لائٹر اور پن سے اور ان قیمتی انگوٹھیوں سے اس دھوکے میں رہ جاؤں کہ تم بل گیٹس کی طرح اربوں کھربوں کے مالک ہو سکتے ہو میں تو تب ہی سچ مانوں گا جب تم مجھے وہ رقم ادا کرو جو الوینہ نے کہی ہے۔" کاشف نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

"ایسی کتنی رقم کہہ دی ہے الوینہ؟ دراصل ہم نے الوینہ کو یہ اجازت دی تھی کہ تم جو کہو اسے مان لے۔"

"اس نے سو کروڑ کی آفر کی ہے۔" کاشف نے ایسے کہا جیسے کوئی بم پھوڑ رہا ہو۔

"تو ٹھیک ہے ہم تمہیں سو کروڑ دیں گے۔" امیر جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خواہ مخواہ امپریس کرنے کی کوشش مت کرو۔" کاشف کے لہجے میں ابھی بھی تلخی بھری ہوئی تھی۔ کہہ تو ایسے رہے ہو جیسے تمہارے نزدیک سو کروڑ کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ پورے نو زیرو ہوتے ہیں سو کروڑ میں۔"

امیر جان کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ سگار کا ایک کش لگاتا ہوا بولا۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ دنیا میں اکیلا بل گیٹس ہی ایسا شخص ہے جو کسی کو اتنی پیمنٹ کر سکتا ہے؟ ایسا نہیں ہے مسٹر کاشف۔ اس ملک میں ایسے لوگ بھی پڑے ہیں جو اس سے زیادہ رقم چیریٹی میں دے سکتے ہیں صرف چیریٹی میں۔

"تو تم ایسی کیا توپ چیز ہو؟ کتنا پیسہ ہے تمہارے پاس؟" کاشف نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"وہ سب تم کو بتانا میں ضروری نہیں سمجھتا لیکن اتنی بات اپنے دماغ میں بٹھا لو کہ ہم وہ رقم تمہیں دے سکتے ہیں جو الوینہ نے تم کو آفر کی ہے اور وہ رقم دے کر ہم تم پر کوئی احسان نہیں کریں گے۔ ہم بزنس مین ہیں۔ رقم لگانے سے پہلے اس سے زیادہ کمانے کا ہم پلان بنا چکے ہیں۔"

"ایسا کیا پلان ہے تمہارے دماغ میں؟"

"ہم اسی پر بات کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ مگر تم ہو کہ آرام سے بیٹھنے تک کو تیار نہیں ہو۔ ذرا اطمینان سے بیٹھے رہو دوست کم سے کم ذرا دھیان سے ہماری بات سن تو لو۔" امیر جان نے رسانیت سے کہا۔

"یہ تو جان لو کہ اس رقم کے بدلے میں ہم تم سے کام کیا لینے والے ہیں۔"

اس بار یہ بات امیر جان نے ایسے انداز میں کہی تھی کہ سیدھی کاشف کے دماغ میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ صوفے سے پشت ٹکا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا۔

"بات تو ٹھیک ہی ہے۔ سننے میں برائی ہی کیا ہے۔ یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا کہ سو کروڑ دینے کی اس کی حیثیت ہے بھی یا نہیں لیکن یہ تو دیکھا جائے کہ یہاں لایا کیوں گیا ہے مجھے؟ آخر ایسا کیا کام ہو سکتا ہے جس کے لیے اتنی بڑی رقم دینے کی بات کی جا رہی ہے اور پھر کام کرنا نہ کرنا تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ زبردستی تو کوئی کسی سے کام نہیں کروا سکتا۔"

کاشف کے چہرے پر سکون پھیلتا دیکھ کر امیر جان نے کہا۔

"گڈ۔" اور پھر گارڈز کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"تم لوگوں کا کام ختم ہو چکا ہے۔"

یہ سن کر دونوں گارڈز بغیر کچھ کہے سوئیٹ سے باہر نکلتے چلے گئے۔

"الوینہ سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ کیونکہ میاں بیوی کے بیچ کوئی پردہ نہیں ہوا کرتا۔"

یہ سن کر کاشف کو پھر ایک جھٹکا سا لگا اور وہ چونک کر الوینہ کی طرف دیکھنے لگا جو امیر جان کی بات سن کر مسکرا رہی تھی۔

کاشف سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہوگی اور بیوی بھی امیر جان جیسے ادھیڑ عمر کے آدمی کی۔

"ہمیں معلوم ہے کہ تم نے مستقبل کے کمپیوٹر کا پروجیکٹ بنا لیا ہے۔" امیر جان نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

کاشف بری طرح چونکا لیکن اس نے چہرے سے

ظاہر نہیں ہونے دیا۔
"مستقبل کا کمپیوٹر؟ میں سمجھا نہیں۔"
امیر جان ایسے مسکرایا جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کے ایسے جھوٹ پر مسکرائے جسے سب جانتے ہوں۔
وہ سگار کا کش لگانے کے بعد بولا۔
"نہیں دوست۔ اس طرح بات آگے نہیں بڑھے گی، جب تم ان باتوں کو قبول نہیں کرو گے جو تم کر چکے ہو اور ہمیں معلوم ہے۔ تو ہم اپنی آفر کیسے رکھ سکیں گے تمہارے سامنے۔"
"کک...... کیا معلوم ہے تم کو؟"
"اوکے۔ سننا ہی چاہتے ہو تو سنو، تم نے ایک ایسا کمپیوٹر بنانے کا پروجیکٹ تیار کیا ہے، جس کی پکچر تھری ڈی ہوگی، جس سے دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہوگا جیسے اس کے سامنے تصویر نہیں حقیقت ہو۔ اس کے ساتھ آنکھوں کو دینے والا اصلی نظر آتا نقلی سینسر تک بنا سکتے ہو تم۔ جب تک آدمی ان تصویروں کو ٹچ نہیں کرے گا، تب تک یہی لگے گا کہ یہ تصویریں نہیں زندہ روپ میں ہیں۔ یہاں تک کہ تم اپنی تصویروں کو کمپیوٹر اسکرین سے باہر بھی نکال سکتے ہو۔ یہی نہیں، تمہارے کمپیوٹر کو آپریٹ کرنے کے لیے کسی کی بورڈ یا ماؤس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپریٹر اس صرف اپنی انگلیوں سے ہی آپریٹ کر سکتا ہے۔ اپنے اس پروجیکٹ کو۔
"مستقبل کا کمپیوٹر" کا نام تم ہی نے دیا ہے، اور بالکل صحیح دیا ہے۔" امیر جان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
کاشف بہت حیران تھا اور آنکھیں پھاڑے امیر جان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے خفیہ پروجیکٹ کے بارے میں ایک غیر آدمی بھی اتنا کچھ جان سکتا ہے۔
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انیتا نے الوینہ کو سب کچھ بتا دیا ہے؟"
"اس چکر میں مت پڑو۔ کیونکہ ایسی بات انسان کو ہمیشہ اپنے خاص ہدف سے بھٹکا دیتی ہے۔ اس ملک کے سرکاری آئی ٹی ڈپارٹمنٹ میں کوئی ایسا اہم افسر نہیں ہے جس سے تم نہیں ملے اور انہیں سمجھانے کی کوشش نہ کی ہو کہ اگر پاکستان نے یہ کمپیوٹر سب سے پہلے بنا لیا تو مستقبل میں امریکی ساختہ کمپیوٹرز اور پروگرامز کی حیثیت کچرے کے ڈبوں سے زیادہ نہیں رہ جائے گی۔"
"مگر وہ احمق سمجھنے کو تیار نہیں ہیں۔" کاشف آخر پھٹ پڑا۔
"اتنے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہوئے افسروں میں سے کوئی ایک بھی میری بات سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔ پتہ نہیں حکومت نے ایسے احمقوں کو کیسے آئی ٹی ڈپارٹمنٹ میں بھرتی کر لیا ہے، جو آئی ٹی کو آئی ٹی سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ یا پھر شاید وہ سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھ بن رہے ہیں، کیونکہ ان میں حب الوطنی نام کو بھی نہیں ہے۔" کاشف ایک جھونک میں سب کہتا چلا گیا اور اپنے دل کا سارا غبار امیر جان اور الوینہ کے سامنے نکالنے لگا۔
"ہمارے ہم وطن ہی اس وطن کے دشمن ہیں، کوئی نہیں چاہتا کہ ہمارا ملک امریکہ سے بڑی طاقت بنے۔ انہیں تو یہ سب صرف ایک لطیفہ ہی لگتا ہے۔ اگر وہ سنجیدہ ہوتے تو میری بات دھیان سنتے۔"
"سن لی ہے، کم از کم ایک آدمی سمجھ گیا ہے کہ اگر تمہارے پروجیکٹ کو عمل میں لایا جائے تو معجزہ ہو سکتا ہے۔"
"مگر وہ حرامزادہ چاہتا ہے کہ پروجیکٹ کو عمل میں لانے سے پہلے میں اسے پوری تفصیل سمجھا دوں تاکہ بعد میں وہ اسے اپنا پروجیکٹ بتا کہ دنیا میں شہرت حاصل کر سکے، آئی ٹی ڈپارٹمنٹ کے سب سے بڑے عہدے پر بیٹھا ہے وہ، اور اپنے اسی عہدے کا فائدہ اٹھا کر میری محنت پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ میں نے آئی ٹی منسٹر سے اس کی شکایت بھی کی لیکن وہ افسر اسی منسٹر کا آدمی نکلا۔"
"اور یہ بات تمہیں آج، آج سمجھ آئی، تب سے پوری طرح سے ٹوٹ چکے ہو، ہوٹل کے بار میں بیٹھ کر خود

کو نشے میں ڈبونے کی کوشش کررہے تھے تم۔ اتنا بڑا کام انجام دینے کے باوجود بھی اب تک تمہیں کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا ہے۔''

کاشف تمتمائے چہرے سے امیر جان کی طرف دیکھتا رہا' اچانک اسے ہوش آیا کہ وہ جوش میں کیا کچھ کہہ گیا ہے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور بولا۔

''تم کو آج کی باتیں۔''

''پھر وہی سوال۔'' امیر جان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''دوست۔ اس طرح کے سوالوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بس یوں سمجھو کہ اس دنیا میں ہر آدمی کو اپنے کام کے آدمی کی تلاش رہتی ہے' ہم بھی انہی میں سے ایک ہیں' اور دیکھو ہم نے تمہیں کھوج نکالا۔''

''اور الوینہ کو ٹھیک اس وقت میرے پاس بھیجا جب میں حکومت سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔''

''درست'' امیر جان نے صاف لہجے میں کہا۔

''ایک کامیاب بزنس مین وہی ہے جو گرم لوہے پر چوٹ لگائے۔''

''اب میں سمجھ گیا کہ تم مجھ سے میرا پروجیکٹ چاہتے ہو۔'' کاشف نے اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''اور اس کے بدلے میں تم مجھے سو کروڑ روپے دو گے۔''

''نہیں' حالانکہ تمہارے پروجیکٹ کی اتنی قیمت آرام سے دی جاسکتی ہے' مگر ہم اسے خریدنا نہیں چاہتے۔ پتہ ہے کیوں؟''

کیوں؟''

''کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تم اسے بیچو گے نہیں۔''

''سمجھدار ہو لیکن' پھر مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟''

''ہم تمہارے دماغ کو خریدنا چاہتے ہیں۔''

''دد...... دماغ کو خریدنا؟'' کاشف چکرا گیا۔

''اس سے تمہیں کیا ملے گا۔''

"ہمیں پورا یقین ہے کہ تمہارے دماغ سے ہمیں وہ مل جائے گا جو ہمیں چاہیے۔"

"کیا چاہیے؟"

"وہ بتانے کا وقت تب آئے گا، جب تم ہماری آفر قبول کرلو گے۔"

"آفر بولیں۔"

"ابھی تو صرف اتنا سمجھ لو کہ اگلے چار سال تک تمہیں ہمارے اور صرف ہمارے لیے کام کرنا ہوگا۔ اس کے بدلے میں ہم تمہیں سو کروڑ روپے دیں گے۔ چار سال بعد تم خود کے لیے یا کسی کے بھی لیے کام کرنے کے لیے آزاد ہو گے۔ یوں سمجھ لو کہ ہمارے لیے چار سال کام کرکے تم سو کروڑ روپے کما لو گے یعنی سالانہ پچیس کروڑ روپے۔"

"یہ تو پتہ لگے کہ مجھے کرنا کیا ہوگا۔" کاشف کا لہجہ اب بھی یقین سے عاری تھا۔

"یہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال تم اتنا جان لو کہ تمہارے پروجیکٹ۔ "مستقبل کا کمپیوٹر" سے ہمارا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ وہ تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔"

"پکی بات۔"

"ایک دم پکی۔ ہمارا حق صرف کام پہ رہے گا جو تم کنٹریکٹ یعنی چار سال کے درمیان کرو گے۔"

کاشف کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے جانچنے کی کوشش کررہا ہو کہ وہ سچ بول رہا ہے یا کوئی جال پھینک رہا ہے۔ امیر جان بھی اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔

"پہلے بھی بتا چکے ہیں، ایک بار پھر بتاتے ہیں، ہم بزنس مین ہیں، اور زبان کے پکے ہیں۔"

کچھ دیر یونہی دیکھتے رہنے کے بعد کاشف بولا۔

"کیا سگریٹ ملے گی؟"

"سگریٹ؟"

"مجھے سوچنے کے لیے سگریٹ کی ضرورت پڑتی ہے اور غلطی سے میں اپنا پکٹ بار میں بھول آیا ہوں۔"

"غلطی سے نہیں، بلکہ بل گیٹس سے ملنے کی خوشی میں تم اسے وہاں بھول آئے۔" یہ کہتے ہوئے امیر جان نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے الوینہ سے کہا۔

"وینا۔ وہ اس دراز میں سگریٹ کا پیکٹ رکھا ہے۔"

الوینہ اٹھی اور دراز میں سے پیکٹ نکال کر کاشف کو تھما دیا۔

"واہ میرے ہی برانڈ کا سگریٹ ہے۔ ایسا لگتا ہے آپ مستقبل کو جان لیتے ہیں۔ آپ کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ مجھے یہاں کس چیز کی ضرورت پڑے گی اور آپ نے پہلے سے ہی اس کا انتظام کررکھا ہے۔"

"مستقبل کو جان لینا بہت بڑی اور معجزاتی بات ہے، ایسی چھوٹی باتوں کا اندازہ آدمی بس تھوڑا سا ایکسٹرا الرٹ رہ کر بھی لگا سکتا ہے۔ ایک کامیاب کاروباری آدمی وہ ہے جو اپنے کام کے آدمی کی صلاحیتوں سے ہی نہیں، اس کی عادتوں اور کمزوریوں سے بھی واقف ہو۔ ہم جانتے تھے کہ تمہارا برانڈ کون سا ہے، بات چیت کے دوران سگریٹ ختم بھی ہوسکتی ہے اور ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اس کے بنا تم بہت دیر تک بات نہیں کرسکتے۔ اس کی ضرورت پڑے گی ہی پڑے گی۔ ہم نے صرف ایک اچھے میزبان کا فرض نبھایا ہے۔"

"مہمان کا تو پتہ نہیں لیکن ضرورت کے آدمی کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ میں آپ کے لیے کچھ زیادہ ہی ضرورت کا آدمی ہوں۔"

"اور یہ بھی سمجھ لو کہ ہم بھی تمہارے اتنے ہی ضرورت کے آدمی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے امیر جان نے جیب سے لائٹر نکال کر کاشف کی طرف بڑھایا۔ کاشف نے تھینک یو کہتے ہوئے سگریٹ لگالی۔

ایک لمبا کش لینے کے بعد کاشف بولا۔

"اب آپ کو مجھے یہ سمجھانا ہے کہ آپ میرے کام کے آدمی کیسے ہیں؟"

"بہت سیدھی بات ہے۔" امیر جان نے کہا۔

"اگر تمہارے پاس پیسے ہوتے تو تم یوں اپنے

پروجیکٹ کو لے کر سرکاری دفاتر کے دھکے نہ کھا رہے ہوتے۔ بلکہ خود عمل میں لے آتے اسے اور اس پروجیکٹ کو عمل میں لانے کے لیے کروڑوں روپوں کی ضرورت ہے اور ہم اس سے کئی کروڑ زیادہ کی آفر دے چکے ہیں۔ تم اس رقم سے اپنے پروجیکٹ کو بڑے آرام سے حقیقت کا روپ دے سکتے ہو۔ جو ابھی تک صرف کاغذوں اور تمہارے دماغ میں ہے۔"

"کاغذوں میں بھی نہیں۔ صرف اور صرف میرے دماغ میں ہے۔ کیونکہ ایسے پروجیکٹس کو کاغذوں پر اتارنے کے خطروں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ لوگ کسی چھوٹے موٹے چور کی مدد سے بھی انہیں حاصل کر کے میری محنت پر پانی پھیر سکتے ہیں۔"

اس بات پر امیر جان ایک بار پھر ایسے مسکرایا جیسے بچے کی بات پر مسکرایا ہو۔

"چلو مان لیتے ہیں کہ سچ وہی ہے جو تم کہہ چکے ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمیں تمہارے اس پروجیکٹ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہم تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ کنٹریکٹ کر کے تم اپنے پروجیکٹ کو بنا کسی کے آگے گڑگڑائے خود تکمیل تک پہنچا سکتے ہو۔ اگر ایک بار تم نے مستقبل کا کمپیوٹر بنا لیا' تو دنیا میں تمہارا کیا مقام ہوگا؟ تمہارے اس کمپیوٹر کے سامنے تمہارے آئیڈیل بل گیٹس کے بنائے کمپیوٹر اور پروگرامز خالی کنستر ثابت ہو جائیں گے جو آج دنیا کے ہر گھر اور آفس کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان کی جگہ تمہارا کمپیوٹر لے لے گا اور ان کی اتنی رائلٹی تمہارے پاس آئے گی کہ گیٹس کو آج حاصل ہونے والی رائلٹی اس کا سود تک نہیں دے سکتی۔"

"آپ نے تو ایک ہی جھٹکے میں مجھے سارے خواب دکھا دیئے۔"

"تو کیا ہم نے کچھ غلط کہا؟"

"نہیں۔ غلط تو نہیں کہا' سوچا تو میں یہی کرتا ہوں۔ مگر اب آپ اپنے سپنوں کی بات کریں۔"

"ہم تم سے ایک بڑا کام لینا چاہتے ہیں۔"

"کون سا بڑا کام؟"

"اس بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔"

"اور میں جانے بغیر آفر قبول نہیں کر سکتا۔"

"مسٹر کاشف یہ ٹھیک ویسی ہی بات ہے جیسے تمہارے اور آئی ٹی ڈپارٹمنٹ کے عہدیدار کے بیچ ہوئی تھی۔ اسی طرح ہم نے تمہیں یہ بتا دیا کہ ہم تم سے کیا کام لینا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس اپنا کچھ نہیں بچے گا۔ امید ہے کہ تم ہماری مجبوری کو سمجھ رہے ہو گے۔ کیونکہ تم خود اس صورت حال سے گزر چکے ہو۔"

"ہوں۔" اس نے ایک ہنکارا بھرا اور ہر زاویے سے سوچنے کے بعد بولا۔

"لیکن جب تک آپ مجھے بتائیں گے نہیں کہ آپ مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں تب تک میں کیا کر پاؤں گا۔"

"اتنا تو ہم بھی سمجھتے ہیں اور وقت آنے پر تمہیں سب بتا دیا جائے گا۔"

سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کاشف سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں اس آفر کو قبول کرنا بھی چاہئے یا نہیں۔ پھر بولا۔

"آپ کو کیسے یقین ہے کہ آپ مجھ سے جو کام لینا چاہتے ہیں وہ میں کر پاؤں گا۔"

"تمہیں پچھلے ریکارڈ کو دیکھ کے۔ تم نے مستقبل کے جس کمپیوٹر کا پروجیکٹ تیار کیا ہے۔ اسی سے لگتا ہے کہ تم ہماری مطلوبہ چیز بنا سکتے ہو جو ہمارے دماغ میں ہے۔ یہ ہمارا تمہارے اوپر اندھا اعتماد ہے۔"

"پھر بھی ایک فیصد میں یہ مان لیتا ہوں کہ چار سال بعد بھی آپ کا کام نہیں ہو پایا' اس صورت میں کیا ہوگا؟ یعنی کام پورا نہ کرنے کی صورت میں بھی کیا میں اپنے یا کسی اور کے لیے کام کرنے کے لیے آزاد ہوں گا؟"

"آزاد بھی ہو گے اور سو کروڑ بھی پورے ملیں گے۔" امیر جان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کنٹریکٹ میں یہ نہیں لکھا جائے گا کہ ان چار سالوں میں تمہیں ہمارا کام پورا کرنا ہے۔ اس کی بجائے صرف یہ لکھا جائے گا کہ چار سال تم صرف ہمارے لیے کام کرو گے۔ اس کے بدلے میں ہم تمہیں اتنا پیسہ دیں گے اور اور چار سال بعد تم آزاد ہو گے۔''

کاشف ہر پہلو پر غور کرتے ہوئے بولا۔

''اگر ایسی بات ہے تو مجھے یہ سودا منظور ہے۔''

❁❁❁❁

کاشف کی نیند ٹوٹی' آنکھ ابھی ٹھیک سے کھلی بھی نہیں تھی کہ عادت کے مطابق ایک انگڑائی لیتے ہوئے زور سے آواز لگائی۔ ''لالو لالو لال بخش۔''

لیکن ہر روز کی طرح لالو کی ''آیا سائیں'' والی جانی پہچانی آواز نہیں آئی۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور بری طرح چونکا اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اس کا بیڈ روم نہیں تھا اور یہ کمرہ عام کمروں جیسا بھی نہیں تھا۔

یہ اسٹیل کی چادروں سے بنا اتنا بڑا کمرہ تھا کہ کاشف نے اپنی زندگی میں اتنا بڑا کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ یہاں انسانی ضرورت کی ہر چیز نظر آرہی تھی۔

مگر......

اس کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی اور نہ کوئی دروازہ اور روشنی پتہ نہیں کہاں سے آرہی تھی۔

''میں تو اپنے کمرے میں سویا تھا' پھر مجھے یہاں کون لایا؟'' ذہن میں سیکڑوں سوال لیے وہ بھونچکا سا کمرے میں موجود ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ زور سے چلایا۔

''کوئی ہے' کوئی ہے یہاں؟''

''گھبراؤ مت مسٹر کاشف۔'' کمرے میں کسی لڑکی کی بہت ہی پیاری آواز گونجی۔

''آپ بالکل محفوظ جگہ پر ہیں۔''

کاشف نے بوکھلا کر کمرے کی چھت کی طرف دیکھا۔ آواز وہیں سے آئی تھی۔ وہاں ایک جالی دار اسپیکر لگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر وہ حیرانگی سے اس اسپیکر کو دیکھتا رہا پھر چلایا۔

''کون ہو تم اور کہاں ہو؟''

جواب میں انسانی نہیں بلکہ ایک مشینی سرسراہٹ کی آواز ابھری۔ کاشف نے آواز کی سمت گھوم کر دیکھا۔

اسٹیل کی دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہوا اور اس میں سے ملک امیر جان اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی کاشف بھڑک اٹھا۔

''یہ کیا حرکت ہے۔ آپ نے مجھے اغواء کیا ہے' آپ نے تو کہا تھا کہ آپ ایک بزنس مین ہیں۔ یہ تو سراسر مجرمانہ حرکت ہے۔''

''غور سے سوچو گے تو' نہیں' رات کو ہم دونوں کے درمیان ہونے والی بات کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ تمہیں یہ سودا منظور ہے اور کنٹریکٹ سائن کرنے کے لیے ہمیں آج یہاں ملنا تھا۔''

''مگر یہ کون سا طریقہ ہے ملنے کا؟'' کاشف آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ ''مجھے یہاں اغواء کر کے لایا گیا ہے۔''

''اس کے باوجود تمہیں کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچی۔''

''نہیں۔ تم بزنس مین نہیں ہو۔ مجرم ہو تم۔ ویسے ہی مجرم جو مجھ جیسے باصلاحیت لوگوں کی صلاحیت کو اپنے لیے استعمال کرتے ہیں۔'' کاشف جھنجھلاہٹ میں کہتا چلا گیا۔

''میں تمہارے لیے کوئی کام نہیں کروں گا۔''

''اتنی جلدی اتنے بڑے نتیجے پر مت پہنچو میرے دوست۔ مجرم تم جیسے لوگوں کو اتنے آرام سے نہیں بلکہ ٹارچر کر کے' ان سے زبردستی کام نکلواتے ہیں۔ کام کے بدلے سو کروڑ نہیں دیتے۔ ہم نے ایسا کیوں کیا' صاف سی بات ہے کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہیں ہمارے ٹھکانے کا پتہ چلے۔'' امیر جان پختہ لہجے میں بولتا رہا۔

''اس کے دو ہی طریقے ہو سکتے تھے پہلا وہی جو ہم نے اپنایا' دوسرا یہ تھا کہ تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کے یہاں لایا جاتا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے تمہیں زیادہ

تکلیف پہنچتی۔ اس لیے ہم نے اس طریقے کا انتخاب کیا۔ تمہیں پتہ بھی نہیں لگا اور۔''

''مگر' کیوں' تم ایسا کیوں چاہتے تھے؟''

''ہر کسی کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے کام کرنے کا۔ ہم نہیں چاہتے کہ کنٹریکٹ کے دوران تم کسی بیرونی آدمی سے ملو۔ اپنے کام کو خفیہ رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔''

''تو آپ کو ڈر تھا کہ میں آپ کے کام کے بارے میں کسی کو کچھ بتا نہ دوں۔''

''سوال یہ نہیں ہے کہ تم کسی کو کچھ بتاؤ گے یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم ایسا رسک ہی کیوں لیں کہ تم کسی کو کچھ بتا سکو یا کوئی کسی قسم کی چالاکی دکھا کر تم سے کچھ اگلوا سکے۔'' امیر جان ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

''بات سمجھنے کی کوشش کرو دوست۔ تم خود ایک انجینئر ہو۔ تمہیں تو ایسی باتوں کو پہلی نظر میں سمجھ لینا چاہئے۔ جیسے تم نہیں چاہتے کہ تمہارے پروجیکٹ کی بھنک کسی کو نہ لگے ویسے ہی ہم چاہتے ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں چار سالوں تک تمہاری قید میں رہوں گا؟''

امیر جان نے بغیر لگی لپٹی کے جواب دیا۔

''مطلب تو یہی ہے۔''

یہ سن کر کاشف کے ہوش اڑ گئے۔ دماغ میں ایک سناٹا سا پھیل گیا۔

''ویسے تم بے فکر رہو۔ یہ قید ویسی نہیں ہوگی' جیسی قید کے بارے میں تمہاری عام رائے ہے۔ بس اتنا کہہ سکتے ہو کہ تم کسی بڑے شہر میں تو نہیں لیکن خود کو ایک چھوٹے سے قصبے میں ضرور تصور کر سکتے ہو اور تم چاہو تو اپنی سہولت کے لیے اس قصبے کو 'امیر آباد' کا نام دے سکتے ہو اور تمہیں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس قصبے کی آبادی پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ تم یہاں رہنے والے کسی بھی شخص سے مل جل سکتے ہو' دوستی کر سکتے ہو۔ لیکن یہاں صرف ایک کام نہیں کر سکتے' وہ ہے امیر آباد کی حدود سے باہر جانا۔ اس حالت میں اگر تم اسے قید کہتے ہو تو اب تمہیں اسی قید میں رہنا ہوگا۔''

''یعنی یہ شہر تمہارا بسایا ہوا ہے اور یہاں جتنے بھی لوگ ہیں وہ سب تمہارے ملازم ہیں؟''

''اس بات کو چھوڑو۔''

''کیوں؟''

''ساری باتوں کو ایک ہی جھٹکے میں سمجھنے کی کوشش مت کرو۔ نہیں تو تم کچھ نہیں سمجھ پاؤ گے اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔ یہاں رہو گے تو دھیرے دھیرے سبھی باتوں کا پتہ لگ جائے گا۔''

اب' اب جا کر کاشف کو لگ رہا تھا کہ یہ شخص اس کی سوچ سے بھی زیادہ دولت مند ہے۔ اتنا بڑا شہر بسانا کوئی مذاق کی بات نہیں تھی۔

اتنی دیر میں پہلی بار کاشف نے امیر جان کے لباس پر دھیان دیا' وہ ہرن کی کھال سے بنا ہوا بہت ہی خوبصورت نائٹ گاؤن پہنے ہوئے تھا اور پیروں میں چپل بھی اسی کھال کی تھی۔

کاشف کی حیران کن خاموشی کا لطف اٹھانے کے بعد امیر جان نائٹ گاؤن کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور کاشف کی طرف بڑھا دیا۔

''ہمارے خیال سے تمہیں اس وقت' اس چیز کی سخت ضرورت ہے۔''

اس کی اس حرکت سے کاشف سٹپٹا کر رہ گیا' طلب کی شدت ہونے کے باوجود اس نے ہاتھ بڑھا کر پیکٹ نہیں لیا۔ صرف امیر جان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

''لے لو دوست۔ ہمیں معلوم ہے آنکھ کھلتے ہی تمہیں سب سے پہلے سگریٹ کی طلب ہوتی ہے' ہمیں حیرت ہے کہ تم اس کے بغیر اتنی دیر تک کیسے رہ لیے۔'' امیر جان کے ہونٹوں پر ایک میٹھی مسکان سجی ہوئی تھی۔

اس بار کاشف نے ہاتھ بڑھا کر پیکٹ لے لیا۔ امیر جان نے گاؤن کی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہیرے جڑا لائٹر نکال کر کاشف کو دیتے ہوئے بولا۔

''اسے بھی رکھ لو۔''

ادھر کاشف سگریٹ سلگانے میں مصروف تھا اور دوسری طرف امیر جان نے کمرے میں موجود چمچماتی شیشے کی سینٹر ٹیبل سے ایک عجیب سا ریموٹ اٹھا کے اس کا بٹن دبا دیا۔ بٹن دباتے ہی کھلے دروازے سے دو لڑکیاں ایک شاندار ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی اندر آ گئیں۔

دونوں لڑکیوں نے لباس کے نام پر چند دھجیاں اپنے جسم پر لپیٹ رکھی تھیں۔

"تمہیں بیڈ ٹی کی عادت ہے نا' اس لیے حاضر ہے۔"

کاشف کا ذہن تیزی سے حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر امیر جان نے ریموٹ کا ایک اور بٹن دبایا اور ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ کمرے میں ایک اور دروازہ نمودار ہوا۔

"یہ باتھ روم ہے۔" امیر جان نے بتایا۔ "اور یہ ریموٹ یہاں کی چابی ہے۔ وارڈ روب میں تمہارے ناپ کے کافی کپڑے ہیں۔ جب فریش ہو جاؤ تو الوینہ کے ساتھ تمہیں آفس آنا ہے۔ کنٹریکٹ وہیں سائن ہوگا۔"

کاشف روکھے لہجے میں بولا۔

"مجھے کوئی کنٹریکٹ سائن نہیں کرنا ہے۔"

"زبردستی نہیں کی جائے گی۔ سائن نہیں کرنا چاہو گے تو جس طرح لائے گئے ہو' ویسے ہی واپس پہنچا دیئے جاؤ گے۔" امیر جان نے متانت سے کہا۔

❀❀❀❀

"اب کہو مسٹر کاشف' تم ہمارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہو یا نہیں؟" امیر جان نے ایک اونچی ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جتنے صاف لہجے میں کہہ سکتے ہو' کہو۔"

جس کاشف نے دو گھنٹے پہلے روکھے لہجے میں کام کرنے سے منع کر دیا تھا' وہ اب کنفیوز تھا۔ وجہ وہ جلوہ تھا جو وہ راستے میں دیکھتا آیا تھا۔ الوینہ کے ساتھ وہ کمرے سے یہاں تک ایک میٹالک کلر کی رولز رائس میں آیا تھا۔ پورے کا پورا شہر بسا ہوا تھا۔ سڑکیں ایسی تھیں کہ کم سے کم پاکستان میں تو اس نے نہیں دیکھی تھیں۔ گاڑی ان سڑکوں پر تیرتی سی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے الوینہ سے پوچھا۔

"کیا ملک امیر جان اس پورے شہر کا اکیلا مالک ہے؟"

"ہاں۔" الوینہ سے صرف اتنا ہی جواب دیا۔

لیکن اس مختصر سی ہاں نے کاشف کی کھوپڑی گھما کر رکھ دی تھی۔ وہ اپنے طور پر اندازہ لگا رہا تھا کہ جس شخص سے وہ اتنے روکھے انداز میں بات کر رہا تھا' جسے اس نے کئی بار غنڈہ اور مجرم تک کہہ دیا تھا' وہ آخر کتنا پیسے والا ہے؟

اس نے الوینہ سے ایک اور سوال پوچھا۔

"یہ شہر زمین کے کس حصے میں واقع ہے؟"

"یہ بات یہاں رہنے والا کوئی شخص جاننے کی کوشش نہیں کرتا اور آئندہ تم بھی مت کرنا۔ ملک صاحب کو کسی کی ایسی حرکت پسند نہیں ہے۔" الوینہ نے بڑے ہی سخت لہجے میں جواب دیا تھا۔

"اور یہاں موجود کوئی شخص ایسا کوئی کام بھی نہیں کر سکتا جو ملک صاحب کو پسند نہ ہو' کیونکہ یہ سب ان کے ملازم ہیں۔" کاشف نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

الوینہ نے اس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کاشف نے ایک اور سوال داغ دیا۔

"ملک امیر جان' بزنس کیا کرتا ہے؟"

تب بھی الوینہ چپ رہی اور گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ امیر جان کے آفس پہنچ چکے تھے۔

کاشف کا دماغ حیرانگی کی سب حدیں پھلانگ گیا تھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں' اسے آفس کی بجائے الیکٹرانک لیبارٹری کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اسٹیل کا بنا ہوا' سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ۔ چھت تقریباً پچاس فٹ اونچی تھی۔ دیواروں کے سہارے کمپیوٹر لگے ہوئے تھے اور وہاں کئی مرد اور عورتیں ان کمپیوٹرز پر کام کر رہے تھے۔

یہاں ہر چیز جدیدیت کا اعلیٰ شاہکار تھی۔ کاشف سلیم نے جتنے بھی الیکٹرانک آلات پر کام کیا تھا یا جن کی کتابوں اور رسائل میں صرف تصاویر دیکھی تھیں، وہ سب وہاں موجود تھے۔ ان میں سے کئی مشینیں ایسی تھیں جنہیں اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا اور دیکھتا بھی کیسے۔ ایک ایک مشین کی قیمت کروڑوں میں تھی اور جن اداروں میں اس نے تعلیم حاصل کی تھی وہاں وہ دستیاب ہو بھی نہیں سکتی تھیں۔

ایک الیکٹرانک انجینئر ہونے کے ناتے اس کے ہاتھ ان مشینوں پر کام کرنے کے لیے مچلنے لگے تھے، جن کو دیکھنے کی اسے اپنی زندگی میں کبھی امید بھی نہیں تھی۔

ہال کے بیچوں بیچ شیشے کا بنا ہوا ایک کمرہ تھا۔ باہر سے اس کمرے میں اور کمرے سے باہر سب کچھ دیکھا جا سکتا تھا۔ کاشف نے دیکھ لیا تھا کہ امیر جان اس کمرے میں ایک اونچی ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے والی کرسیوں پر تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میز پر ایک لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔ الوینہ، کاشف کو لے کر سیدھی اسی کمرے میں آ گئی۔

کاشف کو دیکھتے ہی امیر جان کرسی سے کھڑا ہو گیا، جیسے کسی قابلِ احترام شخصیت کے احترام وادب میں کھڑا ہوا جاتا ہے۔ کاشف کو پہلی بار یہ دیکھ کے بڑا عجیب لگا کہ اتنا بڑا آدمی اس کے احترام میں کھڑا ہو گیا ہے۔

جب مالک ہی کھڑا ہو گیا تو ملازمین کی کیا حیثیت تھی، وہ تینوں لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔

"سب سے پہلے میں اپنے لوگوں سے تمہارا تعارف کروا دوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لمبے، گنجے لمبی ناک والے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ڈاکٹر بابر نعیم ہیں۔"

ڈاکٹر بابر نعیم نے کاشف کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کاشف نے بھی اس سے مصافحہ کیا۔ پھر امیر جان نے کوتاہ قامت، ادرک کی گانٹھ جیسے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ مسٹر سرتاج صدیقی ہیں، ہمارے کمپیوٹر انجینئر، اس لیبارٹری کے انچارج یہی ہیں۔" کاشف نے اس سے مصافحہ کیا۔

"اور یہ مسٹر عثمان حیدر ہیں۔ کمپیوٹر میں پھیلنے والے کسی بھی وائرس کو پکڑنے کے ماہر۔"

کاشف نے اکہرے بدن کے لمبے شخص سے بھی ہاتھ ملایا اور پھر وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تب پوچھا تھا امیر جان نے وہ سوال جس کا کاشف جواب نہیں دے پایا تھا۔

"کیا میں یہاں سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

"آف کورس۔" کہتے ہوئے امیر جان نے میز کے نیچے سے چاندی کی ایش ٹرے نکال کر کاشف کے سامنے رکھ دی۔

سگریٹ سلگانے کے بعد کاشف نے آنکھیں بند کر لیں جیسے کچھ سوچ رہا ہو لیکن وہ شیشے کے کمرے میں آنے سے پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔

"میں کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"گڈ۔" امیر جان نے ایک دراز سے ٹائپ شدہ کنٹریکٹ نکال کر کاشف کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

"اسے دھیان سے پڑھ لو۔"

کاشف نے اسٹامپ پیپر پڑھنا شروع کر دیا اور آخر شق پڑھتے ہی کاشف کا چہرہ زرد پڑ گیا، اس کے چہرے پر ہوائیں اڑنے لگیں اور کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر پھیل گئے۔

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، یہ آخری شق تو عجیب اور بہت ہی خطرناک ہے، نہیں، میں یہ شرط نہیں مان سکتا۔"

"یہ شرط تو ماننی پڑے مسٹر کاشف، ورنہ اب تک کی ساری محنت بیکار ہو جائے گی اور ہمارے بیچ کوئی سودا نہیں ہو پائے گا۔"

"اور اس کے بعد میرے ساتھ کیا کیا جائے گا؟"

"کیا کیا جائے گا سے مطلب؟" امیر جان سگار سلگا کر کش لیتے ہوئے کہا۔ "سودا منظور کرو، نا کرو، تمہاری مرضی، جس طرح تم فلیٹ سے لائے گئے تھے، اسی طرح واپس پہنچا دیئے جاؤ گے۔"

یہ سن کر کاشف کے چہرے سے تناؤ کم ہوا اسے پتہ نہیں کیوں یہ لگ رہا تھا کہ اس کے ساتھ زبردستی کی جاسکتی ہے لیکن اب وہ سمجھ گیا کہ اس نے غلط سوچا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے تو" اس نے ایک لمبا کش لگایا اور بولا۔

"لیکن آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

"بار بار ایک ہی سوال مسٹر کاشف اور ایک ہی جواب' ہمارے کام کی رازداری۔ کنٹریکٹ کی آخری شق کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے۔"

"مگر حیرت کی بات ہے کہ میرے کام کو آپ مجھ سے ہی خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔"

"غلط لفظ استعمال مت کرو" یکا یک امیر جان کا لہجہ سخت ہوگا۔

"کنٹریکٹ کے دوران کیا جانے والا کام ہمارا ہوگا اور ہم تم کو اس کی پوری قیمت ادا کریں گے۔"

ایک پل کے لیے شیشے کے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر کاشف نے کہا۔

"بڑی عجیب بات ہے۔ مطلب مجھے پتہ ہی نہیں چلے گا کہ مجھ سے کیا کام لیا گیا تھا؟"

"یہ ضروری ہے مسٹر کاشف۔ اگر تم کو یہ شق منظور ہے تو سودا ہوگا' ورنہ نہیں۔" امیر جان نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

کاشف سوچ میں پڑ گیا اور ایسی گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ کافی دیر تک فیصلہ نہیں کرپایا۔ خاموشی سے سگریٹ پھونکتا رہا اور جب سگریٹ ختم ہونے لگی تو اسے ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولا۔

"مگر اس کا میرے دماغ پر کوئی غلط اثر تو نہیں پڑے گا؟"

"بال برابر بھی نہیں۔" اس بار ڈاکٹر بابر نعیم نے جواب دیا۔

"ان چار سالوں میں تمہارا دماغ اسی طرح کام کرتا رہے گا جیسے آج کررہا ہے۔"

"ایسا کرنے سے اگر تمہارے دماغ پر رتی برابر بھی کوئی غلط اثر پڑتا تو ہم ایسا کرتے ہی نہیں۔" سرتاج صدیقی نے کہا۔

"آخر ہمیں کام تو تمہارے ہی دماغ سے لینا ہے۔ اگر تمہارے دماغ پر کوئی غلط اثر پڑا تو پھر تم ہمارے کس کام کے رہ جاؤ گے؟"

"میں چار سال بعد کی بات کررہا ہوں۔"

"اس بارے میں ذرا بھی الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ایک بار پھر امیر جان بولا۔

"ڈاکٹر بابر نعیم کے اس کام کا تجربہ تم سے پہلے کئی لوگوں پہ کیا جاچکا ہے۔"

اب کاشف کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ اور سلگالی اور خاموشی سے پیتا رہا۔ جب آدھی سگریٹ پھونک چکا تو ایک جھٹکے سے بولا۔

"اوکے۔ آئی ایم ریڈی۔"

"وری گڈ۔" کہنے کے ساتھ ہی امیر جان کے چہرے پر ایسی چمک ابھری جیسی تین سنگھ اور ہلیری کے چہرے پر اس وقت ابھری ہوگی جب انہوں نے ماؤنٹ ایورسٹ پر جھنڈا گاڑا تھا۔

"مگر اس سے پہلے۔" کاشف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں کنٹریکٹ کی آدھی رقم اپنے اکاؤنٹ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اوکے۔" امیر جان نے بغیر دیر کئے اپنا لیپ ٹاپ کاشف کی طرف گھمادیا اور بولا۔

"ہمارا بینک اکاؤنٹ اور پاس ورڈ ہم تمہیں بتا رہے ہیں۔ تمہارا تمہیں پتہ ہی ہوگا' انٹرنیٹ پر دونوں اکاؤنٹ کھولو۔"

ذرا ہی دیر میں کاشف نے دونوں اکاؤنٹ کھول لیے۔ امیر جان کا اکاؤنٹ بیلنس دیکھ کر کاشف چونک گیا۔

"آپ کے اکاؤنٹ میں۔"

"کل بیلنس ایک سو ایک کروڑ ہے۔ تم اس میں سے پچاس کروڑ نہیں بلکہ پورے سو کروڑ اپنے اکاؤنٹ میں

ٹرانسفر کر سکتے ہو۔ یعنی ڈیل کی مکمل رقم۔"

"ایک ساتھ؟" کاشف نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے دل سے یہ وسوسہ بھی نکل جائے گا کہ چار سال بعد ہم تمہیں باقی کے پچاس کروڑ دیں گے بھی یا نہیں' جبکہ ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ چار سال تک تمہیں رہنا تو امیر آباد میں ہی ہے۔"

"اوکے۔" کہتے ہوئے کاشف نے سو کروڑ روپے اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر لیے۔ اس کا دل بڑی زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سو کروڑ کا مالک بن گیا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اسے لگا کہیں اس کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔

اس کی حالت دیکھ کر امیر جان سمجھ گیا اور اسے ہوش کی دنیا میں واپس لانے کے لیے بولا۔

"زیادہ ایکسائیٹڈ ہونے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر کاشف۔ یہ رقم تمہیں مفت میں نہیں ملی ہے۔ اسے مکمل طور سے حاصل کرنے کے لیے تمہیں اگلے چار سال تک سخت محنت کرنی ہوگی۔ یہ تمہارے خون پسینے کی کمائی ہوگی۔"

اپنا اکاؤنٹ بیلنس ایک بار پھر چیک کرنے کے بعد کاشف نے پہلے اپنا اکاؤنٹ بند کیا پھر امیر جان کا اور پھر انٹرنیٹ ڈس کنیکٹ کر کے لیپ ٹاپ واپس امیر جان کی طرف کھسکا دیا۔

عثمان حیدر نے اپنی جیب سے پین نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اب تو آپ کو کنٹریکٹ سائن کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔"

کاشف نے اس کی طرف دیکھا اور پین اٹھا کر ایک جھٹکے سے اسٹامپ پیپر پر سائن کر دیئے۔

اس کے سائن کرتے ہی ڈاکٹر بابر نعیم نے اپنی جیب سے ایک انجکشن نکال لیا۔

"کیا اب میں اسے لگا سکتا ہوں؟"

"کیا اس سے پہلے میں ایک اور سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

"بات شاید اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ اس انجکشن سے تم بے ہوش تک نہیں ہو گے۔ سب کچھ جوں کا توں رہے گا' سگریٹ کی طلب بھی ویسی ہی رہے گی۔" امیر جان ہنسا اور بولا۔

"پھر بھی میں اس سے پہلے ایک سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔"

امیر جان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

❁❁❁❁

کاشف کے دماغ میں امیر جان کا وہی قہقہہ گونج رہا تھا۔ وہ چیخا۔

"لالو مجھے سگریٹ چاہیے۔ تمہارے پاس ہے؟"

"بھلا میرے پاس کہاں سے ہوگی سائیں؟ آپ تھے تو گھر میں سگریٹ کا ڈنڈا چوبیس گھنٹے گھر میں رہتا تھا' لیکن آپ کے بعد کسی کو سگریٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" لال بخش نے کہا۔

"تو جاؤ جلدی سے لے کر آ جاؤ' مجھے بہت طلب ہو رہی ہے۔"

"مگر سائیں' کیا آپ کو کچھ یاد نہیں آ رہا ہے؟"

"اس بات کو چھوڑ و اور جلدی سے سگریٹ لا دو۔"

"مجھے پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن آپ ضرور لوٹ کر آئیں گے' اسی بھروسے پر یہاں پڑا رہا۔ ویسے بھی' اس فلیٹ کو چھوڑ کر کہاں جاتا' خدا سے روزانہ آپ کی خیریت سے واپسی کی دعا کرتا تھا اور دیکھ لیں اس نے میری سن لی' اب ایک سو ایک روپے کی نیاز بانٹوں گا میں۔" لال بخش جذباتی ہو رہا تھا۔

"اس دنیا میں آپ کا میرے سوا اور میرا آپ کے سوا اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔ بڑے سائیں آپ کو میری گود میں چھوڑ کر......"

"میرے کمپیوٹر کو کسی نے چھیڑا تو نہیں تھا نا۔" کاشف اس کی بات کاٹتے ہوئے ٹیبل کی طرف بڑھا جس پر کمپیوٹر

رکھا ہوا تھا۔

''بھلا آپ کے بعد اسے کون چھیڑتا سائیں۔''

''ویری گڈ۔ تم جاؤ سگریٹ لے آؤ۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔'' کاشف یہ کہتے ہوئے میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

خوشیوں کے سمندر میں غوطے لگاتا لال بخش کنگرو کی طرح اچھلتا ہوا باہر چلا گیا۔ کاشف اسی وقت اپنا بینک بیلنس چیک کرنا چاہتا تھا' لیکن دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

پریشانی کے عالم میں ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا دوسرا ہاتھ عادتاً جیب میں گیا اور اسے جیسے منہ مانگی مراد مل گئی۔ ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ اور ساتھ میں ہیرے جڑا لائٹر' جو اسے امیر جان نے دیا تھا۔ اس نے بغیر دیر کیے سگریٹ سلگا لی۔ سگریٹ منہ سے لگاتے ہی جیسے خشک دماغ کو آئل مل گیا ہو اور وہ خودکار انداز میں کام کرنے لگا۔

انگلیاں بجلی کی تیزی سے کام کرنے لگیں' اسے اپنے اکاؤنٹ کا پاس ورڈ بھی یاد آ گیا تھا۔ یہ محسوس کر کے وہ خوشی سے جھوم رہا تھا کہ اس کا دماغ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔

لیکن اس نے جیسے ہی اپنا اکاؤنٹ کھولا۔

بیلنس دیکھتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے اور چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ایک ہی پل میں پورا بدن پسینے میں نہا گیا۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے اس کے بدن میں خون کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی ہو۔ سگریٹ ہونٹوں سے نکل کر کپڑوں پر گر گئی مگر اسے بھلا کہاں ہوش تھا۔

وہ تو آنکھیں پھاڑے اپنے اکاؤنٹ بیلنس کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے جیتا جاگتا آدمی اپنی ہی لاش کو دیکھ رہا ہو۔

اکاؤنٹ میں صرف پانچ ہزار روپے تھے۔

سو کروڑ تو دور کی بات ہے' اس میں تو وہ رقم بھی پوری نہیں تھی جو امیر جان سے ملنے سے پہلے موجود تھی۔

سنسناتے ذہن میں صرف ایک ہی لفظ کوند رہا تھا۔

''دھوکا۔''

''مگر اس وقت میں نے اپنے ہاتھ سے رقم ٹرانسفر کی تھی۔ شاید بعد میں انہوں نے نکال لی ہوگی۔'' وہ بڑبڑایا۔

''مگر کیسے؟ پاس ورڈ تو اس نے کسی کو دیکھنے ہی نہیں دیا تھا۔ نہیں' وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ تو پھر سو کروڑ اور باقی رقم کہاں گئی؟ ہو سکتا ہے ان چار سالوں کے دوران انہوں نے کسی ترکیب سے اسی سے پاس ورڈ پوچھ لیا ہو اور رقم نکال لی ہو' مگر نہیں' وہ تو کسی بھی صورت ان کو پاس ورڈ نہیں بتا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا دماغ تو بالکل ٹھیک طریقے سے کام کر رہا تھا۔''

ابھی وہ کسی نتیجے پر پہنچا بھی نہیں تھا کہ ران پر تیز جلن ہوئی' وہ اس طرح کرسی سے اچھلا جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ سلگی ہوئی سگریٹ نے پہلے اس کے کپڑے اور پھر ران جلا دی تھی۔ وہی سگریٹ اب فرش پر پڑی ہلکا ہلکا دھواں چھوڑ رہی تھی۔ کاشف نے بوکھلائے ہوئے انداز میں وہ سگریٹ دوبارہ اٹھالی۔

اسی وقت لال بخش کمرے میں داخل ہوا اور کاشف کے ہاتھ میں سگریٹ دیکھ کر بولا۔

''سائیں اگر آپ کے پاس سگریٹ تھی تو مجھے لینے کیوں بھیج دیا تھا۔''

کاشف اس بات کا کیا جواب دیتا۔ اس نے پھر اپنے کمپیوٹر پر توجہ دی اور بیلنس دیکھنے لگا۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے کوئی طالب علم فیل ہو جائے اور وہ بار بار اخبار میں اپنا رول نمبر ڈھونڈ رہا ہو۔

''مم' میں لٹ گیا لالو' برباد ہو گیا میں۔'' کاشف چیخا۔

''سائیں آپ کو کس نے ٹھگ لیا؟'' لالو نے فوراً پوچھا۔

''لیکن نہیں۔'' کاشف خود ہی بولا۔

''وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ امیر جان پکا بزنس مین ہے۔ ایسے لوگ دھوکا نہیں دیتے اور ویسے بھی اس کے لیے سو کروڑ کی ویلیو ہی کیا تھی۔''

اپنے مالک کو یوں پاگلوں کی سی حالت میں دیکھ کر لال بخش بھی گھبرا گیا اور پوچھا۔

''سائیں بات کیا ہے۔ مجھے بھی تو کچھ بتایئے۔''

''نہیں۔'' اب بھی وہ خود میں ہی کھویا ہوا تھا۔

"کام نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ رقم میری ہونی تھی۔ ملک امیر جان ایسا نہیں کر سکتا۔"

"ملک امیر جان۔" لال بخش بڑبڑایا۔

"یہ کون ہے سائیں۔ یہ نام میں نے پہلے بھی کہیں سنا ہے۔"

کاشف چونکا۔ "تت، ...... تم نے کہاں سن لیا یہ نام' بھلا کیا جانو اسے؟"

"یاد نہیں آ رہا سائیں۔ لیکن پکا ہے کہ یہ نام میں نے پہلے بھی سنا ہے۔"

"کہاں سنا ہے۔" کاشف نے جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور پاگلوں کی طرح اسے جھنجوڑتا ہوا چیخا۔ "یاد کرو لالو۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس نے مجھ سے سو کروڑ روپے ٹھگ لیے ہیں۔"

اب لال بخش کو پورا یقین ہو رہا تھا کہ اس کا مالک لٹا ضرور ہے لیکن پاگل ہو چکا ہے۔ یہ سو کروڑ کی بات کر رہے ہیں جبکہ انہوں نے تو کبھی ایک کروڑ بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ بھی چیخنے لگا۔ "بچاؤ' میرے سائیں پاگل ہو گئے ہیں۔"

"ارے۔" کاشف نے بوکھلا کر اس کا منہ بھینچ لیا۔ "کیا کر رہے ہو۔ تم سے کس نے کہا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں؟"

پھر کاشف نے اپنی حالت پر غور کیا تو اسے لگا کہ لال بخش اپنی جگہ صحیح ہے۔ مجھے ہی سکون سے کام لینا چاہئے۔ یہ خیال آتے ہی وہ لال بخش کو سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔

"ڈرو مت لالو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

لال بخش کو کچھ اطمینان ہوا لیکن وہ ابھی بھی ڈری ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کاشف سچ کہہ رہا ہے یا ایسا تو نہیں کہ اسے وقفے وقفے سے پاگل پن کے دورے پڑتے ہوں۔

کاشف نے اسے پوری طرح مطمئن کرنے کے لہجے میں کہا۔

"دیکھو لالو۔ پچھلے چار سالوں میں میرے ساتھ بہت کچھ ہوا ہے لیکن یقین مانو' میری دماغی حالت ایک دم درست ہے۔ تمہاری قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔" کاشف اپنی جھونک میں بولتا ہی رہا۔

"یاد کرو چار سال پہلے رات کو میں نے تم سے کہا تھا کہ ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔ اسی لیے کہا تھا وہ۔ ملک امیر جان نے مجھے تگڑی کمائی کی آفر کی تھی۔ مگر اب لگتا ہے کہ وہ مجھے دھوکا دے گیا۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ تم نے بھی اس کا نام سنا ہے۔ تو میرا یہ ردعمل جائز ہے یا نہیں۔ تم ہی بتاؤ؟ اگر تم کو یاد آ گیا ہو تو مجھے بتا دو پلیز۔"

کاشف کی ان باتوں سے لال بخش کافی حد تک پرسکون ہو گیا۔ اس نے اشارے سے اپنی گردن سے ہاتھ ہٹانے کو کہا۔ کاشف نے فوراً اس کی گردن چھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم نے سچ کہا تھا کہ میرا تمہارے علاوہ اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اپنے ذہن پر زور دو اور یاد کرو کہ تم نے ملک امیر جان کا نام کہاں سنا ہے؟"

"یاد آ گیا۔" لال بخش اچھلتے ہوئے بولا۔

"کچھ لوگ آئے تھے۔ انہوں نے اس آدمی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا تھا کہ کیا میں ملک امیر جان کو جانتا ہوں؟ وہ کہہ رہے تھے کہ ہماری اطلاع کے مطابق اسی نے تمہارے مالک کو اغواء کیا ہے۔ اگر تم اپنے مالک سے ذرا بھی پیار کرتے ہو تو اس کے بارے میں بتا دو۔"

"تم نے کیا کہا؟" کاشف چونک کر بولا۔

"کیا کہتا۔ جب میں نے اس کا نام ہی نہیں سنا تھا تو کیا بتاتا۔"

"اس کے بعد؟"

"انہوں نے پورے فلیٹ کی تلاشی لی تھی۔ ایک ایک چیز کو کھنگال ڈالا تھا انہوں نے۔"

"انہیں کس چیز کی تلاش تھی؟"

"پتہ نہیں' میں نے پوچھا بھی تھا کہ انہیں کیا چاہئے۔ شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔ لیکن انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔"

"میرا کمپیوٹر بھی چیک کیا تھا انہوں نے؟"

''ہاں۔''

''مگر کچھ دیر پہلے تو تم نے کہا تھا کہ......''

''تب مجھے یاد نہیں آیا تھا' بات بھی کافی پرانی ہے۔ آپ کے غائب ہونے کے تقریباً چھ مہینے بعد کی۔''

''کون تھے وہ لوگ اور کیا دوبارہ کبھی آئے؟''

''نہیں۔ پھر کبھی نہیں آئے۔ میں نے ان سے بہت پوچھا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہاں تک کہ میں تھانے تک بھی گیا تھا۔ شروع میں تو مجھے لگا کہ انہیں تشویش ہے کہ ایسی حرکت کون کر سکتا ہے لیکن ایک ہفتے بعد جب میں دوبارہ گیا تو انسپکٹر نے کہا کہ تم اس چکر میں مت پڑو ورنہ لپیٹے میں آ جاؤ گے۔ ان لوگوں کو بھول جاؤ اور گھر جا کر آرام کرو۔'' لال بخش نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''یہی بات میں نے بھی کہی تھی۔ لیکن وہاں جواب دینے والا کوئی نہیں تھا اور پھر میں نوکر آدمی' پولیس سے کتنا الجھتا۔ خاموش ہو کے بیٹھ گیا۔''

کاشف کے دماغ میں سنسنی سی مچی ہوئی تھی۔

''کتنے لوگ تھے؟''

''چار۔''

''دیکھنے میں کیسے تھے؟''

''دیکھنے میں تو غنڈے ٹائپ لگ رہے تھے۔ ہٹے کٹے۔ جیسے روز ورزش کرتے ہوں۔ لیکن کپڑے سبھی نے شریفوں والے یعنی سوٹ اور ٹائی پہنے ہوئے تھے۔

اب کاشف کے پاس پوچھنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ اتنے سوال کر کے بھی وہ وہیں کا وہیں تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ملک امیر جان کو پوچھنے والے کون لوگ تھے اور ان کا مقصد کیا تھا۔

اس اکاؤنٹ سے رقم امیر جان نے نکالی ہے یا ان غنڈوں نے؟

یکا یک اس کے دماغ میں ایک خیال کوندا۔

''اس بات کا پتہ تو بینک سے لگ سکتا ہے۔ اسے بینک ہی جانا چاہیے۔''

❁❁❁❁

بینک منیجر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا۔

''میرا نام کاشف سلیم ہے۔''

''جی کہیئے۔'' ادھیڑ عمر کے شخص نے چشمے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے بینک میں میرا اکاؤنٹ ہے۔ یہ رہا میرا اکاؤنٹ نمبر۔'' کاشف نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی چیک بک منیجر کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''فرمائیں ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟'' منیجر نے پھر پوچھا۔

''مجھے اپنا بیلنس معلوم کرنا ہے۔''

''جی ابھی لیجئے۔'' منیجر نے کہا اور کمپیوٹر کے کی بورڈ سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔

چہرے پر تجسس کے تاثرات لیے کاشف امید بھری نظروں سے منیجر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے منیجر کی زبانی کسی اچھی خبر کی توقع ہو۔

اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے منیجر چونک کر کرسی سے تقریباً اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ چہرے پر حیرت کے تاثرات لیے وہ کاشف کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے چڑیا گھر کا سب سے عجیب جانور کو دیکھ رہا ہو لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

یہ دیکھ کر کاشف کچھ زیادہ بے چین ہو گیا۔

''کیا ہوا؟''

''آں۔'' منیجر چونک کر بولا۔

''کک کچھ نہیں کوئی بھی تو بات نہیں۔'' لیکن اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی بوکھلاہٹ صاف بتا رہی تھی کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔

''کاشف صاحب آپ کے اکاؤنٹ میں صرف پانچ ہزار روپے ہیں۔''

''وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔'' کاشف نے گمبھیر لہجے

میں کہا۔

''ب...... بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں اس بارے میں۔ اکاؤنٹ آپ کا ہے۔آپ کو ہی بہتر پتہ ہوگا۔''

''میں اپنے اکاؤنٹ کی بیلنس شیٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''تو یوں کہئے کہ آپ کو اسٹیٹمنٹ چاہئے۔ اس کے لیے آپ کاؤنٹر نمبر چار پہ چلے جائیں۔ وہاں پرنٹر لگا ہے۔''

''اتنا ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔'' یہ کہتے ہوئے کاشف اپنی کرسی سے اٹھا اور میز کی دائیں طرف سے گھوم کر اسکرین کے سامنے پہنچنے کے لیے لپکا۔

منیجر اس کا ارادہ بھانپ گیا اور تیزی سے ماؤس استعمال کر کے اس فائل کو منی مائز کر دیا جو اس وقت نظر آ رہی تھی۔ اس کی حرکت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ چھپانا چاہتا ہے۔

منیجر کے قریب پہنچ کر کاشف بولا۔

''میں اسکرین پر ہی دیکھ لوں گا۔''

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔'' ماؤس پر منیجر کی پکڑ اور سخت ہو گئی۔

'مجھے بتائیے کیا دیکھنا چاہتے ہیں آپ۔ میں دکھا دیتا ہوں۔''

''25 اگست 2008ء کو میرے اکاؤنٹ میں سو کروڑ جمع ہوئے تھے۔'' کاشف اسکرین کو گھورتے ہوئے بولا۔

''دس۔ سو کروڑ؟'' منیجر نے سٹپٹا کر کاشف کی طرف دیکھا۔

''کیوں...... کیا آپ کو یقین نہیں ہو رہا کہ میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہو سکتی ہے۔'' کاشف بری طرح بھنایا ہوا تھا۔

''کک...... کیوں نہیں۔'' منیجر سنبھل کر بولا۔

''کسی کے بھی اکاؤنٹ میں ہو سکتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ماؤس فائل کو کلک کیا اور 25 اگست 2008ء کی انٹری دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کی پتلیاں باہر ٹپکنے کے لیے بے چین ہونے لگیں۔

کاشف نے جو کہا تھا وہ سچ تھا۔

کاشف کی حالت دیکھ کر اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس شخص کی اتنی حیثیت بھی ہو سکتی ہے۔ حیثیت کا پتہ لگتے ہی اس کا رویہ ایک دم بدل گیا اور وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی پر خلوص لہجے میں بولا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن وہ رقم گئی کہاں؟''

منیجر نے دوبارہ ماؤس سے میٹر کو اوپر سرکایا اور بولا۔

''19 اگست 2013ء کو پانچ ہزار چھوڑ کر ساری رقم نکال لی گئی تھی۔''

''نن نکال لی گئی تھی' کس نے نکالی۔''

''جی یہ تو آپ کو پتہ ہوگا۔''

''میں آپ کو پاگل لگ رہا ہوں۔ میں نے نہیں کسی اور نے میرے اکاؤنٹ سے وہ رقم نکالی ہے۔''

اب منیجر چونکا اور بولا۔ ''کہیں آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ کسی طرح سے آپ کا پاس ورڈ کسی کو پتہ لگ گیا اور اس نے یہ رقم آپ کے اکاؤنٹ سے چوری کر کے اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر لی ہے؟''

''ہاں۔ میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔''

''تب تو یہ پولیس کیس ہے۔ آپ فوراً اس کی رپورٹ درج کروا دیں۔''

''وہ تو میں کروں گا ہی' لیکن یہ تو بتائیے کہ یہ رقم کس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئی ہے؟''

''ایچ ڈی ایف سی کے اکاؤنٹ نمبر 555948300276 میں۔''

''یہ اکاؤنٹ کس کا ہے؟'' کاشف نے پوچھا۔

''یہ تو ایچ ڈی ایف سی والے ہی بتا سکتے ہیں اور وہ بھی آپ کو نہیں بلکہ پولیس کو بتائیں گے۔' ایک منٹ ٹھہریئے۔ اسپیشل ریمارک لگا ہے یہاں۔ آپ کے اکاؤنٹ میں بینک کے نام کوئی پارسل آیا ہوا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھیے۔''

"آپ آرام سے بیٹھنے کی بات کر رہے ہیں۔ جبکہ میرے اکاؤنٹ میں۔"

"اس کے باوجود اتنا گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ اگر کسی نے فراڈ کیا ہے تو وہ بچ نہیں سکے گا۔" یہ کہتے ہوئے مینجر نے انٹرکام پر ایک نمبر دباتے ہوئے کہا۔

"سلمیٰ بینک کے پرسنل لاکر نمبر 33 میں مسٹر کاشف سلیم کے نام کا ایک پارسل رکھا ہے۔ اسے جلدی سے لے آؤ۔"

❁❁❁❁

دونوں سلمیٰ کا انتظار کر رہے تھے کہ مینجر اچانک بولا۔

"کاشف صاحب برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

کاشف بڑی مشکل سے اپنے سنسناتے دماغ کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ پھر بھی بولا۔

"پوچھیں۔"

"اتنی بڑی رقم۔ آپ کے اکاؤنٹ میں آئی اور گئی۔ وہ 25 اگست 2008ء میں آئی اور 19 اگست 2013ء میں چلی گئی۔ یہاں دو سوال کھڑے ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اتنے عرصے میں آپ کے اکاؤنٹ میں کوئی ٹرانزیکشن نہیں ہوئی۔ دوسرا یہ کہ آپ اتنے عرصے کہاں سوتے رہے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا آپ مجھے کچھ بتا سکتے ہیں؟" مینجر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ سوال ایسا تھا جس کا جواب کاشف کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس لیے بہانہ بناتے ہوئے بولا۔

"آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ میری مرضی ہے کہ میں جب چاہوں اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانزیکشن کروں یا نہ کروں۔"

"یقیناً...... یقیناً۔" مینجر جلدی سے بولا۔

"یہ آپ کا حق ہے۔ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جب آپ رپورٹ کرنے پولیس میں جائیں گے تو وہ اس سے بھی زیادہ مشکل سوال پوچھیں گے اور وہاں آپ کو ان کا جواب دینا ہی پڑے گا۔ ورنہ وہ الٹا آپ پر ہی شک کریں گے۔ پاکستانی پولیس کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔"

اس کے الفاظ کاشف پر گڑگڑاتی بجلی کی مانند گرے۔ بات تو مینجر کی صحیح تھی۔ اگر ایسا ہوا تو وہ کیا جواب دے گا؟ کم از کم پولیس کی سمجھ میں تو اس کی باتیں آنا مشکل ہی تھا۔

ابھی وہ انہی سوالوں میں الجھا ہوا تھا کہ ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ سادہ شلوار سوٹ میں میں دبلی پتلی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک جمی ہوئی تھی۔ ایک دم پڑھا کو ٹائپ نظر آنے والی لڑکی تھی وہ۔ اس کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا جو براؤن رنگ کے کاغذ میں لپٹا ہوا تھا اور اس پر کسی کوریئر کمپنی کا اسٹیکر بھی لگا ہوا تھا۔ کاشف ایک نظر میں اتنا ہی دیکھ پایا تھا۔

کاشف نے اس لڑکی کے ہاتھ سے پارسل ایسے جھپٹا جیسے کوئی بندر کسی بچے سے کھانے کی چیز جھپٹ لیتا ہے۔

لڑکی بیچاری "ارے ارے۔" کرتی رہ گئی۔ مینجر نے کہا۔

"سلمیٰ جی لینے دو انہیں۔ یہ انہیں کا ہے۔"

کاشف نے دیکھا پارسل پر بینک کا ایڈریس اور اس کا اکاؤنٹ نمبر لکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی مینجر کے نام ایک پیغام بھی تھا کہ "اس پارسل کو کھولا نہ جائے اور جب بھی اس اکاؤنٹ کا مالک آئے اسے جوں کا توں سونپ دیا جائے۔"

پارسل پوری طرح سیل تھا اور کوئی ایسی نشانی نہیں تھی جس سے پتہ لگتا کہ کسی نے اس پارسل کو کھولنے کی کوشش کی ہو۔

کاشف سے صبر نہیں ہو رہا تھا اس نے وہیں پارسل کو کھول لیا۔ سلمیٰ آنکھوں میں حیرت لیے اس کی حرکتوں کو دیکھ رہی تھی۔ کاشف نے پارسل اوپر سے پھاڑ کر اس کے اندر کا سارا سامان میز پر الٹ دیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ سامان تو اس میں کافی تھا لیکن سمجھ میں نہ آنے والا۔

کالے عدسوں والا چشمہ۔ کلائی کی ایک گھڑی۔ موبائل فون۔ سگریٹ کا ایک پیکٹ۔ ایک لائٹر۔ ایک بلا۔ ایک روپے کا سکہ۔ ایک کاغذ کی چٹ جس پر کوئی نمبر لکھا

ہوا تھا۔ ایک چابی۔ محدب عدسہ، ربر کے گلوز اور کئی لفافوں کے علاوہ ایسی ہی اوٹ پٹانگ چیزیں تھیں۔

کم سے کم کاشف کو ان چیزوں کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یا وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے کھوئے ہوئے سو کروڑ کی فکر ہورہی تھی۔

پارسل کا سن کر اسے امید بندھی تھی کہ شاید اسی سے اسے اپنی گمشدہ رقم کا کوئی سراغ مل سکے۔ لیکن وہ تو دو کوڑی کا سامان نکلا۔

پورے سامان میں اسے ایک ہی چیز مہنگی نظر آئی تھی اور وہ تھی ہیرے کی ایک انگوٹھی۔ لیکن سو کروڑ کے مقابلے میں اس کی کیا اوقات تھی؟

اس بیکار کے سامان کو دیکھ کر اس کا فیوز ہی اڑ گیا تھا۔ بوکھلاہٹ میں وہ ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھا اور منیجر پر گرجا۔ ''یہ آپ مجھے کیا دے رہیں۔ میرے سو کروڑ کے بدلے میں یہ کباڑ تھمارہے ہو مجھے۔ میں اس کا کیا کروں۔ یہ سالی ایک ٹکے کی گھڑی۔ دو ٹکے کی انگوٹھی۔ ایک روپے کا سکہ۔ کیا ہے یہ سب؟''

''مم...... میں کیا بتا سکتا ہوں سر۔'' منیجر ایسے انداز سے بولا جیسے اسی پر یہ بیکار کا سامان رکھنے کا الزام لگایا جارہا ہو۔ ''پارسل آپ کا ہے۔ سامان آپ کا ہے اور آپ کو ہی کسی نے بھیجا ہے۔ بینک نے صرف آپ کی امانت سنبھال کر رکھی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ پارسل مکمل سیل تھا۔''

''کیا خاک امانت سنبھال کے رکھو گے۔ اگر رکھتے ہو تو بتاؤ کہاں گئے میرے سو کروڑ؟ بینک کی ملی بھگت کے بغیر اتنا بڑا فراڈ ہو ہی نہیں سکتا۔ سو فیصد بینک ہی اس فراڈیئے سے ملا ہوا ہے۔ میں ابھی تھانے جارہا ہوں۔ تم سب بھگتو گے۔ ایک ایک کی نوکری جائے گی اور تمہیں میری رقم دینی ہی پڑے گی۔ اتنی بڑی رقم میں یونہی ہڑپ نے نہیں دوں گا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر۔ میری بات تو سنیئے۔''

لیکن اس وقت کاشف کی ذہنی حالت ایسی کہاں تھی کہ کسی کی آواز اس کے دماغ تک پہنچتی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کا باہر نکلنا تھا کہ حیرت انگیز طور پر منیجر کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے۔ یہ تبدیلی دیکھ کر سلمیٰ چونک گئی۔

''ہونہہ یوں ماؤس پر جھپٹا تھا جیسے اسے اسی پل کا انتظار کررہا ہو۔'' منیجر نے بڑبڑاتے ہوئے منی مائز کیا ہوا حصہ کلک جو اس نے کاشف سے چھپالیا تھا۔

پھر اس نے جلدی سے فون کا ریسیور اٹھایا اور اتنی تیزی سے نمبر ڈائل کرنے لگا جیسے ذرا بھی دیر ہوگئی تو غضب ہوجائے گا۔

سلمیٰ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کررہا ہے۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''سر یہ آپ کیا کررہے ہیں؟''

''تم چپ رہو۔'' منیجر نے اسے ایسے ڈانٹتے ہوئے کہا جیسے ایک لمحے کی تاخیر بھی اس کے لیے مصیبت کھڑی کر دے گی۔

اس نے اسکرین پر دیکھ کر نمبر ڈائل کیا تھا۔ بیل جارہی تھی۔ دوسری جانب سے ریسیور اٹھاتے ہی بولا۔

''میں انٹرنیشنل بینک کا منیجر بول رہا ہوں۔ ایمرجنسی۔ اکاؤنٹ نمبر 256341789536 کا اکاؤنٹ ہولڈر کاشف سلیم آیا تھا۔''

''کاشف۔'' دوسری جانب سے ایسے کہا گیا جیسے یہ نام یاد کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ پھر اگلے ہی پل چونک کر بولا۔

''اوہ ہاں...... کیا رہا؟''

''میں چونکہ پرسوں ہی ٹرانسفر ہوکر یہاں آیا ہوں۔ اس لیے پہلے سے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں انسٹرکشنز پڑھیں تو پتہ لگا۔ اس کے بعد میں نے وہی کیا جو کرنا چاہئے تھا۔''

''گڈ اس نے پارسل دیکھا؟''

''ہاں۔''

''ردعمل؟''

"وہ اس میں سے نکلی چیزوں کو دیکھ کر بھڑک گیا۔ اسے اپنے سو کروڑ کی تلاش ہے۔ بینک کو الٹا سیدھا کہہ گیا ہے۔ پولیس کی دھمکی بھی دے رہا تھا۔ شاید اب وہ سیدھا ایچ ڈی ایف سی بینک یا تھانے گیا ہوگا۔"

"نہیں۔ وہ ان میں سے کسی جگہ نہیں جائے گا۔ وہ کہاں جائے گا۔ ہمیں معلوم ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"پارسل کا سارا سامان تمہارے پاس ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ کچھ بھی نہیں لے کر گیا۔"

"اوکے۔" اور فون ڈس کنیکٹ کر دیا گیا۔

منیجر نے ریسیور رکھ کر رومال سے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھا۔ تب حیرت میں ڈوبی سلمٰی نے پوچھا۔ "سر آپ نے کسے فون کیا تھا؟"

منیجر نے چونک کر اسے دیکھا۔ جیسے ابھی پتہ لگا ہو کہ سلمٰی ابھی تک اس کے کمرے میں موجود ہے۔ وہ ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

"یہ بچیوں کے جاننے کی باتیں نہیں ہیں۔ جاؤ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کام دیکھو۔"

✿✿✿✿

کاشف کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کہاں جائے؟ پہلے سوچا کہ تھانے جائے۔ لیکن پھر منیجر کی باتیں دماغ میں آتے ہی وہاں جانے کا فیصلہ ترک کر دیا اور ایچ ڈی ایف سی کا بھی۔ کیونکہ اس کے پاس اتھارٹی ہی کیا تھی کہ وہ کسی بینک میں جا کر کسی کے اکاؤنٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ ظاہر ہے بینک نے صاف انکار کر دینا تھا۔

وہ اپنی سوچوں کے بھنور میں کھویا ہوا تھا کہ ایک آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"کہاں چلنا ہے صاحب؟"

"آں۔" وہ چونکا۔

اس نے چونک کر دیکھا کہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ چکا ہے۔ یہ ٹیکسی اس نے اپنے فلیٹ سے نکلنے کے بعد ہی ہائر کر لی تھی۔ بینک پہنچ کر پیسے نہ ہونے کی وجہ سے باہر انتظار کرنے کو کہہ دیا تھا اور اب واپس اسی میں بیٹھا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ ڈرائیور کی آواز پھر آئی۔

"سگنل گرین ہونے والا ہے صاحب۔ جلدی بتائیے کہاں موڑوں؟"

اسی وقت اس کے دماغ میں انیتا کا نام کوندا اور اس کے ذہن نے اسے احساس دلایا کہ وہی بتا سکتی ہے کہ الوینہ کہاں ملے گی۔

کیونکہ الوینہ ہی اس کی موجودہ اور سابقہ زندگی کے درمیان کی کڑی تھی جو اس نے امیر جان کی قید میں گزاری تھی۔

امیر آباد کے بارے میں۔ وہاں اس نے کیا کیا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا وغیرہ۔ ہر سوال کا جواب صرف الوینہ ہی دے سکتی تھی اور الوینہ تک پہنچا سکتی تھی انیتا۔ اس کی دوست اور وہ اس ٹیکسی کا کرایہ بھی ادا کر دے گی۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر ڈرائیور کو انیتا کا پتہ بتا دیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد وہ انیتا کے فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے ڈور بیل بجانے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

"یہ انیتا نے دروازہ کیوں کھلا چھوڑا ہوا ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

جب سے کراچی کے حالات خراب ہوئے تھے وہ ہمیشہ اپنے دروازے کو بند رکھتی تھی اور یہی حال اس کی بوڑھی ماں کا بھی تھا۔

کاشف کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ اسے انیتا کی فکر ہونے لگی اور وہ آواز دیتا ہوا ڈرائنگ روم میں گھس آیا۔

"انیتا، انیتا۔"

کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

وہ اونچی آواز میں انیتا کو پکارتا ہوا اس کے بیڈ روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اسے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ اس کے پیچھے ایک طویل القامت ہٹا

کتنا آدمی کھڑا تھا۔

چونک کر اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک زوردار لات اس کے شانے پر پڑی اور وہ چیختا ہوا فرش پر گر گیا۔ اس نے سر اوپر اٹھایا تو اس بار اسے چار آدمی دکھائی دیئے۔

وہ چاروں کاشف پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے دنیا میں اس سے بڑا ان کا دشمن اور کوئی نہ ہو۔ انہوں نے اس کا سر دیوار پر دے مارا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

❀❀❀❀❀

اندھیرا چھٹنے لگا۔ اس نے کچا کر آنکھیں کھولیں اور کھلتے ہی تیز روشنی کی وجہ سے دوبارہ بند کرنا پڑیں۔

"آنکھیں کھولو۔" ایک رعب دار آواز آئی۔

تین چار بار کوشش کرنے پر اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے وہی چاروں طویل القامت افراد ایک قطار میں کھڑے تھے۔ جنہوں نے اس کی اچھی خاصی دھنائی کر ڈالی تھی۔ ان چاروں نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے۔

کاشف نے غور کیا تو اس کا خون خشک ہونے لگا کہ وہ ایک ٹارچر چیئر پر بیٹھا تھا اور بات تھی بھی خون خشک ہونے والی کیونکہ ایسی ہی کرسی پر بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ ابھی تک اس کے ہاتھ پیر باندھے نہیں گئے تھے۔ یہ بارہ بائی بارہ کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیوار پر ٹارچر کرنے کے مختلف آلات ٹنگے ہوئے تھے۔

بات کاشف کی سمجھ میں آنے لگی تھی اور یہ بات سمجھ میں آتے ہی اس کے پسینے چھوٹنے لگے تھے کہ اسے ٹارچر کیا جانے والا ہے۔

اگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی تو وہ یہ کہ آخر کیوں؟

کون ہیں یہ لوگ؟

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر مضبوط جسم کا مالک شخص کمرے میں داخل ہوا اور چاروں نے اسے ایک ساتھ سلیوٹ کیا۔

دروازہ بند کر کے وہ شخص اندر آ گیا۔ اس نے شاندار سفید سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

"کیا بتایا اس نے؟"

"اسے ابھی تو ہوش آیا ہے سر۔" ایک نے کہا۔

بڑی مشکل سے ہمت کر کے کاشف نے پوچھا۔

"پپ پلیز۔ کم سے کم یہ تو بتا دیجئے کہ آپ لوگ کون ہیں؟ اور میری یہ حالت کیوں بنائی گئی ہے۔ آپ لوگ مجھ سے آخر چاہتے کیا ہیں؟"

آنے والے شخص نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک کارڈ نکال کر کاشف کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ کاشف نے پڑھا تو اس کا دماغ چکرا سا گیا۔

"سی آئی اے۔" "آپ لوگ سی آئی اے والے ہیں؟" اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔

اس آدمی نے بغیر کچھ کہے کارڈ واپس جیب میں رکھ لیا۔

"مم مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ۔ کیا جرم کیا ہے میں نے؟"

"تم چار سال کہاں رہے؟" اس افسر نے برف کی طرح سرد لہجے میں پوچھا۔

"جھوٹ بولا تو دیکھ رہے ہو کہ روح تک سے سچ اگلوانے والی مشین موجود ہے ہمارے پاس۔"

کاشف روہانسے لہجے میں بولا۔

"مجھے نہیں پتہ۔"

ایک عجیب سی مسکراہٹ لیے وہ افسر کچھ پیچھے کو کھسکا اور کاشف پر نظریں ٹکائے ہوئے بولا۔

"جگی۔"

"لیس سر۔" ان چاروں میں سے ایک بدن تن گیا۔

"ذرا اپنے ڈھنگ سے پوچھو۔"

جگی، کاشف کی طرف بڑھنے کی بجائے اس مشین کی طرف بڑھا جس کے استعمال کا مطلب تھا بجلی کے جھٹکے۔ کاشف کانپ کر رہ گیا اور حلق پھاڑ کر چلایا۔

''روکواسے۔''
''تو سچ بتادو۔ وہ خود ہی رک جائے گا۔'' افسر نے کہا۔
''سچ ہی کہہ رہا ہوں۔ واقعی مجھے نہیں پتہ۔''
''کیا تم ملک امیر جان کو نہیں جانتے؟''
''جانتا ہوں۔''
''کیا جانتے ہو اس کے بارے میں؟''
''وہ بہت امیر آدمی ہے۔ پورا ایک شہر بسار کھا ہے اس نے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا اس کے بارے میں۔''
''اس نے یہ شہر کہاں بسار کھا ہے؟''
''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔''
افسر کا اشارہ پا کر جگی نے ایک سوئچ دبایا اور کاشف کے دونوں ہاتھ اس کرسی سے باندھ دیئے۔
''آپ میرا یقین کریں۔'' کاشف نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔
''میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔''
''تو پھر اس نے تمہیں سو کروڑ کیوں دیئے؟''
''وہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔''
''کیسا کام؟''
''یہ بات آپ لوگوں کو عجیب ضرور لگے گی، لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے اس کام کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔'' خوفزدہ کاشف کے بدن پر لرزہ سا طاری تھا۔
''یعنی تم نے کام کیا اور تمہیں ہی نہیں معلوم کہ تم نے کیا کام کیا ہے اور تم چاہتے ہو کہ ہم اس بات پر یقین بھی کر لیں کیا سمجھا ہوا ہے ہمیں۔'' افسر نے خونخوار لہجے میں گالی دیتے ہوئے کہا۔
''میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جس کام کے بدلے میں اس نے مجھے وہ رقم دی تھی۔ میں وہ کام کر بھی پایا تھا کہ نہیں۔''
''اگر ایسی ہی بے سر و پا بکواس کرتے رہو گے تو ہمیں تم پر ٹارچر کرنا ہی پڑے گا۔''
''آپ جو چاہیں قسم لے لیں۔ میں نے ایک ایک لفظ بالکل سچ کہا ہے۔''
افسر نے اسے ایسی نظروں سے گھورا جیسے وہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ کاشف سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔
''تم نے ایک پروجیکٹ تیار کیا تھا؟'' افسر نے اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔
''مستقبل کے کمپیوٹر کا پروجیکٹ اور تم نے اس کے لیے آئی ٹی ڈپارٹمنٹ کے کئی چکر بھی لگائے تھے لیکن انہیں دیا نہیں۔''
''کیسے دے دیتا؟'' یہ سوال ایسا تھا کہ کاشف یہ بھی بھول گیا کہ وہ ٹارچر چیئر پر بیٹھا ہوا ہے۔
''آئی ٹی ڈپارٹمنٹ کا سب سے بڑا عہدیدار، وہ سالا وزیر کا چمچہ، میرے ساتھ دھوکا کرنا چاہتا تھا۔ تفصیل معلوم کرنا چاہ رہا تھا میرے پروجیکٹ کی۔ تاکہ بعد میں وہ اسے اپنے نام سے متعارف کروا سکے اور میں کہیں کا نہ رہوں۔''
''اور تب تم نے سو کروڑ کے عوض اپنا وہ پروجیکٹ ملک امیر جان کو بیچنا منظور کر لیا؟''
''جب ملک امیر جان نے مجھ سے رابطہ کیا تھا تو پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا۔ لیکن جب میری اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ ایسا نہیں چاہتا اور اس لیے نہیں چاہتا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کتنی بھی دولت کی خاطر میں اپنا پروجیکٹ بیچنے کے لیے راضی نہیں ہوں گا۔''
''تو پھر وہ کیا چاہتا تھا؟''
کاشف نے اپنی اور الوینہ سے ملاقات سے لے کر اپنے اور امیر جان کے بیچ مکمل بات چیت تفصیل سے بتانے کے بعد کہا۔
''مجھے وہ آفر قبول کرنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آئی، اس کے بدلے میں مجھے اتنی دولت مل رہی تھی کہ میں اپنے مستقبل کے کمپیوٹر کا پروجیکٹ کا خواب پورا کر سکتا تھا۔''
''اس کے بعد؟''
''اس رات یہ طے ہو گیا کہ میں اس کے ساتھ کام کروں گا اور اگلے دن کنٹریکٹ سائن ہو جائے گا۔ میں

اپنے فلیٹ پر آ کر سو گیا' لیکن جب صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اجنبی جگہ پر پایا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میں اس کے بسائے ہوئے شہر میں ہوں۔ کچھ باتیں ایسی تھیں کہ میں بیچ بیچ میں پچھا کھڑا اور سب سے زیادہ کنٹریکٹ میں لکھی آخری شق نے میری پھرکی گھما دی تھی۔ لیکن امیر جان کی جانب سے مطمئن کر دینے کے بعد میں نے تمام شرائط مان لیں اور یوں ہمارے درمیان وہ معاہدہ طے پا گیا تھا۔"

"وہ شق کیا تھی؟"

"اس میں لکھا تھا کہ ڈاکٹر بابر نعیم مجھے ایک ایسا انجکشن لگائے گا' جس کا اثر چار سال تک رہے گا اور ان چار سالوں میں جو بھی کروں گا' مجھے کچھ یاد نہیں رہے گا۔ ایک طرح سے میری زندگی میں سے وہ چار سال پوری طرح سے حذف ہو جائیں گے۔ یہ پڑھ کر میں بوکھلا گیا تھا۔ دل میں کئی وسوسے جاگ رہے تھے' لیکن انہوں نے مجھے ہر طرح سے مطمئن کر دیا تو میں نے بے دھڑک سائن کر دیئے اور ہوا بھی ویسا ہی' ٹھیک چار سال بعد میں اپنے فلیٹ پہ ویسے ہی سوتا پایا گیا' جیسے چار سال پہلے سویا تھا۔ شروع میں مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں بھرپور نیند لے کر کل کا سویا آج ہی جاگا ہوں' لیکن بڑھے ہوئے بال اور شیو دیکھ کر میں بوکھلا گیا' مگر پھر رفتہ رفتہ انجکشن لگنے سے پہلے تک کے تمام واقعات یاد آنے لگے۔ لیکن انجکشن لگنے کے بعد کیا ہوا۔ ذہن پر زور دینے کے بعد بھی مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ مجھے اپنے آپ میں کوئی دماغی تبدیلی بھی محسوس نہیں ہوئی۔ میرا دماغ بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ میں خود کو بالکل صحت مند محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن اُن چار سالوں میں امیر جان نے مجھ سے کیا کام لیا ہے' وہ میں کر بھی پایا یا نہیں' کچھ یاد نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں خاموشی سی چھا گئی۔ افسر نے جگی اور دیگر تین ساتھیوں کی طرف ایسے دیکھا جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ ان سب کا کاشف کی طرف سے سنائی گئی کہانی پر کیا خیال ہے۔ کیا انہیں اس کہانی پر یقین آیا۔ کم از کم ان چاروں کے چہروں سے تو ایسا لگ نہیں رہا تھا۔

افسر نے تھوڑی دیر کے بعد خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"تم نے اور امیر جان نے کیا سوچ کر یہ کہانی گھڑی ہے؟"

"جج جی۔" کاشف ہٹپٹا کر رہ گیا۔

"کیا تم دونوں نے یہ سوچا کہ ہم اس بکواس پر یقین کر لیں گے اور یہ سوچ کے تفتیش بند کر دیں گے کہ اسے کچھ یاد ہی نہیں آ رہا ہے تو تفتیش کا کیا فائدہ۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" کاشف نے ایک بار پھر یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

"ایسی ہی بات ہے۔" افسر کے لہجے میں اب غراہٹ ابھر آئی تھی۔

"ہم پچھلے دس سالوں سے ملک امیر جان کی تلاش میں ہیں۔ آج تک کسی مجرم نے سی آئی اے کو اتنا نہیں تھکایا اور خود کو بچانے کے لیے وہ کئی طریقے استعمال کرتا رہا ہے اور اس بار تو کمال ہی کر دیا۔ تم سے اپنا من چاہا کام بھی لے لیا اور آزاد بھی چھوڑ دیا۔ ایک ایسی من گھڑت کہانی کے ساتھ' جسے سن کے ہم تفتیش سے باز آ جائیں گے۔ لیکن یہ اس کی اور تمہاری بھول ہے۔ کیونکہ ہم کسی بھی صورت میں اس بکواس پر یقین نہیں کر سکتے۔" افسر کاشف کو تیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولتا رہا۔

"کیونکہ دنیا میں ابھی تک ایسا کوئی انجکشن بنا ہی نہیں ہے جو کسی آدمی کی زندگی کے مخصوص دنوں کی یادداشت کو محو کر دے۔ یا تو اسی ٹارچر چیئر پر تمہاری زندگی کہانی ختم کر دی جائے گی' یا پھر تمہیں نا صرف یہ بتانا ہوگا کہ وہ کہاں ملے گا؟ وہ شہر کہاں ہے۔ جس کے بارے میں تم سے پہلے بھی ہم کچھ لوگوں کی زبانی سن چکے ہیں۔"

اب تو جیسے کاشف کی رہی سہی امیدوں پر بھی ایک ہی جھٹکے میں پانی پھر گیا ہو۔ وہ جو یہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ اپنی کہانی انہیں سنائے گا تو ان لوگوں کی تسلی ہو جائے گی اور

کم از کم ٹارچر کرنے کا خیال تو یہ رد کر ہی دیں گے۔ مگر وہ تو اس کہانی پر یقین کرنے کو ہی تیار نہیں تھے۔ اب تو ایک ہی بات رہ گئی تھی، وہ یہ کہ وہ یہی کہتا رہے کہ یہ سب سچ ہے حالانکہ اس کے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا جس سے وہ انہیں یقین دلا پاتا اور انجام اسی ٹارچر چیئر پر اس کی دردناک موت۔

پلک جھپکتے ہی یہ سارے خیالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ وہ موت کے خوف سے گڑگڑانے لگا۔

''میں نہیں جانتا تھا، بلکہ آج بھی نہیں جانتا کہ آپ کو اس کی تلاش کیوں ہے؟ شک تو مجھے بھی کئی بار ہوا کہ وہ مجرم قسم کا آدمی ہے۔ لیکن اس نے ہر بار میرے ساتھ ایک سلجھے ہوئے بزنس مین کا سلوک روا رکھا۔ تو مجھے لگا کہ میرے اور اس کے درمیان ایک بزنس ڈیل ہو رہی ہے۔''

''بزنس مین اپنی دی ہوئی رقم واپس نہیں لیتے۔''

''وا، واپس؟'' کاشف چونکا۔

''کیا اس نے رقم واپس''؟''

''جس رقم کے لیے تم بھٹکتے پھر رہے ہو، وہ اسی کے اکاؤنٹ میں واپس چلی گئی ہے۔ ایچ ڈی ایف سی کا وہ اکاؤنٹ ملک امیر جان کا ہی ہے۔''

''نن..... نہیں۔'' کاشف کے حلق سے چیخ سی نکل گئی۔

''وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ جب اسے میرا پاس ورڈ ہی معلوم نہیں تھا تو میرے اکاؤنٹ سے رقم اپنے اکاؤنٹ میں کیسے ٹرانسفر کر سکتا ہے؟''

افسر کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ ابھری جیسے کاشف نے کوئی بچکانہ بات کہہ دی ہو۔

پھر وہ بولا۔

''کچھ دیر پہلے تم نے بتایا کہ تم نے اس کے لیپ ٹاپ سے اپنے اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر کی تھی۔ کمپیوٹر کے معاملے میں تم چاہے جتنے بھی ایکسپرٹ سہی، لیکن اس لیپ ٹاپ میں امیر جان نے ایسا کوئی طریقہ ضرور رکھا ہوگا، جس سے تمہاری ٹرانزیکشن کا ریکارڈ اس میں رہ گیا ہوگا۔ اسے تمہاری کمپیوٹر کی زبان میں شاید ہیکنگ بھی کہتے ہیں۔''

کاشف کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو خون نہ نکلے۔ اس طرف تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا اور جو کچھ اس افسر نے کہا وہ ممکنات میں سے ہی تھا۔

''کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ جس اکاؤنٹ میں میری رقم ٹرانسفر کی گئی ہے وہ ملک امیر جان کا ہی ہے؟ کہیں آپ یہ سب اس لیے تو نہیں کہہ رہے کہ یہ سن کے میں بھڑک جاؤں اور اس کے بارے میں جو آپ چاہتے ہیں، وہ بیان دوں۔ لیکن میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اس کے بارے میں مجھے اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں ہے۔'' کاشف نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

افسر کے چہرے پر ناچنے والی وہ مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ اس نے ایک سیاہ پوش کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور جیب سے سی آئی اے کے نام ایچ ڈی ایف سی بینک کے لیٹر پیڈ پر لکھا ایک لیٹر کاشف کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ جس میں لکھا تھا کہ آپ نے جس اکاؤنٹ کے بارے میں پوچھا ہے وہ اکاؤنٹ ملک امیر جان ولد ملک رستم جان، سکنہ 69 تالپور اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ کراچی کا ہے۔ جون 1999ء میں کھولا گیا تھا۔

یہ لیٹر پڑھتے ہوئے کاشف کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون پانی بن گیا ہو۔ اس کے دماغ میں ایک بات بار بار گونج رہی تھی۔ دھوکا، دھوکا، دھوکا۔

ملک امیر جان نے اس کے ساتھ زبردست دھوکا کیا تھا۔

''اب کہو مسٹر کاشف۔ کیا کہتے ہو؟'' افسر نے پھر سوال کیا۔

''کیا اب بھی تم اسے بچانے کا کھیل کھیلو گے؟''

''آپ میرا یقین کیوں نہیں کر رہے کہ میں کوئی کھیل نہیں کھیل رہا ہوں۔ آپ ہی بتائیں کہ یہ سب جاننے کے بعد میں اسے کیوں بچاؤں گا۔ اگر میرا بس چلے تو میں اس حرام کے جنے کو گولی سے اڑا دوں۔ لیکن آپ کو تو اس کا پتہ بھی معلوم ہے۔ تو اسے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے؟''

"کیا تم ہمیں یہ بتانا چاہتے ہو کہ ہم اتنے نادان ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ایسے ایڈریس فرضی ہوتے ہیں۔"

"اس کا اکاؤنٹ فریز کیوں نہیں کروا دیتے آپ؟"

"اس کی دو وجوہات ہیں۔" افسر نے کہا۔

"پہلا تو یہ کہ اکاؤنٹ فریز کرنے سے وہ ہمارے ہاتھ نہیں آ جائے گا۔ دوسرا یہ کہ وہ اتنا چالاک ہے کہ اس کے باوجود کہ ہم اس کی مجرمانہ کارروائیوں سے واقف ہیں، مگر آج تک ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے اور بغیر ثبوت کے ہم چاہیں بھی تو اس کا اکاؤنٹ فریز نہیں کر سکتے۔ عدالت کو مطمئن کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔"

"اس حرامزادے کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کے لیے ہی تو بھٹک رہے ہیں ہم۔" جگی بولا جو اتنی دیر سے خاموش کھڑا باتیں سن رہا تھا۔

"اور انہیں ثبوتوں کے لیے تو ہم تمہارے پیچھے پڑے ہیں۔ تمہارے غائب ہونے کی رپورٹ تھانے میں انیتا نے لکھوائی تھی۔ پولیس جب تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی تو یہ کیس ہمارے ڈپارٹمنٹ کو سونپ دیا گیا۔ کیونکہ تم عام شہری ہوتے ہوئے بھی عام نہیں تھے۔ آئی ٹی ڈپارٹمنٹ کے مطابق تم نے مستقبل کے کمپیوٹر کا پروجیکٹ تیار کیا تھا۔ اس کی تفتیش کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ غائب ہونے والی رات تم ایک لڑکی کے ساتھ تھری اسٹار ہوٹل کے بار میں دیکھے گئے تھے اور وہ لڑکی الوینہ تھی اور ہم یہ جانتے تھے کہ الوینہ کا شمار ان چند افراد میں ہوتا ہے جو ملک امیر جان کے ارد گرد رہتے ہیں۔ اس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ تمہاری گمشدگی میں کہیں نہ کہیں امیر جان کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اب ہماری نظر میں معاملہ انتہائی سنجیدہ اور بے حد پراسرار ہو چکا تھا، باوجود اس کے کہ ہم کچھ پتہ نہیں لگا پائے لیکن ہم مستقل تمہاری تلاش میں لگے رہے۔ ہمارے ڈپارٹمنٹ کے لوگ تمہارے فلیٹ پر بھی گئے تھے اور تمہارے ملازم اور انیتا سے بھی امیر جان کے متعلق معلوم کیا تھا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ بس لے دے کر ایک ہی سرا ملا، وہ بھی تب جب ہم نے امیر جان کے اکاؤنٹ سے تمہارے اکاؤنٹ میں سو کروڑ روپے ٹرانسفر ہوتے دیکھے۔ اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ تم اغواء نہیں کیے گئے ہو اور تم امیر جان کے ساتھ کوئی ڈیل کر کے غائب ہوئے ہو اور یہ بھی اندازہ تھا کہ تم نے اسی مستقبل کے کمپیوٹر کے سلسلے میں یہ ڈیل کی ہوگی۔ مگر ہم کوشش کر کے بھی یہ پتہ لگانے میں ناکام رہے کہ تم کہاں ہو۔ اب بس ایک ہی امید تھی۔ تمہارے اکاؤنٹ میں پڑے سو کروڑ روپے۔"

"ہمیں لگ رہا تھا کہ وہ تمہیں بینک تک ضرور لائیں گے اور ہم نے اتنا مضبوط جال بچھایا ہوا تھا کہ تم جیسے ہی بینک میں آؤ ہمیں علم ہو جائے۔ ہمارے محکمے کی طرف سے تمہارے اکاؤنٹ کے اوپر بینک کے مینجر کو ہدایت لکھوا دی گئی تھی کہ تم جیسے ہی بینک سے رابطہ کرو، مینجر فوراً ہمارے چیف کے پرسنل نمبر پر اطلاع کرے۔" افسر نے کہا۔

"مگر ایسا کیا تو نہیں تھا اس نے۔"

"کیا تھا۔" ایک سیاہ پوش ہنسا۔

"نہ کیا ہوتا تو تم بھلا یہاں کیسے ہوتے۔ ہدایات میں تبدیلی تب کی گئی تھی جب تمہارے نام بینک میں پارسل آیا اور مینجر نے ہمیں اطلاع کر دی۔ چیف صاحب فوراً بینک پہنچے تھے اور اس پارسل کو کھول کر چیک کیا تھا۔"

"مگر وہ تو سیل کیا ہوا پارسل تھا؟" کاشف نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دوبارہ سیل کرنا ہمارے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔" چیف افسر نے کہا۔

"پارسل میں موجود چیزوں نے ہمارا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ بلکہ آج تک گھوما ہوا ہے۔ ہیرے کی انگوٹھی سمیت وہ پارسل کوئی اتنا قیمتی نہیں تھا۔ لیکن اگر اس طرح بینک میں پارسل بنا کر محفوظ رکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا تو یقیناً ان چیزوں کی بہت زیادہ اہمیت ہونی چاہئے تھی۔ اس سے پہلے ایک اور واقعہ ایسا ہو چکا تھا جس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اور وہ واقعہ یہ تھا کہ تمہارے اکاؤنٹ سے

لگ بھگ ساری رقم کا امیر جان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جانا۔ اس سے ہمیں لگا کہ تمہارے اور امیر جان کے بیچ کچھ پک رہا ہے اور ہم یہ سمجھنے لگے کہ یا تو تم دونوں کی ڈیل پروان نہیں چڑھی یا پھر امیر جان تم سے کسی قسم کا دھوکا کر رہا ہے۔ دماغ چکرا دینے والے ان دو واقعات کے بعد ہی ہم نے مجبور ہو کر بینک منیجر کو وہ ہدایات لکھوائی تھیں' کہ اگر تم بینک پہنچو اور پارسل لینا چاہو تو منیجر اسے تمہیں سونپ دے اور فون تمہارے بینک سے نکلنے کے بعد کرے۔ دراصل ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ تم پارسل سے برآمد ہونے والی چیزوں کا کیا کرتے ہو۔ لیکن اس بات نے ہمیں اور بھی چکرا دیا کہ تم نے ان میں سے کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہ لیتے ہوئے وہ پارسل بینک میں ہی چھوڑ دیا تھا۔"

"سر۔ کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ سچ وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں؟" کاشف کو جیسے انہی کی باتوں سے اپنی گلوخلاصی کا ایک پوائنٹ مل گیا۔ "یہ بات کہ مجھے پچھلے چار سالوں کی کوئی بات یاد نہیں آ رہی ہے۔ اگر یاد ہوتی تو۔"

"شٹ اپ۔" افسر اتنی زور سے چیخا کہ کاشف سہم کر رہ گیا۔

"بے وقوف سمجھتے ہو ہمیں؟"

"ج ج جی؟"

"تمہاری اور امیر جان کی حرکتوں سے ہمارا دماغ گھوما تھا۔ تب گھوما تھا۔ لیکن اب کوئی کنفیوژن نہیں ہے۔ ہم تمہاری ساری سازش سمجھ چکے ہیں۔ تم دونوں نے ہمیں چکمہ دینے کے لیے بہت گہری چال چلی ہے۔"

"چچ...... چال"؟"

"بہت اونچا کھلاڑی ہے وہ' جس کا نام ملک امیر جان ہے۔ اس نے ہمیں ایسے ہی نہیں چکرا کر رکھا' پچھلے دس سالوں سے۔ مجھ سے پہلے کے چیف اسے پکڑنے کی حسرت لیے ہوئے ہی ریٹائر ہو گئے۔ لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ میں اپنے کیریئر پر داغ نہیں لگنے دوں گا۔ ایک دن میں اسے اس ٹارچر چیئر پر لا کر بٹھانے میں کامیاب ہو ہی جاؤں گا اور سیڑھی بنو گے تم۔ امیر جان نے اپنی چال پر بھروسہ کرتے ہوئے تمہیں آزاد چھوڑ کر زندگی کی سب سے بڑی بھول کی ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اسے بینک میں ہماری دلچسپی اور ان ہدایات کے بارے میں پتہ چل گیا ہوگا اور یہ چال اس نے اسی کی کاٹ کے لیے چلی ہے۔ وہ سب سے پہلے تو سو کروڑ واپس اپنے اکاؤنٹ میں لے گیا۔ یہاں یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ وہ پہلے سے ہی جانتا تھا کہ اس کا ایچ ڈی ایف سی اکاؤنٹ ہماری نظروں میں ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام اس نے جان بوجھ کر ہمارے دماغ میں یہ بات ٹھونسنے کے لیے کیا ہے کہ یا تو اس کے اور تمہارے درمیان ڈیل کینسل ہو گئی ہے۔ یا اس نے تمہیں فریب دیا ہے۔ اس کے بعد بینک کو پارسل بھیجا گیا اور اس کے ساتھ ہی تم بھی سامنے آ گئے۔ اس کہانی کے ساتھ کہ تمہیں ایک ایسا انجکشن لگایا تھا جس سے تمہارے پچھلے چار سال کی یادداشت ختم ہو چکی ہے۔ اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے تم نے پارسل کی کسی بھی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔"

کاشف منہ پھاڑے چیف افسر کی باتیں سن رہا تھا۔

"تم نے یہ اس لیے کیا کیونکہ تمہیں پتہ تھا کہ منیجر کے ذریعے یہ خبر ہم تک پہنچ جائے گی۔" افسر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم ہمارے ذہن میں یہ بات بٹھانے میں کامیاب ہو جاؤ گے کہ تمہاری انجکشن والی بات سچ ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تم دونوں ملے ہوئے ہو۔ تم نے اس کا وہ کام کر دیا تھا جو وہ کروانا چاہتا تھا اور آنے والے وقت میں وہ تمہیں تمہاری رقم بھی دے دے گا' وہ رقم جو کہیں گئی نہیں ہے' اسی کے اکاؤنٹ میں آرام فرما رہی ہے۔ یہ سارا ڈرامہ صرف اور صرف تمہیں ہمارے شک کے دائرے سے باہر نکالنے کے لیے کیا گیا ہے۔"

کاشف کا حیرت کے مارے برا حال تھا' یہ افسر نہ جانے کہاں کی بات کہاں ملا رہا تھا۔

"آپ تو ہر بات کا الٹا ہی مطلب نکال رہے ہیں۔"

''ہم بالکل سیدھا مطلب نکال رہے ہیں برخوردار۔ کیونکہ مجرم کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو' کوئی نہ کوئی غلطی کر ہی بیٹھتا ہے۔''

''غغ...... غلطی' کون سی غلطی؟''

''تم نے شاید خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ہم یہ پتہ لگالیں گے کہ وہ پارسل کس نے بھیجا تھا؟''

''کس نے بھیجا تھا؟'' کاشف یہ بات سن کر اچھل ہی پڑا تھا۔

افسر کے ہونٹوں پر بہت ہی زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے کاشف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بم پھوڑا۔

''تم نے۔''

''مم...... میں نے؟'' کاشف کو ایسا لگا جیسے سچ مچ اس کے آس پاس دھماکا ہو گیا ہو اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ اس بات نے اس کے دماغ کے سارے تار ڈھیلے کر کے رکھ دیئے تھے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنے بینک کو پارسل کیوں بھیجے گا؟

کافی دیر بعد اس کے ہونٹ وا ہوئے۔

''کیا بات کر رہے ہیں آپ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ایسا کوئی پارسل نہیں بھیجا۔ بھلا میں کوئی پارسل کیوں بھیجوں گا۔''

''ہمیں چکمہ دینے کے لیے۔''

''نہیں۔ میں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔'' کاشف چیخا۔

''کیوں۔'' چیف نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''جب تمہیں یاد ہی نہیں کہ پچھلے چار سال میں تم نے کیا کیا تو یہ کیسے یاد ہے کہ یہ پارسل تم نے نہیں بھیجا؟''

اس بات کا کاشف کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''افضل۔'' چیف نے کہا۔

''اسے ثبوت دکھاؤ۔''

افضل آگے بڑھا اور جیب سے ایک کاغذ نکال کر کاشف کے سامنے لہراتا ہوا بولا۔

''یہ گوادر کے اس پوسٹ آفس کی رسید ہے جہاں سے پارسل رجسٹرڈ کر کے بھیجا گیا تھا اور یہ رسید تم نے اپنے ہاتھ سے بھری ہے۔ اپنی ہینڈ رائٹنگ تو جانتے ہو نا تم اور دستخط بھی تمہارے اپنے ہیں اور ہم اس کا بینک میں موجود تمہارے دستخط سے موازنہ بھی کر چکے ہیں۔''

کاشف کا ذہن حیرت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ یہ سب باتیں الف لیلوی سی لگ رہی تھیں۔ اس سے کچھ بولے نہیں بن رہا تھا۔ دماغ عجیب سی ادھیڑ بن میں تھا۔ اب وہ کہے تو کیا کہے۔ اس کی اپنی ہینڈ رائٹنگ اور دستخط اس کی آنکھوں کے سامنے تھے اور وہ ان کے اصلی ہونے کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ اہلکار ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔

چیف نے وہ پارسل جیب سے نکالا جسے کاشف بینک میں چھوڑ آیا تھا۔

''کیا اب بھی تم اپنے ناٹک کو جاری رکھنا چاہتے ہو؟ یا تم یہ کہو گے کہ تم پارسل میں پائی گئی چیزوں کا مطلب نہیں سمجھتے؟''

''سچائی یہی ہے سر۔ یہی ہے۔'' کاشف رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے آپ؟ اگر یہ میں نے بھیجا ہوتا تو۔''

''نہیں جگی۔'' چیف نے اس کی بات کاٹ کر اپنے ماتحت سے کہا۔

''یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ باتوں کا بھوت نہیں ہے یہ پٹھا۔ اپنا طریقہ شروع کرو۔''

''نہیں۔ ایسا مت کرنا۔'' کاشف منمنایا۔

''آخری موقع دے رہا ہوں۔ سچ اگل دو۔''

اب کاشف کو لگ رہا تھا کہ سچ بول کر وہ بچ نہیں سکتا۔ بلکہ اس کا سچ اس کے گلے کا پھندا بنتا جا رہا ہے۔ ان کے جان لیوا تشدد سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ وہ کہنا شروع کر دے جو وہ سننا چاہتے تھے۔ بعد میں کورٹ میں وہ اپنا بیان بدل بھی سکتا تھا۔

مگر سوال یہ تھا کہ وہ کیا کہے؟ یہ لوگ اس کی کسی بے

پر کی بات پر تو یقین کرنے سے رہے۔
''اسے کوئی انجکشن نہیں لگایا گیا تھا۔''
''وہ اور امیر جان مل کر قانون کو گمراہ کر رہے ہیں۔''
''اس نے امیر جان کے کام کو تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔''
''امیر آباد کہاں ہے۔''
اس کا ذہن تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ کوئی ایسی کہانی بنانی پڑے گی جس پر انہیں کوئی شک بھی نہ ہو ورنہ سب بیکار جائے گا۔ انہیں ایسا نہیں لگنا چاہئے کہ میں سچ کو چھپانے کے لیے ایک اور کہانی بنا رہا ہوں' ورنہ نتیجہ پھر وہی تشدد' کیا' کیا کہانی بناؤں' یکا یک اسے سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ سوچنے کے لیے اسے ہمیشہ سگریٹ کی ضرورت پڑتی تھی۔
''کیا مجھے ایک سگریٹ مل سکتی ہے؟'' کاشف نے پرامید لہجے میں کہا۔
''سگریٹ؟'' چیف افسر چونکا۔
''کیوں؟''
''کیونکہ اب میں آپ کو حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔''
کاشف ایسے انداز میں بولا جیسے ٹوٹ سا گیا ہو۔
''اس کے لیے ریلیکس ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے ہمیشہ سگریٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔''
چیف افسر نے اپنے ساتھیوں کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا کرنا چاہئے۔ وہ بھی کاشف کی بات سن کر الجھن میں پڑ گئے تھے۔
''مگر ہمارے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی سگریٹ۔''
''اس میں ہے۔'' کاشف نے اس کی بات کاٹ کر پارسل کی طرف اشارہ کیا۔
''میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے برانڈ کا سگریٹ اس میں رکھا تھا۔''
چیف نے پھر دوسروں کی طرف دیکھا کہ یہ بھی کاشف کی کوئی چال تو نہیں۔ پھر اس نے خود ہی سر جھٹک دیا کہ بھلا یہ خوفزدہ آدمی ہماری حراست میں کیا چال چل سکتا ہے۔ اس نے سگریٹ صرف اپنی طلب پوری کرنے کے لیے مانگی تھی۔
ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد چیف نے پارسل میں سے سگریٹ اور لائٹر نکالا اور جگی کو اشارہ کر کے کاشف کے ہاتھ کھلوا دیئے اور ایک سگریٹ اس کے ہونٹوں سے لگا کر خود لائٹر سے اسے سلگایا۔
''میں صرف اس سگریٹ کے ختم ہونے تک کا وقت چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کاشف نے کش لینے شروع کر دیئے۔ لیکن کش لگاتے ہی وہ تھوڑا الجھ سا گیا۔ سگریٹ کا ذائقہ تھوڑا الگ سا تھا۔ وہ مزا ہی نہیں آ رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ آنکھیں بند کر کے سوچ میں ڈوب گیا۔
ابھی وہ ڈھنگ سے سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ ''پھٹ'' کی زوردار آواز ہوئی اور آنکھیں کھلتے ہی حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
تبھی ''پھٹ'' کی دوسری آواز کے ساتھ ایک اور سیاہ پوش فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ایک پہلے ہی فرش پر پڑا تھا۔
باقی ایسے جھوم رہے تھے جیسے برداشت سے زیادہ شراب پی لی ہو۔
اسی انداز میں جھومتے ہوئے چیف افسر نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''چالاکی دکھائے بغیر مانا نہیں حرامزا.....'' وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔
اگر حیرت کی کوئی انتہا ہوتی ہے تو وہ اس وقت کاشف کے چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ سورج کو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے دیکھ رہا ہو یا ساری زمین کو سمندر میں غرق ہوتے دیکھ رہا ہو۔ اس وقت تک افضل اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح گرا نہیں تھا۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے' کانپتے ہاتھوں سے ریوالور نکالا اور چلایا۔
''مم...... میں' تت تجھے' چھوڑوں گا نن نہیں۔'' اور ریوالور کاشف کی طرف تان لیا۔
کاشف کے ذہن نے اسے خبردار کیا کہ اس پر گولی

چلائی جانے والی ہے۔ لیکن وہ اتنا حیرت زدہ تھا کہ کرسی سے ہل بھی نہیں پایا۔

افضل نے ٹرائیگر پر دباؤ بڑھایا لیکن اتنا نہیں بڑھا سکا جتنی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ فرش پر لمبا لیٹ چکا تھا۔ سی آئی اے کے پانچوں اہلکار اس وقت کاشف کے سامنے بے بس بے ہوش پڑے تھے اور کاشف کے دماغ میں ایک بات چکرا رہی تھی کہ یہ سب ہو کیسے گیا؟

اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

اس نے اپنی انگلیوں کے بیچ دبی ہوئی سگریٹ کی طرف دیکھا۔

"کیا یہ کارنامہ اس سگریٹ کا ہے؟ ہاں سگریٹ کا ذائقہ بھی الگ سا تھا۔ ضرور اس کے دھوئیں میں کچھ ہے۔ لیکن اگر ہاں تو وہ کیوں بے ہوش نہیں ہوا؟

اس سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ اس نے یوں تڑپ کر سگریٹ دور پھینک دی جیسے اس نے سگریٹ نہیں کوئی سانپ پکڑ رکھا ہو۔

اس کی پھینکی ہوئی سگریٹ جگی کے اوپر جا گری اور یہ سوچ کر کاشف بوکھلا گیا کہ کہیں یہ سگریٹ جگی کو جلا نہ دے۔ یہاں آگ بھی لگ سکتی ہے۔ وہ اٹھا اور جگی پر سے سگریٹ اٹھا کر اپنے پیر سے مسل دی۔

اس کی سمجھ میں ابھی بھی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ کافی دیر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہنے کے بعد جب دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو اسے ماننا پڑا کہ یہ سب اس سگریٹ کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔

یہ سگریٹ پارسل میں تھی اور یہ پارسل میں نے بینک میں بھیجا گیا تھا۔ مگر کیوں؟

اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ مگر ایک بات تو اس پر ظاہر ہو گئی تھی کہ پارسل میں بیکار نظر آنے والی چیزیں بیکار نہیں ہیں بلکہ بہت ہی کام کی ہیں۔ سگریٹ نے جو کام دکھایا تھا اس سے تو یہی لگ رہا تھا۔

جن حالات میں وہ پھنس چکا تھا، اس میں سے اسے اسی پارسل نے نکالا تھا۔ ورنہ اس کے ذہن میں کوئی ایسی کہانی نہیں بن پائی تھی جو اسے ان کے تشدد سے بچا پاتی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پارسل میں موجود ہر چیز کی افادیت ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جھپٹ کر پارسل اٹھا لیا۔ سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر چیف افسر کے نزدیک پڑے ہوئے تھے، اس نے وہ بھی اٹھا کر پارسل میں رکھ لیے اور پوسٹ آفس کی وہ رسید بھی جو اس کے جی کا جنجال بنی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن نے پھر مشورہ دیا کہ اب اسے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔ کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ تو ویسے بھی میرا یقین نہیں کر رہے تھے۔ اس واقعے کے بعد تو یہ پکا سوچیں گے کہ یہ بھی میری ہی چال ہے۔ وہ یہی کہیں گے کہ مجھے پتہ تھا کہ یہ سگریٹ کیا کر سکتی ہے، اسی لیے تو میں نے سگریٹ مانگی تھی۔

ذہن میں صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ بھاگ کاشی بھاگ۔ یہ سوچ کر وہ دروازے کی طرف لپکا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر رک گیا۔ چیف افسر کا پرس اس کی پینٹ کی پچھلی جیب سے جھانک رہا تھا۔ کاشف نے سوچا باہر پیسوں کی ضرورت تو لازمی پڑے گی۔ اس نے تو ابھی یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کہاں جائے گا، کیا کرے گا۔

اس نے بغیر دیر کیے پرس کھولا، اس میں کافی پیسے تھے لیکن شاید کاشف کو یہ کم لگ رہے تھے۔ اس لیے اس نے باقی سب کی جیبیں بھی صاف کر دیں اور ان میں سے ایک کار یوالور بھی لے لیا۔ ہاتھ میں پارسل لیے وہ دروازے کے پاس آ کر ٹھٹکا اور دروازہ ہلکا سا کھول کر باہر جھانکا۔

وہ ایک لمبی راہداری تھی اور ہر طرف سناٹا تھا۔ چھت پر کہیں کہیں لگے بلب روشن تھے۔ جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ رات ہو چکی ہے۔ یعنی وہ کافی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ لیکن وہ وقت کا اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ اس کے پارسل میں ایک رسٹ واچ بھی ہے۔ اس نے گھڑی نکال کر دیکھی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ اس نے گھڑی اپنی کلائی میں باندھ لی اور کافی دیر تک

راہداری کی ٹوہ لینے کے بعد جب اسے اچھی طرح اطمینان ہوگیا تو وہ باہر نکلا اور ٹارچر روم کا دروازہ باہر سے بند کردیا۔ اب وہ شش و پنج میں تھا کہ راہداری میں کس طرف جائے' یہاں کھڑا رہتا تو بے وقوفی ہی ہوتی۔

کسی طرف تو جانا ہی تھا اس لیے سب کچھ اپنے نصیب پر چھوڑ کر وہ ایک طرف چل پڑا اور پھر اس کی نظر ایک لفٹ پر پڑی۔ لفٹ کے دروازے پر لگے کاؤنٹر سے پتہ لگ رہا تھا کہ لفٹ اسی فلور پر آنے والی ہے اور ظاہر ہے اس میں کوئی موجود ہوسکتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ فوراً دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔ لفٹ اسی فلور پر آ کر رکی اور اس میں سے ایک آدمی باہر آیا جو وردی میں تھا اور اس کے کندھے پر ایک گن لٹک رہی تھی۔ وہ سیکورٹی کا بندہ تھا۔ وہ بندہ کاشف کی موجودگی سے بے خبر اسی طرف بڑھے جارہا تھا جہاں سے کاشف آیا تھا۔

کاشف تیزی سے حرکت میں آیا اور لفٹ میں داخل ہوگیا۔ مگر لفٹ میں آتے ہی اس کے ہوش خطا ہوگئے۔ لفٹ میں لفٹ مین بھی موجود تھا۔

لفٹ مین اسے دیکھ کر ایسے چونکا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''تم......؟ اس کے چہرے پر حیرت ہی حیرت تھی اور کاشف کی حالت اس سے بھی زیادہ بری ہورہی تھی۔ اسے بچاؤ کا ایک ہی راستہ سوجھا اور اس نے جیب سے ریوالور نکال کر لفٹ مین کی پسلیوں سے لگادیا۔

''ہلے تو گولی مار دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے گراؤنڈ فلور کا بٹن دبادیا۔

لفٹ مین ڈرا سہا ہوا تھا' پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔

''تت......تم وہی ہو نا جسے صاحب لوگ دن میں لائے تھے' تم بے ہوش تھے؟''

''ٹھیک پہچانا۔'' کاشف نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''مم......مگر......تم یہاں کیسے' صاحب لوگ تو شاید تمہیں ٹارچر کرنے......''

''میں نے ان سب کو لڑھکا دیا۔''

''لل......لڑھکا دیا' مطلب صاحب لوگ مر......''

''نہیں۔ صرف بے ہوش کیے ہیں۔ لیکن تم نے اگر میرے سوالوں کے صحیح جواب نہیں دیئے تو سیدھا اوپر پہنچا دوں گا۔''

''کک......کیا؟''

''ابھی جو آدمی اس لفٹ سے اترا تھا۔ وہ کس آفس میں گیا ہے؟''

''وہیں ٹارچر روم میں۔'' جواب ملا۔

یہ سنتے ہی کاشف کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ یعنی کچھ ہی دیر میں یہ خبر پوری عمارت میں ہنگامہ مچادے گی کہ وہ سی آئی اے والوں کو بے ہوش کرکے ٹارچر روم سے بھاگ رہا ہے۔

مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''اس عمارت میں کتنے لوگ ہیں؟''

''اب آدمی کہاں' رات ہوچکی ہے۔ سارا اسٹاف جاچکا ہے۔ بس میں ہوں اور سیکورٹی کے پانچ بندے ہیں۔''

''جن میں سے ایک اوپر گیا ہے۔''

''ہاں۔''

لفٹ گراؤنڈ فلور پر آ کر رک گئی۔ کاشف نے بورڈ پر نظر ڈالی' جو اس بات کا اشارہ کررہا تھا کہ یہ لفٹ پانچویں فلور تک جاسکتی ہے۔ اس نے پانچ کا ہندسہ دبایا اور لفٹ نے واپس اوپر کا سفر شروع کردیا۔

''یہ کیا کررہے ہو تم؟'' لفٹ مین نے حیرت سے پوچھا۔

''خاموش رہو۔'' کاشف غرایا۔

''باقی چار کہاں ہیں؟''

''سیکنڈ فلور پہ۔''

''سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر کی بس اتنی سی سیکورٹی؟''

''یہ کوئی بینک تو نہیں ہے جسے کوئی لوٹنے آجائے گا۔''

کاشف چپ رہ کر سوچنے لگا۔ کم سیکورٹی اس کے لیے مفید ثابت ہورہی تھی۔

''زندہ رہنا چاہتے ہو تو چہرہ دیوار کی طرف گھمالو۔''

کاشف نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔
لفٹ مین بغیر کوئی دیر کیے فوراً دیوار کی طرف گھوم گیا۔
کاشف نے ریوالور اس کی کمر سے لگاتے ہوئے پوچھا۔
''گراؤنڈ فلور کا نقشہ کیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے پارسل والا بیگ ٹٹولا۔ ''لفٹ کہاں رکے گی' عمارت سے باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے؟'' وہ ایک ہی سانس میں سارے سوال کیے جا رہا تھا۔
''لفٹ تو اوپر جا رہی ہے۔ پھر نیچے کا کیوں پوچھ رہے ہو۔'' لفٹ مین نے ذرا سی گردن گھماتے ہوئے کہا۔
''پیچھے دیکھا یا کوئی سوال کیا تو گولی مار دوں گا۔'' اس نے پارسل میں سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔
''جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔''
''دد...... دائیں طرف۔''
لفٹ پانچویں فلور پر رکی ہی تھی کہ اس نے پھر گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا دیا۔
''لفٹ سے مین گیٹ کتنا دور ہے؟''
''تت...... تقریباً سو میٹر۔''
''گارڈ کہاں تعینات رہتا ہے؟'' کاشف نے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔
''مین گیٹ پہ۔''
''گیٹ بند رہتا ہے یا کھلا؟''
لیکن اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہی لفٹ مین نیچے ڈھیر ہو چکا تھا۔
کاشف سگریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔
''عجیب کرشماتی سگریٹ ہے۔''
اس نے جلدی سے سگریٹ نیچے پھینک کر مسل دی۔ لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچ رہی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اسے اب صرف ایک ہی گارڈ سے نمٹنا ہے۔
مگر اس گارڈ سے نمٹنا ہی اسے بھاری پڑ گیا۔
اس نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ کیونکہ اس نے سوچا کہ گارڈ تو سو میٹر کی دوری پر ہے اور دائیں جانب ہونے کی وجہ سے وہ لفٹ کے دروازے کی طرف سیدھا دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے لفٹ سے باہر قدم رکھا لیکن باہر نکلتے ہی اسے چونک کر رک جانا پڑا۔ مین گیٹ کا گارڈ سامنے گن تانے کھڑا تھا۔
''ہینڈز اپ۔'' بڑی بڑی مونچھوں والا گارڈ گرجا۔
بوکھلاہٹ میں کاشف کو یہی سوجھا کہ اس گارڈ پر ٹوٹ پڑنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے اور گن تانے کھڑے گارڈ کو بھی شاید ایسی حرکت کی امید نہیں تھی۔
دھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلنے کی آواز سناٹے میں گونج اٹھی لیکن گولی کسی کو لگنے کی بجائے چھت میں گڑ گئی اور کاشف گارڈ کو لیے ہوئے زمین پر آ رہا۔ اور گن چھوٹ کر دور جا گری۔ اسی پل سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔
اب کاشف کی سمجھ میں آیا کہ گارڈ لفٹ کے سامنے کیوں کھڑا تھا اور سائرن کا بجنا بھی شاید ٹارچر روم میں جانے والے گارڈ کا کارنامہ تھا۔
پہلا موقع ملتے ہی کاشف اٹھ کر گیٹ کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن گارڈ نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ گارڈ نے اس پر چھلانگ لگائی لیکن کاشف نے عین وقت پر کروٹ بدلی اور اب گارڈ منہ کے بل زمین پر پڑا تھا۔
کاشف پھرتی سے اٹھا اور گارڈ کے سر پر ٹھوکر مارنے ہی والا تھا کہ بائیں طرف سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔
''رک سالے۔''
کاشف نے آواز کی سمت گھوم کر دیکھا۔ ایک گارڈ سیڑھیاں اترتے ہوئے کندھے سے گن اتارتا ہوا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ کاشف کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دوسری منزل والا گارڈ تھا اور خطرہ تھا کہ جلد ہی تیسری منزل والا بھی پہنچ جائے گا۔ سائرن نے سب کو الرٹ کر دیا تھا۔
اگر وہ ان سے الجھا رہا تو شاید یہاں سے نکلنا ناممکن ہی ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر کاشف نے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی اور جب وہ گیٹ کے نزدیک تھا تو ایک اور گولی چلنے کی آواز آئی۔ لیکن قسمت اچھی تھی کہ وہ گولی کاشف کو چھو نہیں

سکی۔ وہ رک کر وقت ضائع کیے بغیر سرپٹ بھاگتا ہی رہا۔

مین گیٹ سے باہر کا نظارہ دیکھتے ہی ایک بار پھر کاشف کو اپنا دل بیٹھتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ سی آئی اے کا ہیڈ کوارٹر صدر جیسے گنجان اور پر رونق علاقے میں تھا اور اس وقت بھی لوگوں کی بھیڑ اور کافی ٹریفک چل رہا تھا۔

سائرن اور فائرنگ کی آواز اپنا کام دکھا چکی تھی اور گیٹ کے باہر اچھی خاصی بھیڑ جمع تھی جو تجسس بھری نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

کاشف کو لگا کہ وہ اس بھیڑ سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

اسی وقت ایک اور فائر ہوا' مرنے کا ڈر بہت برا ہوتا ہے اور اسی لیے وہ ہر بات کو بھول کر بھیڑ کی طرف بھاگا اور اس کے قریب پہنچتے ہی بھیڑ کائی کی طرح پھٹ کر اسے راستہ دینے لگی۔ پھر بھیڑ کے بیچ میں سے کسی نے زور سے آواز لگائی۔

''پکڑو سالے کو۔''

کئی نوجوانوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر کاشف نے جیب سے ریوالور نکال کر للکارتے ہوئے کہا۔

''ہٹ جاؤ۔ اگر کوئی میرے راستے میں آیا تو گولی مار دوں گا۔''

یہ سنتے ہی نوجوان پیچھے ہٹ گئے۔ ظاہر ہے جان بوجھ کر کون موت کے منہ میں جانا پسند کرتا ہے۔ کاشف ریوالور ہاتھ میں لیے بھاگتا رہا اور ڈرے سہمے لوگ اسے راستہ دیتے رہے۔ اسی بھیڑ میں ایک شخص وہ تھا جو ملک امیر جان کا باڈی گارڈ ہاشم تھا۔

اگر کاشف کی نظر اس پر پڑتی تو ضرور پہچان لیتا۔ مگر اس وقت تو اسے اپنی جان بچانے کی فکر لگی ہوئی تھی' اس کا دھیان کسی اور پر کہاں سے جاتا اور نہ ہی یہ سب دیکھنے کا اسے ہوش تھا۔ لیکن ہاشم اپنی آنکھوں میں حیرت لیے اسے ضرور دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظر پیچھے دوڑتے ہوئے دو سیکورٹی اہلکاروں پر پڑی جو۔

''پکڑو پکڑو۔'' چلاتے ہوئے آرہے تھے۔

مگر ان کے کہنے پر کوئی اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ ان دونوں میں سے ایک کے ہاتھ میں گن بھی تھی اور وہ فائر کرنے کے لیے بے چین بھی ہو رہا تھا لیکن لوگوں کے اژدھام کی وجہ سے وہ ایسا کر نہیں پا رہا تھا۔

سڑک پر ایک نوعمر لڑکا بائیک کنارے پر لگائے بڑے انہماک کے ساتھ یہ فلمی سین دیکھ رہا تھا اور اس وقت وہ خود اس سین کا ایک حصہ بن گیا جب قریب پہنچ کر کاشف نے غراتے ہوئے کہا۔

''بائیک مجھے دے دو ورنہ۔''

اپنی طرف تنے ہوئے ریوالور کو دیکھ کر لڑکے نے فوراً بائیک چھوڑ دی۔ کاشف نے اس کے اترتے ہی بائیک سنبھالی اور دوسرے لمحے وہ وہاں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

اب صرف ایک ہی شخص اس کے پیچھے تھا۔ ملک امیر جان کا باڈی گارڈ ہاشم۔

دو تین موڑ کاٹنے کے بعد کاشف بھی اسی بے ہنگم ٹریفک کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ صورت حال زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکتی۔ کچھ ہی دیر میں پولیس تک اس کا حلیہ اور اس بائیک کا نمبر پہنچ جائے گا اور سارے شہر میں اس کی تلاش شروع ہو جائے گی اور کسی نہ کسی چوراہے پر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ سکتا ہے اور اگر اس نے ان سے بچ کر نکلنے کی کوشش کی تو اس پر گولی بھی چلائی جا سکتی ہے۔

ایک چوراہے پر سرخ سگنل کی وجہ سے گاڑیوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ کاشف کے پاس کہیں رکنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے بائیک فٹ پاتھ پر چڑھا دی اور آگے نکلتا گیا۔ ہاشم بھی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اور کاشف اس بات سے بالکل بے خبر تھا۔

چوراہا پار کرنے کے بعد کاشف کے ذہن نے اسے خبردار کیا کہ یہ بائیک اس کے لیے کسی بھی وقت خطرے کی گھنٹی بجا سکتی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جلد از جلد اس مصیبت سے جان چھڑا لی جائے۔ اس وقت تک وہ کینٹ اسٹیشن پہنچ چکا تھا۔ جہاں کئی گاڑیاں پہلے سے پارک تھیں۔

کاشف نے بائیک انہی گاڑیوں کے بیچ میں پارک کر دی اور خود اسٹیشن کے اندر داخل ہوگیا۔ اس کا ذہن اسے پھر سمجھا رہا تھا کہ کسی بھی قسم کی گھبراہٹ اور بڑبڑاہٹ لوگوں کا دھیان اس کی طرف کھینچ سکتی ہے۔ اس لیے اسے چاہئے کہ وہ خود کو بالکل پرسکون رکھے۔ اس نے اپنے ذہن کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنی اپنی مطلوبہ ٹرین کے لیے بوکھلایا ہوا ہوتا ہے کہ نکل نہ جائے۔ اس لیے تیز چلنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

اس کے ذہن نے اسے پھر مشورہ دیا کہ اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ کوئی بھی ٹرین پکڑ کر فوراً یہ شہر چھوڑ دے۔ یہاں رکا تو پکڑے جانے کا زیادہ امکان ہے۔ سی آئی اے سے الجھنا اسے بہت مہنگا پڑ سکتا تھا۔ اس کے لیے بچنا تو کہیں بھی ممکن نہیں تھا لیکن کراچی میں رہتا تو فوراً دھر لیا جا سکتا ہے۔

یہ سوچ دماغ میں آتے ہی وہ دوڑ کر پلیٹ فارم چھوڑتی ہوئی ایک ٹرین میں سوار ہوگیا۔ بنا یہ سوچے کہ یہ ٹرین کون سی ہے اور کہاں جا رہی ہے۔ لیکن یہ سب باتیں اس کے لیے بے معنی تھیں۔ اسے تو جلد سے جلد کراچی سے باہر نکلنا تھا۔ آدھے پونے گھنٹے بعد ٹرین شہر سے نکل کر ویرانے میں سفر کر رہی تھی۔ تب کاشف سلیم نے سکھ کا سانس لیا۔ اب وہ کم سے کم اگلے اسٹیشن سے پہلے تو نہیں پکڑا جا سکتا تھا۔

مسافروں میں سے زیادہ تر سونے کی تیاریوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ تبھی اسے خیال آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ بھی نہیں ہے اور اگر ٹی ٹی نے اسے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پکڑ لیا تو؟

یہ سوچ کر وہ پھر ہمت ہار گیا لیکن اس کے ذہن نے اسے دلاسہ دیا کہ روزانہ پتہ نہیں کتنے لوگ بغیر ٹکٹ سفر کے جرم میں پکڑے جاتے ہیں اور موقع پر جرمانہ ادا کر کے بچ جاتے ہیں۔ اس کے پاس پیسے تو ہیں ہی، پھر ڈر کس بات کا۔

اس نے ایک خالی سیٹ دیکھ کر اپنے بیٹھنے کی جگہ بنائی اور پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ پارسل میں پائی گئی چیزوں کو اچھی طرح سے جانچا تو جائے کہ یہ ہیں کیا بلا۔

یہ پارسل اس کے لیے کسی کرامت سے کم نہیں تھا۔ اس کی دو چیزیں سگریٹ اور لائٹر اسے بڑے آڑے وقت میں کام آئی تھیں اور اب اسے سکون کے ساتھ باقی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرنی تھی۔ یہ سوچ کر اس نے پارسل کھولا اور پارسل کھولتے ہی جس پہلی چیز پر اس کی نظر پڑی اس نے اسے بری طرح سے چونکا دیا تھا۔ وہ اسی کے نام ٹرین کا ریزرو ٹکٹ تھا۔

ابھی وہ آنکھیں پھاڑے ٹکٹ کو دیکھ ہی رہا تھا کہ کمپارٹمنٹ میں ٹی ٹی کی آواز گونجی۔

''ٹکٹ پلیز۔''

کاشف اتنا بوکھلا گیا تھا کہ اس نے بنا کچھ سوچے وہ ٹکٹ ٹی ٹی کی طرف بڑھا دیا اور ٹی ٹی نے ہاتھ بڑھا کر ٹکٹ اس سے لے لیا اور اپنے دوسرے ہاتھ میں موجود چارٹ سے ملانے کے بعد مارک کرتا ہوا بولا۔

''کاشف سلیم۔''

کاشف نے کھوئے ہوئے انداز میں وہ ٹکٹ واپس لیا اور غور سے دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ جو وہ دیکھ رہا ہے وہ سب سچ ہے۔ وہ ٹکٹ اس کے نام آج کی تاریخ کا اور جس برتھ پر وہ بیٹھا تھا، اسی برتھ کا تھا۔ یعنی اس ٹکٹ کے مطابق وہ سیٹ اس کے نام پر ریزرو تھی۔

❀❀❀❀

''یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' امیر جان نے چونک کر پوچھا۔

''ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ بھلا سی آئی اے والے کاشف سلیم کے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں؟''

''اس وقت تو میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا سر۔'' امیر جان کے سامنے باادب کھڑے ہاشم نے کہا۔

''اور سچ پوچھیں تو ان واقعات کو دیکھ کر میری عقل بھی

دنگ ہے۔"

"شروع سے بتاؤ تم نے کیا کیا دیکھا۔" امیر جان نے کہا۔

"آپ نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کاشف سلیم پر نظر رکھنے کی۔" ہاشم نے کہنا شروع کیا۔

"میں اس وقت تک یعنی صبح تک اس کے کمرے میں ہی بیڈ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ جاگنے کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے پچھلے چار سال کہاں گزارے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ایک رات کی نیند لے کر جاگا ہے۔ پھر اپنے بڑھے ہوئے بال دیکھ۔"

"خاص خاص باتیں بتاؤ۔" امیر جان نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ پھر اس نے کمپیوٹر پر اپنا اکاؤنٹ کھولا۔"

"ظاہر ہے۔ سب سے پہلے اسے یہی کرنا تھا۔" امیر جان کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ ابھری۔ "بہرحال اسے اپنی چار سال کی محنت کا انعام تو دیکھنا ہی تھا۔"

"لیکن اس کے اکاؤنٹ میں صرف پانچ ہزار روپے ہی تھے۔ جو اکاؤنٹ کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔"

"ہک۔ کیا بات کر رہے ہو؟" امیر جان حیرت سے اچھل پڑا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں سر۔ بیڈ کے نیچے سے کمپیوٹر اسکرین صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بھی دیکھا تھا۔" یہ کہتے ہوئے ہاشم کے ہونٹوں پر چھپی چھپی سی مسکراہٹ تھی اور امیر جان پراسرار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اپنی رقم کو غائب دیکھ کر وہ پاگل سا ہو گیا۔"

"ظاہر سی بات ہے۔ ایسی صورت حال میں کسی کی بھی حالت یہی ہوسکتی تھی۔" الوینہ نے بیچ میں کہا۔

"کسی کی چار سال کی۔"

"مگر کیسے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" امیر جان کے چہرے پر حیرت کا سمندر امڈ آیا تھا۔

"رقم تو اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کی تھی۔ اس کا سود ملا کر اب تک تو وہ رقم کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوتی اور تم کہہ رہے ہو کہ صرف پانچ ہزار روپے؟"

ہاشم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ جیسے وہ کچھ جانتا ہو لیکن زبان پر نہ لا رہا ہو۔ وہ امیر جان کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے امیر جان کے چہرے پر موجود تاثرات سے اس کے اندر کے خیالات جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔

جبکہ امیر جان اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر کافی دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ آخر امیر جان نے ہی یہ خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"پھر تو وہ سیدھا بینک گیا ہوگا۔"

"یس سر۔" ہاشم کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

"تھا تو میں اپنی ڈیوٹی پر ہی لیکن بینک کے اندر نہیں جا پایا۔ لیکن یہ ضرور دیکھا کہ جب وہ واپس باہر نکلا تو بری طرح سے بھنایا ہوا تھا۔ وہ اسی ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا انیتا کے فلیٹ پر پہنچا۔ میں پھر باہر رک گیا اور کچھ دیر بعد جو دیکھا اس نے میرا دماغ چکرا کر رکھ دیا۔"

"ایسا کیا دیکھ لیا تم نے؟"

"سی آئی اے کے چار سیاہ پوش کاشف کے بے ہوش جسم کو لے کر باہر نکلے اور بلیک سفاری میں ڈال کر چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے لگ گیا۔"

"تم نے کیسے جانا کہ وہ سی آئی اے والے تھے؟" امیر جان نے پوچھا۔

"ان میں سے ایک ہمارا مخبر معراج علی تھا۔"

"اوہ تب تو تم نے پتہ لگا لیا ہوگا کہ سی آئی اے والوں نے اسے کیوں پکڑا؟"

"یہی جاننے کے لیے میں سی آئی اے سینٹر کے سامنے کھڑا رہا۔ تاکہ معراج علی باہر آئے تو اس سے معاملہ معلوم کرسکوں۔ اسی چکر میں شام کے پانچ بج گئے۔ سارا اسٹاف چلا گیا لیکن وہ گروپ ابھی تک اندر ہی تھا۔ پھر نو

بجے کے بعد جو ہنگامہ ہوا اس کے بارے میں آپ کو میں بتا ہی چکا ہوں۔"

"وہاں سے وہ کہاں گیا؟" اس بار سرتاج صدیقی نے پوچھا۔

ہاشم کے جواب دینے سے پہلے امیر جان بولا۔

"وہ سب بعد میں، پہلے وہ بتاؤ جو تمہیں معراج علی سے معلوم ہوا؟"

"اس کا کہنا ہے کہ کاشف سلیم کی گمشدگی کے چھ مہینے بعد اس کے غائب ہونے کا کیس سی آئی اے کے پاس آیا تھا۔"

"اس نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"اس کا کہنا تھا کہ اسے بھی اس ساری بات کا علم ٹارچر روم میں جا کر ہی ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ سی آئی اے نے معلوم کر لیا تھا کہ جس رات کاشف غائب ہوا، اس رات وہ الوینہ میڈم سے ملا تھا اور سی آئی اے والے پہلے سے جانتے تھے کہ الوینہ آپ کے بہت قریب ہے۔ یہ جان کر انہوں نے کیس آپ کے ساتھ لنک کر دیا۔ پھر انہوں نے کاشف کے ملازم اور انیتا سے بھی تفتیش کی لیکن وہ کاشف یا ہم تک نہیں پہنچ پائے آخر وہ کاشف کے بینک اکاؤنٹ تک پہنچ گئے اور اس میں سو کروڑ کی انٹری دیکھ کر سمجھ گئے کہ اس کے اور آپ کے بیچ کوئی ڈیل ہوئی ہے۔ بلکہ یہ اندازہ بھی لگایا گیا کہ یہ ڈیل مستقبل کے کمپیوٹر کے سلسلے میں ہوئی ہے۔" ہاشم نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ آپ آئی ٹی کے میدان میں کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے آپ نے کاشف کے پروجیکٹ کو چنا تھا۔"

اس بات پر امیر جان نے سرتاج صدیقی کی طرف دیکھا اور دونوں کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تیرنے لگی جیسے وہ اپنے سامنے پوری دنیا کو بہت بونا سمجھ رہے ہوں۔ ان کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ کوئی ایسا راز ضرور ہے جس کے بارے میں صرف وہ دونوں ہی جانتے ہیں۔

اور یہ راز وہاں موجود کسی تیسرے فرد کو معلوم نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد امیر جان بولا۔

"اس بارے میں وہ جو سوچتے ہیں، انہیں سوچنے دو، تم آگے بتاؤ۔"

"سی آئی اے کو یقین تھا کہ اس رقم کی خاطر کاشف سلیم ایک نہ ایک دن بینک ضرور آئے گا۔ اس لیے انہوں نے کاشف کے اکاؤنٹ کے کھلتے ہی یہ ہدایت لکھوا دی تھی کہ جیسے ہی وہ پہنچے تو مینجر فوراً سی آئی اے کو انفارم کرے۔ اب اس سے پہلے کہ کاشف بینک پہنچتا، اس سے پہلے ہی صرف سات دن پہلے یعنی 19 اگست کو انٹرنیٹ کے ذریعے ساری رقم ایچ ڈی ایف سی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو گئی۔ ہدایات کے مطابق بینک مینجر نے سی آئی اے کو انفارم کر دیا تھا۔"

"وہ اکاؤنٹ کس کا تھا؟"

اس بات پر ہاشم نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ سفید جھوٹ بولا۔

"وہ ابھی تک پتہ نہیں لگ سکا ہے۔"

"خیر۔ اس کے بعد؟"

"سی آئی اے کا چیف بینک پہنچا لیکن الجھ کر رہ گیا۔"

"کیوں؟"

"اکاؤنٹ سے پیسے تو گئے ہی، ساتھ میں اس ہدایت کے ساتھ بینک کو ایک پارسل موصول ہوا تھا کہ اسے کاشف سلیم کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا جائے اور جب کاشف سلیم بینک پہنچے تو اسے دے دیا جائے۔ چیف نے پارسل کھول کر اس میں موجود چیزیں دیکھیں۔ مگر وہ کچھ سمجھ نہیں سکا۔"

"پارسل میں کیا تھا؟"

"دو تین چیزوں کو چھوڑ کر معراج کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ پارسل ہمہ وقت چیف کے پاس رہا۔ مگر وہ بات بعد میں، اہم بات یہ ہے کہ چیف نے پارسل دوبارہ جوں کا توں سیل کروا کے مینجر کو ہدایات دیں کہ جب کاشف آئے تو یہ پارسل اسے دے دیا جائے۔ اور جب وہ پارسل لے کر بینک سے نکلے تو سی آئی اے کو مطلع کر دے۔"

"چیف نے ایسا کیوں کیا۔" امیر جان نے پوچھا۔

"اصل میں اس الجھی ہوئی کہانی نے اس کا دماغ گھما دیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ پارسل میں موجود چیزوں کو دیکھ کر کاشف کس ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔"

"اوہ۔" امیر جان کے ہونٹ سکڑ سے گئے۔

"دوسری طرف جب سی آئی اے نے یہ پتا لگایا کہ بینک کو وہ پارسل کب' کس نے اور کہاں سے بھیجا تھا تو انہیں ایک حیرت انگیز بات معلوم ہوئی۔"

'وہ کیا؟"

"بقول معراج علی کے بینک کو 21 اگست کو ملنے والے پارسل کو 19 اگست کو گوادر کے پوسٹ آفس سے خود کاشف نے بھیجا تھا۔"

"کیا بات کر رہے ہو تم؟" امیر جان نے چلا کر پوچھا۔ سب کے چہروں پر ایسے تاثرات چھائے ہوئے تھے جیسے سورج کو مغرب سے طلوع ہوتا دیکھ رہے ہوں۔

"ناممکن۔" سرتاج صدیقی بولا۔

"ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ 19 اگست کو تو وہ یہاں تھا۔ امیر آباد میں۔ بھلا وہ گوادر سے پارسل کیسے بھیج سکتا ہے؟"

"سی آئی اے والے پوسٹ آفس سے وہ رسید لے آئے تھے جو کاشف نے پُر کی تھی اور اس پر کاشف کے دستخط بھی تھے اور کاشف نے بھی مان لیا تھا کہ دستخط اسی کے ہیں۔"

"ناممکن سر! ایک دم ناممکن۔" الوینہ بولی۔

"19 اگست کو تو وہ دوسری ہی زندگی گزار رہا تھا۔ چار سال کے اندر والی۔ وہ تو اس وقت امیر آباد میں تھا اور ذرا یہاں کی سیکورٹی پر غور کریں' کسی حالت میں یہ سوچنا بھی بے وقوفی ہوگی کہ وہ گوادر یا دنیا کے کسی اور حصے میں جا بھی سکتا تھا۔"

"وہ سب کیسے بھی ہوا۔ میں تو صرف وہ بتا رہا ہوں جو سی آئی اے والے معراج کے سامنے کاشف نے بتایا تھا۔"

"انہوں نے کاشف سے جھوٹ بولا ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ اسے کسی اور چکر میں لے رہے ہوں۔" سرتاج صدیقی نے کہا۔

"خیر ہے خیر ہے۔" امیر جان بڑبڑایا۔

"مگر یہ طے ہے کہ ایک عجیب چکر دار سلسلہ شروع ہوگیا ہے' پھر اس کے بعد؟"

"جب کاشف بینک پہنچا تو منیجر نے ہدایات کے مطابق ہی عمل کیا۔ لیکن اس نے پارسل میں موجود کسی بھی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اپنی غائب شدہ رقم کا رونا روتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی منیجر نے چیف کو فون کردیا۔ معراج کا کہنا ہے کہ تب تک اسے صرف اتنا ہی پتہ تھا کہ چیف نے اس سمیت چار اہلکاروں کو ایک ایڈریس دے کر ہدایت دی تھی کہ یہاں کاشف سلیم نام کا ایک بندہ پہنچے گا۔ اس کی اتنی ٹھکائی کرنی ہے کہ وہ ہوش کھو بیٹھے' پھر اسے سی آئی اے سینٹر لانا ہے۔ وہ لوگ کاشف سے پہلے ہی اس ایڈریس پر پہنچ گئے تھے اور جیسے ہی وہ فلیٹ میں داخل ہوا انہوں نے اس کی خاطر داری شروع کردی۔"

سرتاج صدیقی نے پوچھا۔

"چیف کو یہ کیسے پتہ لگا کہ بینک سے وہ سیدھا انیتا کے فلیٹ ہی جائے گا؟"

"معراج کا کہنا ہے کہ اس بارے میں تو خود چیف ہی بتا سکتا ہے۔"

"اور ٹارچر روم میں کیا ہوا؟"

"سی آئی اے کے لوگ اس سے آپ کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔" ہاشم نے نگاہیں اپنے باس پر جماتے ہوئے کہا۔

"یہ جاننا چاہتے تھے کہ چار سال وہ کہاں رہا اور کیا کیا۔ اس نے تشدد کے ڈر سے وہ سب بتا دیا جو وہ جاننا چاہتے تھے۔ لیکن چار سال کے درمیان کیا ہوا۔ وہ یہ نہیں بتا پایا۔ اس بارے میں اس نے صرف یہی بتایا کہ ڈاکٹر بابر نعیم نے اسے ایک ایسا انجکشن لگایا تھا جس کی وجہ سے اس کے پچھلے چار سال کی یادداشت محو ہوچکی ہے۔ لیکن سی آئی اے کو اس کی اس بات پر رتی برابر بھی یقین نہیں آیا کہ دنیا میں ایسا بھی کوئی انجکشن ہے جو مخصوص وقت کی یادداشت ختم کر

دے۔"

یہ سن کر ڈاکٹر بابر نعیم کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ کھیلنے لگی جیسے بھری محفل میں اس کی تعریف کی جارہی ہو۔

"تب تو اس پر بہت تشدد کیا گیا ہوگا؟" سرتاج صدیقی نے پوچھا۔

"چیف یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ پارسل کاشف نے خود ہی بھیجا تھا۔ اس لیے سی آئی اے کے مخصوص انداز سے اس کی مہمان نوازی کی تیاریاں کرنے لگے۔ سی آئی اے کے لیے اس کی باتوں پر یقین کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ان باتوں کے علاوہ پارسل میں موجود چیزوں کے بارے میں بھی جاننا چاہتے تھے۔ پہلے تو کاشف نے پچھاڑی دکھائی لیکن الیکٹرک شاک کے ڈر سے ٹوٹ گیا۔"

"ٹوٹ گیا؟" امیر جان حیران ہو کر بولا۔

سرتاج صدیقی نے بھی اسی لہجے میں پوچھا۔ "ٹوٹنے کے بعد اس نے کیا بتایا؟"

"ٹوٹ کر بھی وہ کیا بتا سکتا تھا۔" ڈاکٹر بابر نعیم نے کہا۔ "انجکشن سے پہلے کے واقعات وہ بتا ہی چکا تھا' بعد کے اسے یاد نہیں تھے۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں۔" ہاشم نے بابر نعیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس نے کچھ نہیں بتایا' کیونکہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ خود کو ریلیکس کرنے کے لیے اس نے سگریٹ مانگی' ان میں سے کوئی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ اس لیے پارسل میں موجود سگریٹ نکال کر دی گئی۔ سگریٹ سلگتے ہی کمال ہو گیا۔ معراج کا کہنا ہے کہ جانے کیسا نشہ ہم پر حاوی ہو گیا تھا کہ پانچوں کے پانچوں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔"

"بے ہوش ہو کر گر پڑے۔" امیر جان کی حیرت بڑھتی ہی جارہی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"اس کے علاوہ معراج کچھ نہیں بتا سکا' جب وہ ہوش میں آئے تو پنچھی اڑ چکا تھا۔"

"مگر ایسا کیسے ہو گیا؟ اور اگر ہوا بھی تھا تو اس سگریٹ میں ایسا کیا تھا۔ اگر کچھ تھا بھی تو خود کاشف بے ہوش کیوں نہیں ہوا؟" بابر نعیم نے پوچھا۔

"اس پر بھی تو۔"

"بات بالکل بھی سمجھ میں نہیں آرہی۔" امیر جان پر سوچ لہجے میں بولا۔

"پہلی بات تو یہ کہ کاشف وہ پارسل بھیج ہی نہیں سکتا تھا اور دوسری بات یہ کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ اس نے ایسا کیا تھا' تب بھی اسے یاد نہیں ہو سکتا تھا کہ سگریٹ میں کیا ہے۔ یا اس میں ایسی کوئی خوبی ہے۔"

"لیکن سی آئی اے والے اس کے الٹ سوچ رہے ہیں۔ ان کے خیال سے یہ بات ایک بار پھر پختہ ہوتی ہے کہ پارسل اسی نے بھیجا تھا' تب ہی تو وہ سگریٹ کی خوبی جانتا تھا۔ یہی نہیں سگریٹ کا استعمال اس نے دوسری مرتبہ بھی کیا تھا' لفٹ مین کو بے ہوش کرنے کے لیے۔"

"یعنی وہ سگریٹ کا پیکٹ ساتھ لے گیا؟" ہاشم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"صرف سگریٹ ہی نہیں۔ پورا پارسل' پوسٹ آفس کی رسید اور اس کے علاوہ سی آئی اے والے بھنائے ہوئے اس لیے ہیں کہ وہ ان سب کی جیبیں بھی خالی کر گیا اور ساتھ میں ایک ریوالور بھی۔"

شیشے کے آفس میں پھر خاموشی چھا گئی۔ جو اس بات کا ثبوت تھی کہ سب کے دماغ سنائے ہوئے ہیں۔ کسی کو بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

کافی دیر بعد امیر جان نے پوچھا۔

"اب سی آئی اے والے کیا سوچ رہے ہیں؟"

"سوچنا کیا ہے۔ وہ اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ کر الیکٹرک چیئر پر بٹھا کر اس کھیل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جو اس نے آپ کے ساتھ مل کر کھیلا ہے۔"

"ہمارے ساتھ مل کر؟"

"میں ان کا خیال بتا رہا ہوں۔"

"خیر تم نے بتایا کہ تم نے سی آئی اے سینٹر کے بعد بھی اس کا پیچھا کیا تھا۔" سرتاج نے پوچھا۔

”وہاں سے وہ کہاں گیا۔“

”اس کے بعد جو ہوا۔ اس پر آپ یقین نہیں کریں۔“

اس کے بعد ہاشم نے کاشف کے فرار کی کہانی پوری تفصیل کے سنادی۔

”یہی حقیقت ہوگی۔“ امیر جان کی حیرت ابھی تک برقرار تھی۔

”یہ ہمیں غلط رپورٹ کیوں دے گا‘ خیر اس کے بعد کیا ہوا؟“

”میں بھی ٹرین میں سوار ہوگیا اور ٹی ٹی کے آنے پر جرمانہ ادا کر کے ٹکٹ بنوایا۔ پھر ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ایک اور عجیب بات ظہور پذیر ہوئی۔“ ہاشم نے کہا۔

”کیا؟“

”وہ بڑے غور سے پارسل کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا‘ اس وقت میں اپنا منہ چھپائے اس کی سیٹ کے عین اوپر والی برتھ پر بیٹھا تھا اور اس کی ایک ایک حرکت میری نظروں کے سامنے تھی۔ ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر دو منٹ رکنے کے بعد دوبارہ رینگنے لگی تھی۔ وہ اس پارسل سے ہیرے کی انگوٹھی نکال کر بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت ایک کچی عمر کے لڑکے نے جو کاشف کی سیٹ کے بالکل سامنے والی سیٹ پر بیٹھا تھا‘ اور جھپٹا مار کر انگوٹھی اس کے ہاتھ سے چھین کر بھاگا۔ ایک لمحے کے لیے تو نہ میرے اور نہ ہی کاشف کی سمجھ میں آیا کہ یہ ہوا کیا ہے اور جب سمجھ میں آیا تو وہ پکڑو پکڑو کہتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ میں بھی فوراً ان کے پیچھے لپکا۔ سارے کمپارٹمنٹ میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔ لوگ اٹھ اٹھ کر ماجرا سمجھنے کی کوشش کررہے تھے جس کی وجہ سے میں اتنی تیزی سے نہیں بھاگ سکا‘ جبکہ اتنی دیر میں وہ لڑکا پلیٹ فارم پر کود چکا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے کاشف نے بھی چھلانگ لگا دی تھی۔ مگر جب تک میں دروازے تک پہنچا اس وقت تک ٹرین اتنی رفتار پکڑ چکی تھی کہ اس سے کودنا خودکشی کرنے کے مترادف ہوتا۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہوگیا اور اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔“ امیر جان نے اس کی طرف کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا اور ہاشم نے بنا کچھ کہے اپنی گردن جھکالی۔

”گدھے ہو تم۔“ امیر جان کو اس پر سخت غصہ آرہا تھا۔

”تم نے موقع ملتے ہی اسے دبوچ کیوں نہیں لیا؟“

”سر آپ ہی کا حکم تھا کہ اس کی کسی بات میں دخل اندازی نہ کرتے ہوئے صرف اس پر نظر رکھوں اور وہ بھی اس کی لاعلمی میں۔ اور پوری رپورٹ آپ کو دینی تھی۔“ ہاشم نے دھیمی آواز میں کہا۔

”پتہ نہیں ہمارے آدمی اپنے دماغ کا استعمال کرنا کب شروع کریں گے۔“ امیر جان کا لہجہ زہریلا ہورہا تھا۔

”گدھے وہ حکم عام حالات کے لیے تھا۔ یہ سوچ کے دیا تھا کہ خاص تو کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ ہمارا کام تو ہوچکا ہے۔ وہ اپنی دنیا میں لوٹ گیا‘ قصہ ختم۔ لیکن جب ایسے ایسے دماغ کو چکرا دینے والے واقعات ہوئے تو کیا تمہارے دماغ نے یہ نہیں کہا کہ ان کا جواب پانے کے لیے ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی اور تمہیں کسی بھی طرح اسے اپنی گرفت میں لے لینا چاہیے۔“

ہاشم کیا بولتا۔ چپ چاپ جھاڑ سنتا رہا۔

”خیر۔“ سرتاج صدیقی نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”جب ٹرین اگلے اسٹیشن پر رکی تو میں اترنے کے لیے اپنی سیٹ سے اٹھا ہی تھا کہ کئی مسلح افراد اندر گھس آئے۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ مجھ سمیت سارے مسافر خوفزدہ ہوگئے تھے اور ہوش گھما دینے والی بات یہ تھی کہ وہ سیدھے اسی سیٹ پر جھپٹے جس پر پچھلے اسٹیشن تک کاشف بیٹھا تھا۔“ ہاشم نے ایک اور دھماکہ کرتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

”بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“ الوینہ نے کہا۔

”تب تک میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ کاشف کو سیٹ پر نہ پا کر وہ غصے میں آگئے اور اس کا حلیہ بتا کر

سارے مسافروں سے اس کے بارے میں تفتیش کرنے لگے۔اس کا حلیہ سن کر مسافروں نے پچھلے اسٹیشن پر ہونے والے واقعے کے بارے میں انہیں بتادیا۔"

"تب تک کا مطلب؟ اور وہ لوگ کون تھے؟"

"ٹرین چلنے سے پہلے میں اسی اسٹیشن پر اترا اور پرائیویٹ گاڑی کر کے واپس کراچی آ کر سیدھا معراج علی کے فلیٹ پر پہنچا۔ اس نے بتایا کہ چیف نے ہوش میں آتے ہی کہا تھا کہ کاشف فلاں ٹرین کی فلاں سیٹ پر سفر کرتا ہوا ملے گا۔ کیونکہ اس نے پارسل میں آج کی ٹرین کا ٹکٹ دیکھا تھا۔" ہاشم ایک ایک بات پوری تفصیل سے بتا رہا تھا۔

"پھر چیف نے ہی یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اس وقت ٹرین کہاں سے گزر رہی ہے اس نے اگلے اسٹیشن کی سی آئی اے برانچ کو اطلاع دے کر چھاپہ مارنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے صرف سیٹ نمبر ہی نہیں بلکہ کاشف کا مکمل حلیہ بھی انہیں بتا دیا تھا۔ چھاپہ انہی سی آئی اے والوں نے مارا تھا۔ مگر اتفاق دیکھیں کہ وہ پچھلے اسٹیشن پر ہی ٹرین چھوڑ چکا تھا اور سی آئی اے والے ناچتے رہ گئے۔"

شیشے کے کمرے میں ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی' جیسے اب ان کے پاس پوچھنے کے لیے کچھ نہ بچا ہو۔اسی خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہاشم نے امیر جان سے کہا۔

"سر میں آپ کو ایک بہت ہی ضروری بات بھی بتانا چاہتا ہوں۔"

"بولو۔"

ہاشم نے کچھ سوچا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"وہ میں آپ کو تنہائی میں بتانا چاہتا ہوں۔"

امیر جان چونکا۔

"تنہائی میں' کیا مطلب؟"

"جب صرف آپ اور میں ہوں گے۔" ہاشم نے سب کی طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

ایک ہی پل میں ان سب کے چہرے اتر گئے۔

"ایسا کیوں؟" امیر جان بولا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ ہم سب ایک ہی ہیں۔ جو کہنا ہے بے جھجک کہو۔"

"بس...... سوری سر۔" ہاشم نے کہا۔ "آپ کچھ بھی کہیں' وہ بات میں آپ کو اکیلے میں ہی بتاؤں گا۔ سر پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔"

امیر جان نے ہاشم کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پرکھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔ دوسری طرف دل میں یہ خیال بھی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا کہ آخر یہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ وہ کون سی بات ہو سکتی ہے جو وہ اسے صرف اکیلے میں ہی بتانے کی ضد کر رہا ہے۔ جبکہ وہ جانتا ہے کہ ان چاروں کے بیچ کوئی پردہ نہیں تھا۔

کافی دیر الجھے رہنے کے بعد وہ باقی تینوں سے مخاطب ہوا۔ "اگر یہ ایسا ہی چاہتا ہے تو آپ لوگ کچھ دیر کے لیے باہر چلیں جائیں پلیز۔"

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ امیر جان کے اس فیصلے سے ناخوش ہوں۔ لیکن امیر جان کا حکم مانتے ہوئے وہ تینوں ایک ساتھ باہر نکل گئے۔

❂❂❂❂

اسٹیشن سے نکلنے کے بعد بھی کاشف نے کافی دور تک اس لڑکے کا پیچھا کیا تھا لیکن اسے پکڑنے میں ناکام رہا۔ انجان شہر کی پتلی پتلی گلیوں میں وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کاشف کو انگوٹھی چھینے جانے کا بہت دکھ ہو رہا تھا۔اس لیے نہیں کہ انگوٹھی ہیرے کی تھی اور اسے مالی نقصان ہو گیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ مستقبل میں وہ انگوٹھی کیا کمال دکھاتی۔ اور یہ خیال اسے سگریٹ لائٹر اور ٹرین کے ٹکٹ سے آیا تھا۔

رات کے تین بج رہے تھے اور اسے سگریٹ کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ اگرچہ پارسل میں اس کا برانڈ موجود تھا لیکن اسے پینے میں مزا نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے وہ واپس اسٹیشن پر آ گیا۔

اسٹیشن کے پاس ایک کیبن سے اگرچہ اسے اپنے برانڈ کا سگریٹ نہیں ملا لیکن اس نے طلب پوری کرنے

کے لیے ایک پیکٹ لے لیا اور اتنی بے تابی سے سگریٹ پینے لگا جیسے دن بھر کے پیاسے کو اچانک پانی مل گیا ہو۔

پھر اس نے ایک اسٹال سے چائے اور بسکٹ کھا کر پیٹ کو بھی کچھ سہارا دیا اور پوچھنے پر پتہ لگا کہ اس جگہ کا نام جھمپیر ہے۔ وہ پلیٹ فارم پر لگی بینچ پر بیٹھ کر دوسری ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ اسے لاہور جانا تھا۔

مگر کیوں؟

یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ٹکٹ لاہور کا تھا تو شاید لاہور میں کچھ نہ کچھ ضرور ہونا ہوگا۔

صبح سے پہلے کوئی ٹرین نہیں تھی اور اسٹیشن پر بیٹھنا اسے خطرناک لگ رہا تھا۔

اچانک اس کے دماغ میں خیال کوندا کہ اب تک سی آئی اے والوں کو تو ضرور پتہ لگ گیا ہوگا کہ میں اس ٹرین میں بیٹھا ہوں۔ بائیک بھی کینٹ اسٹیشن کے باہر ملی ہوگی اور انہوں نے بھی تو پارسل میں ٹرین کا ٹکٹ دیکھا ہوگا اور ان کو بھی پتہ ہوگا کہ میں اسی ٹرین میں سفر کر رہا ہوں۔

چاہے یہ سب اتفاق ہی ہو لیکن وہ تو یہی سوچ رہے ہوں گے کہ میں یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے انہیں کسی طرح ٹرین میں ہونے والے واقعے کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا ہو۔

اوہ مائی گاڈ!

پھر تو وہ یہاں تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی اسٹیشن اسے سب سے زیادہ غیر محفوظ جگہ لگنے لگا اور وہ تیزی سے اٹھ کر باہر نکلا اور اس چھوٹے سے شہر کے بیچ پہنچ گیا۔ اور ایک سرائے نما ہوٹل میں جعلی نام سے ایک کمرہ لے کر بستر پر لیٹ گیا۔

مگر اس کا دماغ بے چین تھا' ذہن میں امیر جان کا چہرہ ابھر رہا تھا' اس کا دھوکا ابھر رہا تھا' ساتھ میں الوینہ بھی ابھر رہی تھی اور الوینہ کا خیال آتے ہی اس کے دماغ میں انیتا چکرانے لگی۔

انیتا ہی ایک ایسی کڑی تھی جو اسے الوینہ تک اور الوینہ کے ذریعے امیر جان تک پہنچا سکتی تھی۔ انیتا اپنی والدہ کے ساتھ رہتی تھی لیکن جب کاشف اس کے فلیٹ پر پہنچا تھا تو ان دونوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں اس وقت کہاں تھیں۔ کاشف کو اب ان کی فکر ہونے لگی تھی۔

اس کے دماغ نے مشورہ دیا کہ وہ فون کر کے ان کی خیریت تو معلوم کر ہی سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے پارسل کھول کر اس میں سے موبائل نکال کر دیکھا جو بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا اور سگنل بھی پورے آ رہے تھے۔ یہ کیا چکر ہے۔ کیا پارسل میں موبائل اسی مقصد سے رکھا گیا تھا؟ لیکن اس بات پر زیادہ سوچ بچار کر کے وقت ضائع کرنا بھی بے وقوفی تھی۔

اسے انیتا کا نمبر یاد تھا اس نے نمبر ملا کر فون کان سے لگا لیا۔ بیل جاتی رہی لیکن دوسری طرف سے ریسیو نہیں ہو رہا تھا۔ اب تو وہ اور بھی زیاہ فکر مند ہونے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ انیتا کی نیند تو اتنی کچی ہے کہ بلی کی میاؤں پر بھی جاگ جاتی تھی اور ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنا فون کہیں اور رکھ کر سو گئی ہو۔ پھر وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہی؟ اس نے کئی بار ری ڈائل کیا مگر نتیجہ صفر۔

پھر اس نے اپنے فلیٹ کا نمبر ملایا اور پہلی بیل پر فون ریسیو ہو گیا اور لال بخش اپنی عادت کے مطابق تیز آواز میں بولا۔

''ہیلو۔''

''لالو' میں بول رہا ہوں۔''

''اڑے سائیں۔ کہاں ہو آپ۔'' اس کی آواز ہی بتا رہی تھی کہ کاشف کی آواز سن کر وہ خوشی سے جھوم اٹھا تا۔

''کچھ دیر کا بول کے آپ پھر سے غائب ہو گئے۔ میں ابھی تک آپ کے انتظار میں ہی جاگ رہا ہوں۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔''

''لالو۔ اس وقت میں ایک کام میں الجھا ہوا ہوں۔ ہو سکتا ہے کئی دن تک نہ آ سکوں۔ تم فکر مت کرنا اور وقت پر کھانا کھا لیا کرنا۔''

''سائیں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ چار

سال بعد تو آئے اور۔"

"اس وقت میں نے تمہیں ایک خاص کام سے فون کیا ہے۔" کاشف نے لالو کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں دن میں انیتا کے گھر گیا تھا۔ وہاں کوئی نہیں ملا اور اب فون کر رہا ہوں تو کوئی اٹھا نہیں رہا۔ کیا تمہیں ان کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"وہ وہاں کیوں ملیں گے سائیں۔"

کسی انہونی کا سوچ کر کاشف اندر ہی اندر لرز سا گیا۔

"کیوں...... کیا ہوا؟"

"اس کی امی تو اب اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔"

"اوہ اور انیتا؟"

"اس کی تو شادی ہو گئی سائیں۔"

"ش...... شادی"؟" کاشف کو لگا جیسے کسی نے اس کے دل پر زور کا گھونسہ دے مارا ہو۔ حالانکہ اس کے اور انیتا کے بیچ ایسا کچھ نہیں تھا۔ بس اچھی دوستی تھی۔ اس کے باوجود اس خبر نے جانے کیوں اسے شاک سا پہنچایا تھا۔

جب کافی دیر تک لالو کو کوئی آواز نہیں سنائی دی تو بولا۔ "کیا ہوا سائیں؟"

"کک...... کچھ نہیں۔" وہ اپنے خشک ہوتے گلے کو تر کرتا ہوا بولا۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

"سائیں پچھلے سال کی تو بات ہے۔ اس کی شادی کے بعد ہی اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ جیسے وہ صرف اسی بات کے انتظار میں جی رہی ہو۔"

"تمہیں پتہ ہے کہ اس کی شادی کس کے ساتھ ہوئی ہے؟"

"مجھے سب پتہ ہے سائیں۔ ان کے شوہر کے نام عمران انصاری ہے۔ وہ مجھے اپنی شادی کا کارڈ خود دینے آئی تھی۔"

"اور اب شادی کے بعد وہ کہاں رہتی ہے؟"

"سائیں جب وہ آئی تھی تو اپنے سسرال کا پورا ایڈریس لکھ کر دے گئی تھی۔ کہہ گئی تھی کہ بھولے بھٹکے اگر تمہارے سائیں واپس آ جائیں تو کہنا کہ ایک بار ضرور مل لے۔"

"پتہ بتاؤ۔"

"ابھی بتاتا ہوں۔ یہیں ٹیبل کی دراز میں ہی رکھا ہوا ہے نوٹ کرو سائیں۔"

"ہاں بولو۔"

اور لال بخش نے اسے انیتا کا نیا پتہ لکھوا دیا۔

"کک...... کیا۔" پتہ سن کر کاشف اچھل پڑا۔ جیسے اسے ہزار وولٹ کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو۔

"جھمپیر ہی کہا ہے نا تم نے۔ ایک بار پھر دھیان سے پڑھو۔"

"سائیں صاف صاف جھمپیر ہی لکھا ہوا ہے۔"

"یہ تو کمال ہو گیا۔ اتفاق سے اس وقت میں بھی جھمپیر میں ہی ہوں۔"

"تب تو سائیں آپ انیتا میم صاحب سے مل کر ہی آنا۔ وہ بہت خوش ہو گی۔ اتنا ہی جتنا آپ کو دیکھ کر میں ہوا تھا۔"

"ضرور۔ ضرور ملوں گا۔" اس وقت وہ ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ یہ صرف اتفاق ہے یا انگوٹھی نے اپنا کمال دکھا دیا ہے۔ کہیں انگوٹھی کا کام اتنا ہی تو نہیں تھا کہ اسے انیتا تک پہنچا دے؟

❁❁❁❁

ان تینوں کے جانے کے بعد امیر جان اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اب بولو۔ کیا بات ہے؟"

"میں اس کہانی میں ایک بات گول کر گیا تھا۔" ہاشم ایک پراسرار مسکراہٹ سجائے ہوئے بولا۔

"آپ سمجھ تو گئے ہوں گے۔"

امیر جان کی تو کھوپڑی ناچ گئی۔

"کیا سمجھ گئے ہم؟"

ہاشم ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ امیر جان کا کوئی راز جانتا ہو۔

''آپ مجھ سے چھپانے کی کوشش مت کریں سر۔''

''تم سے' بھلا ہم تم سے کیا چھپانے کی کوشش کریں گے۔'' اس کا دماغ کھول رہا تھا کہ ایک اتنے نچلے درجے کا ملازم اس کے ساتھ ایسے انداز میں بات کر رہا تھا۔ آج تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی اس کے ساتھ ایسے انداز میں بات کرنے کی۔

''دماغ تو ٹھکانے پر ہے تمہارا۔''

''میرا دماغ اپنے ٹھکانے پر ہے سر۔'' ہاشم پھر اسی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''اسی لیے تو ان تینوں کو باہر نکلوا دیا۔ کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ آپ ان سے یہ بات چھپانا چاہتے ہیں۔''

امیر جان نے غصے سے کہا۔

''ہم کیا چھپا رہے ہیں۔ اگر اب تم نے صاف صاف لفظوں میں نہیں کہا تو ہم تمہارا سر پھوڑ دیں گے۔''

''سر۔ اگر آپ صاف لفظوں میں سننا چاہتے ہیں تو سمجھ تو آپ تب ہی گئے ہوں گے جب میں نے کاشف کے اکاؤنٹ سے رقم غائب ہونے کی بات کی تھی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھ سے کیا پردہ کر رہے ہیں آپ۔ آپ کو سمجھ جانا چاہئے کہ جب مجھے ساری بات پتہ لگ گئی ہے تو کیا یہ پتہ نہیں لگا ہوگا کہ کاشف کے اکاؤنٹ سے رقم آپ نے ہی نکالی ہے۔''

''ہم' ہم نے نکالی ہے وہ رقم۔ یہ کیا بک رہے ہو تم؟'' امیر جان حلق پھاڑ کر چیخا۔

''پلیز سر۔'' ہاشم زہریلے انداز میں مسکرایا۔

''آپ میرے ساتھ ناٹک مت کریں۔ مجھے سب پتہ ہے۔''

اب امیر جان ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھا اور ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور نزدیک آتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے ہاشم کا گریبان پکڑ لیا اور جنونی انداز میں اسے کرسی سے اٹھاتے ہوئے خونخوار لہجے میں بولا۔

''تیرے ساتھ ناٹک کریں گے ہم' تیری اوقات ہی کیا ہے' لگتا ہے کھوپڑی نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے' تم سے کس نے کہا کہ کاشف کے اکاؤنٹ سے رقم ہم نے نکالی ہے؟''

اسے غصے میں دیکھ کر ہاشم کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ بات بھی آ رہی تھی کہ کہیں وہ اس بارے میں غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہو گیا۔ وہ تو اس بات کا رازدار بن کر امیر جان کو بلیک میل کرنے کے چکر میں تھا' اب اس کے کڑے تیور کافور ہو رہے تھے اور اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پا رہا تھا۔

''جواب کیوں نہیں دیتے۔ تم کو کس نے بتائی یہ بات؟'' امیر جان پھر چیخا۔

''اس' اسی معراج نے۔''

''کیا کہا تھا اس نے؟''

''یہی کہ سی آئی اے والے یہ بھی پتہ لگا چکے ہیں کہ انٹرنیٹ کے ذریعے وہ رقم آپ کے اکاؤنٹ میں گئی ہے۔''

''اور تم نے یقین کر لیا۔''

''یقین نہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہے سر۔'' وہ اپنی جان بچانے کے لیے بڑی مشکل سے بول پا رہا تھا۔

''چیف نے کاشف کو باقاعدہ ایچ ڈی ایف سی بینک کا لیٹر دکھایا تھا' اس میں صاف لکھا تھا کہ جس اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر ہوئی ہے وہ آپ کا ہے۔''

یہ سن کر امیر جان سناٹے میں آ گیا۔ کچھ دیر تک وہ تو ہکا بکا ہاشم کو دیکھتا رہا۔ پھر گلا پھاڑ کر چلایا۔ ''یہ بات تم نے اسی وقت کیوں نہیں بتائی؟''

''میں نے سوچا کہ رقم غائب ہونے کی بات سنتے ہی آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن آپ حیرت کا اظہار کر رہے تھے تو مجھے لگا کہ آپ ان سے یہ بات چھپانا چاہتے ہیں۔ اس لیے آپ کا وفادار ملازم ہونے کے ناتے یہ میرا فرض تھا کہ میں بھی ان سے یہ بات چھپاؤں۔''

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

ردوبدل

حسن اختر

جنگ عظیم دوم نے یورپ کو اخلاق کی پستیوں میں گرا دیا تھا۔ انگلینڈ کی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی خواتین ویشیا کی سطح پر آگئی تھیں۔
اسی ماحول میں جنم لینے والی ایک کہانی' ایک ذہین سراغ رساں کی چال بازیوں کا احوال

کیلہن آتش دان کے پاس کھڑا مسز گیلیری کی طرف دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جن پر ماہ و سال اثر انداز نہیں ہوتے جو سدا بہار رہتی ہیں اور پچاس سال کی عمر میں بھی اتنی ہی پر کشش نظر آتی ہیں۔ جتنی پچیس سال کی عمر میں رہی تھیں۔

مسز گیلیری نے بڑے تمکنت سے اسے سگار بکس پیش کیا اور شیری کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

''میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسٹر کیلہن! مجھے ڈیانا کی فکر ہے وہ ابھی صرف چوبیس سال کی ہوئی ہے اور اسے زمانے کی اونچ نیچ کا کوئی علم نہیں ہے۔ اس کی کل کائنات لے دے کر ایک نیکلس ہے جو اس کی مرحوم ماں میرے پاس امانت چھوڑ گئی تھی۔''

''اس کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟'' کیلہن نے پوچھا۔

''تھوڑی بہت رقم اس کے پاس رہ گئی ہے۔'' مسز گیلیری نے جواب دیا۔

''تین ماہ پہلے اس کے بینک اکاؤنٹ میں تین ہزار پاؤنڈ تھے ہمارا نوجوان دوست پال اس رقم کا بیشتر حصہ ہضم کر چکا ہے۔ ڈیانا اس کے پیچھے دیوانی ہو رہی ہے۔ میں نے اسے سمجھایا بھی کہ وہ کئی عورتوں کو الو بنا چکا ہے لیکن اس پر میری بات کا اثر نہ ہوا۔''

''آپ شاید کہنا چاہتی ہیں کہ پال کی نظر اب اس نیکلس پر ہے۔'' کیلہن نے بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے کہا۔

''بالکل یہی بات۔'' مسز گیلیری بولی۔ ''جب ڈیانا میرے پیچھے پڑ گئی کہ میں نیکلس بینک کے لاکر سے لا کر اسے دے دوں تو میں ایک گھنٹے تک اس سے سر کھپاتی رہی کہ اس کے سرپرست ہونے کے ناتے نیکلس کو اس وقت تک اپنی تحویل میں رکھوں گی جب تک وہ پچیس سال کی نہیں ہو جاتی۔ اس کی ماں نے یہی وصیت کی تھی۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ اسے پال سے متعارف کرا کر پچھتا رہی ہوں اور اب اسے پال کے جال سے بچانا میرا فرض ہے اور میں یہ فرض ادا کروں گی اس پر وہ بپھر کر بولی کہ پال اب ایک پالتو جانور کی طرح میرے سامنے دم نہیں ہلاتا اور اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس لیے میں اس کے خلاف ہو گئی ہوں میں سچ کہتی ہوں مسٹر کیلہن پال نے اس لڑکی پر جادو کر دیا ہے۔''

''کیا آپ کے دل میں نیکلس اسے دے دینے کا خیال تھا۔'' کیلہن نے پوچھا۔

''کیوں نہیں، چند ہی ماہ میں وہ اس کی حق دار بننے والی تھی۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تم ڈیانا اور پال دونوں پر نظر رکھو میرے خیال میں اگر پال کے ماضی کو کریدا جائے تو بہت کچھ انکشاف ہو سکتا ہے۔''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں لڑکی سے کچھ باتیں کر لوں؟'' کیلہن نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے میں اس

کے خیالات بدل سکوں۔"

"کوشش کر دیکھو، میں تمہاری کامیابی کی دعا کروں گی۔" مسز گیلیری نے جواب دیا۔

کیلہن رخصت ہوا تو مسز گیلیری اسے دروازے تک چھوڑنے آئی اور اس کے کپڑوں سے اٹھتی ہوئی مہک دور تک کیلہن کا پیچھا کرتی رہی۔

ڈیانا، مسز گیلیری کے گھر سے کوئی تین میل دور ایک فیشن ایبل علاقے کے خوش نما فلیٹ میں رہتی تھی کیلہن اس سے ملنے گیا تو وہ غم زدہ اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ روتی رہی ہو۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔

"میرے خیال میں مسز گیلیری نے تمہیں بھیجا ہے۔" وہ کہنے لگی۔

"اب آ گئے ہو تو شاید تم میری کچھ مدد کر سکو۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔" کیلہن نے کہا۔

"میرا نام کیلہن ہے اور میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں ابھی کوئی بیس منٹ پہلے میری ملاقات مسز گیلیری کے ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہاری ماں کا نیکلس تمہیں وقت سے پہلے دے دیا گیا ہے اور تمہارا دوست پال اسے تم سے ہتھیانے کی فکر میں ہے۔"

"تو مسز گیلیری نے تمہیں رات کا واقعہ نہیں بتایا؟" ڈیانا نے حیرت سے کہا۔ پھر خود ہی بولی۔ "میں نے انہیں صرف پانچ منٹ پہلے ہی تو بتایا ہے تم وہاں سے چل پڑے ہو گے۔"

"کیا ہوا تھا رات؟" کیلہن نے پوچھا۔

"نیکلس چوری ہو گیا۔" ڈیانا حسرت سے بولی۔ "یقیناً تم اور مسز گیلیری دونوں یہی کہو گے کہ اسے پال نے چرایا ہے تم اسے ثابت کرنے کی بھی کوشش کرو گے کیونکہ فلیٹ کی ایک چابی اس کے پاس بھی رہتی ہے۔ تم لوگ کہو گے تو وہ رات کو آیا اور نیکلس نکال لے گیا۔"

"ذرا ایک منٹ مس ڈیانا! اطمینان سے میری بات سنو۔" کیلہن نے شفقت سے کہا۔ "میں ثبوت کے بغیر کسی پر الزام نہیں لگاتا یہ بتاؤ کہ نیکلس رات کو ہوائی حملے سے پہلے چوری ہوا ہے یا اس کے بعد؟"

"ہوائی حملے کے دوران میں ہوا ہے۔" ڈیانا نے جواب دیا۔

"وہ اس تصویر کے پیچھے ایک چھوٹی سی دیوار گیر تجوری میں تھا حملہ ہوا تو میں گھبراہٹ میں کمرہ کھلا چھوڑ گئی۔"

"کہاں گئی تھیں؟" کیلہن نے پوچھا۔

"نیچے زمین دوز پناہ گاہ میں۔" ڈیانا نے بتایا۔

"اور تمہیں اس کے غائب ہونے کا علم کب ہوا؟" کیلہن نے پھر سوال کیا۔

"ابھی پندرہ منٹ ہوئے۔" ڈیانا نے جواب دیا۔ "لیکن یہ کہے دیتی ہوں کہ اگر تم نے پال کو صرف اس بنا پر پھانسنے کی کوشش کی کہ وہ فرانسیسی ہے اور اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے تو سمجھ لو کہ......!" کیلہن کی مسکراہٹ نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔

اس نے کہا۔

"اگر تم چاہو گی تو اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ نیکلس تمہاری ملکیت ہے اور صرف تم ہی قانونی چارہ جوئی کر سکتی ہو اچھا یہ بتاؤ کل رات وہ یہاں آیا تھا؟"

"میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی البتہ چوکیدار کہتا ہے کہ حملے کا سائرن بجنے کے بعد شاید اس نے پال کو زینہ چڑھتے دیکھا تھا پھر اس نے مین سوئچ بند کر دیا اور اندھیرا ہو گیا۔" ڈیانا نے بتایا۔

"دیکھا اگر تمہیں یقین ہے کہ نیکلس پال نے نہیں چرایا تو کیوں نہ معاملہ پولیس کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔" کیلہن نے کہا۔

ڈیانا غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چیخ کر بولی۔ "میں نہیں چاہتی کہ پولیس کو درمیان میں گھسیٹا جائے۔"

"بہت اچھا تو میں ایک دوسرے طریقے سے کام کرتا ہوں۔" کیلہن نے کہا۔

"تم کیا کرو گے؟" ڈیانا نے تمتمائے ہوئے چہرے سے کہا۔

"میں پال سے ملوں گا مسز گیلیری نے مجھے اس کا پتا دے رکھا ہے میں تمہارے اس فرانسیسی دوست سے چند باتیں کروں گا۔" کیلہن اٹھ کھڑا ہوا۔

❖......⌘......❖

پال لیفٹیننٹ کی وردی میں بہت جچ رہا تھا۔ کیلہن دل میں اس کی وجاہت اور پرکشش شخصیت کا قائل ہوگیا۔ اس کی انگریزی بہت صاف تھی اور انداز بھی مہذبانہ تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے مس ڈیانا کا نیکلس چوری ہونے کا شدید صدمہ ہے اور مجھے کوئی حیرت بھی ہو رہی کہ شبہ مجھ پر کیا جا رہا ہے۔"

"اس شبے کی معقول وجوہ بھی ہیں۔" کیلہن نے کہا۔ "تمہارے پاس مس ڈیانا کے فلیٹ کی چابی بھی ہے اور بلڈنگ کے چوکیدار نے حملے کے دوران تمہیں زینہ چڑھتے بھی دیکھا ہے۔"

پال ہنس کر کہنے لگا۔ "رات خطرے کا سائرن بجنے سے پہلے حملے کے دوران میں اور اس کے ایک گھنٹے بعد تک میں اپنے ہیڈ کوارٹر میں تھا تیس چالیس آدمی اس بات کے گواہ ہیں آپ جا کر مسز گیلیری کو یہ بتا دیں۔"

"اگر اس سے تمہاری گلو خلاصی ہوتی ہے تو میں تمہارا مزید وقت ضائع نہیں کروں گا۔" کیلہن نے جیب سے فاؤنٹین پین نکالتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا فون نمبر پوچھ سکتا ہوں؟"

پال نے اسے نمبر دیا وہ اسے ڈائری میں نوٹ کر رہا تھا۔ "روشنائی کے چھینٹے پال کی سفید، بے داغ وردی پر پڑ گئے۔ کیلہن نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"معاف کرنا...... میں بے حد شرمندہ ہوں۔" کیلہن نے معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں۔" پال فراخدلی سے مسکرایا۔ "دھل جائے گی۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک اور وردی ہے۔"

ہیرے لوگ سنہرے بول

❖ خاموشی کو اپنا شعار بناؤ تاکہ زبان کے شر سے محفوظ رہ سکو۔ (افلاطون)

❖ شروع کرنا تیرا کام، تکمیل کرنا خدا کا کام ہے۔ (حضرت عبدالقادر جیلانی)

❖ جذبات کے بغیر تاریخ، شاعری، آرٹ اور محبت بے معنی الفاظ ہیں۔ (بالزاک)

❖ کوئی بھی چیز مفت میں ایسے نہیں ملتی جیسے نصیحت۔ (ڈک ڈی آنا)

❖ قسمت ملکیت کے طور پر نہیں آزمائش کے طور پر تمہارے پاس آتی ہے۔ (رابن مور)

❖ آپ خود کو دیانتدار بنا کر یہ یقین کرلیں کہ دنیا میں ایک بے ایمان کی کمی ہوگئی ہے۔ (کارلائیل)

❖ مصیبت سب کے لیے بہترین کسوٹی ہے جس پر یار دوست پرکھے جاتے ہیں۔ (تلسی داس)

❖ جو شخص محنتی، ذہین، ایماندار اور پُرجوش ہے اسے زندگی سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ (گولڈوین)

طاہر بٹ...... لاہور

کیلہن زیرلب مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اپنے دفتر پہنچ کر اس نے مسز گیلیری کو فون کیا اور بتایا کہ ڈیانا کی زبانی اسے نیکلس چوری ہو جانے کا علم ہوا ہے۔ پھر یہ بھی بتایا کہ وہ پال سے ملا تھا اور اس کا خیال ہے کہ پال نے یہ حرکت نہیں کی وہ بے قصور ہے۔

''اچھا؟'' مسز گیلیری نے کہا تو اس کے لہجے سے مسرت صاف جھلک رہی تھی۔ ''اب تم کیا کرنے والے ہو؟''

''ابھی سوچوں گا۔'' کیلہن نے کہا۔ ''شاید شام کو آپ سے ملنے آؤں۔'' ریسیور رکھ کر وہ سوچنے لگا کہ پال کو بے قصور ٹھہرائے جانے پر مسز گیلیری کو خوشی کیوں ہوئی تھی؟ معاً اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی اور وہ ٹیلیفون پر پال کا نمبر ملانے لگا۔

''میں نے معذرت کرنے کے لیے تمہیں زحمت دی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور مسز گیلیری کو بتا بھی دیا ہے کہ تم بے قصور ہو تمہاری طرف سے ان کا دل صاف کرنے کے لیے کیا بہتر نہ ہوگا کہ تم شام کو ان کے ہاں آجاؤ۔''

''بڑی خوشی سے آؤں گا جناب۔'' پال نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

کیلہن، مسز گیلیری کے خوش ہونے پر مسکرایا تھا اور اب پال کے اظہار مسرت پر قہقہے لگانے لگا۔

شام کو وہ ساڑھے سات بجے مسز گیلیری کے ہاں پہنچا تو پال پہلے سے موجود تھا۔ مسز گیلیری بھڑکیلے لباس میں حسن و رعنائی کا توبہ شکن پیکر نظر آرہی تھی۔ اس کے انداز و اطوار سے مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ خوب چہک رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کیلہن نے سب سے پہلے پال کی وردی کی طرف دیکھا۔

''میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں مسٹر کیلہن!'' مسز گیلیری اور پال دونوں منہ کھولے اسے دیکھنے لگے۔

''تم نے وردی نہیں بدلی لیفٹیننٹ۔'' کیلہن نے اس کی وردی پر پڑے ہوئے روشنائی کے چھینٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا تمہاری دوسری وردی کہاں ہے؟''

پال پیچ و تاب کھاتا ہوا کرسی سے اٹھنے لگا تو کیلہن نے اسے اشارے سے بیٹھ جانے کو کہا اور مسز گیلیری سے مخاطب ہوا۔

''تم نے بڑی لاجواب اسکیم تیار کی۔ پال کو ڈیانا سے متعارف کرا کر اس کے پیچھے لگا دیا تا کہ اس کے بینک بیلنس سے تم دونوں گل چھرے اڑاتے رہو۔ واردات کے لیے تم پال کی دوسری وردی پہن کر ڈیانا کے گھر گئیں۔ تم جانتی تھیں کہ ہوائی حملے کی افراتفری اور اندھیرے کی وجہ سے کوئی تمہیں غور سے نہیں دیکھے گا اور تم نے آسانی سے نیکلس پار کر لیا۔ تم نے پال کو مشتبہ اس لیے ٹھہرایا کہ تم پر کوئی شبہ نہ گزرے اور پھر جب یہ خود کو بے قصور ثابت کر دے گا تو اس کا دامن بھی صاف ہو جائے گا۔ اس طرح تم دونوں نیکلس مزے سے ہڑپ کر جاؤ گے۔ مسز گیلیری اب تو پال کو اس کی وردی واپس کر دو۔''

آخری چوری

امجد بخاری

اندھیرے اور تاریکی کی اپنی ایک داستان اور دنیا ہوتی ہے اس کی کوکھ میں جانے کتنی کہانیاں اور گناہ جنم لیتے ہیں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید تاریکی میں کیے جانے والے جرائم تاریکی کا ہی حصہ بن جاتے ہیں لیکن ایسا ہوتا نہیں۔

ایک چور کا قضیہ، وہ رات کی تاریکی کو اپنا دوست قرار دیتا تھا لیکن ایک روز اسی تاریکی نے اسے نگل لیا۔

گہری تاریکی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا شہر فراعینِ مصر کے کسی قدیم اہرام کی مانند بالکل بے جان اور بے روح دکھائی دے رہا تھا۔ رات کے تقریباً ڈھائی بج رہے تھے اور چاروں طرف ہو کا عالم تھا' یوں لگتا تھا جیسے پورے شہر میں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو' ایسے عالم میں تن تنہا سڑک پر چلتا ہوا وہ پراسرار وجود اگر کسی کی نظروں کے احاطے میں آ بھی جاتا تو وہ اسے بھوت ہی تصور کرتا۔ وہ چوکنے انداز میں اردگرد دیکھتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ رات کا یہ پہر دن بھر کے تھکے ہارے لوگوں کے لیے بے ہوشی کی نیند کے علاوہ اور کوئی تحفہ دینے کے قابل ہرگز نہیں تھا سو شاید اس شہر کے تمام مکین اس وقت خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے لیکن وہ شخص جو گہری سیاہ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک پر محو سفر تھا' وہ خود بھی گہرے سیاہ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھا جو اندھیرے کا حصہ بن کر رہ گئے تھے اور وہ محض ایک ہیولے کی صورت میں آگے بڑھتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ اس وقت سناٹے کا سینہ چیرتی ہوئی بڑی عجیب محسوس ہو رہی تھی۔ گنجان آباد علاقے میں داخل ہونے کے بعد جوں ہی اس نے ایک گلی میں داخل ہونے کی کوشش کی ایک خوف ناک آواز نے اس کے قدموں کو منجمد کر دیا۔ اس نے چونک کر آواز کی سمت نظریں اٹھائیں تو اندھیرے میں چمکتے ہوئے دو روشن چراغ بالکل سامنے دکھائی دیے۔ خوف کی ایک شدید لہر اس کے رگ و پے میں سرائیت کرتی چلی گئی ٹھیک اسی لمحے اندھیرے میں آویزاں دونوں چراغوں کے زاویے میں تبدیلی نمودار ہوئی اور پھر دل دہلا دینے والی غراہٹوں کی آواز کے ساتھ وہ چراغ جیسے فضا میں پرواز کرتے ہوئے تیزی سے اس کی جانب بڑھے' وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں جلدی سے زمین پر بیٹھ گیا اور چراغوں کی زد میں آنے سے بال بال محفوظ رہا' اس کے حلق سے میکانکی انداز میں ایک کھگھیاتی ہوئی سی بے ساختہ آواز نمودار ہوئی۔

''ب...... بھائی...... میں تو اپنے راستے جا رہا ہوں میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ اللہ کا نام مانو یار! خوامخواہ کیوں دشمنی پر آمادہ ہو؟ اور بات جیسے اس کی سمجھ میں آ گئی کیوں کہ دوسرے ہی لمحے اس کی غراہٹوں کے انداز میں تبدیلی نمودار ہوئی اور ساتھ ہی چراغوں کا رخ بھی تبدیل ہو گیا۔ لیکن ایسا اس کے بے ساختہ جملے کی وجہ سے نہیں بلکہ قریب ہی گونجنے والی ''میاؤں'' کی سہمی ہوئی آواز کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کی خوف ناک غراہٹوں سے یقیناً اس معصوم بلی کی نیند میں خلل پڑا تھا اور پھر سامنے ہی نظر آنے والے اس دہشت ناک منظر نے اسے اس حد تک خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ اپنی آواز پر قابو نہ پا سکی

اور پھر وہ ایک بند دکان کے سامنے رکھے لکڑی کے اس تخت پوش کے نیچے سے نکل بھاگی لیکن اس کا ایسا کرنا اسے ایک نئے عذاب میں مبتلا کر گیا کیوں کہ دونوں روشن چراغ جو یقیناً اس جسیم اور خطرناک کتے کی اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھیں تھیں وہ اب جیسے فضا میں پرواز کرتے ہوئے بلی کے تعاقب میں تھیں۔ وہ ایک طویل سانس لیتے ہوئے زمین پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر آنے والی مصیبت بے چاری بلی نے اپنے سر لے لی تھی اور وہ اس بات پر کلمہ شکر بجالاتے ہوئے تقریباً دوڑتے ہوئے آگے کی جانب بڑھ گیا۔ خاصی دیر کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ وہ کتے کی پہنچ سے محفوظ ہو چکا ہے تب اس کی رفتار معمول پر آگئی۔ چند لمحے ایک جگہ رک کر اس نے اپنی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی پھر وہ دوبارہ آگے بڑھنے لگا لیکن اب اس کی رفتار خاصی حد تک نارمل تھی۔ گلی کا اختتام ہو گیا اور پھر مکانات کی دو رویہ قطاریں بھی بہت پیچھے رہ گئیں اب اس کے سامنے چھوٹی چھوٹی چار دیواری میں مقید خالی پلاٹوں کا ایک طویل سلسلہ تھا لیکن شاید ابھی اس کی منزل نہیں آئی تھی کیوں کہ وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر تک اس کا یہ سفر جاری رہا پھر اس کے قدموں کی رفتار سست پڑنے لگی۔ اب اس کی نظریں وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے خالی پلاٹوں کے اس عظیم الشان سلسلے کے عین وسط میں کھڑے اس تن تنہا مکان پر جمی ہوئی تھیں جو اپنی بناوٹ کے انداز سے چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ مکان کسی انتہائی مال دار شخص کی ملکیت ہے۔ وہ آہستہ قدمی سے چلتا ہوا مکان کے بالکل قریب پہنچ گیا اور پھر مکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے کی جانب بڑھنے لگا' اب وہ گھوم کر مکان کے سامنے والے حصے پر آن پہنچا تھا۔ مکان کا بڑا سا آہنی دروازہ بند نظر آ رہا تھا اور باہر لٹکتے ہوئے قفل کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ گھر کے مکین گھر میں موجود نہیں ہیں۔ اندھیرے میں چمکتے ہوئے اس کے سفید سفید دانت چند لمحوں کے لیے فضا میں لہرائے، شاید وہ ہنس رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر قفل کو ہاتھ میں لیا، الٹ پلٹ کر اس کا جائزہ لیا پھر آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ مکان کے گرد تقریباً دو چکر مکمل کرنے کے بعد وہ ایک جگہ رک کر دیوار پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر چہرہ اوپر اٹھا کر یوں دیکھنے لگا جیسے دیوار کی اونچائی کا اندازہ لگا رہا ہو پھر اس نے اپنی شرٹ کے بٹن کھولنا شروع کر دیے، شرٹ اتار کر ایک جانب رکھی، اب وہ اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی رسی کے بل کھول رہا تھا چند ہی لمحوں میں وہ رسی کی کمند بنانے کے بعد اسے دیوار کے دوسری جانب پھینک کر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب وہ دیوار میں اٹکی ہوئی رسی کو کھینچ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ لگا رہا تھا پھر مطمئن انداز میں سر ہلانے کے بعد شرٹ اٹھا کر واپس پہنی اور اپنی جیبیں تھپ تھپانے لگا۔ کچھ ہی دیر کے بعد جب اس کا ایک ہاتھ جیب میں داخل ہونے کے بعد واپس برآمد ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پینسل ٹارچ دبی ہوئی تھی۔ اس نے ٹارچ جلا کر دیوار پر نظر آنے والے اس کے ہالے پر نظر ڈالی، تمام تر اطمینان کے بعد اس نے ٹارچ بند کی اور اسے اپنے دانتوں میں دبانے کے بعد دونوں ہاتھوں میں رسی کو مضبوطی سے تھامے کسی بندر کی سی پھرتی اور تیز رفتاری کے ساتھ دیوار پر چڑھتا چلا گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ دیوار پر بیٹھا گہری گہری سانسیں

لے رہا تھا۔ حواس ذرا اعتدال پر آئے تو اس نے مزید آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ چند لمحے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صحن کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا پھر دونوں ہاتھ دیوار پر جما کر فضا میں لٹک گیا، ایک لحظے کے لیے اس نے اپنے وجود کو تولا اور پھر دیوار کو ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ چند ہی ساعتوں کے بعد اس کا وجود جیسے اڑتا ہوا دھپ کی آواز کے ساتھ زمین پر آ رہا لیکن اس کے نتیجے میں سنائی دینے والی ''اوغ ......'' کی تیز آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے اور وہ گھبرا کر کئی قدم پیچھے کی جانب ہٹ گیا۔ جو ہوا تھا وہ شاید اس کی توقع کے بھی خلاف تھا کیوں کہ اس کے قدم سخت اور ٹھوس زمین سے ٹکرانے کے بجائے کسی لج لجے وجود سے جا الجھے تھے اور یہی نہیں ''اوغ'' کی ایک عجیب و غریب آواز نے بھی اس کی سماعتوں کو مجروح کر ڈالا تھا۔ اسی بدحواسی کے عالم میں ٹارچ کب اس کے منہ سے نکل کر ہاتھ تک پہنچی اس کا اندازہ اسے بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے بجلی کی سی پھرتی سے ٹارچ روشن کی اور پھر اس کی لپ لپاتی روشنی کے احاطے میں وہ عجیب الخلقت وجود واضح ہوتا چلا گیا۔

جھاڑ جھنکاڑ سفید داڑھی، جسم پر پیروں تک لمبا اوور کوٹ جس پر جگہ جگہ لگے ہوئے پیوند صاف نظر آ رہے تھے، سر پر ایک پھٹا پرانا لیکن پیشانی تک جھکا ہوا فلیٹ ہیٹ اور زمین پر بچھا ہوا بوری نما وہ ٹاٹ جس کے اوپر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبائے کھڑا تھا۔ فضا میں کسی جیٹ طیارے کی مانند پرواز کرنے کے بعد اس کے وجود نے یقیناً اس مجہول صورت بوڑھے کے کمزور جسم پر لینڈ کیا تھا جو اپنی وضع قطع اور حلیے کے اعتبار سے کوئی بھکاری دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا مکمل جائزہ لینے کے دوران اس کے حواس قدرے بحال ہو گئے تو اس کا داہنا ہاتھ بے اختیار پینٹ میں اڑسے ہوئے اپنے اس خوفناک دوست تک جا پہنچا جو ایسے لمحات میں اس کا بہترین ساتھی ثابت ہوتا تھا اور پھر اگلے ہی لمحے ریوالور کی اکلوتی آنکھ بوڑھے کو خطرناک انداز میں گھور رہی تھی۔ اب وہ مکمل طور پر با اعتماد دکھائی دے رہا تھا کیوں کہ بوڑھے کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ٹارچ کی دھیمی اور مدقوق روشنی کی لپلپاتی زبان نے بوڑھے کے ساتھ ساتھ اردگرد کے ماحول پر چھائے ہوئے اندھیرے کو چاٹ کر اسے یہ بھی بہ خوبی باور کروا دیا تھا کہ عمارت میں بوڑھے کے علاوہ اور کوئی ذی نفس موجود نہیں ہے، سو اس کا اعتماد بحال ہونا ایک فطری عمل تھا۔ چند لمحے ماحول گہرے سکوت اور خاموشی کی گرفت میں پھڑ پھڑاتا رہا پھر اس کی سسکارتی ہوئی سی غراہٹ آمیز آواز بلند ہوئی تو اس کا مخاطب یقیناً وہی بوڑھا شخص تھا۔

''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' جواب میں چند لمحے کی تاخیر ہوئی تو وہ دوبارہ ڈپٹ کر بولا۔

''کیا پوچھ رہا ہوں میں' سنا نہیں کیا' کون ہو تم؟'' بوڑھے نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر برا سا منہ بنا کر کراہتے ہوئے بولا۔

''بلائے ناگہانی کی طرح آسمان سے تم نازل ہوئے ہو اور پوچھ مجھ سے رہے ہو کہ میں کون ہوں؟ پوچھنا تو مجھے چاہیے کہ بھائی تم کون ہو اور میرے پیٹ پر لات مارنے کا حق آخر تمہیں کس نے دیا ہے؟'' بوڑھے کا جواب اور انداز دونوں ہی خاصے مضحکہ خیز تھے لیکن ظاہر ہے کہ وہ بوڑھے کی باتوں سے محظوظ ہونے نہیں آیا تھا بلکہ اس کو بوڑھے پر شدید غصہ آ رہا تھا کہ اس خالی مکان میں آخر وہ موجود

ہی کیوں ہے؟ سوائے تمام تر غصے کا اظہار اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ میں شامل تھا۔

''بکواس بند کرو، سیدھی طرح اگل دو کہ کون ہو تم اور یہاں کیوں موجود ہو ورنہ برا پیش آؤں گا۔'' لیکن بوڑھا بھی عجیب ہی ڈھیٹ واقع ہوا تھا کہ اس کے الفاظ اور غصے سے متاثر ہوئے بغیر دوبارہ اسی ٹون میں بولا۔

''برا تو تم پیش آ چکے، میرے پیٹ کا کچومر تو نکال دیا اور کیا برا پیش آؤ گے، کتنی عجیب بات ہے کہ ایک نامعلوم شخص دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوتا ہے اور گھر کے مکین سے ہی سوال کرتا ہے کہ تم کون ہو، ہے نا عجیب بات؟'' بوڑھا جواب خاصی حد تک سنبھل چکا تھا اور شاید پیٹ کی تکلیف میں بھی افاقہ محسوس کر رہا تھا اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اب بغور اس کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی دھیمی مگر غراتی ہوئی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔

''زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ، اپنا حلیہ دیکھو، بات عجیب لیکن تم غریب ہو، تمہیں اس گھر کا مکین ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ رہی بات میری تو میں چاہے دیوار پھاند کر آؤں یا سرنگ کھود کر۔ پستول میرے ہاتھ میں ہے اس لیے سوال کرنے کا حق بھی میرا ہے۔'' بوڑھے نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی پھر سمجھ داری کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ چلو تمہیں تمہاری مرضی کا جواب دیتا ہوں۔ میں ایک بھکاری ہوں اور یہاں سو رہا تھا۔ میں نے تمہاری بات کا جواب دے دیا ہے اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟'' بوڑھے کی بات سن کر وہ دھیرے سے ہنسا پھر طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔

''اب آئے نہ لائن پر، ویسے تو بڑے افلاطون بنتے ہو لیکن میرا دیوار پھاند کر آنا اور پھر اپنے اوپر تنے ہوئے پستول کو دیکھ کر بھی تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ میں کون ہوں۔ چچ ..... چچ.....چچ.....'' اس نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''چلو بڈھے! تم بھی کیا یاد کرو گے میں بھی بتا ہی دیتا ہوں کہ میں ایک چور ہوں اور ظاہر ہے یہاں چوری کرنے آیا ہوں، اب تم جلدی اور سیدھے طریقے سے بتا دو کہ اس گھر کے مکین کہاں ہیں، کیا تم ان سے واقف ہو؟'' جواباً بوڑھا بھی دھیرے سے ہنسا پھر اپنے اسی مخصوص انداز میں بولا۔

''ویسے تو میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں کیوں کہ تم دیوار کے راستے آئے ہو لیکن اب تم آ ہی گئے ہو تو اس گھر میں مہمان ہو اور کیوں کہ میں یہاں پہلے سے موجود ہوں اس لیے میں خود بخود تمہارا میزبان کہلاؤں گا۔ اب مہمانوں کا اتنا حق تو بنتا ہی ہے کہ ان کے کچھ سوالوں کا جواب دے دیا جائے۔ تمہارا پہلا سوال یہ تھا کہ اس گھر کے مکین کہاں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گھر میں میرے علاوہ کوئی موجود نہیں ہے۔ رہی تمہاری دوسری بات کہ کیا میں اس گھر کے مکینوں سے واقف ہوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گھر کے مکین تو کیا میں اس گھر کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ اب تم بتاؤ کہ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' پستول بردار شخص نے بوڑھے کی طویل تقریر کو خاموشی سے سنا پھر اس کی کرخت آواز سنائی دی۔

''زیادہ وضع داری کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تم جیسے فقیروں کو بخوبی جانتا ہوں جو خالی گھروں میں گھس کر ہم سے پہلے ہی ان کا صفایا کر

ڈالتے ہیں، ایک بات کان کھول کر سن لو کہ اگر اس گھر سے میرے ہاتھ کچھ نہیں لگا تو میں کم از کم تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا یہ بات کر کے تم نے اپنی مصیبت کو خود دعوت دے ڈالی ہے کہ تم اس گھر کے چپے چپے سے واقف ہو اگر ایسا ہے تو پھر یقیناً تم اس بات سے بھی واقف ہو گے کہ گھر کے مالک نے اپنی دولت اور روپیہ پیسہ کہاں چھپا رکھا ہے اب تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم خاموشی سے مجھے اس مقام تک لے جاؤ سمجھے۔" بوڑھا ایک بار پھر دھیرے سے ہنسا اور بولا۔

"بڑے ہی ضدی اور ناسمجھ چور ہو چلو تمہاری یہ بات بھی مان لیتا ہوں تا کہ کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ فیضو فقیر مہمانوں کی عزت نہیں کرتا۔ آؤ میرے ساتھ۔" اور پھر پلٹ کر گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ پستول بردار شخص بھی چوکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کے تعاقب میں تھا۔ بوڑھا چلتے چلتے اندرونی حصے کے مرکزی دروازے پر رکا اور پھر دروازے کی کنڈی ہٹا کر دروازہ کھولنے لگا۔ "چرررررچوں" کی تیز آواز کے ساتھ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ رات کے اس پہر سناٹے اور تاریکی کے دوش پر لہراتی دروازہ کھلنے کی یہ آواز بڑی ہولناک تھی جس نے ایک لمحے کے لیے پستول بردار شخص کے ہاتھوں میں لرزش پیدا کر دی لیکن پھر وہ دل کڑا کر کے بوڑھے کے عقب میں چلتا ہوا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک طویل کاریڈور کراس کرنے کے بعد سامنے ہی نظر آنے والے ایک اور دروازے کو کھولنے کے بعد بوڑھا اندر داخل ہوا اور پھر پلٹ کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بوڑھے کی کپکپاتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

"آؤ آؤ ڈرو مت اندر آ جاؤ۔" پستول بردار شخص اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں گویا ہوا۔

"منحوس بڈھے! تم آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ اس پورے گھر میں اس وقت تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں اور تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تم سے ڈر جاؤں گا؟ ایک بات یاد رکھنا کہ میرے ہاتھ میں پستول ہے، اگر تم نے ذرا سی بھی کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو میں بلا تاخیر تمہیں گولی مار دوں گا۔" اپنی بات مکمل کرنے کے ساتھ ہی وہ بوڑھے کے تعاقب میں چلتا ہوا کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر ٹارچ کی کمزور روشنی کمرے میں چاروں طرف دوڑائی تا کہ کمرے کا جائزہ لے سکے ٹھیک اسی وقت بوڑھے کی مخصوص آواز سنائی دی۔

"تمہیں شاید اندھیرے میں دیکھنے میں دقت محسوس ہو رہی ہے، ٹھہرو میں کچھ روشنی کا انتظام کرتا ہوں۔" اور پھر بوڑھے کی بات مکمل ہوتے ہی ایک ہلکی سی "ٹرچ" کی آواز کے ساتھ کمرے میں ماچس کی ایک تیلی جلتی ہوئی دکھائی دی پستول بردار شخص نے چونک کر ٹارچ کی روشنی اس جانب گھما دی۔ بوڑھا ایک شمع دان میں لگی ہوئی موم بتیاں روشن کر رہا تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد کمرے کی فضا اس حد تک منور ہو چکی تھی کہ وہ باآسانی کمرے کا تفصیلی جائزہ لے سکتا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو اسے اس بات کا اندازہ لگانے میں یکسر کوئی دشواری نہ ہوئی کہ یہ کمرہ یقیناً اس گھر کا ڈرائنگ روم تھا۔ دونوں جانب دیواروں کے ساتھ رکھے ہوئے صوفے، کھڑکیوں پر مخملیں پردے، کمرے کے عین وسط میں رکھی ہوئی قدیم طرز کی بیضوی میز اور فرش پر بچھے ہوئے خوب صورت ایرانی قالین کو دیکھ کر یہ بات سمجھ لینا بھی ہرگز مشکل نہ تھا کہ گھر کے مالکان خاصے مالدار واقع ہوئے ہیں۔ کمرے کے جائزے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اس نے مڑ کر بوڑھے کی جانب دیکھا

تو بھونچکا رہ گیا۔ بوڑھا نوابی شان کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے صوفے پر براجمان اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے حیرت کے تاثرات کے زیر اثر وہ خاموش کھڑا رہا پھر رفتہ رفتہ اس کی تیوریوں پر بل نمودار ہونے لگے اور وہ پستول لہراتے ہوئے سخت کھردری آواز میں بولا۔

''واہ بھئی واہ! باپ کا گھر سمجھ رکھا ہے تم نے تو تمہیں ذرا بھی اس بات کی پروا نہیں کہ تمہارے گندے اور بدبودار وجود سے صوفہ گندا بھی ہوسکتا ہے۔ میں یہاں تمہاری طرح سونے یا آرام کرنے نہیں آیا ہوں بڈھے۔ میں چور ہوں اور چوری کرکے فوراً نکل جانا ہی ایک کامیاب چور کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ میں یہاں تمہیں مال کی نشان دہی کے لیے لایا ہوں، استراحت فرمانے کے لیے نہیں' اٹھو اور بتاؤ کہ گھر والوں نے مال کہاں چھپا رکھا ہے؟''

بوڑھا اپنے مخصوص انداز میں دھیرے سے ہنسا یوں لگتا تھا جیسے بوڑھے کو چور کی یا اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کی ذرا بھی پروا نہ ہو پھر وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

''چور بھائی! چوری تو تم کرتے ہی رہتے ہو آج مجھ سے ملے ہو تو کچھ باتیں ہی کرلو۔ ابھی بہت رات باقی ہے، میں اس گھر سے بہت واقف ہوں، یہ بتاؤ ٹھنڈا لوگے یا گرم؟'' پستول بردار کے چہرے پر خشونت برسنے لگی پھر وہ غراتے ہوئے بولا۔

''باوا جی کا گھر ہے کیا؟ دعوت تو ایسے دے رہے ہو جیسے کولڈ ڈرنک کے کریٹ منگوا کر تم نے ہی یہاں رکھے ہوئے ہوں۔'' بوڑھا سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

''انگارے کیوں چبا رہے ہو' چلو تمہیں کولڈ ڈرنک ہی پلا دیتا ہوں کچھ تو تمہارا مزاج ٹھنڈک پکڑے گا اور اٹھ کر ایک اٹیچ دروازے کی جانب بڑھا۔ پستول بردار شخص تیزی سے بوڑھے کی جانب لپکا اور پھر اس کا کالر پکڑتے ہوئے دھاڑا۔

''ایک بات یاد رکھنا بڈھے! اگر ذرا سی بھی ہوشیاری کی تو اپنی جان سے جاؤ گے۔'' اس کی بات اور انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے بوڑھے شخص نے آہستگی سے اپنا کالر چھڑایا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ پستول بردار شخص بھی جو دروازے کے قریب ہی موجود تھا آگے بڑھ کر اندر جھانکنے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا کچن تھا جس میں کچن سے متعلقہ تمام لوازمات موجود تھے، بوڑھا ایک جانب رکھے ہوئے فریج کا دروازہ کھول کر کولڈ ڈرنک نکال رہا تھا۔ کولڈ ڈرنک نکالنے کے بعد اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور فریج اوپر رکھے ہوئے پیکٹ میں سے اسٹرا نکال کر بوتل میں لگایا اور پھر پلٹ کر پستول بردار شخص کو پیش کردی۔

اس نے بوڑھے کے ہاتھ سے بوتل تھامتے ہوئے ایک جانب ہٹ کر اسے راستہ دیا تو بوڑھا آرام سے چلتا ہوا دوبارہ صوفے پر جا بیٹھا۔ چند لمحے بوڑھے کو گھورتے رہنے کے بعد اس کے قدموں نے بھی حرکت کی اور پھر وہ بوڑھے کے سامنے رکھے ہوئے دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔ اب وہ کولڈ ڈرنک کے ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے بوڑھے کو گھور رہا تھا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد بوڑھے کی آواز نے کمرے کی خاموش فضا کا سکوت درہم برہم کرڈالا۔

''کب سے کررہے ہو یہ چوری چکاری؟'' وہ خاموشی سے بوڑھے کی جانب دیکھتا رہا پھر پرخیال انداز میں گویا ہوا۔

''یہی کوئی چار پانچ سال سے۔'' بوڑھے نے تاسف آمیز انداز میں ہونٹ سکوڑے پھر گویا ہوا۔

''کیا تمہارے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ جس کا تم سب کچھ چرا کر لے جاتے ہو اس نے وہ سب جمع کرنے کے لیے کتنی محنت کی ہوگی؟'' اس نے کولڈ ڈرنک کا ایک اور سپ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''دیکھو بڈھے! میں اگر نرمی سے کام لے رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم تبلیغ شروع کر دو' خود تم سارا دن بھیک مانگ کر کون سا ثواب کا کام کرتے ہو؟ تم بھی دوسروں کے مال پر ہاتھ صاف کرتے ہو اور میں بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم لوگوں کی مرضی سے وصول کرتے ہو اور میں ان کی رضامندی کے بغیر' یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اگر لوگ سب کچھ جمع کرنے کے لیے محنت کرتے ہیں تو جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کو چرانے کے لیے، ہم بھی کچھ کم محنت نہیں کرتے۔'' بوڑھا اس کی بات سن کر دھیرے سے ہنسا پھر اس نے فوراً ہی ایک اور سوال داغ دیا۔

''تندرست ہو، جوان ہو گفتگو سے پڑھے لکھے بھی لگتے ہو، کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ تمہاری محنت کی سمت کچھ اور ہوتی۔ تم مزدوری کر سکتے تھے' کہیں نوکری کر کے رزق حلال کما سکتے تھے' وہ زیادہ اچھا ہوتا یا یہ اچھا ہے جو تم کر رہے ہو؟'' بوڑھے کی بات ختم ہوئی تو اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی پھر جب وہ بولا تو یہی تلخی اس کے لہجے میں بھی گھلی ہوئی تھی۔

''یہ ملک اور اس ملک کا نظام کسی کو درست سمت میں چلنے کی مہلت ہی نہیں دیتا کیوں کہ نہ تو ہمارا ملک درست سمت میں چل رہا ہے اور نہ ہی اس کا نظام پھر ہماری سمت درست کیسے رہ سکتی ہے؟ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں کوئی جاہل شخص نہیں ہوں، گریجویٹ ہوں، گریجویشن کے بعد میں یہی سمجھا تھا کہ میں نے بہت بڑا تیر مار لیا ہے، کسی پہاڑ کی چوٹی سر کر لی ہے لیکن افسوس کے ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ڈگریاں ہاتھ میں اٹھا کر سڑکوں پر جوتیاں چٹخانے کی طویل تاریخ رقم کی ہے میں نے لیکن جانتے ہو کیا ہوا ہر جگہ سفارش اور رشوت چلتی نظر آئی اور میرے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں تھیں۔ سارا دن خوار ہونے کے بعد گھر آتا تو بیوی پوچھتی۔

''نوکری ملی؟'' اور میرے پاس ہمیشہ کی طرح ایک ہی مختصر جواب ہوتا نہیں' نوبت فاقوں تک آ گئی، بچے بھوک سے بلکتے نظر آئے تو پہلی مرتبہ چوری کی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا جو آج تک جاری ہے۔'' بوڑھے نے پوری توجہ سے اس کی بات کو سنا پھر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''تمہارے حالات خاصے افسوس ناک ہیں لیکن اگر ملک غلط ہو، نظام غلط ہو تو کیا اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ بندہ خود بھی غلط راستے پر چل نکلے؟'' پستول بردار شخص جو اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے خاصا آزردہ ہو گیا تھا اس کے چہرے پر فوراً ہی غصے کے تاثرات نمودار ہوئے پھر وہ یک لخت اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے دھاڑا۔

''ابے او بڈھے تو نے سماج سدھار کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا؟ میں نے ذرا سی نرمی کیا کر دی تو تو سر پر ہی بیٹھ گیا' زیادہ مفتی اعظم مت بن' اب انسانوں کی طرح اٹھ اور مال کی نشاندہی کر ورنہ ادھر ہی لمبا لٹا دوں گا۔'' بوڑھا اپنے مخصوص انداز میں ہنسا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''بہت ہی جلدی ہے تمہیں' اب تم خود ہی جلدی میں ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ آؤ تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں تا کہ کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ فیضو فقیر مہمانوں کی عزت نہیں کرتا۔'' بوڑھا بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ کر دروازے سے باہر نکلا تو پستول بردار شخص بھی اسے نشانے پر لیے ہوئے بدستور اس کے

پیچھے تھا۔ چند قدم راہداری میں چلنے کے بعد بوڑھا ایک اور دروازے پر رکا اور پھر کنڈی ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہوا تو وہ بھی تیزی سے کمرے میں داخل ہوگیا۔ بوڑھے نے رک کر پہلے کی طرح یہاں بھی ماچس کی تیلی جلائی اور پھر ایک جانب رکھے شمع دان میں ایک کے بعد ایک موم بتیاں روشن ہوتی چلی گئیں۔ اب یہ کمرہ بھی خاصی حد تک روشنی سے منور ہو چکا تھا اور یہ کمرہ یقیناً کسی کا بیڈ روم تھا۔ دیوار گیر الماریاں، کھڑکیوں پر لٹکتے ہوئے قیمتی پردے، فرش پر بچھا ہوا دبیز قالین اور کمرے کے عین وسط میں بچھا ہوا بڑا سا جہازی سائز کا قیمتی بیڈ اس کمرے کی کل کائنات تھا۔ ماحول کا جائزہ لینے کے بعد اس نے گھور کر بوڑھے کی جانب دیکھا اور پھر پستول لہراتے ہوئے استفہامیہ انداز میں دریافت کیا۔

''مال کہاں ہے بڈھے؟'' بوڑھے نے اسے عجیب سے انداز میں دیکھا پھر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''بہت ہی جلدی میں ہو، اچھا مال بھی دیکھ لو۔'' بوڑھا قدم گھسیٹتے ہوئے بیڈ کی جانب روانہ ہوا تو وہ للکار کر بولا۔

''منحوس بڈھے! اگر صوفے پر بیٹھنے کے انداز میں تم نے یہاں بیڈ پر لیٹنے کی جرأت کی تو میں تمہاری کھوپڑی کھول دوں گا سمجھے تم؟ اب ٹائم ضائع کیے بغیر الماری کھولو اور مال میرے سامنے لا کر رکھو۔'' بوڑھے نے تاسف آمیز انداز میں پھر وہی جملہ دہرایا۔

''بہت ہی جلدی میں ہو، مال الماری میں نہیں ہے جب خود ہی دکھا رہا ہوں تو چپ کھڑے رہو۔'' اس دوران بوڑھا بیڈ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اور اب بیڈ پر بچھے ہوئے فوم کے بھاری گدے کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ کچھ ہی دیر کی کوشش کے بعد بوڑھا گدے کو بیڈ سے گھسیٹ کر الگ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن اس دوران اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا اور وہ ایک جانب کھڑا ہو کر سانسوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ گدے کے نیچے جگہ جگہ پیوند لگا گدڑی نما ایک اور گدا بچھا ہوا تھا جو یقیناً کسی فقیر کا بوریا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھے کی یہ حرکت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ چند قدم مزید قریب آتے ہوئے پھنکارا۔

''بڈھے! تو یقیناً میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جائے گا، میں تجھ سے مال دکھانے کی بات کر رہا ہوں اور تو یہ بدبودار گدڑی دکھا کر میرے ساتھ کیا مذاق کرنا چاہ رہا ہے؟'' بوڑھے نے اس کی بات کو جیسے سنا ہی نہیں اور خاموشی سے آگے بڑھ کر گدڑی نما اس گدے کو گھسیٹنے لگا پھر اس نے گدے کے ایک سرے پر موجود لٹکتے ہوئے دھاگے کو پکڑ کر کھینچا تو دھاگا ادھڑتا چلا گیا۔ اب فقیر ہانپتے ہوئے، گدے کو اٹھا کر کمرے کے خالی حصے میں پہنچا اور پھر اس نے اس گدڑی نما گدے کا کھلا ہوا منہ فرش کی جانب کر کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے تو فرش پر مڑے تڑے نوٹوں اور سکوں کا ڈھیر سا لگ گیا۔ نوٹ چھوٹے لیکن مجموعی تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ پستول بردار شخص کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ خزانہ یقیناً کسی فقیر کی عمر بھر کی کمائی ہی ہو سکتا تھا...... چند لمحوں تک وہ سحر زدہ سے انداز میں سکوں اور نوٹوں کے اس ڈھیر کی جانب حیرت سے تکتا رہا لیکن پھر جلد ہی جیسے ہوش میں آتے ہوئے بولا۔

''بڈھے لگتا ہے کہ یہ تیری ہی کمائی ہے، چل مجھے کیا، مجھے تو مال چاہیے تھا، گھر والوں کا نہ سہی تمہارا ہی سہی یہ بھی بہت دن تک میرے کام آجائے گا۔ چل اب جلدی سے اسے گدے میں واپس بھر دے تاکہ میں اسے اٹھا کر لے جا سکوں۔'' بڈھا مخصوص انداز

میں ہنسا اور پھر مسکراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہ مال یقیناً میرا ہے لیکن صرف مال ہی نہیں یہ گھر بھی میرا ہے تم کیا سمجھتے ہو گھر کے مالک کی موجودگی میں تم یہ مال لے جاسکو گے؟ اور وہ بھی آسانی سے؟ میں نے ساری زندگی لگا کر اپنی یہ پونجی جمع کی ہے یہ میں تمہیں دے دوں؟ ہاہاہا...... ہاہاہا......“ بوڑھا جنونی انداز میں قہقہے لگانے لگا۔ پستول بردار شخص، جس کے لیے یہ اطلاع ہی خاصی حیرت کا باعث تھی کہ بوڑھا اس گھر کا مالک ہے وہاں بوڑھے کا جنونی انداز میں ہنسنا بھی اسے خاصا مضطرب کررہا تھا۔ وہ دہاڑ کر بولا۔

”بند کرو اپنی یہ منحوس ہنسی، پاگل بڈھے! تجھے کیا لگتا ہے کہ تو مجھے روک لے گا؟ یہ مال اب تیرا نہیں میرا ہے۔ تیرا تو ویسے بھی چل چلاؤ کا دور ہے، چند دن اور جی لے۔ مرنا تو تو نے ویسے بھی ہے پھر اپنے گندے خون کا بوجھ میرے کاندھوں پر کیوں ڈالنا چاہتا ہے؟ مال کو واپس بھر اور خاموشی سے ایک سائیڈ پر ہٹ جا، ورنہ جان سے جائے گا۔“ بوڑھے نے اس کی بات سن کر تمسخرانہ انداز میں داہنے ہاتھ کی مدد سے کان سے جیسے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

”ایک تو تم چور لوگ بہت جلدی میں رہتے ہو، میں تو کبھی کسی کام میں جلدی نہیں کرتا، مرنے میں بھی نہیں، تم نے اپنی کہانی تو مجھے سنادی چل ایک چھوٹا سا واقعہ میرا بھی سن لے آج سے چالیس، پچاس سال پہلے بھی ایک چور یہاں آیا تھا بالکل تمہاری ہی طرح جوان اور جلد باز وہ بھی یہ ساری دولت لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا، میں نے اسے یہ بھی کہا کہ یہ دولت میری ساری زندگی کی جمع پونجی ہے یہ میرے بڑھاپے کا سہارا ہے، میں یہ تمہیں نہیں دے سکتا لیکن وہ نہیں مانا،

اس کو بھی اپنے ہاتھ میں دبے پستول پر بڑا ناز تھا۔ اس نے دھڑ سے گولی چلادی اور میں گرا' یہاں ادھر یہ بیڈ کے بالکل ساتھ۔ اس نے مجھے مار دیا اور میں مر گیا لیکن اگر میں مر گیا تھا تو کیا میں اسے یہ دولت لے جانے دیتا؟ نہیں وہ یہ دولت پھر بھی نہیں لے جاسکا اور اگر وہ نہیں لے جاسکا تو تم کیسے لے جاسکتے ہو؟'' پستول بردار شخص جو بڑی توجہ کے ساتھ فقیر کے جملوں پر غور کر رہا تھا اس کی آواز اور انداز کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی میں پھریریاں سی دوڑتی محسوس کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس پر ایک عجیب سی بے یقینی کی کیفیت طاری تھی جس کا اظہار اس کے منہ سے ادا ہونے والے لفظوں میں در آیا۔

''کک......کک......کیا بکواس ہے؟ گھامڑ سمجھ رکھا ہے کیا؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہاری ڈراؤنی کہانیاں سن کر میں ڈر جاؤں گا؟ ایک بات یاد رکھو خوف انسان کی فطرت ہے لیکن میرے ہاتھ میں دبے ہوئے اس کھلونے کو اپنے حلق سے گولی اگلنے میں ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوتا اور اب اگر تم نے خاموشی سے سارا مال گدے میں واپس نہیں بھرا تو میں بلا تامل تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''ہاہا......ہاہا......'' اس کی بات کے جواب میں گونجنے والا بوڑھے کا قہقہہ بالکل پہلے کی طرح جنونی اور وحشت ناک تھا شاید وہ اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھا تھا پھر وہ ایک عجیب کھرکھراتی ہوئی سی آواز میں بولا۔

''بے وقوف! موت صرف ایک بار آتی ہے اور مرے ہوئے کسی شخص کو دوبارہ نہیں مارا جاسکتا۔ ہاہا......ہاہا۔'' جملہ مکمل کرنے کے بعد بوڑھا پھر وحشیانہ انداز میں ہنسنے لگا تھا۔ پستول بردار شخص کے چہرے پر شدید غصے کے تاثرات نمودار ہوگئے پھر وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

''اچھا' مرنا ہی چاہتے ہو تو پھر یہ لو۔'' اس کی انگلی کا دباؤ ریوالور کے ٹریگر پر خطرناک حد تک بڑھ گیا ''دھائیں'' کی آواز بلند ہوئی اور پستول کی نال میں سے نکلی ہوئی گولی بوڑھے شخص کے عین سینے کی جانب روانہ ہوئی لیکن جو کچھ ہوا وہ اتنی تیزی اور سرعت کے ساتھ ہوا کہ اس کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ گولی بوڑھے شخص کے سینے سے یوں ٹکرائی جیسے اسٹیل کی دیوار سے جا لگی ہو، ٹن کی ایک زوردار آواز سنائی دی اور گولی جیسے اچٹتی ہوئی سی واپس اس کی پیشانی میں آ لگی وہ لہرا کر کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمین پر آ گرا اور پھر چند لمحے پھڑکنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

وہ مر چکا تھا۔ فقیر نے تاسف آمیز انداز میں فلیٹ ہیٹ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا، پھر جوں ہی اس نے فلیٹ ہیٹ ہٹایا اس کی پیشانی میں بنا ہوا وہ سوراخ واضح ہوگیا جیسا سوراخ ابھی ابھی پستول بردار شخص کی پیشانی میں نمودار ہوا تھا۔ اب کمرے میں فقیر کی تاسف آمیز آواز گونج رہی تھی۔

''میں نے تو کہا تھا' بہت سمجھایا تھا کہ جلدی مت کرو خود ہی جلد باز تھا۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں؟ میرا نام تو ڈبو دیا نا؟ اب لوگ کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ فیضو فقیر مہمانوں کی عزت نہیں کرتا۔''

کج ادا

علی اختر

کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں عقل ان کی کوئی توجیح پیش نہیں کرتی لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا جاتا۔
ایک ایمبولینس ڈرائیور کو پیش آنے والا عجیب و غریب واقعہ، اک لاش کا احوال جو یکایک زندہ ہوگئی تھی۔

اگلے پاؤں پر کھڑی رات نے ابھی اپنے پہلے جگراتے کی جمائی نہیں لی تھی' شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے احاطے اور وارڈز میں تین اونگتی اور جاگتی رہتی ہیں۔ بہت سے لوگ اب بھی اپنے مریضوں کے لیے ادویات کی پرچیاں لے کر اسپتال کے اندر سے نکلتے اور ایک طرف بنے میڈیکل اسٹورز پر بڑی تیزی سے جاتے اور چند لمحوں بعد ادویات کے شاپر اٹھائے واپس پلٹ جاتے۔ میں اپنے ساتھی کے ساتھ اپنی کیری وین سے دور کھڑے تھے لیکن ٹھہریے باتیں تو ہوتی رہیں گی پہلے میں اپنا اور اپنے ساتھی کا تعارف کروادوں۔

میرا نام امانت ہے دس جماعتیں پڑھ رکھی ہیں۔ غریب ہونے کے ناتے ملازمت کی پری میرے گھر آنگن میں نسلوں سے نہیں اتری اور نہ آگے اترنے کا امکان ہے۔ کچھ عرصہ میں نے مکینک کا کام سیکھا' ہتھوڑی' پلگ پانے اور دوسرے اوزاروں سے واقفیت ہونے لگی تو بھوک تن کھانے لگی۔ ڈرائیوری سیکھی تو ایک کرم فرمانے لائسنس بنوادیا۔ میں نے ڈرائیوری شروع کردی' میرے ساتھ میرا ایک دوست قیصر ہے اس کی بھی کم وبیش یہی کہانی ہے اس لیے اسے دہرانے کا فائدہ نہیں اسے میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا اور ہماری کیری وین ایک معزز شخص کی ہے جس نے یہ ہمیں دیہاڑی پر دے رکھی ہے۔ سارا دن اسے مختلف روٹوں پر اندرون شہر چلاتے ہیں اور رات شہر کے اس بڑے اسپتال میں آجاتے ہیں یہاں سے مریضوں کے لواحقین' تندرست ہوکر گھروں کو جاتے مریض اور بعض اوقات مردے بھی ان کے ٹھکانوں پر پہنچانے پڑتے ہیں۔

ان سے ہمیں توقع سے زیادہ پیسے مل جاتے ہیں' یہاں زندگی کی رعنائیاں اور دلفریبیاں تو دیکھنے کو نہیں ملتیں' البتہ مایوسیاں' اداسیاں اور بے بسی کی تمام تصویریں اور رنگ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ مجھ جیسے لوگوں کو اپنے جیسا ماحول مل جائے تو اس کا جی بہلا رہتا ہے۔ مجھے مذہب سے اتنا لگاؤ کبھی نہیں رہا لیکن زندگی کے ان بے اثبات لمحوں میں رہ رہ کر میرے لمحے کبھی بھی بھیگ ضرور جاتے ہیں۔ تعارف کچھ طویل نہیں ہوگیا چلئے پھر اسی ماحول میں چلتے ہیں' اسپتال کے اندر میں نے کئی بار جھانکا ضرور ہے لیکن اس کے اندر جانے کا مجھے جاگتی اور اونگتی راتوں میں کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ہسپتال کی باہر والی عمارت کی روشنیاں چونکہ ساری رات جلتی رہتی ہیں' اس لیے یہاں دن کا سماں رہتا ہے۔ مریضوں کو لاتی گاڑیوں' ایمبولینس کے آنے جانے کی آوازیں' اسٹریچر پر رکھے مریضوں کو ایمرجنسی تک لے جانے والے تیمارداروں کی گفتگو اور مرے ہوئے لوگوں کی لاشوں کے اردگرد بین کرتے رشتہ داروں کی آوازیں...... برابر آنکھ کو جگائے رکھتی ہیں۔

اس روز صبح سے حبس نے جسموں کا عرق نچوڑ رکھا تھا' اسپتال کے کمپاؤنڈ میں کھڑے اونچے اور تن آور درخت بھی چپ چاپ کھڑے تھے' ہوا بالکل بند تھی میں اور قیصر دونوں اپنی کیری وین سے ہٹ کر کھڑے تھے۔

''آج تو گرمی اور حبس کی انتہا ہوچکی ہے' سانس لینا دشوار ہورہا ہے۔'' قیصر نے کہا۔

''ہوں...... دوسرے شہروں میں بادل برستے ہیں لیکن ہمارے شہر میں تو زمین بھی ایک بوند کو ترسنے لگی ہے۔'' میں

نے جواب دیا۔

''آج تو دیہاڑی بھی بہت مندی رہی۔'' قیصر دوبارہ بولا۔

''اتنی گرمی تو سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں کو جلائے دے رہی ہے' سواریاں کہاں سے نکلیں گی۔'' میں نے اداسی سے کہا۔

''استاد میں پانی پی کر آتا ہوں' اسپتال کے اندر کولر سے۔'' قیصر یہ کہہ کر اسپتال کا مین گیٹ عبور کر کے اندر چلا گیا اور میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر جلالیا اور سوچنے لگا کہ وین کے مالک کو کیا بہانہ لگاؤں گے' آج تو کھانے اور پٹرول کے لیے ہی بمشکل خرچہ نکلا ہے۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اسپتال کے مین گیٹ سے چند خواتین اور دو آدمی ایک اسٹریچر لے کر نکلے ان کی دبی دبی سسکیاں اور اترے چہروں سے لگتا تھا کہ ان کا مریض مر چکا ہے۔ عورتیں ابھی تک رو رہی تھیں' ان کے ایک مرد ساتھی نے اردگرد دیکھا' اس وقت کمپاؤنڈ میں کوئی ایمبولینس موجود نہیں تھی۔ اسٹریچر پر پڑا ہوا جسم ایک بڑی چادر سے ڈھکا ہوا تھا' وہ مرد چلتا ہوا ہماری کیری وین کی طرف آ گیا اور اس پر ہاتھ رکھ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا میں نے ادھ پئی سگریٹ کو زمین پر پھینکا اور اس کی طرف بڑھا۔

''جی فرمائیے۔'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں میت لے کر جمیل آباد جانا ہے۔ وین آپ کی ہے تو بتائیں چلیں گے۔''

''جمیل آباد قصبہ میں یا آگے؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''اس سے تھوڑا آگے چک ہے' وہاں تک۔'' اس نے بھیگی آواز میں کہا۔

''اتنے لوگوں کو بٹھا کر اور ڈیڈ باڈی کو لے جانا مشکل ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''ڈیڈ باڈی کے ساتھ میں اور میرا بھائی جائیں گے' خواتین ادھر شہر میں اپنے ایک عزیز کے ہاں رات گزار کر صبح گاؤں آجائیں گی۔''

جمیل آباد شہر سے دس پندرہ میل دور پکی لیکن سنگل روڈ پر واقع ایک قصبہ ہے' جس کے راستے میں اجاڑ اور گھنے درختوں کا ذخیرہ بھی آتا تھا' اس لیے بہت سے لوگ ادھر جانے سے خوفزدہ اس لیے بھی ہو جاتے ہیں کہ بے آباد اور سنسان جگہوں پر چور ڈاکوؤں کا بھی راج ہوتا ہے لیکن میں نے نہ جانے کیوں ادھر جانے کی ہامی بھر لی تھی۔ معقول کرایہ بلکہ میری سوچ سے بھی زیادہ رقم مل رہی تھی لہٰذا میں نے انکار کرنا مناسب نہ جانا' ابھی ہم کرایہ طے کر رہے تھے کہ قیصر بھی آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک مُردے کو جمیل آباد کے نزدیکی گاؤں لے جانا ہے۔

''استاد تمہیں پتا ہے راستہ کتنا خطرناک ہے۔'' اس کے اندر کا ڈر بولا۔ یہ بات سن کر لواحقین منت ترلوں پر آ گئے اور ہمیں منہ مانگی رقم دینے پر تیار ہو گئے۔

''کیا خیال ہے؟'' میں نے پھر قیصر سے پوچھا۔

''چلو اللہ مالک ہے۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔

تب میں نے وین اسٹارٹ کی اور اسٹریچر کے نزدیک لے آیا' انہوں نے دونوں اطراف سے میت کو اٹھایا اور وین میں سیٹوں کی درمیانی جگہ پر لٹایا اور خود اس کے قریب سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ قیصر میرے ساتھ بیٹھا تھا ہم نے وین کو اسٹارٹ کیا اور کمپاؤنڈ سے باہر نکل آئے۔ شہر کی سڑکوں کو عبور کر کے ہم جمیل آباد کی سنگل سڑک پر آئے تو یک لخت ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ہمارے جسموں میں دوبارہ زندگی دوڑا دی۔

''لگتا ہے موسم بدل گیا۔'' قیصر نے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔

''جب ہم اسپتال سے نکلے تھے تو کس قدر گرمی اور حبس تھا مگر یار بادل تو بالکل صاف ہیں۔ دیکھو ستارے بھی چمک رہے ہیں۔'' میں نے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر یہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کدھر سے آ رہے ہیں' ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے ائیر کنڈیشنر چلا کر اس کا رخ ہماری طرف کر دیا ہو۔'' قیصر نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے جمیل آباد کی سڑک پر آتے ہی گاڑی کی رفتار تیز کر دی تھی' مجھے پتا تھا رات کے اس وقت یہ سڑک بے آباد

ہوگی اور ٹریفک بھی نہیں ہوگا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے شہر کو کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے راستہ بے آباد اور سنسان تھا۔ ہم درختوں کے جھنڈ کے قریب آ گئے تھے ہمارے دونوں طرف گھنے اور اونچے درخت تھے کہ یک لخت آندھی چلنا شروع ہوگئی۔ درختوں کی سائیں سائیں وین کے اندر تک محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرلی' درختوں سے عجیب وغریب آوازیں آنے لگیں پھر آندھی کی تیزی میں ذرا کمی ہوئی تو کتنی دور دور آگے جا کر مجھے یوں لگا جیسے گاڑی کے آگے کسی نے دیوار کھڑی کردی ہو راستہ نظر آنا بند ہوگیا تھا میں نے قیصر کو ٹہوکا دیا جو اونگھ رہا تھا۔

"کیا ہوا استاد جی!" وہ ہڑبڑایا۔

"لگتا ہے ہم راستہ بھٹک گئے ہیں وہ دیکھو سامنے تو لگتا ہے سڑک پر کسی نے دیوار کھڑی کی ہوئی ہے۔" میں نے اسے بتایا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا اور ڈر کر بولا۔

"استاد جی! دیوار نہیں ہے یہ تو کوئی اور ہی چیز ہے۔ وہ دیکھو اس کی بڑی بڑی ٹانگیں دکھائی دے رہی ہیں اور ان کے بیچ سے سڑک بھی نظر آرہی ہے مگر اس کا دھڑ کتنا بڑا ہے سر تو دکھائی نہیں دے رہا۔" قیصر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

تب میں نے بھی غور کیا تو وہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے قیصر نے بتایا تھا' چلتی ہوئی گاڑی بھی ہچکولوں پر آ گئی تھی میں نے ایکسلیٹر پر پورا دباؤ ڈالا تا کہ رفتار میں کسی طرح کمی نہ ہو مگر گاڑی جھٹکے لینے لگی تھی لیکن ابھی بند نہیں ہوئی تھی اور وہ سامنے جو کوئی بھی تھا نزدیک سے نزدیک آنے لگا تھا۔

ابھی ہم اسے دیکھ ہی رہے تھے کہ پیچھے زور سے دھڑ دھڑ کی آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی چیخ نما آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"گاڑی روکو...... گاڑی روکو......" آوازیں سن کر ہم اور بھی خوف زدہ ہوگئے تھے۔ میں نے قیصر کی طرف دیکھا تو اس کا رنگ فق ہو چکا تھا اور گلا خشک۔ اس کی تو آواز بھی نہیں نکل رہی تھی میں نے وین کو بریک لگا کر روکا اور باہر نکل آیا۔ وین کے پچھلے دروازے کے پاس آیا تو وہ دونوں تقریباً بے ہوش ہونے کے قریب تھے۔

"پانی...... پانی ہے تمہارے پاس......" وہ بیک وقت بولے۔

"کیا ہوا...... کیا ہے' بتاؤ تو سہی؟" میں نے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

"پانی ہے تو دو...... بعد میں بتاتے ہیں۔" میں نے مردے کی طرف دیکھا وہ خاموشی سے بے حس وحرکت لیٹا ہوا تھا۔ قیصر بھاگ کر وہ بوتل اٹھا لایا جس میں ہم نے بوقت ضرورت ریڈی ایٹر میں پانی رکھا ہوا تھا اور بوتل ان کے حوالے کردی۔ گاڑی رکتے ہی باہر کا موسم ایک بار پھر حبس زدہ ہوگیا تھا۔ پانی پی کر ان کے اوسان بحال ہوئے تو ان کی آواز میں لرزش تھی۔

"وہ...... وہ...... یہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔"

"کیا......؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ہم نے سمجھا شاید جھٹکوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے لٹایا مگر یہ چند ثانیے بعد پھر اٹھ کر بیٹھ گیا یہ تو اونگھ رہا تھا اور میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔" میں نے جلدی سے اسے اٹھایا اس نے بھی دیکھا تو مردہ اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا میں نے موبائل کے ذریعے تمہیں بتانا چاہا مگر یہ بند تھا۔

"ہم دونوں نے دوبارہ اسے بڑی مشکل سے لٹایا اور جتنی بھی قرآنی آیات تھیں ہم نے اونچی آواز میں پڑھنا شروع کردیں' پڑھتے پڑھتے ہماری آنکھ لگ گئی اچانک بھائی جان نے مجھے پکڑ کر جھنجوڑا میں نے آنکھیں کھولیں تو مردہ تیسری بار پھر اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا اب کے اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ یہ دیکھ کر تو ہماری چیخیں نکل گئیں' ہم نے زور زور سے دروازہ اور کیبن کو پیٹنا شروع کیا تو خود بخود آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا۔"

"خدا کے واسطے کچھ کرو ورنہ آپ کو ایک کی بجائے تین مردے جمیل آباد چھوڑ کے آنا پڑیں گے۔" وہ چیختے ہوئے بولے۔

میں نے قیصر کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بھی خوف

سے پھیلی ہوئی تھیں، سنسان و ویران راستہ، درختوں سے بھرا ہوا، اندھا ماحول...... دور دور تک کوئی ذی حس نظر نہیں آ رہا ہے صرف ہم چاروں زندہ اور ایک مردہ گاڑی میں پڑا ہوا تھا۔ فضا میں ایک بار پھر حبس زوروں پر تھی، سانس بھی رک رک کر آ رہا تھا۔ ہم نے اپنے موبائل چیک کیے وہ بند تھے لیکن سگنل آ رہے تھے۔

"قیصر...... کچھ کرو، ورنہ صبح ہم چاروں کی لاشیں ادھر پڑی ہوں گی۔"

"استاد جی اس ویرانے میں صرف خدا کو یاد کیا جاسکتا ہے اور کچھ نہیں، میں نے آپ کو روکا تھا۔" قیصر نے بمشکل تمام اپنی بات پوری کی۔

"دیکھو میرے بھائی! اب یہاں ٹھہرنا بھی خطرناک ہے اور سفر کرنا بھی مشکل ہے لیکن ہمیں اپنی منزل تک تو جانا ہی ہے اس لیے جتنی بھی قرآنی آیات ہیں انہیں اونچی آواز میں مردے کے سرہانے پڑھو اور وین کا پچھلا دروازہ مضبوطی سے بند کرلو۔ اسے کسی بھی حالت میں نہیں کھولنا اور قیصر تم بھی ان کے ساتھ پیچھے بیٹھ جاؤ۔" میں نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"استاد جی! میں تو آپ کے ساتھ ہی بیٹھوں گا۔"

جتنی دیر ہم گاڑی روکے رہے کوئی نیا واقعہ پیش نہ آیا تھا لگتا تھا قرآنی آیات کا اثر ہوچکا تھا۔ قیصر مجھ سے پہلے میرے ساتھ والا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا میں نے پچھلا دروازہ بند کروادیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی ایک بار پھر سے ٹھنڈی اور میٹھی ہوا چلنے لگی میں نے قیصر کی جانب دیکھا تو اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے مگر اس کا رنگ سفید ہوچکا تھا۔

ٹھنڈی ہوا گاڑی کے شیشوں کی درزوں سے اندر آ رہی تھی پھر بارش کی بوندیں ونڈ اسکرین پر تیرنے لگیں ابھی ہم چند میل دور گئے ہوں گے کہ ایسا لگا جیسے کسی شادی پر شادیانے بجنے لگے ہوں اس کے ساتھ گھنگھروؤں اور ڈھولک کی آوازیں بھی آنے لگیں۔

"لگتا ہے نزدیکی گاؤں میں کوئی شادی ہورہی ہے۔"

میں نے قیصر کو بتایا تو وہ ایک بار پھر خوفزدہ ہوگیا اور بولا۔

"استاد جی! اس سڑک پر ہم دن کے وقت پہلے بھی دو چار دفعہ آچکے ہیں اس کے اردگرد دُور دور تو کوئی آبادی نہیں ہے، پہلا اور آخری قصبہ جمیل آباد ہی آتا ہے۔"

"تو پھر......" میں بھی اندر سے ڈر چکا تھا۔

"گاڑی کی اسپیڈ بڑھاؤ تاکہ جلد از جلد ہم قصبے میں پہنچ جائیں۔" قیصر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"قیصر میں نے ایکسلیٹر پر پورا دباؤ ڈالا ہوا ہے، لگتا ہے انجن کو کسی نے باندھ رکھا ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ ابھی ہم یہ باتیں کرہی رہے تھے کہ ہماری دائیں طرف سے گھنگھروؤں کی واضح جھنکار میں چھنکتی پازیبوں کی مدھر آواز میں ایک نہایت خوب صورت اور زیورات سے لدھی نوجوان لڑکی سڑک کے درمیان آ کھڑی ہوئی وہ اس قدر خوب صورت تھی کہ ہماری آنکھوں کو اس کی خوب صورتی خیرہ کررہی تھی۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں رکنے کا اشارہ کررہی تھی اس کے ساتھ چند آدمی بڑی بڑی ڈانگیں لے کر ہاتھوں میں لالٹین پکڑے سڑک کنارے خاموش کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے ان کی آنکھوں کی سرخی اور گھنی بڑی مونچھیں اندھیرے میں بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔

"استاد گاڑی کی اسپیڈ بڑھاؤ۔" قیصر چیخ اٹھا۔

میں نے ایکسلیٹر پر پورا دباؤ ڈال دیا لیکن گاڑی ہچکولے بھرنے لگی تھی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی وہ دلہن نزدیک سے نزدیک آنے لگی تھی پھر اچانک مجھے اپنے سائیڈ والے شیشے پر دستک محسوس ہوئی میں نے دیکھا تو وہ حسین و جمیل دلہن نہ صرف شیشے کو کھٹکارہی تھی بلکہ اونچی آوز میں کہہ رہی تھی۔

"امانت...... دروازہ کھولو...... شیشہ گرا کر میری بات سنو۔" میں نے پورے زور سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ایکسلیٹر پر اور دباؤ بڑھادیا۔

"امانت...... تم میرے...... میرے دُلہا کو اس طرح نہیں لے جاسکتے دیکھو میں پوری تیاری کے ساتھ اسے

لینے آئی ہوں' دروازہ کھولو امانت...... میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی مگر اپنے دلہا کو نہیں لے جانے دوں گی۔'' وہ گاڑی کے ساتھ بھاگتی ہوئی ہیجانی کیفیت میں قیصر والے دروازے کی طرف ہوگئی تھی اب وہ اس کا دروازہ پیٹ اور اس کے شیشے پر زور زور سے دستک دے رہی تھی۔

قیصر...... ایک بار شیشہ کھول کر میری بات سن لو...... میری جوانی پر تمہیں ترس نہیں آرہا' تمہیں تمہارے پیاروں کا واسطہ میرے دلہا کو چھوڑ جاؤ ورنہ تمہارا بھی وہی حشر کروں گی جو میں نے اس کا کیا۔ یہ بھی نہیں مانتا تھا مگر میں کیا کرتی میں تو اس کے آگے دل ہار چکی تھی میں اسے زندہ رکھنا چاہتی تھی ساری عنایتوں اور ساری سہولتوں کے ساتھ مگر یہ نہ مانا تو میں نے اس کی زندگی چھین لی تاکہ میں اسے حاصل کرلوں۔ قیصر...... مردہ تن تمہارے کسی کام کا...... یہ مجھے دے جاؤ' میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔'' وہ چیخنے لگی اچانک پتا نہیں میرے ذہن میں کیسے جھماکا ہوا میں نے ڈیش بورڈ کو کھولا تو اس میں آیت الکرسی پڑی تھی' مجھے یہ زبانی یاد نہیں تھی مگر پھر بھی میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے نکال لیا اور اسے کھول کر اس کا رخ روتی ہوئی دلہن کی طرف کردیا۔

اس کی نظر اس پر پڑی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو چھپالیا اور چیخیں مارتی ہوئی ان کھڑے لوگوں کی طرف بھاگ گئی' اس کے واپس جاتے ہی ڈھولک اور شادیانے بجنے بند ہوگئے اور فضا میں دوبارہ حبس پھیل گیا۔ اب یوں لگنے لگا تھا جیسے درختوں کے سارے پتّے رونے لگے ہوں' ہواؤں میں چیخوں اور بین کرنے کی بے تحاشہ اور بے ہنگم آوازیں آنے لگی تھیں۔ بہت سی عورتیں اور بچوں کے اونچی آواز میں رونے کی صدائیں آنے لگی تھیں' جیسے بے شمار عورتیں اور مرد ماتم کررہے ہوں' میری گاڑی کی رفتار خود بخود تیز ہونے لگی تھی اور ہم تیزی سے بقیہ سفر طے کرنے لگے تھے۔

''ہم کتنے بجے اسپتال سے چلے تھے؟'' میں نے پھولتی سانس میں قیصر سے پوچھا۔

''شاید بارہ بجے تھے' جب ہم نے اسپتال کا کمپاؤنڈ چھوڑا تھا۔'' قیصر نے جواب دیا۔

''جمیل آباد کا فاصلہ کتنے وقت کا تھا؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کا۔'' اس نے بتایا۔

''مگر اب تو اذانیں ہونے والی ہیں گویا ہم کتنا وقت ادھر پھنسے رہے ہیں' اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔'' میرے ہونٹوں سے نکلا تو قیصر نے بھی اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ جمیل آباد آنے کو تھا جب دور کہیں سے اذان کی آواز ہوا کے دوش پر لہراتی سنائی دی' سپیدی سحر نمودار ہونے کو تھی جب ایک بار پھر ہمارے رستے میں ایک سفید براق کپڑوں میں ملبوس' چاندنی کی طرف سفید داڑھی' بڑے بڑے گیسو' سر پر ململ کی ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح پکڑے ایک بزرگ نظر آئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے گاڑی روک دی۔

''کس کا لاشہ اٹھائے پھرتے ہو؟'' انہوں نے قریب آکر پوچھا تو میں نے اپنی طرف کا شیشہ گرادیا انہوں نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''کس کا لاشہ اٹھائے پھرتے ہو؟''

''شہر کے بڑے اسپتال میں کوئی فوتگی ہوئی تھی اس کی ڈیڈ باڈی جمیل آباد کے گاؤں میں لے جانی تھی۔'' میں نے بتایا۔

''شکر کرو اتنی بڑی مصیبت سے بچ کر نکل آئے ہو۔''

''بابا جی! یہ کیا مصیبت تھی اور کون تھا یہ بے چارہ؟'' میں نے حوصلہ پاکر پوچھا۔

''اللہ کا بندہ تھا ان بدروحوں کا شکار ہوگیا۔ بہت دیر بعد پتا چلا مجھے' بہت دیر ہوگئی تھی یا شاید میرے ربّ کو اس کی اسی طرح موت منظور تھی۔ مرنے سے پہلے موت کے منہ میں انہی کم بختوں نے دھکیل دیا۔ ذرا پچھلا دروازہ کھلواؤ گے۔'' بزرگ نے آہستگی سے کہا۔

''جی۔'' میں نے دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگائی اور پچھلا دروزہ کھٹکھٹایا' تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے دروازہ کھولا اور ان میں سے ایک نے آنکھیں ملتے ہوئے

پوچھا۔
''جمیل آباد آ گیا؟'' گویا وہ بڑی گہری نیند سے بیدار ہوئے تھے۔
''نہیں، ابھی نہیں...... مگر یہ بزرگ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔'' میں نے بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو دونوں نے بڑی حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا، بزرگ ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولے۔
''مرنے والے کا چہرہ دکھاؤ گے؟''
''جی......جی......'' ان میں سے ایک نے مُردے کے چہرے سے چادر سرکا دی۔
''سو رہے ہو بیٹے! جاؤ تمہارا اگلا سفر آسودہ رہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا اس کے عزیزوں کے ساتھ میری آنکھوں نے بھی دیکھا کہ مُردے کا جسم تھوڑی دیر کو اس طرح لرزا جیسے ابھی بھی اس کی جان نکلی ہو اور پھر پُرسکون آ گیا۔
''ان کا اثر ابھی تک اس پر باقی تھا جب تم اسے مٹی کے سپرد کر کے آتے تو یہ ایک بار پھر اسے تنگ کرتیں اب میں نے وہ اثر بھی نکال دیا ہے۔'' بزرگ نے مسکرا کر کہا اور پھر ایک طرف ہٹ گئے۔
میں نے سوالیہ نظروں کے ساتھ ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے دھیرے دھیرے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا مجھے اس طرح لگا جیسے کسی نے پھولوں کا ہلکا سا خوشگوار بوجھ میرے کاندھے پر رکھ دیا ہو۔
''واپس آؤ گے تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ یہ سب کیا تھا اور کیسے ہوا...... جاؤ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' بابا جی کی بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ ان میں سے ایک کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی اس نے بڑی عجیب نظروں سے ہماری طرف دیکھا میں نے قیصر کی جانب دیکھا اس نے موبائل دیکھا تو وہ حیرانی سے کہنے لگا۔
''تمام رات ہم مصیبتوں میں گھرے رہے، اس وقت تو موبائل بھی جام ہو چکے تھے، اب کتنی تیزی سے بجنے لگے ہیں۔'' موبائل کی گھنٹی بج رہی تھی اس نے آن کر کے کان کو لگایا تو دوسری طرف سے اتنے زور سے آواز آ رہی تھی جو ساتھ کھڑے آدمی کو بھی واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔
''قاسم کہاں ہو؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
''ہم بس جمیل آباد پہنچنے ہی والے ہیں۔'' قاسم نے جواب دیا۔
''ہم پریشان ہو گئے تھے، پتا نہیں راستے میں کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو یا کہیں گاڑی خراب نہ ہو گئی ہو۔ ہم نے بہت فون کیے مگر آگے سے ہر بار تمہارا موبائل بزی ملا، کہاں کر رہے تھے فون؟'' پوچھا گیا۔
''کہیں بھی نہیں بس میرا خیال ہے نیٹ ورک خراب تھا۔'' قاسم نے جواب دیا۔
''بس ہم جلد ہی پہنچ رہے ہیں، فکر نہ کرو۔'' یہ کہہ کر قاسم نے ہماری طرف دیکھا میں نے آگے بڑھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، قیصر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھ گئے تو گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی۔ بابا جی تھوڑی دور تک ہمیں نظر آئے پھر وہ پتا نہیں کدھر روپوش ہو گئے، کچھ دیر بعد ہم جمیل آباد کے قریب گاؤں جا پہنچے جہاں لوگ میت کا انتظار کر رہے تھے۔
''استاد جلدی سے واپسی کر لیں، مجھے بہت خوف آ رہا ہے۔'' قیصر نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔
''ہوں......'' میت اتار کر ہم نے کرایہ لیا اور دوبارہ اسی ویران اور سنسان سڑک پر آ گئے مگر اب دھیرے دھیرے ٹریفک بحال ہو چکی تھی اور بین کرتی ہواؤں کے لبوں پر بھی تالے لگ چکے تھے گویا ایک عرصہ بعد انہیں بھی گہری نیند نے آ گھیرا ہو۔

قسط نمبر 5

ارشد علی ارشد

صیہونی قوتیں صدیوں سے مسلم امہ کے خلاف ہر محاذ پر سرگرم ہیں۔ مسلمانوں میں جنم لینے والے فرقوں اور فسادات کے پس پشت بھی انہی کا ہاتھ کارفرما ہے۔ کبھی ان کی سازشیں حسن بن صباح کے روپ میں سامنے آتی ہیں تو کبھی غلام احمد قادیانی کی شکل میں یہود نے خلافت ترکی کا خاتمہ کرکے پورے عالم کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور اب ان کا نشانہ مسلم دنیا کی واحد ایٹمی طاقت پاکستان ہے' جو ہمہ وقت خار کی طرح انہیں تکلیف پہنچا رہا ہے زیر نظر ناول انہی سازشوں کے پس منظر میں ہے۔ گو اس کے حالات و واقعات خیالی ہیں' اس کے کسی کردار و علاقہ کا تعلق حقیقت سے نہیں ہے لیکن اس کا تھیم اور خمیر اصل واقعات سے ہی اٹھایا گیا۔

وطن پرستوں کے لیے بطور خاص' دلوں کو جھنجھوڑتا ہوا ایک دلچسپ ناول

جدید میک اپ کے چمتکار نے جان رائٹ اور ڈورتھی کے حلیے یکسر تبدیل کر دیئے تھے۔ اب جب تک ان سے بات نہ کی جائے اس کا پہچان لینا ناممکن تھا۔ اردو بولنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر مقامی لب و لہجہ اپنانا ان کے بس سے باہر تھا۔ جان رائٹ نے ان باشندوں کا روپ دھارا تھا جن باشندوں کے پاس امریکن پاسپورٹ تھے۔ پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کی رو سے وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ راستے میں دو جگہ انہیں چیک کیا گیا تھا۔ چیک پوسٹوں پر موجود پولیس والوں نے انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا تھا مگر حیدر عباس کی حاضر جوابی کے سبب وہ بخیر و خوبی چیک پوسٹیں کراس کر گئے تھے۔ اب آگے کچھ رہائشی علاقے کچھ پہاڑی اور جنگل تھا۔ وہ تینوں تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ جان کے کندھے سے چمڑے کا بیگ جھول رہا تھا۔ ڈورتھی کے پاس ہینڈ بیگ تھا اور اس کا تیسرا ہمسفر حیدر عباس خالی ہاتھ تھا۔ گزشتہ چند ماہ میں حیدر عباس نے جو پھرتی اور مستعدی دکھائی تھی وہ جان رائٹ کے لیے حیران کن اور تسلی بخش تھی۔ حیدر عباس کی جانفشانی، مربوط حکمت عملی اور برق رفتاری اسے جان رائٹ کے اہم ترین بندوں میں کھینچ لائی تھی۔

جان اس اتفاق پر بہت حیران و پریشان ہوا تھا۔ جو بندہ بیس دن قبل رونما ہوا تھا وہ ڈورتھی کولن اور ہیلری کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھا۔ اچانک تپائی پر پڑے ہوئے ٹرانسمیٹر نے کچھ آوازیں کیچ کیں۔ آوازوں پر وہ اس لیے چونکے تھے کہ ان میں شانی کا نام لیا گیا تھا۔ جان رائٹ نے اپنے ساتھیوں کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور توجہ سے گفتگو سننے لگا۔ وہ جیسے جیسے گفتگو کو سنتا جا رہا تھا حیرانی اسے لپیٹ میں لیتی جا رہی تھی۔ کیونکہ میٹنگ میں فاروق بلوچ، عبدالبارق اور حیدر عباس پر گفتگو ہو رہی تھی۔ پھر وہ بری طرح چونک پڑا۔ جب ان کے تین خفیہ ٹھکانوں پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا۔ وہ ساری صورت حال سمجھ گیا تھا۔ فاروق بلوچ کو اغواء اور قتل کرنے والے وہی لوگ تھے۔ فاروق بلوچ انہیں ہوم منسٹر عبدالبارق، حیدر عباس اور تین خفیہ ٹھکانوں کا بتا گیا تھا۔ اس گفتگو میں بار بار شانی کا نام پکارا گیا تھا۔ اس کی موجودگی سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ شانی کوئی عام لڑکا نہیں جبکہ پرائیویٹ سراغ رساں ادارے کا سرگرم رکن یا رہنما ہے اور یہ ادارہ ان کے خلاف برسرپیکار ہے۔ یہ بات وہ تھامس کو روانہ کی گئی رپورٹ میں بتا چکا تھا۔ جان رائٹ نے فوراً حیدر عباس کو

بلالیا تھا۔ حیدر عباس نے بتایا تھا کہ ان تینوں ٹھکانوں میں ہمارا اسلحہ سمیت بہت سا دوسرا سامان پڑا ہوا ہے۔ جان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا بحالت مجبوری اس نے حیدر عباس کو تینوں ٹھکانے تباہ کرنے اور عبدالبارق کو راستے سے ہٹانے کا حکم دے دیا تھا۔ اس کے بعد حیدر عباس، جان کے انتہائی قریب آگیا تھا۔

اس وقت وہ ایک اونچی چٹان پر پہنچ کر رک گئے تھے۔ انہیں چٹان کے اس پار اترنا تھا۔ وہ اس انداز میں بیٹھ گئے کہ اس پار والے انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جان نے تھوڑا سا اوپر ہو کر دوسری جانب دیکھا وہ خاصی بلندی پر موجود تھے۔ نیچے مزید چھوٹی چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جان رائٹ نے اشارے سے حیدر عباس کو وہاں دیکھنے کو کہا۔

''جان! چھوٹی چٹانوں کے بعد تقریباً آٹھ دس ایکڑ پر محیط درختوں کا سلسلہ آتا ہے۔ جو یو کی شکل میں ہے اور یو کے بیچ میں ایک میدان ہے اور میدان سے آگے ہماری مطلوبہ طویل وعریض اور قدیم بلڈنگ آتی ہے یہ عالی شان بلڈنگ پہلی نظر میں بوسیدہ اور غیر آباد دکھائی دیتی ہے مگر ایسا نہیں ہے اس کے زیر زمین دنیا آباد ہے۔ عمارت کو جدید ترین حفاظتی نظام سے محفوظ کیا گیا ہے۔ عمارت کے تین اطراف جنگل ہے اور ایک طرف بلند چٹانیں۔ جنگل کے اردگرد کچھ حفاظتی نظام موجود ہے، مقامی لوگوں کی روک کے لیے باڑھ لگائی گئی ہے کیونکہ جنگل سے تقریباً تیس کلومیٹر ادھر شمال کی طرف آبادی ہے۔ اگر باڑھ نہ ہو تو لوگ لکڑیاں کاٹنے کے لیے جنگل کا رخ کر سکتے تھے۔ باڑھ کے ساتھ جنگلی خونخوار جانوروں سے بچاؤ کے لیے تنبیہی بورڈ لگائے گئے ہیں۔''

''عمارت میں جانے کے لیے ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا ہوگا؟''

''یہی جنگل والا۔'' حیدر عباس نے جواباً کہا۔ ڈورتھی اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

'حیدر عباس! جنگل کی بجائے ہم چٹانوں کا راستہ اختیار کرتے تو کیا اچھا نہ ہوگا۔''

''نہیں ڈورتھی! وہاں سے جانا مشکل ہے۔ چٹانوں میں کئی جگہ سکیورٹی فورسز کے جوان مورچہ بند رہتے ہیں جبکہ جنگل میں صرف خفیہ کیمرے نصب کیے گئے ہیں۔''

''حیدر عباس! اندر تمہارے کتنے آدمی موجود ہیں؟''

''دو آدمی۔'' حیدر عباس نے کہتے ہوئے ڈورتھی کو اشارتاً کچھ کہا۔ اس کے اشارے پر ڈورتھی نے ہینڈ بیگ سے ایک نقشہ نکالا۔ حیدر عباس نقشہ لیتے ہوئے ایک جگہ انگلی پھیر کر بولا۔

''ہم یہاں کھڑے ہیں اس چٹان سے ایک راستہ بل کھاتا ہوا نیچے جنگل میں جاتا ہے۔ نیچے اترنے میں ہمیں آدھا گھنٹہ لگے گا۔ اب سے ٹھیک ایک گھنٹہ بعد عمارت میں لنچ بریک ہوگا۔ بریک کے دوران میرا ایک آدمی ان دو کیمروں کو آف کرے گا۔ جبکہ دوسرا آدمی سائرن سسٹم میں خلل ڈالے گا۔ چونکہ ہر آدمی کنٹرول روم میں ہوتا ہے اس لیے جن کیمروں کو وہ آف کرے گا اس کی اطلاع اسے دینا پڑے گی۔ اطلاع کے بعد ٹیکنیشن کو کیمروں تک پہنچنے میں 20 منٹ لگتے ہیں ہمیں نہ صرف ان بیس منٹوں میں جنگل کا ایریا کراس کرنا ہے بلکہ کیمرں میں خلل بھی ڈالنا ہے۔'' حیدر عباس نے نقشے میں لگائے دو دائروں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''گڈ جاب حیدر عباس! چلو ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' جان رائٹ نے تحسین آمیز نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ حیدر عباس پھرتی سے نیچے اترنے لگا۔ اس کی پیروی میں جان اور ڈورتھی بھی نیچے اترنے لگے تھے۔ نقشہ حیدر عباس کے ہاتھ میں ہنوز موجود تھا وہ نقشے پر لگائے گئے نشانات کی روشنی میں چل رہے تھے۔ پچیس منٹ میں وہ نیچے باڑھ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ جہاں وہ کھڑے تھے وہاں جالی کا جوائنٹ تھا ایک نظر میں دیکھنے پر باریک تاریں بندھی ہوئی لگتی تھی۔ مگر حیدر عباس نے انہیں ہاتھ سے جدا کیا تو وہ علیحدہ ہوگئیں اس کے بندے بخوبی کام کر چکے تھے۔ وہ باآسانی جنگل میں داخل ہوگئے تھے۔ حیدر عباس نے ایک درخت کے پاس رک کر ٹائم دیکھا۔ انہیں

ابھی آدھا گھنٹہ انتظار کرنا تھا۔ آدھا گھنٹہ وہ دھیمی آوازوں میں پلان پر ڈسکس کرتے رہے۔ جان رائٹ نے نقشہ اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔ اس لیے آدھے گھنٹے بعد جب وہ جنگل میں چلنے لگے تو جان کے پیروں میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھی۔ حیدر عباس نے پہلا کیمرہ دیکھ لیا تھا۔ جان نے اسے آگے جانے کو کہا۔ حیدر عباس اور ڈورتھی دوسرے کیمروں کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ جان رائٹ کیمروں پر جھک گیا تھا۔ حیدر عباس نے دوسرا کیمرہ تلاش کر کے اس میں ہلکی سی گڑبڑ کر دی تھی۔ پندرہ منٹ میں وہ جنگل کراس کر کے میدان میں پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد عمارت تھی۔ جس کو حیدر عباس نے میدان کہا تھا۔ وہ دراصل عمارت کا وسیع صحن اور اجڑا ہوا لان تھا۔ وہاں وسیع سوئمنگ پول نظر آرہا تھا۔ جو عدم توجہی کی وجہ سے بالکل سوکھا پڑا تھا۔ سوئمنگ پول گرد سے اٹا ہوا تھا۔ میدان میں مصنوعی نہر بنائی گئی تھی۔ مگر عرصہ دراز سے نہر کا پانی رکا ہوا تھا۔ اس پر توجہ نہیں دی گئی جس کی وجہ سے پانی پر کائی جمی ہوئی تھی۔ لان مرجھایا اور سوکھا ہوا تھا۔ سوکھے پتے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ گھاس بھی دھول میں جل گئی تھی۔ سوکھے درخت بھی بہت سے نظر آرہے تھے۔ میدان میں کچھ جنگلی جانور گھوم رہے تھے۔ جہاں وہ لوگ کھڑے تھے وہاں سے طویل و عریض قدیم عمارت صاف نظر آرہی تھی۔ عمارت بھی باہر سے بوسیدہ اور غیر آباد لگتی تھی۔ جان نے سوالیہ نگاہ سے حیدر عباس کو دیکھا۔

''یہی عمارت ہے جان! یہ بظاہر بوسیدہ اور غیر آباد لگتی ہے مگر اس میں جدید ترین حفاظتی نظام لگایا گیا ہے۔ اس کے اندر زیر زمین ایک دنیا آباد ہے۔''

''حیدر عباس! نقشے میں سوئمنگ پول سے چھ میٹر جنوب کی طرف درختوں کے پاس مین ہول ہے جس میں 80 انچ نکاسی آب کا پائپ ہے اس پائپ سے ہم اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جان! چلو برق رفتاری سے مگر احتیاط سے۔'' اونچی گھاس میں کرالنگ کرتے ہوئے مین ہول تک پہنچ چکے تھے۔ تینوں نے مل کر مین ہول کا بھاری بھر کم ڈھکن اٹھایا۔ مین ہول بہت بڑا تھا۔ نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ جان نے ڈورتھی کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور حیدر عباس سے بولا۔

''حیدر عباس! تم یہاں رک کر ہمارا انتظار کرنا باہر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔'' جان نے کہتے ہوئے بیگ سے ٹارچ نکال لی تھی۔

حیدر عباس کو اس کا ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ وہ دونوں واپس لوٹے تو جان اور ڈورتھی کے چہروں پر غیر معمولی جوش ہلکورے لے رہا تھا۔

''آؤ حیدر عباس! ہم کامیاب لوٹے ہیں۔ اب نکلنے کی کوشش کرو۔''

''باہر جانے کے لیے بھی وہی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ جس سے ہم یہاں تک آئے ہیں مگر اس بار کیمرے آف نہیں آن ملیں گے۔''

''اب کوئی فکر نہیں حیدر۔ ہم انہیں توڑ کر نکل جائیں گے۔'' جان رائٹ تیزی سے جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس بار انہوں نے کرالنگ کی بجائے صرف جھکنا بہتر سمجھا تھا۔ جنگل میں پہنچ کر جان بنا کسی ہچکچاہٹ کے کیمروں کو توڑ رہا تھا کیمروں کو توڑتے وقت وہ خود ان کے عقب میں تھا۔ جیسے ہی کیمرے ٹوٹے دور عمارت میں سائرن کی آواز گونجنے لگی تھی۔

''جان! ہمیں جلدی کرنا ہوگی۔ عمارت میں سائرن بجنے لگے ہیں۔'' حیدر عباس نے چونکتے ہوتے کہا۔ وہ لاشعوری طور پر الرٹ ہو گیا تھا۔ جان اور ڈورتھی نے جواباً معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا۔ تاہم وہ کچھ بولے نہیں جس چٹان سے وہ نیچے اترے تھے جیسے ہی اس کی جڑ میں پہنچے عمارت میں کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ وہ لوگ بھی لڑکھڑا گئے تھے۔ جنگل میں پرندوں کے غول بدحواسی میں اڑنے لگے تھے۔ جانوروں کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگی تھی۔ عمارت میں ایک دھماکہ نہیں ہوا تھا بلکہ دھماکوں کا

سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جو وقفے وقفے سے جاری تھا۔ حیدر عباس حیران و پریشان آسمان کی طرف بلند آگ کے شعلوں اور گرد و غبار کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔

''جا...... جان یہ کیا؟'' عمارت کو تباہ کرنا پلان میں شامل نہیں تھا۔ بلکہ خفیہ فائلیں حاصل کرنا تھی۔ حیدر عباس کو حیرت کے جھٹکے سے باہر نکلنے میں دشواری ہو رہی تھی کیونکہ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

''کیوں حیدر عباس تمہیں افسوس ہو رہا ہے اس تباہی پر؟'' ڈورتھی کے لہجے میں ہلکی سے سرزنش تھی۔

''نہیں یہ بات نہیں میں حیران ہوں کہ آپ لوگوں کے پاس تو ایسا کچھ مواد بھی موجود نہیں تھا پھر یہ یکے بعد دیگرے دھماکے۔''

''ایسی عمارت کی تباہی کے لیے مواد کا ساتھ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ مواد تو ان کے اندر بھرا پڑا ہوتا ہے۔''

وہ باتوں کے دوران تیز قدموں سے اس علاقے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس ایک چنگاری کی ضرورت ہوتی ہے اور عمارت راکھ کا ڈھیر۔''

''جان! مجھے نہیں لگتا کہ اس میں کوئی زندہ بچا ہوگا۔''

''مجھے کوئی زندہ چاہیے بھی نہیں، حیدر عباس۔''

''اس میں ہمارے دو خاص بندے تھے جان، ہم ان سے مزید کئی اہم کام لے سکتے تھے۔''

''دوسروں سے زیادہ ہمیں ان دو آدمیوں کی موت چاہیے۔ حیدر عباس، ہم نہیں چاہتے کہ کوئی کلیوا اپنے پیچھے چھوڑیں۔'' جان نے کہا۔ اس نے حیدر عباس کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ عمارت کی تباہی کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہاں سے چرائی گئی فائلوں کا کسی کو پتہ نہیں چلے۔ جان رائٹ کو یقین تھا ماہرین جب اس دھماکے کی تحقیق کریں گے تو انہیں سسٹم کی فنی خرابی کا ہی پتہ چلے گا۔ گم شدہ فائلوں کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ کیونکہ جب آگ لگتی ہے تو سب کچھ بلا تفریق جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ آگ کی آنکھیں اور سوچ نہیں ہوتی۔

⁂

فاروق بلوچ نے تین خفیہ ٹھکانوں کے ساتھ دو نام عبدالبارق اور حیدر عباس بتائے تھے۔ ٹھکانے راکھ اور مٹی کا ڈھیر ہو گئے تھے۔ عبدالبارق اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ مگر حیدر عباس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ سر جی نے حمزہ کی ڈیوٹی حیدر عباس کی تلاش میں لگائی تھی۔ حمزہ زیر زمین دنیا میں گھوم پھر کے دیکھ چکا تھا۔ حیدر عباس کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ سر جی کے توسط سے وہ نادرا آفس سے فاروق بلوچ کے حلقے کے تمام حیدر عباس نامی اشخاص کے ایڈریس بھی لے کر چیک کر چکا تھا۔ تیس کے قریب لوگ تھے جو حیدر عباس یا عباس حیدر کے نام سے رجسٹرڈ تھے۔ مگر ان کی خفیہ نگرانی سے ان کے عام شہری ہونے کا پتہ ملا تھا۔ اب وہ کسی تیسرے آپشن پر غور کر رہا تھا۔ اس موقع پر شہریار نے اچھی خبر سنائی تھی۔

''حمزہ بھائی! زیر زمین دنیا کا ایک گروپ پیلا گروپ کے نام سے مشہور ہے۔ پیلا گروپ کا سرغنہ عارف شکیل ہے اس کا ایک اہم بندہ میرے ہتھے چڑھا ہے۔ جس نے چونکا دینے والے انکشافات کیے ہیں۔'' شہریار لحظہ بھر رکا تو حمزہ بے چینی سے موبائل دوسرے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔

''بولو۔ شہریار! میں سن رہا ہوں۔''

''حمزہ بھائی! عارف شکیل کے ہاتھ سرحد پار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا گروپ اسلحہ اور انسانی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ بہت سے غیر ملکی شر پسند عناصر اسے جدید اسلحہ مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے مفت فراہم کرتے ہیں۔ عارف یہ اسلحہ فرقہ وارانہ وارداتوں میں ملوث گروپوں کو فروخت کرتا ہے۔ اس کے کسٹمرز میں سب سے زیادہ اور بھاری تخمینہ پر اسلحہ خریدنے والا شخص حیدر عباس ہے۔ جو اسلحہ مذہبی فرقہ واریت کی وارداتوں میں استعمال کرتا ہے۔'' حیدر عباس نام سن کر حمزہ اچھل پڑا۔

''حیدر عباس جسے ہم تلاش کر رہے ہیں۔''

''ہاں حمزہ بھائی! وہی حیدر عباس وہ عارف کو منہ سے

مانگی رقم پیش کرتا ہے تاہم وہ یہ نہیں جانتا کہ عارف یہ اسلحہ کہاں سے لاتا ہے۔ عارف شکیل، حیدر عباس کے ہاتھوں اغواء کیے گئے کئی مذہبی راہنما سرحد پار پہنچا چکا ہے۔"

"اوہ! اس کا مطلب ہے حیدر عباس ہی نہیں عارف شکیل بھی ان غداروں میں شامل ہے۔ جن کا وجود پاک دھرتی سے مٹانا ہوگا۔ یہ گندگی ہماری پاک سرزمین پر بوجھ ہے۔ عارف شکیل کا کچھ پتہ چلا۔ وہ کہاں ملے گا؟" حمزہ نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"ان دنوں وہ ایران گیا ہوا ہے۔ پرسوں اس کی واپسی ہوگی۔"

"سرحد پار آنے جانے کے لیے وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔"

"سمندری راستہ۔"

"عارف شکیل! مجھے بڑی مچھلی دکھائی دے رہا ہے۔ یہ کام کسی عام گروپ کا نہیں ہوسکتا۔ ان کے ہاتھ یقیناً اوپر تک ہوں گے۔ ہم کئی سفید چہروں سے جھوٹ کا ملمع اتار سکتے ہیں۔" حمزہ نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں حمزہ بھائی۔"

"شہریار! تم شاہ میل اور صداقت تیار رہنا۔ میں پرسوں عارف شکیل سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں اور ہاں اس آدمی پر گہری نگاہ رکھنا ہمیں اس سے مزید اہم باتیں پتہ لگ سکتی ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں حمزہ بھائی، میں اسے ایسی حالت میں لے آیا ہوں کہ وہ صرف بول اور دیکھ سکتا ہے۔ کچھ کرنے کی سکت سے محروم ہو چکا ہے۔"

حمزہ نے رابطہ منقطع کیا اور فوراً سر جی کو کال ملائی۔ سر جی کے لائن پر آتے ہی حمزہ نے انہیں پوری تفصیل بتائی جسے سن کر وہ بولے۔

"یہ بہت بڑی کامیابی ہے حمزہ اور تمہارا خیال مجھے درست لگتا ہے ہوسکتا ہے عارف شکیل ہمارے لیے حیدر عباس سے زیادہ اہم ثابت ہو۔"

"جی ہاں سر جی! جب اس گروپ کا ایک عام شخص اتنا کچھ جانتا ہے تو سرغنہ کیا کچھ انکشاف کرسکتا ہے۔"

"عارف شکیل جیسے ہی سرحد پار سے لوٹے اسے دبوچ لو۔ میں اس طرف بھی رابطہ کرتا ہوں۔" سر جی نے کہا۔ حمزہ کو شانی کا خیال آیا تو وہ بولا۔

"سر جی! شانی سے کافی دن ہوئے بات نہیں ہوئی۔"

"شانی بھی بہت کامیاب جارہا ہے۔ حمزہ، پچھلے کئی دنوں سے اس نے بہت سی اہم کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ ہر مہینے کے آخر میں ہم لوگ ایک میٹنگ میں اکٹھے ہوا کریں گے تاکہ ایک دوسرے سے مل بیٹھنے کا موقع بھی میسر آسکے۔ ٹھیک ہے سر جی۔" حمزہ نے کہا۔ سر جی نے رابطہ کاٹ دیا تھا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

کرہ ارض کے تمام ممالک معاشی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ توانائی چاہتے ہیں۔ تیل اور گیس توانائی کے بنیادی عنصر ہیں۔ جن ممالک نے ان کے ذخائر سمیٹے وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے اور ملک کو ترقی کی بلندیوں پر لے گئے ہیں۔ تیل اور گیس پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے کئی ترقی یافتہ قوموں نے ایک دوسرے کو بچھاڑنے کی کوشش کی ہے۔ مغرب نے مشرق کو لوٹا ٹرنے کی کوشش کی ہے۔ توانائی کے حصول کے لیے جتنی اہمیت خشکی کی ہے اتنی اہمیت سمندر کی ہے۔ ستر فیصد تیل کی ترسیل کا راستہ سمندر ہے اس کے علاوہ دنیا برآمدات و درآمدات کے لیے نوے فیصد بحری جہازوں پر انحصار کرتی ہے۔ ایشیائی اور خلیجی ممالک کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔ خصوصاً تیل اور گیس کے لامحدود ذخائر ہیں مغرب والے چاہتے ہیں یہ سارے کے سارے وسائل ان کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آن گریں اس خواہش کی تکمیل کے لیے مغربی اتحادی بشمول امریکہ بحرالہند پر اپنی برتری ثابت کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کیونکہ خلیجی ریاستیں اور مڈل ایسٹ کے ممالک تیل و گیس پیدا کرنے میں اہم مقام رکھتے ہیں اوپر سے کچھ ریاستیں بحرالہند میں موجود ہیں اور کچھ بحرالہند کے

راستوں میں پڑتی ہیں امریکہ بحرالہند کو ترجیح بنیادوں پر حاصل کرنے کا خواہاں رہا ہے۔ امریکہ کے سابق ایڈمرل الفریڈ نے 1914ء میں ہی کہہ دیا تھا اگر ہمیں کرہ ارض کے ممالک پر حکمرانی کرنی ہے تو بحرالہند پر اپنی بالادستی قائم کرنا ہوگی۔ شاید تبھی سے بحرالہند امریکہ توجہ کا مرکز بنا تھا۔ مگر سوویت یونین آڑے آتا رہا کیونکہ سوویت یونین کی موجودگی میں بحرالہند سے زیادہ بحراہلکاہل ضروری تھا۔ مگر سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے کے بعد بحرالکاہل سے بحرالہند کئی گنا زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ 48 ممالک کی سرحدیں بحرالہند سے ملتی ہیں۔ جن پر بلواسطہ یا بلاواسطہ امریکہ کا ہی سکہ چلتا ہے 58 مسلم ممالک میں امریکہ کی حکمرانی چلتی ہے ان تمام ممالک میں کہیں اعلانیہ اور کہیں خفیہ امریکی فوجی اڈے قائم ہیں کویت، بحرین، سعودی عرب، مسقط، عمان، مصر کی اہم دس بندرگاہوں کے ساتھ ساتھ اہم ترین گزرگاہ نہر سویز سب پر امریکی بالادستی ہے۔ ان سب سمندری گزرگاہوں میں 90 سے زیادہ دیوہیکل بحری جہاز ہر وقت دندناتے پھرتے ہیں جن کا مالک امریکہ ہے۔ مغرب جانتا ہے یہاں بے شمار لامحدود اور عظیم قدرتی وسائل موجود ہیں مغربی تھنک ٹینکس بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا میں توانائی کے ذخائر کہاں کہاں موجود ہیں۔ مگر ان کے اذہان وقلوب میں چین کی ہوشربا ترقی بے چینی اور اضطراب انڈیل چکی ہے۔ اوپر سے چین کا جھکاؤ اسلامی ملک پاکستان کی طرف ہمیشہ سے زیادہ رہا ہے۔ جبکہ مغرب نے مختلف حیلے بہانوں سے پاکستان کی معیشت کو تباہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں بھی چین ہی آڑے آجاتا ہے۔ جس نے ہمیشہ پاکستانی معیشت کو سہارا بخشا ہے۔ چین اور پاکستان کو لگام دینے کے لیے امریکہ نے افغانستان میں پاکستان کے ازلی دشمن انڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ ساتھ ہی انڈیا سے سول ایٹمی معاہدہ بھی کر لیا تھا۔ ان سارے معاملات میں بظاہر امریکہ تن تنہا پیش پیش ہے مگر ڈیوڈ جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا کام جو نیو ورلڈ آرڈر کی طرف جاتا ہے اس میں اسرائیل کی شمولیت ناگزیر ہوتی ہے۔ دنیا کو فتح کرنے کے ماضی بعید، ماضی قریب یا حال میں جتنے بھی منصوبے بنے ہیں۔ ان کے پیچھے ڈیوڈ جوہانسن کا ہاتھ تھا۔ ڈیوڈ کے شاطر دماغ نے نت نئے تجربات اگلے ہیں حال ہی میں اس کا ایک اور کامیاب تجربہ تکمیل کو پہنچا تھا۔ ڈاکٹر وائٹ کا ایم کے الٹرا کا تجربہ مائیکروچپ کے امتزاج سے سو فیصد کامیاب کر دیا تھا۔ ایم کے الٹرا کے استعمال میں بس اب یہی قباحت تھی کہ مائیکروچپ ہر شخص کے پاس ہونا ضروری تھی۔ ڈیوڈ کی نظر میں آج کل یہ معمولی کام ہے۔ کیونکہ مائیکروچپ کسی نہ کسی شکل میں ہر فرد کی جیب میں منتقل ہو رہی تھی۔ ڈیوڈ جوہانسن نے اسرائیلی پارلیمنٹ سے سترہ کروڑ ڈالرز کا بل منظور کرنے کی درخواست دی تھی۔

اسرائیلی وزیر داخلہ گورین، چیف منسٹر آف تل ابیب، نیل ایلڈرن اور موساد کے ڈائریکٹر ریمنڈسن توانائی کے وزیر کی طرف سے دیئے گئے ظہرانے میں شریک تھے۔ کھانے کے بعد وہ ایک طرف بیٹھ گئے تھے۔ وزیر داخلہ گورین ڈیوڈ کی درخواست پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

''آپ لوگوں کو پتہ چل ہی گیا ہوگا۔ ڈیوڈ جوہانسن نے اسرائیلی پارلیمنٹ سے سترہ کروڑ ڈالرز کا بل منظور کرنے کی درخواست دی ہے۔''

''جی ہاں یہ بات ہمارے علم میں ہے۔ مگر درخواست میں مسٹر ڈیوڈ نے وضاحت نہیں کی کہ یہ خطیر رقم اسے کس سلسلے میں چاہیے۔'' ریمنڈسن نے کہا۔

''درخواست وصول ہوتے ہی ہم نے مسٹر ڈیوڈ کو آفس میں بلایا تھا۔ ڈیوڈ اسرائیل کی قدآور شخصیت ہیں۔ اسرائیل کو عظیم تر اسرائیل بنانے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔'' نیل ایلڈرن نے انہیں بتایا۔

''یہ بات بالکل سچ ہے سر۔'' ریمنڈسن نے جواباً کہا۔

''ڈیوڈ نے ایک اور اہم قدم اٹھایا ہے۔ جس کے لیے انہوں نے سترہ کروڑ ڈالرز کی ڈیمانڈ کی ہے۔ وہ قدیم ترین

بندرگاہ ہیمین ہے۔ٹوٹا کے عین سر پر خلا میں نیا پروجیکٹ کھولنا چاہتے ہیں۔" نیل ایلڈرن نے کہا

"ہم کچھ خاص سمجھے نہیں۔"

"میں تفصیل سے بتاتا ہوں ہیمین ٹوٹا کی دوسری اہم خصوصیات میں دو بہت اہم ہیں۔ایک یہ کہ بحر الہند کے انتہائی اہم تجارتی راستے پر واقع ہے یہ راستہ ایشیاء اور یورپ کو باہم منسلک کرتا ہے یعنی آبنائے ملاکا نہر سویز سے ملاتا ہے۔اس کی دوسری انفرادیت یہ ہے کہ بحر الہند اور بحر الکاہل کے درمیان تجارتی راستہ فراہم کرتی ہے اسی میں ابنائے ملاکا بھی شامل ہے جس سے سالانہ پچاس ہزار تجارتی بحری جہاز گزرتے ہیں جبکہ خاص ہیمین ٹوٹا سے سالانہ 36 ہزار بحری جہاز گزرتے ہیں ان تجارتی بحری جہازوں میں 4500 آئل ٹینکر شامل ہیں۔مسٹر ڈیوڈ کا کہنا ہے کہ ہم ہیمین ٹوٹا بندرگاہ کے سر پر خلا میں ایسا خلائی پروجیکٹ بنائیں گے کہ ہم اسرائیل میں بیٹھے بٹھائے ان راستوں سے گزرنے والے جہازوں کا سامان غائب کر سکتے ہیں۔"

"یہ تو انتہائی حیران کن بات ہے۔"

"جی ہاں! اس کا مطلب یہ ہوگا اس راستے پر جو بھی ہماری مرضی کے بغیر سفر کرے گا وہ اپنے سامان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔مسٹر ڈیوڈ کا کہنا ہے کہ جہاز کا تمام میٹریل ایسے غائب ہوگا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔حتیٰ کہ آئل ٹینکروں سے آئل بھاپ بن کر خلا میں ہمارے پروجیکٹ میں چلا جائے گا۔جہاں سے اسے ہم پھر سے آئل میں تبدیل کر سکتے ہیں۔"

"اوہ! اس قدر حیران کن منصوبہ۔" وہ سبھی چونک پڑے تھے۔

"اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ ڈیوڈ جوہانسن کا منصوبہ ہے۔جس نے ہمیشہ مافوق الفہم منصوبے تیار کیے ہیں اور انہیں کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے بل ضرور منظور ہونا چاہیے۔"

"جی ہاں اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔" ڈیوڈ کی درخواست پر تینوں اہم شخصیات پوری طرح متفق تھی۔

❁......❁......❁

"طارق ایسا ممکن نہیں ہے تمہیں اس وقت تین گولیاں لگی تھی اور تم نیم غنودگی میں تھے یہ تمہارا وہم بھی ہو سکتا ہے اور آنکھوں کا دھوکہ بھی۔"

"نہیں شانی بھائی! میں اس وقت زخمی ضرور تھا مگر پورے ہوش و حواس میں تھا۔طارق نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔" وہ ابھی تک اسپتال میں زیر علاج تھا۔اس دوران شانی دو بار اس کی تیمارداری کے لیے آچکا تھا۔تاہم پہلے طارق کو اس موضوع پر بات کرنے کا موقع میسر نہیں آیا تھا۔

"میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔جب بروج نے فل اسپیڈ میں آنے والی گاڑی کو کھلونے کی طرح ہاتھوں پر اٹھایا تھا۔میں تب سے اب تک ناقابل یقین حالت میں گرفتار ہوں۔" طارق کا پر اعتماد لہجہ بتا رہا تھا اسے اپنی کہی باتوں پر سو فیصد یقین ہے۔طارق نے شانی کو کھویا ہوا دیکھا تو بولا۔

"شانی بھائی! جب آپ کو بروج ہوش میں لایا تب بھی گاڑی کی فیول ٹینکی پھٹنے سے کھیتوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ہماری گاڑی تو راستے میں کھڑی تھی پھر وہ دس پندرہ میٹر دور کھیتوں میں کیسے جا پہنچی؟" طارق کا اٹھایا ہوا سوال قابل غور تھا۔جب شانی آدمی سے لڑ رہا تھا تب ان کی گاڑی راستے ہی میں موجود تھی۔

"راجہ جنید صاحب نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تھا......" طارق نے شانی کے پرسوچ چہرے کو دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"راجہ صاحب گاڑی کھیتوں میں جانے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔"

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ بروج میڈم کے بارے میں بات آگے بڑھاؤں۔اس لیے لاعلمی کا اظہار

کیا تھا۔"

"یہ آپ نے دانش مندی کا کام کیا ہے۔ آپ جلدی سے صحت یاب ہوجائیں میں نے راجہ جنید سے بات کرلی ہے آپ کو مستقل میرے ساتھ کام کرنا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" شانی کے لہجے میں دادو تحسین تھی۔

شانی اسپتال سے نکلا تو بروج کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ وہ بروج کو گھر تک جانتا تھا وہ گوریا بستی کی عام سی لڑکی تھی۔ ہاں البتہ ان کے گروپ میں شمولیت اور شانی کے ساتھ آنے سے بے حد پر اعتماد بنا دیا تھا۔ وہ بہت ہوشیار و چالاک ہوگئی تھی۔ اس نے بہت جلد لڑائی کے تمام رموز سیکھ لیے تھے۔ مگر پھر بھی وہ مافوق الفہم لڑکی ہرگز نہیں تھی۔ طارق اسپتال کے تیسرے فلور پر ایڈمٹ تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے شانی کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ شانی طارق کے روم سے نکل کر دائیں جانب کی راہداری میں مڑ گیا تھا۔ اسی وقت بروج ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ پکڑے سامنے کے دروازے سے داخل ہوئی تھی۔ وہ شانی کی موجودگی سے لاعلم تھی۔ طارق کے ذہن پر بروج ہی سوار تھی۔ جب وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو بستر پر لیٹے ہوئے طارق کے چہرے پر انجان سا خوف پھیل گیا تھا۔ لحظہ بھر وہ اسے اپنا وہم سمجھا تھا مگر بروج کی آواز نے اسے حقیقت کا یقین دلایا۔ بروج اسے گلدستہ پیش کرتی ہوئی بولی۔

"تم کیسے ہو طارق؟ ایم سوری مصروفیت کی وجہ سے اتنے دن آنہ سکی۔" گلدستہ لیتے ہوئے طارق کے ہاتھوں میں لاشعوری طور پر کپکپاہٹ آگئی تھی۔ جسے بروج نوٹ نہ کرسکی تھی۔ طارق نے خود کو سنبھالا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

"میں ٹھیک ہوں میڈم بروج۔ یہ آپ لوگوں کی محبت اور خلوص ہے ابھی چند منٹ پہلے ہی شانی بھائی بھی مل کر گئے ہیں۔"

"اوہ! شانی یہاں آیا تھا۔" بروج نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"کب؟"

"ابھی ابھی تو گئے ہیں راستے میں ملے نہیں؟"

"نہیں تو۔" بروج کہتی ہوئی کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ اسپتال کا پارکنگ ایریا اس طرف تھا اس نے نیچے جھانک کر دیکھا شانی کار کا لاک کھول رہا تھا۔ بروج پھرتی سے پلٹی اور بولی۔

"ایم سوری طارق میں پھر آؤں گی۔ میرا شانی سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"اوکے میڈم کوئی بات نہیں۔" طارق کا جواب سنتے ہی وہ باہر نکل آئی۔ بروج تیز قدموں کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ ابتداء میں ہی ایک کھڑکی باہر کی طرف کھل رہی تھی۔ اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہوکر نیچے دیکھا شانی گاڑی ریورس کررہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کا راستہ اترنے میں جتنی بھی پھرتی دکھاتی شانی کو جالینا بہت مشکل تھا۔

بروج نے ہاتھ آگے بڑھا کر کھڑکی کی چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑا اور اچھل کر اوپر پہنچ گئی۔ کھڑکی میں پل بھر کو رکی اور نیچے چھلانگ لگادی۔

شانی بیک مرر میں دیکھتے ہوئے گاڑی ریورس کرنے میں مگن تھا۔ جب شیشے پر دستک ہوئی بروج کو دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔

"بروج تم یہاں......؟"

"ہاں طارق کے پاس آئی تھی۔ وہاں سے پتہ چلا تم بھی یہاں ہو تو معذرت کرکے فوراً نکل آئی۔" بروج جھٹ سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے طارق کو دوسری بار حیران و پریشان کیا تھا۔ بروج جیسے ہی اس کے کمرے سے نکلی تھی وہ فوراً اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا آیا تھا تاکہ دیکھ سکے شانی واقعی یہاں سے نظر آتا ہے۔ شانی کو اس نے ایک نظر ہی گاڑی ریورس کرتے دیکھا تھا دوسرے لمحے وہ ایسے اچھلا جیسے اس کے پاؤں میں بم پھٹ گیا ہے۔ اچھلنے سے اس کے زخموں سے شدید ٹھیسیں اٹھنے لگی تھی۔ مگر حیرت اور پریشانی میں وہ اپنا درد بھول بیٹھا تھا۔ بروج شانی کی گاڑی کا شیشہ کھٹکھٹا رہی

تھی۔ بروج کا کمرے سے نکلنے اور طارق کی کھڑکی تک آنے میں بمشکل ایک منٹ صرف ہوا ہوگا۔ تیسری منزل سے سیڑھیوں کے ذریعے اتنے قلیل وقت میں بروج شانی کے پاس کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہ بھی ایسے کہ طارق کو وہاں دیکھنے کے باوجود یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ کس طرف سے آئی ہے۔ طارق نے پلکیں جھپکائیں اور بروج کو شانی کی گاڑی پر جھکے ہوئے پایا۔ طارق نے سر کو جھٹکا دیا وہ خود کو باور کروانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کوئی خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے بروج ایک منٹ سے پہلے شانی کی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکی تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بیڈ پر آ کر ٹک گیا۔ بروج کی ذات اس کے لیے مسلسل پر اسراریت میں ڈوبی جا رہی تھی۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا یہ پر اسرار بات راجہ جنید کو بتائی جائے یا پھر شانی کو ایک بار پھر بروج سے متنبہ کیا جائے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

یہ شانی کا بے پناہ پیار تھا یا بروج کے بے مثل حسن کا کرشمہ، جس بات نے شانی کو سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبو رکھا تھا۔ وہ بروج کے سامنے آتے ہی ذہن سے محو ہو گئی تھی۔

''شانی! ہر وقت بزی رہتے ہو۔ اب تو تمہیں دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس جاتی ہیں۔'' بروج کے لہجے میں پیار اور شکوے کا حسین امتزاج تھا۔ شانی نے ایک مسکراتی نظر اس پر ڈالی پھر روڈ پر نگاہیں جماتے ہوئے بولا۔

''بروج! ابھی چند دن پہلے تو ڈنر پر ملے تھے۔ جو اتنا طویل ہو گیا تھا کہ شاید ہوٹل والے بھی ہم سے عاجز آ گئے تھے۔''

''ہاں تبھی انہوں نے دگنا بل کاٹا تھا۔'' بروج نے ہلکا سا شوخی بھرا قہقہہ لگایا۔ شانی بھی جواباً مسکرا دیا تھا۔

''شانی! تم نے ممی اور منزہ سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا۔ کب مل رہے ہو؟''

''آج کل انہوں نے نثار پور میں ڈیرے جما رکھے ہیں جیسے ہی واپس لوٹتی ہیں ملا دوں گا۔''

''اس کا مطلب ہے تم ان دنوں گھر میں اکیلے ہو؟''

''نہیں تو۔''

''کوئی ہے ساتھ میں؟''

''ہاں۔''

''کون؟''

''وہی حسن جس پر فریفتہ ہے اس کی خوبصورت یادیں۔ گھنگرو کی طرح چھن چھن بجتی باتیں اور شوخ و چنچل ادائیں۔'' شانی فل رومانٹک موڈ میں ڈھل چکا تھا۔ گاڑی کے اندر پیار کا دلفریب ماحول بن چکا تھا۔ بروج کی محبت اگلتی آنکھیں شانی کے چمکتے چہرے کو تک رہی تھیں۔

''ایسی خوش قسمت کون ہے؟'' بروج سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن گئی تھی۔ اس کی یہ ادا بھی نرالی تھی شانی نے اسے شریر آنکھوں سے دیکھا۔ وہ شرم و حیا سے سرخ ہوتی ہوئی بولی۔

''ایسے مت دیکھو شانی۔ اتنی مضبوط نہیں ہوں میں۔ ان آنکھوں کی تپش سے پگھل جاؤں گی۔''

''کیا تم نہیں جانتیں بروج! میری تنہائیوں کی سفیر خوش قسمت کون ہے؟''

''تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔'' بروج کا ہاتھ دوپٹے سے کھیل رہا تھا۔ شانی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''تمہارے سوا کون ہو سکتا ہے۔''

شانی کے ہاتھ کا انوکھا لمس پا کر بروج کے اندر بجلیاں دوڑ گئی تھیں۔

''تھینک یو شانی! تم نہ ہوتے تو آج میں زمین کے دو گز نیچے ہوتی۔''

''ایسی باتیں مت کرو بروج۔''

''ہاں شانی! میرے گھر سے ماں باپ بہن بھائی کے اکٹھے جنازے اٹھے ہیں ایک رات میں میری دنیا اجڑ گئی تھی۔ کوئی پتھر دل انسان بھی اتنے بڑے گھاؤ برداشت

نہیں کر سکے گا۔ مگر میں نے تمہارے سہارے پر کیے ہیں۔"

"بروج مقدر کی منطق سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ میری بہن کنزہ نے میری باہوں میں دم توڑ دیا تھا۔ ڈیڈی میری تلاش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہم انسان ہیں بروج مقدر کا لکھا بہر حال سہنا پڑتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو شانی۔ تم نے مجھے کہا تھا تم فلسطین میں گولان کے پہاڑوں میں جنات کے پاس تھے جب تمہارے ڈیڈی کی موت ہوئی تھی۔" بروج نے کہا۔

"ہاں بروج میں خود حیران تھا۔ میں نے جنات کی بستی میں پورا ڈیڑھ سال گزارا تھا اور بروج جتنا میں نے ان سے ڈیڑھ برس میں سیکھا ہے ویسا پہلے کبھی نہیں سیکھ پایا۔" بروج نے حیرت زدہ آنکھوں سے اسے دیکھا۔ شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"کچھ باتیں میں وہاں سمجھ نہیں رہا تھا بوڑھے جن نے مجھ سے کہا تھا کبھی اپنی زندگی میں لوٹ کر گئے تو میری باتوں پر غور کرنا۔ سب جان جاؤ گے۔ میں اب اس دنیا پر غور کرتا ہوں تو مجھے ان کی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔" شانی نے دائیں جانب گاڑی ٹرن کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا باتیں تھی شانی مجھے بھی بتاؤ نا۔"

چھوڑو پھر کبھی بتاؤں گا۔ آؤ یہاں اچھی سی کافی پیتے ہیں۔ شانی نے گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے کھڑی کر دی تھی۔ بروج گہرا سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ شانی فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ دوران کال شانی کے چہرے پر اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی۔ دس منٹ بعد کال ختم ہوئی تو وہ بولا۔

"سر جی کا فون تھا۔ انہوں نے انتہائی اہم خوشخبری سنائی ہے۔" شانی کے لہجے میں خوشی کی جھلک واضع تھی۔ اس نے سر جی سے ہونے والی باتوں کا متن بروج کو بتایا۔

"واقعی شانی! عارف شکیل بہت اہم ثابت ہوگا۔ اگر کل حمزہ اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو عین ممکن ہے حیدر عباس بھی ہماری مٹھی میں ہو۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا بروج۔"

"ویسے حمزہ کے ساتھ ہمیں بھی جانا چاہیے۔ عارف شکیل خطرناک آدمی ہے۔"

"حمزہ اکیلا نہیں ہے بروج! اسے طلحہ کا گروپ کور کرے گا۔" شانی نے بروج کو پوری تفصیل بتائی۔

کافی پینے کے لیے وہ ہوٹل کے باہر بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ باہر کا ماحول اچھا تھا۔ شام ڈھلنے کے وقت نے اسے خوبصورت بنا رکھا تھا۔ چاروں طرف پودوں کے گلدان رکھے گئے تھے۔ برقی قمقمے متفرق رنگوں کے فٹبال نما بڑے بلب خوبصورت آرائش سے سجے سائن بورڈ اس پر شانی اور بروج کی آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارتا پیار کا سمندر چار سو محبت کے رنگ بکھیرنے لگے تھے۔ ہوا کے تیور محبتوں میں ڈھل گئے تھے۔ جب تک ان کا آرڈر سرو ہوتا وہ آنکھوں اور باتوں سے ایک دوسرے پر پیار کے پھول نچھاور کرتے رہے تھے۔ وہ شمالاً جنوباً آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ شانی کی دائیں جانب روڈ تھا۔ روڈ بھی شمالاً جنوباً تھا شانی نے دائیں جانب گردن موڑ کر روڈ پر خراٹے بھرتی گاڑیوں کو دیکھا معاً وہ اچھل پڑا۔ ایک لینڈ کروزران کے بالکل سامنے رکی تھی۔ اس میں تین چار آدمی سوار تھے۔ شانی نے شاٹ گن کی جھلک دیکھی تو زور سے بروج کو آواز دی۔

"بروج......" کہتے ہوئے اس نے پیچھے کی طرف قلابازی کھائی۔ کرسی الٹ گئی تھی۔ یہی حرکت بروج نے بھی دہرائی تھی اس دوران فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی تھی۔ چند سیکنڈز پہلے جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں گولیوں کی بوچھاڑ برسی تھی۔ جس سے برتن کرسیاں ٹیبل اڑنے لگے تھے۔ یکدم بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ہوٹل کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ فٹ پاتھ پر چلنے والے بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے۔ کچھ وہیں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ شانی نے گرتے ہی پسٹل نکال لیا تھا۔ مگر گاڑی فائرنگ کرنے کے بعد آگے بڑھ گئی تھی۔ گاڑی کے چلتے ہی شانی پھرتی سے اٹھا اور اپنی گاڑی کی طرف دوڑ لگا دی۔

اس نے مڑ کر نہیں دیکھا' بروج سے پیروی کا اسے یقین تھا۔ گری ہوئی کرسیاں اور ٹیبل پھلانگتا ہوا اس نے لینڈ کروزر کو نگاہ میں رکھا تھا۔ لینڈ کروزر آگے جا کر پل بھر رکی تھی پھر دائیں جانب مڑ گئی تھی۔ اس دوران شانی اس کا نمبر ذہن نشین کر چکا تھا وہ جیسے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بروج بھی کھٹک سے اندر آ چکی تھی۔ وہ بیٹھتے ہی تیز آواز میں بولی۔

''شانی گاڑی دائیں طرف کی گلی میں مڑی ہے۔ یہ گلی بھی آگے جا کر مین روڈ سے ملتی ہے تم سیدھا چلو ہم انہیں جالیں گے۔'' بروج کی بات سے پہلے شانی ہم نواز کو گاڑی کا نمبر بتا کر حکم دے چکا تھا کہ وہ لینڈ کروزر کا پیچھا کرے۔

ہم نواز نے اسے پہلی خبر یہ دی کہ جس گلی میں لینڈر کروزر مڑی تھی وہاں پہلے سے سفید رنگ کی ٹویوٹا کار موجود تھی۔ کروزر سے تین آدمی نکل کر اس میں بیٹھ گئے تھے۔ کروزر کو اب ایک اور ڈرائیور خالی بھگا رہا تھا۔ جبکہ وہ تین آدمی ٹویوٹا کار میں جا رہے تھے شانی نے اسے تعاقب جاری رکھنے کی ہدایت کی اور ہم نواز کے بتائے گئے روڈ پر اپنی گاڑی ٹرن کر لی۔

''شانی! فائرنگ سے وہ بیرا زخمی ہو گیا ہے۔ جو ہمارا آرڈر لے کر آ رہا تھا۔'' بروج نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

شانی ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا ہاں میں دیکھ چکا ہوں۔'' شانی کے چہرے پر چٹانوں سی سنجیدگی اور سختی تھی روڈ پر رش بڑھ گیا تھا اسے ڈرائیونگ میں دشواری ہو رہی تھی۔ ہم نواز نے اسے دوسری خبر پہنچا دی تھی۔ ٹویوٹا کار جہاں داخل ہوئی تھی وہاں قاسم پہلے سے نگرانی پر مامور تھا۔ بروج اور شمس سے جو لوگ ملے تھے انہوں نے دو نام بتائے تھے۔ شیخ منیر اور اقبال خان۔ مہران نے بھی شیخ منیر کا نام لیا تھا۔ اقبال خان جوس کارنر اور ریسٹورنٹ کا مالک تھا۔ شانی نے اقبال خان کو اٹھوا لیا تھا اور شیخ منیر کی کوٹھی کی نگرانی پر قاسم کو لگا دیا تھا۔ اب ان پر فائرنگ کرنیوالے لوگ بھی شیخ منیر کی کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔ شیخ منیر کی کوٹھی جی 123 کے علاقے میں واقع تھی۔ شانی اب مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شمس کو کال ملاتے ہوئے کہا۔

''شمس! تین چار آدمی لے کر فوراً جی 123 پہنچو تاہم وہاں پہلے سے موجود ہے۔ میں اور بروج بھی وہیں آ رہے ہیں۔'' شانی چند منٹ شمس کو ہدایت دیتا رہا بروج اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ کال منقطع ہوتے ہی وہ بولی۔

''شانی! ان آدمیوں کو چھوڑ کر اچانک جی 123 پر حملہ۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔'' بروج کے لہجے میں حیرت تھی۔

''یہ آدمی بھی شیخ منیر کی کوٹھی میں گئے ہیں۔'' شانی کے جواب نے اس کی حیرت دو چند کر دی تھی۔ وہ اس اطلاع کا پس منظر پوچھنا چاہ رہی تھی۔ مگر خاموش ہو گئی۔ شانی ایک بار پھر موبائل کان سے لگا چکا تھا۔ وہ قاسم سے صورت حال کی خبر لے رہا تھا۔ قاسم نے بھی سفید ٹویوٹا کار کے اندر جانے کی تصدیق کر دی تھی۔ قاسم نے یہ بھی بتایا تھا شیخ منیر بھی چند منٹ پہلے اندر داخل ہوا ہے۔

شانی کے لیے یہ موقع اچھا تھا۔ وہ سب کو دبوچ سکتا تھا۔ بروج اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ شانی شیخ منیر کی کوٹھی کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے وہ نیچے اتر آئے۔

''بروج اردگرد کا خیال رکھنا میں قاسم سے مل کر آتا ہوں۔'' بروج ایک گلی کے سرے پر رک گئی تھی۔ شانی ٹہلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ قاسم شیخ منیر کی کوٹھی سے تھوڑا آگے چھوٹے سے میدان میں بچوں کا جھولا لگائے کھڑا تھا۔ چار پانچ بچے جھولے میں سوار تھے۔ شانی قاسم کی طرف ہی آ رہا تھا۔ ہم نواز نے ایک خبر سنا کر اسے چونکا دیا تھا۔

''شانی! ان لوگوں کو تمہارے حملے کا پتہ چل گیا ہے۔ اب وہ یہاں سے نکل رہے ہیں۔''

''اوہ! مگر کیسے......؟'' شانی بری طرح چونک پڑا تھا۔

''پتہ نہیں شانی۔ مگر دوران گفتگو انہوں نے کہا ہے کہ تم ان پر حملہ کرنے والے ہو۔ وہ تمہارے نام سے بھی واقف ہیں۔'' شانی اس خبر پر حیران و پریشان تھا۔ وہ ہم نواز سے بولا۔

''تم ان کا پیچھا کرتے رہو میں انہیں مزید ڈھیل نہیں دے سکتا۔ ہم انہیں راستے میں ہی پکڑ لیں گے۔'' شانی واپس اپنی گاڑی کی طرف پلٹ گیا تھا۔ اسے گاڑی میں سوار ہوتے دیکھ کر بروج بھی بیٹھ گئی تھی۔

''کیا ہوا شانی؟''

''سمجھ نہیں آ رہی بروج' انہیں ہمارے حملے کی اطلاع ہو چکی ہے۔''

''شانی! سمجھ تو مجھے بھی نہیں آ رہی تم مسلسل مجھے وہ باتیں بتا رہے ہو جو تمہیں کوئی بھی دوسرا شخص نہیں بتا رہا۔'' بروج کے لہجے کی حیرت برقرار تھی۔ شانی کو اپنی عجلت کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ کوئی معقول بہانہ تراش رہا تھا کہ شیخ منیر کی کوٹھی سے آگے پیچھے دو گاڑیاں نکلیں۔ ہم نواز نے شانی کو بتایا۔

''دونوں میں ٹوٹل سات افراد سوار ہیں۔ شیخ منیر اگلی گاڑی میں ہے۔'' شانی نے گاڑی ان کے تعاقب میں ڈال دی۔ وہ قاسم کو ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔ قاسم کی موجودگی میں اب بروج خاموش ہو گئی تھی۔ بس سوچیں اسے مسلسل بے چین کر رہی تھیں۔

❁ .... ❁ .... ❁

''شانی! مجھے لگتا ہے ہم میں کوئی کالی بھیڑ موجود ہے۔ اگر ہم نے اسے جلد نہ کھوجا تو اسی طرح پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

آپ کا کہنا بجا ہے سر جی! گزشتہ کئی مہینوں سے ہم کوئی بھی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ ہماری اندرونی خبریں باہر نکل رہی ہیں۔''

''شانی! فاروق بلوچ کے بتائے گئے تین ٹھکانوں، عارف شکیل پر حملہ اور اب شیخ منیر کی کوٹھی پر تمہارا ریڈ ان تینوں کارروائیوں پر سوچا جائے تو ٹوٹل پانچ افراد کو ان مشترکہ کارروائیوں کا علم تھا۔ باقی لوگوں میں کسی کو ایک کارروائی کا پتہ تھا۔ کسی کو دوسری اور کسی کو تیسری کا۔'' سر جی نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

شانی نے سر جی کو صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے فوراً شانی کو بلڈنگ میں بلا لیا تھا۔ شانی کا شیخ منیر کو راستے میں گھیرنے کا پلان تھا۔ مگر انہوں نے انتہائی گنجان آباد سڑکوں کا انتخاب کیا تھا۔ شانی کو ایکشن میں آنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا تاہم وہ ان کی نئی رہائش گاہ ہم نواز کی وجہ سے جاننے میں کامیاب ہوا تھا۔ شیخ منیر سلطان باہو روڈ پر واقع ایک گھر میں گئے تھے۔ سر جی انتہائی اداس اور پریشان تھے۔ شانی کے چہرے پر بھی غم کی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ ان کے گروپ کا انتہائی وفادار ساتھی طلحہ گزشتہ روز شہید ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ان کے دو قریبی ساتھی شرجیل اور شاہ میل بھی وطن عزیز پر جان کا نذرانہ پیش کر چکے تھے۔ عارف شکیل پر کیا جانے والا حملہ بری طرح ناکام ہوا تھا۔ کیونکہ عارف شکیل کے 30 کے قریب بندے پہلے سے گھات لگا کر وہاں بیٹھے تھے۔ حمزہ اور منظر شدید زخمی تھے۔ حمزہ نے سر جی کو واضح بتا دیا تھا کہ عارف شکیل کو ہماری کارروائی کی پہلے سے خبر پہنچ چکی تھی اس لیے وہ بالکل تیار بیٹھے تھے۔ سر جی نے شانی کو پکارتے ہوئے کہا۔

''شانی برا مت ماننا مجھے بروج پر شک آ رہا ہے۔'' شانی پل بھر کے لیے اندر سے لرز کر رہ گیا تھا۔ بروج اس کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکتی تھی۔ اس کی سانسوں کے ساتھ تحلیل تھی۔ بروج کی غداری کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ بروج نے بارہا مواقع پر جان پر کھیل کر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے اندرونی جذبات کو سنبھالتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سر جی! ہوٹل میں ہم پر فائرنگ ہونے سے لے کر شیخ منیر پر چڑھائی کا پلان بنانے تک بروج مسلسل میرے ساتھ تھی۔ اس دوران ایک منٹ کے لیے بھی وہ ادھر ادھر نہیں گئی نہ اسے کسی کا فون آیا نہ اس نے کسی کو کیا۔

پھر بھی ہمارے پہنچنے سے پہلے ان لوگوں کو علم ہو گیا کہ ان پر حملہ ہونے والا ہے۔“

”سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ کیا ان لوگوں کے پاس جادو ہے۔ یا جنات ہماری خبریں پہنچا رہے ہیں۔“ سر جی نے پریشانی میں بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ شانی کے دماغ میں ایک دھماکہ ہوا۔ طارق کی باتیں وہ یکسر بھول گیا تھا۔ مگر جادو کا لفظ سن کر اسے یاد آیا کہ بروج کی ذات طارق کی نظر میں انتہائی پراسرار اور مافوق الفہم ہے کیونکہ طارق اسے فون پر بروج کا چند سیکنڈوں میں تیسری منزل سے شانی کے پاس پہنچنے کا بھی بتا چکا تھا۔

”ہم نواز! فوراً چیک کرو بروج اس وقت کیا کر رہی ہے۔“

”شانی! تم غلط سوچ رہے ہو۔ روشن نواز کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ جسے تم رگوں میں دوڑنے والے خون میں شامل کر چکے ہو اسی کی ذات کو شک کی عینک لگا کر دیکھ رہے ہو۔“

”روشن نواز! میں شک نہیں کر رہا ہوں محبت کسی بھی شک سے پاک ہوتی ہے۔“

”تو پھر بروج کی نگرانی؟“ روشن نواز تڑپ کر بولا۔ شانی کے اندر ہلچل مچ اٹھی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جسے ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے ہیں روشن نواز کی باتیں اسے لہولہو کر رہی تھی کیونکہ بروج کو وہ خود سے بڑھ کر پیار کرتا تھا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بروج اسے دھوکہ دے گی۔

”روشن نواز! شانی جو کچھ کہہ رہا ہے اسے کرنے دو۔“ عاصم نواز نے روشن کی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

”یہ شانی کی ذات کا نہیں اس کے ملک پاکستان کا مسئلہ ہے۔“ عاصم نواز کی بات نے شانی کے ٹھٹھرتے جسم کو سہارا بخشا تھا۔

”میں پاکستان کے لیے اپنی جان اپنا پیار سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں لیکن شانی، بروج کو ہم سب بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔“ روشن نواز بروج کو کسی صورت غدار ماننے کو تیار نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے۔ بروج اسی کی تو تھی۔ مگر عاصم نواز حسب عادت اسے ٹوکنے لگا تھا۔

”روشن نواز! تم طارق کی باتیں بھی ملحوظ رکھو۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے بروج کو چلتی ہوئی گاڑی کو ہاتھوں میں اٹھاتے دیکھا ہے۔ پھر وہ چند سیکنڈز میں طارق کے کمرے سے نیچے شانی کے پاس کیسے پہنچی؟ بروج بظاہر مافوق الفطرت اور ناقابل یقین صلاحیتوں کی مالک لگتی ہے ہو سکتا ہے وہ بیٹھے بٹھائے کہیں دوسری جگہ جانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو۔“

”بات صلاحیتوں کی نہیں ہے عاصم نواز۔ اگر وہ ان سب پر قادر بھی ہے تو سوال یہ ہے وہ شانی کو دھوکہ کیونکر دے گی جبکہ شانی پر جان دینے کو تیار رہتی ہے۔ یاد نہیں ہے گوریا بستی میں جب شانی اسے ساتھ لے لانے سے انکاری ہوا تھا تو بروج نے پیٹ میں چھری گھسیڑ دی تھی۔

روشن نواز میں خود بھی بروج کو ایک عام لڑکی ہی سمجھتا ہوں اور اس سے اتنا پیار کرتا ہوں کہ خود سے بڑھ کر بروج پر یقین ہے۔ مگر چند دن بروج کی نگرانی میں کوئی قباحت نہیں ہے۔“

”شانی! ہمارے پاس ابھی چند آپشن موجود ہیں۔“ سر جی کی آواز نے شانی کو اس کی طرف مبذول کروایا۔ عارف شکیل کا جو بندہ حمزہ کی کسٹڈی میں تھا اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ عارف شکیل اور حیدر عباس کے مابین جو بھی ڈیلنگ ہوتی ہے وہ شہر کے مشہور ارباب ہوٹل کے تہہ خانے میں ہوتی ہے۔ یہ ہوٹل بھی عارف شکیل کا ہے۔

”عین ممکن ہے سر جی! اب وہ چوکنے ہو گئے ہوں اور وہاں نہ ملیں۔“

”ممکن ہے مگر مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس ویک اینڈ پر دونوں ہوٹل میں مل رہے ہیں۔ شانی اس بار میں ایسا پلان بنانا چاہتا ہوں کہ آپریشن کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔“

”سر جی! حمزہ زخمی ہے ورنہ اس آپریشن کے لیے ہم دونوں کافی تھے۔ پھر بھی آپ مجھ پر بھروسہ رکھیے۔ مجھے

صرف عبداللہ چاہیے۔ انشاء اللہ ہم دونوں کو آپ کے قدموں میں لا پھینکیں گے۔"

میں پلان کو حتمی شکل دے کر تمہیں بتاؤں گا۔ فی الحال یہ بتاؤ تم شیخ منیر کا کیا کر رہے ہو۔"

"میرا خیال ہے سر جی آج رات اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے گھر میں اپنے ہمراہ صرف بروج کو لے کر جاؤں گا۔ اس طرح بروج کا پتہ بھی چل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے شانی! تم جو بہتر سمجھتے ہو کرو۔"

سر جی سے اجازت لے کر شانی سیدھا بروج کے پاس پہنچا تھا۔ ہم نواز نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ فلیٹ میں ہی موجود ہے۔

⁂

پوری دنیا کو چند غیر مرئی ہاتھ اپنے کنٹرول میں کرتے جا رہے ہیں۔ ان کا طریقہ غیر محسوس مگر لامتناہی ہے۔ یہ ہاتھ ایسے ہیں کہ برق رفتار پاؤں رکھتے ہیں کہ کرہ ارض کی بادشاہت کے حصول میں کوئی ان کے مدمقابل دوڑ نہ سکے۔ یہ وسیع اور بلند پایہ سوچ رکھتے ہیں ایسی کہ کوئی ان کی برابری کا سوچ نہ سکے۔ یہ حد درجہ جہاندیدہ اور شاطر ہیں۔ یہ ریاستوں کو ایسا قدغن لگاتے ہیں کہ انہیں اپنی تباہی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جب ہوتا ہے تب ریاستیں لولی لنگڑی اور معذور ہو چکی ہوتی ہیں۔ اپنے بچاؤ کے لیے ان کے پاس کوئی آپشن نہیں ہوتا ماسوائے اس کے کہ وہ انہی لٹیروں کو مسیحا سمجھتے ہوئے آوازیں دیں۔ ریاستوں کی دہائی پر جب یہ مسیحا پہنچتے ہیں تو پھر ان کا اپنا ہی دائرہ عمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد صاحب اقتدار سے لے کر عوام الناس تک سب ان کے دائرہ عمل میں چلے جاتے ہیں۔ یہیں سے ان باکمال حد درجہ وسیع اور بلند پایہ دماغ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ وہ پوری ریاست کو نوچتے ہیں مگر اس طرح کہ ریاست کے مقیموں کے جسموں میں درد کی ٹھیس تک نہیں اٹھتی۔ ریاست کے صاحبان اقتدار ہوں یا تمام رعایا وہ دھیرے دھیرے ان میں سرایت کر جاتے ہیں۔ وہ قوموں میں ایسی لامحدود خواہشات بھر دیتے ہیں کہ قومیں ذاتیات اور امنگوں کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جب قومیں زر، زمین، راحت اور آسائشوں کی عادی بن کر اپنا ماضی، کلچر، ثقافت اور اسلاف کو بھول جاتی ہیں تو یہ غیر مرئی ہاتھ ان کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں نفرت و غیض و غضب کو اس طرح ہوا دیتے ہیں کہ وہ حکمران نہ اب تمہیں سہولیات زندگی دے سکتے ہیں نہ جان و مال کا تحفظ نہ ان کی عزتیں محفوظ ہیں نہ ان کے کاروبار۔ عوام اور حکمرانوں کو لڑاتے ہیں اور خود من مرضی کے بندے اقتدار کی کرسی پر بٹھا کر ان کی ڈور مٹھی میں بند کر لیتے ہیں۔ ان غیر مرئی ہاتھوں میں سب سے بڑا ہاتھ ڈیوڈ جوہانسن کا ہے۔

ڈیوڈ جاہانسن اسرائیل میں 1955ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ اس کا اسرائیل میں نمودار ہونے کا سال تھا۔ مگر حقیقت میں ڈیوڈ جوہانسن صدیوں سے کرہ ارض پر اپنی بے مثل صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اثر انداز ہو رہا تھا۔

اسرائیل میں تو فقط اس نے ڈیوڈ جوہانسن کا ایک اور روپ دھارا تھا۔

فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کا قیام یہودیوں کا دیرینہ خواب تھا۔ وہ اسے مذہبی فریضہ خیال کرتے تھے۔ 1980 سے 1940ء کے عشروں میں ہی کئی مایہ ناز یہودی سائنسدان فلسطین ہجرت کر گئے تھے۔

اسرائیل کے ایٹمی توانائی کمیشن کا سربراہ اور جوہری ہتھیاروں کے پروگرام کا بانی سائنسدان ارنسٹ ڈیوڈ برگمین بھی ہجرت کرنے والے سائنسدانوں میں شامل تھا۔ 1946 میں اسرائیل کا قیام ہوا تو یہ سائنسدان اپنے کاموں میں جت گئے تھے۔ برگمین کو اسرائیل کے لیے ایٹمی ہتھیار ناگزیر نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ نومولود اسرائیل چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں تھا۔ اس کی ٹیم میں جب ایک نوجوان ڈیوڈ جوہانسن کے نام سے شامل ہوا تھا۔ وہ غیر معمولی ذہین لگتا تھا۔ ڈیوڈ جوہانسن نے برگمین کے دماغ میں ایک بات ڈال کر اپنی وسیع ذہانت کا

ثبوت دیا تھا۔ جنگ عظیم دوم سے قبل فرانس سائنس و تحقیق میں اول نمبر تھا۔ مگر جنگ کے بعد پانسہ پلٹ گیا تھا۔ چین، امریکہ، روس اور برطانیہ اس دوڑ میں اس سے سبقت لے گئے تھے۔ ڈیوڈ جوہانسن نے برگمین کو باور کروایا کہ اس وقت فرانس بھی ہماری تلاش کر رہا ہے۔ اور اسرائیل کو بھی فرانس جیسے پارٹنر کی اشد ضرورت ہے اور فرانس کے ساتھ مل کر ایٹمی معاہدہ ممکن بھی ہے اور سودمند بھی۔ برگمین کو یہ آئیڈیا اس لیے بے حد پسند آیا تھا کہ فرانس کے ایٹمی توانائی کا سربراہ فرانس پیرن اس کا ذاتی دوست بھی تھا۔

1956ء میں ہونے والی اس میٹنگ میں ڈیوڈ جوہانسن نے دونوں ممالک کے فوائد کے ایسے ایسے نقطے اٹھائے تھے کہ دونوں ممالک کا معاہدہ طے پا گیا۔ دمونہ میں خفیہ طور پر ایٹمی ری ایکٹر قائم کر دیا گیا اس موقع پر ڈیوڈ جوہانسن نے فرانس اور اسرائیل کو برطانیہ کے ساتھ مل کر دنیا کی اہم تجارتی گزرگاہ نہر سویز پر قبضہ جمانے کا آئیڈیا بھی دیا تھا۔ نہر سویز کی اہمیت اور افادیت سے سبھی واقف تھے۔ تینوں ملکوں نے مل کر اس پر قبضے کی کوشش کی تھی مگر بیچ میں امریکہ اور روس کود پڑے تھے۔ اس لیے انہیں پیچھے ہٹنا پڑا تھا اور ری ایکٹر کے لیے 1959ء میں 20 ٹن بھاری پانی ناروے سے خریدا گیا تھا۔

یہیں سے ڈیوڈ جوہانسن اسرائیلی اعلیٰ حکام کی نظروں میں آیا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اس نے ایسی کامیابیاں سمیٹی تھی کہ وہ اسرائیل کے ایوانوں میں کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا۔ پھر نیو ورلڈ آرڈر کے لیے جو کچھ ڈیوڈ نے کیا تھا اس کے سبھی معترف تھے۔ صرف اسرائیل ہی نہیں مغربی طاقتوں میں جو بھی نیو ورلڈ آرڈر کے خواہاں تھے وہ ڈیوڈ جوہانسن کے مداح ہو گئے تھے۔

ڈیوڈ جوہانسن کا یہ ایک اور دنیاوی روپ تھا۔ کائنات میں اس کے کئی روپ تھے ہر روپ میں اس نے کائنات کی ہر شے سے خود کو اعلیٰ وارفع ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنے مقصد میں وہ بتدریج کامیاب ہو رہا تھا۔

اقوام عالم میں ستر فیصد لوگ اور ملک اس کے تابعدار اور مطیع تھے۔ ماسوائے کچھ مسلمانوں کے۔ کائنات کی ابتداء سے لے کر انتہاء تک اس کا سب سے بڑا دشمن مسلمان تھا۔ اس نے نیو ورلڈ آرڈر کے لیے جتنی بھی کوششیں کی تھیں اس کا مقصد صرف مسلمانوں کو اپنا مطیع بنانا تھا۔ انہیں باور کرانا تھا کہ دنیا میں صرف ایک ہی حکمران ہمیشہ رہ سکتا ہے جو مسلمانوں میں سے نہیں ہو سکتا اس نے مسلمانوں کے خلاف کئی محاذ کھول رکھے تھے ہر معاذ پر وہ کسی نہ کسی روپ میں موجود تھا اس کا اصل روپ کسی ذی روح کے لیے دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ہاں البتہ مسلمانوں کے پیغمبر نے اسے کھوجا تھا اور مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن مجید نے انہیں اس سے آگہی دی تھی اور کچھ ایسے ہتھیار بھی مسلمانوں کو سونپے تھے جن کے استعمال سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی تھی مگر پھر بھی اس نے کئی محاذوں پر مسلمانوں کو شکست سے دوچار کر رکھا تھا۔ وہ ان میں مختلف اشکال سے دھنس جاتا تھا۔ وہ کسی کے سامنے اصل روپ میں نہیں آتا تھا۔ ماسوائے اپنے چیلوں کے جب وہ سمندر پر ڈیرے جماتا تھا تب وہ اصل روپ یعنی گرو کے روپ میں ہوتا تھا اور اس کے سامنے کروڑوں اربوں چیلے سربسجود ہوتے تھے۔

❋ ❋ ❋

شانی کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پسٹل تھا اور کندھے سے مشین گن لٹک رہی تھی۔ یہی تیاری بروج کی بھی تھی۔ بروج کو شانی نے اچانک ہی کال کر کے بلایا تھا اور بنا کچھ بتائے گاڑی میں بٹھا کر سلطان باہو روڈ لے آیا تھا۔ اس نے راستے میں اس طرح رات گئے اچانک بلانے کی وجہ پوچھی تو شانی نے فقط اتنا کہا کچھ دیر بعد تمہیں پتہ چل جائے گا۔ شانی نے آخری وقت تک اپنے عزائم کو خفیہ رکھا تھا۔ سلطان باہو روڈ پر واقع دودھیا پینٹ سے آراستہ بڑے گھر کے سامنے پہنچ کر شانی بولا بروج اس گھر میں شیخ منیر اپنے آدمیوں کے ساتھ موجود ہے۔ ہم نے شیخ منیر کو زندہ پکڑنا ہے۔ باقی جو بھی نظر

آ ئے اڑا دو۔

تمہاری اس بات سے کہ تیاری کر کے آنا میں سمجھ گئی تھی۔

سیٹ کے نیچے اسلحہ پڑا ہوا ہے۔ بروج جو بھی ہو آج نتائج حسب منشا لینے ہیں۔ ہم نے پاکستان کے غداروں کو بہت ڈھیل دے دی اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ شانی کے لہجے میں اس قدر سختی تھی کہ بروج نے بے اختیار اسے بغور دیکھا۔

ایسا ہی ہوگا شانی تم فکر نہ کرو۔ میں آج شیخ منیر کے علاوہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ دونوں نے ضروری اسلحہ اٹھایا اور گھر کے عقبی طرف چلے گئے۔ شانی نے انتہائی مختصر وقت میں حملہ کا لائحہ عمل واضح کیا تھا۔ عقبی حصے کی دیوار کافی طویل تھی۔ بروج دیوار کے مشرقی طرف چلی گئی تھی۔ شانی مغربی حصے سے دیوار پھلانگ کر اندر اترا تھا۔ عقبی طرف تیز روشنی کے لیے بڑے سائز کے بلب لگے ہوئے تھے۔ تاہم درختوں کی بہتات روشنی کے سامنے بڑی رکاوٹ تھی۔ رات کی گہری خاموشی میں پودوں اور پھل دار درختوں کی متفرق خوشبو رچ بسی تھی۔ رات کی رانی بھی اپنی خوشبو بکھیر رہی تھی۔ شانی اندر کودنے کے فوراً بعد چیتے جیسی پھرتی کے ساتھ درختوں کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ درختوں کی اوٹ میں رک کر وہ عقابی نگاہوں سے وہاں کا جائزہ لے رہا تھا بظاہر اس طرف کوئی محافظ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رات کا گہرا سکوت طاری تھا۔ شانی چار پانچ منٹ تک وہاں دبکا رہا۔ اسے عقبی طرف محافظوں کے مورچہ زن ہونے کا شبہ تھا۔ شیخ منیر مشکوک آدمی تھا اور ایسے لوگ یوں بے خبری سے سویا نہیں کرتے۔ وہ دبے پاؤں ایک درخت سے دوسرے درخت کی اوٹ لیتا ہوا عقبی کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کھڑکی اسے پانچ چھ میٹر کے مختصر فاصلے پر رہ گئی تھی اس نے ایک بار پھر دائیں بائیں نگاہیں دوڑائیں کسی بھی مشکوک چیز کو نہ پا کر وہ کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ کھڑکی کے نیچے پھولوں کی کھاریاں تھی۔ اس نے کھڑکی کو ہاتھ لگا کر دیکھا کھڑکی اندر سے بند تھی۔ وہ اچھل کر کھڑکی میں بیٹھنا چاہ رہا تھا مگر بائیں جانب کھٹکا سنائی دیا۔ اس نے واپس لمبی جست لگائی' اس جست نے اسے گولیوں کی بوچھاڑ سے بال بال بچا لیا اس پر پورا برسٹ فائر کیا گیا تھا۔ وہ درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔ ریوالور فوراً ہولسٹر میں ڈال کر مشین گن ہاتھ میں لے لی تھی۔ اب احتیاط کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ حملہ آوروں کو تاڑ چکا تھا۔ دو آدمی درختوں کی اوٹ میں دبکے بیٹھے ہوئے تھے۔ شانی کے لیے بروج کو علیحدہ اندر اتارنا سودمند ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ حملہ آور کی پشت اس طرف تھی جس طرف بروج داخل ہوئی تھی۔ بروج نے شانی پر فائرنگ ہوتے دیکھ لی تھی۔ اس نے بلا تاخیر دونوں آدمیوں پر فائر کھول دیئے تھے۔ اس کا نشانہ بالکل درست تھا۔ دونوں آدمیوں کو تڑپنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ شانی پھرتی سے اٹھ کر کھڑکی میں پہنچ گیا تھا۔ بروج بے خبر تھی کہ اس کی طرف بھی دو آدمی موجود ہیں۔ جو نہ صرف بروج کو دیکھ چکے تھے بلکہ اسے نشانے پر رکھ لیا تھا۔ بروج کو جب تک اس بات کا ادراک ہوا تب تک تڑتڑ کرتی گولیاں اس کی طرف لپک چکی تھی۔ دونوں آدمیوں کے پاس اسٹین گنیں تھی دونوں نے بیک وقت فائر کھولے تھے۔ گولیوں کا جتھہ بروج کی طرف لپکا تھا لیکن بروج اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکی۔ یکے بعد دیگرے گولیاں اس کے بدن میں پیوست ہو گئی تھیں۔ بیسوں گولیاں کھانے کے بعد بھی بروج اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی نہ جسم سے خون کا قطرہ نکلا تھا۔ نہ کوئی زخم اور نہ ہی چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ یہ حیرت انگیز کرشمہ دیکھ کر گولیاں چلانے والوں کی گھگی بندھ گئی تھی۔ وہ جہاں کھڑے تھے وہیں ساکت و جامد ہو گئے تھے۔ بروج بڑے اطمینان سے چلتی ہوئی ان کے سروں پر پہنچی تو انہیں ہوش آیا' خوف و ہراس ان کے چہروں پر ٹھہر گیا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے خوبصورت لڑکی کو دیکھ رہے تھے جسے کئی گولیاں ذرہ برابر گزند نہ پہنچا سکی تھیں۔ بروج کو اپنے قریب پا کر وہ

چند قدم پیچھے کی طرف سر کے پھر پلٹ کر سرپٹ بھاگنے لگے تھے مگر بروج کی اسٹین گن کی اگلتی گولیاں ان کی زندگیوں کے چراغ گل کر گئی تھی۔ بروج جا کر اس کھڑکی کے پاس پہنچی جہاں چند منٹ پہلے شانی چڑھا تھا۔ کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ بتا رہا تھا کہ شانی اندر داخل ہو چکا ہے۔

بروج نے سامنے سے اندر جانے کا فیصلہ کیا تھا اسے شبہ تھا کہ فائرنگ نے اندر کے مکینوں کو چوکنا کر دیا ہوگا اور وہ مین گیٹ سے بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ بروج جب بھاگتی ہوئی سامنے کی طرف آئی تو اس کا شبہ درست ثابت ہوا۔ پورچ میں گاڑی اسٹارٹ کھڑی تھی۔ اندر سے شیخ منیر ایک آدمی کے ساتھ بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف آرہا تھا۔ بروج سکون سے کھڑی انہیں دیکھنے لگی تھی۔ شیخ منیر کے ایک ہاتھ میں چمڑے کا بیگ تھا دوسرے ہاتھ میں ری پیٹر گن۔ اس پھرتی سے بیگ دروازے سے اندر پھینکا اور برق رفتاری سے بیٹھ گیا ڈرائیونگ سیٹ پر پہلے سے آدمی موجود تھا۔ دوسرا شخص بھی گھوم کر اندر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے ڈرائیو وے پر دوڑنے لگی۔ اس وقت گاڑی بروج سے سو میٹر سے زیادہ فاصلے پر تھی۔ لحظہ بھر بروج نے ان کی طرف گن سیدھی کی مگر پھر جھکا لی پھر جیسے پرندہ اڑنے کے لیے زمین سے جست لیتا ہے اسی طرح بروج نے جست لی اور پلک جھپکتے میں ڈرائیو وے پر گاڑی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

گاڑی کے سواروں نے اچانک نمودار ہونے والی اس خوبصورت لڑکی کو بری طرح چونک کر دیکھا لڑکی کے اچانک نزول نے انہیں اس قدر حیران کر دیا تھا کہ ڈرائیور نے بے اختیار گاڑی روک دی تھی۔

''دیکھتے کیا ہو' کچل دو اسے۔'' شیخ منیر نے حلق کے بل دہاڑتے ہوئے ڈرائیور کو حکم دیا۔ مگر بدحواسی میں ڈرائیور سے گاڑی بند ہو چکی تھی۔ وہ بار بار سلف دے رہا تھا۔ بروج سکون سے کھڑی ان کی حرکات دیکھ رہی تھی۔ شیخ منیر انتہائی غصے میں باہر نکلا اور ری پیٹر کا رخ بروج کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ 1700 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والا کارتوس بروج کی طرف بڑھا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر کارتوس گیند کی طرح کیچ کر لیا۔ شیخ منیر کو دوسرا فائر کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ناقابل یقین حالت میں گرفتار ایک ہی جگہ جم گیا تھا۔ بروج نے کارتوس مٹھی میں پکڑ کر بازو سر سے گھمایا اور کارتوس واپس گاڑی کی طرف اچھال دیا۔ کارتوس گاڑی سے بم کی طرح ٹکرایا اور گاڑی زوردار دھماکے سے فضا میں بلند ہوگئی تھی۔ اسے آگ اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ شیخ منیر دھماکے سے ہی ایک طرف گر گیا تھا۔ گرنے سے اسے کوئی گہری چوٹ نہیں آئی تھی مگر خوف اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر چکا تھا۔

اندر سے شانی بھاگتا ہوا باہر آیا اور حیرت سے وہاں کا منظر دیکھنے لگا۔ گاڑی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ بروج شیخ منیر کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

''شانی! یہ لوگ گاڑی میں بھاگ رہے تھے میں نے گاڑی پر فائر کر دیا تھا۔ جس سے گاڑی کا فیول ٹینک دھماکے سے پھٹ گیا۔ یہ شخص جو حلیے سے مجھے شیخ منیر لگتا ہے خوش قسمتی سے بچ گیا ہے۔''

''گڈ ورک بروج! اندر کوئی نہیں ہے۔ میں اسی شک میں باہر بھاگا چلا آیا تھا کہ شاید یہ لوگ بھاگ گئے ہیں۔'' شانی نے تحسین آمیز انداز سے بروج کو دیکھا۔ پھر موبائل نکال کر قاسم کو گاڑی گھر کے مرکزی دروازے کی طرف لانے کی ہدایت کی۔

قاسم پہلے سے گھر کی نگرانی پر مامور تھا۔ اس سے بات کرنے کے بعد شانی نے بھاری بھر کم شیخ منیر کو پلک جھپکتے میں کندھوں پر اٹھا لیا۔

''شانی! گاڑی اندر لے آتے ہیں۔'' بروج نے کہا۔ مگر شانی رکا نہیں وہ تیز قدموں سے گیٹ کی طرف جانے لگا تھا۔ وہ لوگ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلے قاسم گاڑی لے کر وہاں پہنچ گیا۔ بروج نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور شانی نے شیخ منیر کو سیٹ پر دھکیل دیا۔ ساتھ ہی خود بھی بیٹھ گیا۔

"بروج! آگے بیٹھو جلدی۔" شانی کے لہجے میں بھی تیزی در آئی تھی۔ پولیس موبائل کے سائرن سنائی دینے لگے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں سن کر غالباً پڑوسیوں نے پولیس کو اطلاع دیدی تھی۔ پولیس حسب روایت تاخیر سے پہنچی تھی۔ شیخ منیر کو خفیہ ٹھکانے پہنچا کر شانی نے سر جی کو فون پر اطلاع دیدی تھی۔ سر جی اس اطلاع سے بے حد خوش ہوئے تھے۔

اس کارروائی کا سارا کریڈٹ بروج کو جاتا تھا۔ گھر میں کل سات افراد موجود تھے بروج نے سب کو ہلاک کر دیا تھا۔ صرف شیخ منیر کو شانی کی منشاء کے مطابق زندہ پکڑ لیا تھا۔ شانی کا خیال تھا کہ بروج کے معاملے میں سر جی مطمئن ہو چکے ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں تھا وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ سر جی بروج کی متواتر نگرانی کروا رہے ہیں۔

شیخ منیر کو ہوش میں لایا گیا تو وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ کمرے میں شانی کے ساتھ شمس موجود تھا۔ شیخ منیر خوف زدہ نگاہوں سے ٹارچر سیل کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں تشدد کے تمام لوازمات موجود تھے۔

شیخ منیر کرسی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اس کرسی میں ایک بٹن دبانے سے کرنٹ دوڑ جاتا تھا۔ دوسرا بٹن دبانے سے چھت سے کھولتا ہوا پانی گرنے لگتا تھا۔ شانی شیخ منیر کے روبرو کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"شیخ منیر! میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ دوٹوک بات کرتا ہوں اور اپنا مقصد جلد مکمل کرتا ہوں۔" شانی کے لہجے میں تحکمانہ پن تھا۔ چہرے پر ٹھوس سنجیدگی تھی۔

"آپ کون ہیں؟ اور وہ لڑکی......" شیخ منیر کے ذہن میں گزرے لمحات روشن ہوئے تو اسے بروج کی عجیب و غریب اور ناقابل فہم حرکت یاد آئی جس سے اس کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ شانی اس کی باڈی لینگویج دیکھ رہا تھا۔ اسے شیخ منیر اتنا سخت جان نہیں لگا تھا۔ وہ لڑکی کا لفظ ادا کرتے ہوئے بے حد خوف زدہ تھا۔ چونکہ بروج نے اس کے سارے بندے مار دیئے تھے اور گاڑی بھی تباہ کر دی تھی۔ اس لیے شیخ منیر کا لڑکی کے تذکرے پر خوف زدہ ہو جانا شانی نے سابقہ واقعہ سے نتھی کر دیا تھا۔ وہ شیخ منیر کو سخت نگاہوں سے گھورتا ہوا بولا۔

"وہ لڑکی بھی آ جائے گی اور میرا بھی تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں فی الحال مجھے تمہارے بارے میں جاننا ہے۔"

"مم...... میں تو بزنس مین ہوں۔ میرا چھوٹا سا بزنس ہے اور میں......" شیخ منیر کی بات ادھوری رہ گئی تھی شانی کے تھپڑ نے اس کے موٹے گالوں پر نشان جما دیا تھا۔

"مجھے تمہارے اس بزنس کے بارے میں سب پتہ ہے جو تم اقبال خان کی پارٹنر شپ میں کرتے ہو۔" شانی نے انتہائی غصہ میں کہا۔

"تم لوگوں کے بہت سے ہوٹل، ریسٹورنٹ اور جوس کارنرز ہیں تمہیں اتنا بتا دوں کہ اقبال خان بھی میرے پاس ہے۔" اقبال خان کا تذکرہ سنکر شیخ منیر چونک پڑا تھا۔

"مجھے صرف سچ سننا ہے صرف سچ بصورت دیگر بھیانک تشدد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایسا تشدد کہ تم موت مانگو گے مگر موت نہیں ملے گی۔"

"میرا یقین کیجئے میں ایک عام سا بزنس مین ہوں۔ میرا اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔"

"شانی! یہ شخص مجھے بروج سے بہت خوفزدہ لگتا ہے اسے بروج کے حوالے کرو۔ سچ خود بخود اس کی زبان پر آئے گا۔" ہم نواز نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ شانی کو ہم نواز کی بات پسند آئی تھی۔ اس نے شمس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شمس بروج کو بلاؤ۔" شمس سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ بروج کا نام سن کر شیخ منیر کے چہرے پر پھیلے خوف و ہراس کے آثار مزید گہرے ہو گئے تھے۔

"کون...... کون بروج...... وہ لڑکی جس نے میری گاڑی تباہ کر دی تھی۔" شیخ منیر نے ہکلاتے ہوئے کہا ساتھ ہی تھوک نگل کر خشک ہوتے گلے کو تر کرنے کی

کوشش کی اسے خشک گلے میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہونے لگے تھے۔ اس کی ابتر حالت دیکھ کر شانی ہم نواز کو داد دیے بنا نہ رہ سکا۔ ہم نوا کا آئیڈیا سود مند دکھائی دیتا تھا۔ بروج کمرے میں داخل ہوئی تو شیخ منیر اسے دیکھ کر واقعی تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

"بروج! میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں مجھے اس شخص کی اصل اصلیت کا پتہ چاہیے۔"

بروج کے اوکے شانی کہنے پر وہ شمس کے ساتھ باہر نکل گیا۔

شیخ منیر خوف زدہ آنکھوں سے بروج کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر عجیب وغریب کرختگی موجود تھی جسے وہ کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔

"میرا ایک کمال تو تم دیکھ چکے ہو شیخ میر۔ دوسرا کوئی کمال دیکھنا ہے یا سچ بتانا ہے۔" بروج ٹھہرے ہوئے پرسکون انداز میں بولی۔

"کک...... کیا' آپ ...... آپ کیا جاننا چاہتی ہیں؟" شیخ منیر خود پر کنٹرول نہیں کر پا رہا تھا۔

"وہی جو شانی نے پوچھا ہے تم اقبال خان کے ساتھ مل کر ریسٹورنٹ اور جوس کارنر کی آڑ میں کون سا مکروہ دھندہ کرتے ہو؟"

"میں کچھ اور نہیں کرتا۔ آپ میرا یقین......" شیخ منیر کے بولنے سے بیشتر ہی بروج نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے سختی سے چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر بولی۔

"مجھے جھوٹ نہیں سچ سننا ہے اور میرا خیال ہے کہ تم آسانی سے سچ بولو گے نہیں۔" بروج اس کے سامنے ٹہلنے لگی تھی۔ کمرے میں پراسرار خاموشی چھا گئی تھی۔ شیخ منیر نے ایک دم حبس محسوس کیا تھا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے نازک اندام لڑکی کو دیکھا جس کے اندر ایک اور مخلوق پوشیدہ لگ رہی تھی۔ بروج نے سامنے کی خالی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ دیوار دیکھ رہے ہو۔" شیخ منیر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دیوار کی طرف دیکھا پھر کچھ کہنے کے لیے بروج کی طرف گردن موڑنا چاہی مگر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بروج نے سیدھی ہتھیلی کا اشارہ دیوار کی طرف کیا تو دیوار سے فرش تا چھت آگ کے تیز شعلے نکلنے لگے۔

"یہ...... یہ کک...... میں......" شیخ منیر بدحواس ہو گیا تھا۔ آگ کے شعلے ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے اس کی طرف لپک رہے تھے۔ جس طرح بے چین کتا دشمن کو کاٹنے کے لیے مالک سے رسی چھڑانے کے لیے زور لگاتا ہے اس طرح آگ کے شعلے شیخ منیر کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے بے چین نظر آ رہے تھے۔ بروج ہنوز اطمینان سے ٹہل رہی تھی۔ شیخ منیر کے لیے حیرت ناک بات یہ تھی کہ بروج ٹہلتی ہوئی آگ میں چلی جاتی تھی اور پھر اطمینان سے باہر نکل آتی تھی۔ جبکہ آگ کی تپش کا یہ حال تھا کہ شیخ منیر کو دور سے اپنی جلد جلتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ شیخ منیر کو اپنی دردناک موت شعلوں کی لپیٹ میں نظر آنے لگی تھی۔

"شیخ منیر! سچ بتانا ہے یا دنیا میں ہی جہنم کی آگ کا نوالہ بننا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں' سب کچھ سچ بتاتا ہوں مگر خدا کے لیے اسے بند کرو۔"

"جیسے ہی تمہارا بیان ختم ہو گا آگ بھی بجھ جائے گی۔ شروع ہو جاؤ۔" بروج کے کہنے پر وہ بغیر رکے بولنے لگا تھا۔

جان رائٹ کو انتہائی اہم فائلیں مل گئی تھیں۔ یہ فائلیں اس کے لیے باعث مسرت بھی تھی اور باعث حیرت بھی۔ پاکستان جیسے تیسری دنیا کے پسماندہ ملک میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہاں اتنے زیادہ معدنی ذخائر موجود ہوں گے پاکستان کے دو صوبے بلوچستان اور پنجاب توانائی کے گڑھ ہیں یہاں اتنی وافر مقدار میں قدرتی ذخائر موجود ہیں کہ جان رائٹ کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اسے پاکستانی قوم پر ترس آنے لگا تھا۔ جو اتنے زرخیز ملک کے باشندے ہونے کے باجود پرلے درجے کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ اسے حکمرانوں پر حیرانی ہو رہی

تھی۔ پاکستان کے صاحب اقتدار ہمیشہ ہاتھوں میں کشکول لیے دوسرے ممالک کے پیچھے پھرتے ہیں جبکہ ان کی جھولی میں قدرت نے اتنا کچھ ڈال رکھا ہے اگر وہ قوم و ملک سے مخلص ہوں تو صورت حال الٹ ہو۔ دوسرے ممالک ان کے پیچھے گھومیں۔ خصوصاً تیل و گیس کے لیے۔ جان رائٹ نے کئی دنوں تک ان فائلوں پر کام کیا تھا۔ ان فائلوں میں ایک فائل ایسی بھی تھی جس نے ان کو نئی سوچ بخشی تھی۔ اس نے تھامس کو بھیجنے کے لیے ایک رپورٹ تیار کی تھی۔ دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا 90 فیصد محرک اقتصادی عمل ہوتا ہے۔ تاریخ نے ہمیشہ طبقاتی ہیر پھیر سے ہی آگے کو جست لی ہے۔ کرہ ارض کے سارے باشندوں میں کچھ خصلتیں مشترکہ ہوتی ہیں ہر ملک کے غریب اور مظلوم طبقے ہمیشہ سرمایہ داروں کے ظلم کی چکی میں پستے ہیں مگر یہ مظلوم طبقے بھی برداشت کی ایک حد رکھتے ہیں جب بات ان کی قوت برداشت سے باہر ہو جاتی ہے تب وہ ایک نئی تبدیلی کی طرف راغب ہونا شروع ہو جاتے ہیں یہ تبدیلی انہیں کسی کے توسط سے ملے تو وہ اسے خوش آمدید کہہ کر گلے لگا لیتے ہیں اور اگر بیچ کی کوئی کڑی ان کے ہاتھ نہ آئے تو یہ خود جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں کیونکہ معاشرے میں دو ہی طبقے ہوتے ہیں امیر اور غریب۔ بعض دفعہ ہم ان طبقات کو ظالم اور مظلوم کی اصطلاع بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ امیر جب خود کو خدا سمجھنے لگتے ہیں تو ان کے مظالم بھی بڑھ جاتے ہیں اس وقت بلوچستان میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے لوگ گونگوں کی کیفیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ محرومی اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔ دوسری اہم بات کہ ان میں قوم پرستوں کی کمی نہیں۔ کچھ لیڈران حکومت وقت سے ناراض ہیں اور کچھ لیڈروں سے حکومت خائف ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو توانائی سے مالا مال اور گوادر پورٹ کا حامل یہ صوبہ ٹیڑھے میڑھے انداز میں تاریخ رقم کر رہا ہے۔ اگر ہم یہاں مظلوم اور ظالم کی لڑائی میں تیسرے فریق کی حیثیت سے عمل دخل کریں تو قدرتی ذخائر سے مالا مال یہ صوبہ ہماری گود میں پکے ہوئے پھل کی طرح گر سکتا ہے۔

جان رائٹ نے ساتھ ہی اپنے مشن کا اگلا پلان بھی لکھ دیا تھا۔ تھامس نے اس رپورٹ کا جواب چند دنوں میں ہی دے دیا تھا۔ تھامس نے اس کی رپورٹ حکام بالا کو پہنچائی تھی۔ جسے بہت سراہا گیا تھا۔ تھامس نے اسے بتایا کہ اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمہارے ساتھ را کے مایہ ناز ایجنٹ کو اس مشن پر بھیجا جائے اس لیے آپ لوگوں کو جلد ان کی کھیپ پہنچا دی جائے گی۔ جوزف کی طرف جان رائٹ نے بھی را کے آدمیوں کی مخالفت کی تھی مگر تھامس نے مدلل دلیل سے اسے خاموش کر دیا تھا۔ پاکستان کے ماحول، رنگ و نسل سے ہماری مطابقت اور ان کے کلچر و ثقافت میں ڈھلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جبکہ انڈین لوگ بہت جلد ان میں گھل مل جاتے ہیں یہ مقامی لوگوں کی خدمت حاصل کرتے ہیں اور اپنی سرگرمیاں باآسانی جاری رکھ سکتے ہیں دوسری اہم بات ایشیاء میں ہمیں اگر حکمرانی کرنی ہے تو انڈیا کا ہماری جیب میں ہونا بے حد ضروری ہے۔

پاکستان انڈیا کا نظریاتی اور ازلی حریف ہے یہ ایک دوسرے سے دوستی کی کتنی بھی پینگیں چڑھا لیں ان کے اندر سے کینہ اور بغض ختم نہیں ہوتا اور پھر ہمیں کیا فرق پڑتا ہے جان رائٹ۔ ہمیں اپنا مقصد پانا ہے اور جس طرح بھی ملے ویلکم۔ جان رائٹ کو بہر حال تھامس کی بات ماننا پڑی تھی۔ اس لیے کہ یہ اس کے بڑوں کا فیصلہ تھا۔ جس کی بجا آوری اس کے فرائض میں شامل تھی۔ ایک ہفتے بعد اس کے ساتھ را کے دس مرد حضرات اور تین لڑکیاں میٹنگ کر رہی تھیں۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

شیخ منیر، بروج کے سامنے ہار مان چکا تھا۔ جب اس نے بولنا شروع کیا تو پھر اندر کا سارا سچ باہر اگل دیا۔ اس نے سر جی کے روبرو بہت سے اہم انکشافات کیے تھے۔

"پاکستان میں مذہبی فرقوں کا باریک بینی سے تنقیدی

مطالعہ کر کے ان میں سے منفی الفاظ کو چھانٹا جاتا ہے۔ ہر فرقے کے ان علماء کو بھی پرکھا جاتا ہے جو جذبات پر کنٹرول نہیں کر پاتے اور بلا سوچے سمجھے مذہبی تحفظ کے فریضے میں انتشار اور قتل و غارت کا سبب بنتے ہیں ان کے فرقوں سے چھانٹا گیا تنقیدی مواد دوسروں تک ایسے پہنچا دیا جاتا ہے کہ یہ مخالف فرقے کی کارستانی لگتی ہے اس کا ہمیں حسب منشا نتیجہ ملتا ہے۔ جواباً کارروائی ہوتی ہے۔ دونوں فرقوں کے درمیان بڑھتی ہوئی چپقلش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی ایک فرقے کی معتبر شخصیت یا جید عالم کو قتل کرا دیا جاتا ہے۔ نتیجے میں نفرت کی آگ مزید بھڑک اٹھتی ہے جو ایک شہر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے شہر تک پہنچ جاتی ہے اس طرح ایک ہی جگہ بیٹھ کر ہم پورے ملک کو آگ کی بھٹی میں جلتا دیکھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ کارروائیوں میں اضافے اور اہل اسلام کی قرآن وسنت سے توجہ ہٹانے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ پرنٹ یا الیکٹرونک میڈیا کے کچھ بتنگڑ باز نام نہاد مذہبی اسکالرز، مختلف این جی اوز' انسانی حقوق کے نام پر بنائی گئی کچھ تنظیمیں اور چند دیگر ذرائع سے ایسا مواد پھیلایا جاتا ہے۔ جس سے نہ صرف فرقہ واریت کی راہ ہموار ہوتی ہے بلکہ ایک عام شخص کے احساسات، رجحانات اور نظریات بجائے مذہبی قالب میں ڈھلنے کے سیکولر اور لبرل بن جاتے ہیں یوں یہودیوں کی پیدا کردہ جمہوریت میں ہی اپنی بقا سمجھتے ہیں۔ کبھی خلافت عثمانیہ یا حضرت عمر فاروقؓ کے دور حکومت کی خواہش نہیں کرتے......'' شیخ منیر سانس لینے کے لیے رکا اور پھر گویا ہوا۔

''زن، زر اور زمین کی تکون کا استعمال ذہین وفہیم دشمنان پاکستان نے جس قدر یہاں کیا ہے شاید ہی کہیں اور کیا ہوگا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت مختلف اخبارات و رسائل میں نت نئے دوست بنانے کا اشتہار دیا جاتا ہے اشتہار پر دیئے گئے نمبر پر کال کرنے سے سمیرا اور نوید پرویز جیسے لوگ ملتے ہیں وہ انہیں اقبال خان جیسے بندوں کے مخصوص ہوٹل یا جوس کارنر پر لے جاتے ہیں یہ پہلا اسٹیپ ہوتا ہے۔ اس کے بعد لامتناہی دنیا ہوتی ہے۔ جس میں عیش وعشرت کے تمام لوازمات موجود ہوتے ہیں لڑکے کو لڑکی سے اور لڑکی کو لڑکے سے تنہائی میں ملنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ ان لوازمات میں ایڈز اور ہیپاٹائٹس سی کے تحفے بھی رچے بسے ہوتے ہیں۔ جس ایڈز کا طوق گلے میں پہنے وہ معاشرے کے لیے قابل نفرت بن جاتے ہیں اور زندگی سے دور موت کے قریب بڑھنے لگتے ہیں تب انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ انہیں اچھے علاج کا لالچ دیا جاتا ہے بے حس معاشرے سے انتقام لینے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

اس طرح نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس گروپ میں شامل ہو کر ایڈز کے پھیلاؤ میں معاون بن جاتے ہیں۔ ایڈز اور ہیپاٹائٹس سی کو پھیلانے کے لیے مختلف سرکاری اسپتالوں میں ان امراض کی آلودہ سرنجیں غیر محسوس طریقے سے پہنچائی جا رہی ہیں۔ یوں یہ امراض پاکستانی عوام میں تیزی سے بڑھ رہے ہیں اس سے پس پردہ لوگ بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں ان امراض کی ادویات اور منرل واٹر کی تجارت بھی یہی لوگ کرتے ہیں۔ پاکستانی نوجوانوں کو بے راہ روی کا شکار بنا کر انہیں کمزور، کاہل اور فکری ارتداد کی طرف دھکیلا جاتا ہے جن لڑکیوں کو ایڈز کا مرض لاحق ہو جاتا ہے انہیں ایوان بالا تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سارے سیٹ اپ میں نیچے سے لے کر اوپر تک بہت سے لوگ ملوث ہیں۔ جنہیں غیر ملکی ہاتھ استعمال کر رہے ہیں۔''

شیخ منیر کے انکشافات کی تصدیق اس لیے بھی ہو گئی تھی کہ جو سرنجیں شانی اسپتال سے چرا کے لایا تھا ان میں سے ایک سیل شدہ سرنج بھی ہیپاٹائٹس سی کے وائرس سے آلودہ تھی۔ سر جی نے ایک جامع رپورٹ بنا کر ذمہ دار اعلیٰ آفیسر کو روانہ کر دی تھی۔ باقی کا کام وہ لوگ کریں گے۔ سر جی کا کام انٹرنیشنل گروپ کا قلع قمع کرنا تھا۔ کیونکہ شیخ منیر کے دو غیر ملکیوں سے رابطے تھے۔ شانی کا خیال تھا جو حلیے شیخ منیر نے انہیں بتائے ہیں وہ نثار پور کی پہاڑیوں پر اس

کے پیچھے بھاگنے والے مرد اور عورت کے ہیں۔ شیخ منیر نے یہ بھی بتایا تھا یہ لوگ بلوچستان اور پنجاب میں بیک وقت متحرک ہیں۔ شانی کو حیدر عباس اور عارف شکیل کے لیے بلوچستان جانا تھا۔ سر جی سے مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ پہلے غیر ملکیوں سے نمٹا جائے پھر حیدر عباس اور شکیل کو دیکھا جائے گا۔

عبداللہ اور طلحہ پہلے سے بلوچستان میں موجود تھے۔ پنجاب سے شانی بروج، قاسم، شمس اور صداقت علیحدہ علیحدہ بلوچستان پہنچے تھے۔ شانی سیدھا گھر چلا گیا تھا۔ آپریشن کی تیاری میں انہیں مزید دو دن لگ جانے تھے۔ یہ دو دن وہ ممی اور منزہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ رات بھر نثار پور کے حالات پر گفتگو کرتے رہے۔ نثار پور میں لوگ اب بھی پر اسرار پہاڑیوں کا رخ کرنے سے کتراتے تھے۔ باوجود اس کے کہ اب وہاں کوئی پراسرار موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ کنزہ آخری لڑکی تھی جس کی لاش پہاڑیوں کی جڑ میں ملی تھی۔ شانی کو ایک اور بات کا بہت افسوس ہوا تھا۔ نثار پور میں لوگ اب زیادہ تر نیسلے کا منرل واٹر ہی پیتے تھے اور پوش گھرانوں میں یہ فیشن بن چکا تھا۔ لوگ ہاتھوں میں نیسلے کی بوتل رکھنا فخر محسوس کرتے تھے۔ شانی نے آتے ہوئے چند ایسی چیزیں بھی دیکھی تھیں جس سے وہ اندر سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اب وہ کس کس کو بتاتا پھرتا کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس علاقے میں یہودیوں کی کمپنی نیسلے کی پروڈکٹس کو پھیلایا گیا اور تو اور لوگ نیسلے منرل واٹر کی دیکھا دیکھی نیسلے کے خشک دودھ کے ساتھ چند مزید پروڈکٹس بھی استعمال کرنے لگے تھے۔

ممی اور منزہ کو وہ یہی بتا رہا تھا۔ بیرون ملک طاقتیں کس طرح پاکستان میں سر گرم عمل ہیں۔ وہ رات گئے تک باتیں کرتے رہے تھے۔ باتوں کے دوران میں شانی کو بروج کا خیال آیا۔ کیونکہ ممی اور منزہ سے ملنے کے لیے بروج کا اسرار بھی بڑھ گیا تھا۔ اس لیے اگلے روز ناشتے پر شانی نے تذکرہ چھیڑ دیا تھا۔

''ممی! ہمارے گروپ میں ایک لڑکی ہے بروج۔ وہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہے۔'' بیگم کلثوم نے بریڈ پر مکھن لگاتے ہوئے معنی خیز نظروں سے شانی کو دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

''وہ ملنا چاہتی ہے یا تم ملوانا چاہتے ہو؟''

منزہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ چہک کر بولی۔

''شانی! شرمانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ دل میں جو ہے وہ بتاؤ۔'' شانی منزہ کو گھور کر رہ گیا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ بولا۔

''بھئی میرے ساتھ وہ کام کرتی ہے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کئی بار ہم ملتے ہیں اس لیے ایک دوسرے کے خاندان والوں سے ملنے کا شوق تو رہتا ہی ہے۔''

''بیٹا شانی! اصل بات تو تم پھر بھی گول کر رہے ہو۔'' بیگم کلثوم نے انتہائی خوشگوار موڈ میں شانی کی طرف دودھ کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ شانی نے گلاس لیتے ہوئے ممی کے چہرے کو دیکھا اور انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

''ممی! پاپا اور کنزہ کی وفات کے بعد میں نے آج پہلی بار آپ کے چہرے پر شگفتگی دیکھی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا! ٹھہرے ہوئے تالاب میں چھوٹے سے چھوٹا کنکر بھی ارتعاش کا سبب بن جاتا ہے۔ ہماری زندگی میں تو طوفان گزر گئے ہیں۔ تمہارے پاپا اور کنزہ کی ناگہانی اموات کے زخم کیا کم تھے کہ اذان اور کامران کا غیروں جیسا برتاؤ بھی دیکھنا پڑا۔ انہیں میں نے جنم دیا ہے بیٹا! لیکن پتہ نہیں ہماری پرورش میں کہاں کوتاہی ہوئی ہے کہ ان کے خون سفید ہو گئے ہیں۔'' بیگم کلثوم کے چہرے کی شگفتگی یک لخت افسردگی میں بدل چکی تھی۔

''ہاں ممی! ہم نے کبھی اذان اور کامران بھائی کے بارے میں ایسا کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ جس دن شانی ہمیں اذان بھائی کے پاس لے کر گئے تھے اس دن سے

آج تک انہوں نے ہماری کوئی خبر گیری نہیں کی۔ اذان بھائی ہمیں اپنے گھر میں رہنے کے لیے چند دن نہ دے سکے اور ہم غیروں کے گھر بنا کسی تکلیف کے کئی ماہ گزار آئے ہیں۔" منزہ کے لہجے میں بھی اداسی در آئی تھی۔ شانی کو افسوس ہو رہا تھا پاپا اور کنزہ کا ذکر چھیڑ کر اس نے زخم ہرے کر دیئے تھے اور اچھے بھلے ماحول کو سوگوار کر دیا تھا۔

"ارے آپ لوگ تو اداس ہی ہو گئے۔ مجھے جواب تو ملا ہی نہیں بروج کو ملوانے کب لاؤں؟" اس نے حتی المقدور کوشش سے لہجے میں شوخی بھرنے کی کوشش کی تھی۔ بیگم کلثوم نے ٹھنڈی آہ بھر کر اسے دیکھا۔

"شانی! تم چاہو تو ابھی بلا لو۔ مجھے تمہارے سر پر سہرا دیکھنے کی بہت حسرت ہے۔"

"ممی! بروج میرے ساتھ کام کرنے والی لڑکی ہے۔ اس کا آپ لوگوں سے ملنا روٹین کی بات ہے آپ نے تو لمحوں میں بڑا فیصلہ کر لیا۔" بدلتے موضوع کا منزہ نے بھی خاطر خواہ اثر لیتے ہوئے کہا۔

"ہمیں پتہ ہے شانی! تمہیں کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں تم بروج کو آج ہی بلاؤ۔ میں اسے دیکھنے کے لیے پر اشتیاق ہو گئی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں ابھی اسے فون کر کے پتہ کرتا ہوں۔" شانی کو موبائل نکالتے دیکھ کر بیگم کلثوم اور منزہ کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ انہوں نے مسکراتی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"ہیلو بروج! کہاں ہو تم؟" شانی کا رابطہ ہو چکا تھا۔

"اپنے گھر گوریا بستی میں ہوں شانی۔"

"تم گوریا بستی میں ہو......؟" شانی نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی دانست میں بروج کو آج دو تین گھنٹے بعد پہنچنا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اسے سیدھا گھر ہی بلا لے گا۔ مگر بروج نے کمال حیرت کی پھرتی دکھائی تھی۔

"دل پر بہت بوجھ تھا شانی! پچھلے کئی دنوں سے گھر والے بہت یاد آ رہے تھے اس لیے سیدھی یہاں چلی آئی کہتے ہیں دل پر بوجھ ہو تو اسے رو کر ہلکا کر دینا چاہیے میں بھی کچے مکان کے در و دیوار سے لپٹ کر خوب روئی ہوں۔"

"بروج! مجھے لگ رہا ہے تم ابھی تک رو رہی ہو۔"

"شانی! اجڑے گھر میں لٹکے جالوں نے دل چیر دیا ہے۔ کبھی اس کچے مکان میں بہت رونق ہوا کرتی تھی۔ آج سارے منوں مٹی تلے دب گئے ہیں۔ مم......میں" بروج کا لہجہ گلوگیر تھا۔ بات کرنا اس کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔

"سنو بروج! تم پلیز مت رو۔" شانی بے چین ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

"ممی اور منزہ تم سے آج ہی ملنا چاہتی ہیں تم وہیں گوریا بستی میں ہی رکو میں تمہیں لینے کے لیے آتا ہوں۔"

"نہیں شانی! تم مت آؤ ہمارے پاس ٹائم کم ہے تم ممی اور منزہ کے پاس ہی رکو میں لنچ تک تمہارے گھر پہنچ جاؤں گی۔ دوپہر کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔"

"ٹھیک ہے بروج مگر پلیز تم اداس مت ہونا اور اپنا خیال رکھنا۔" شانی کے بے تاب لہجے اور چہرے کے اتار چڑھاؤ نے بیگم کلثوم اور منزہ پر وہ سب کچھ عیاں کر دیا تھا جو اس کے دل میں پنہاں تھا۔ رابطہ منقطع ہوتے ہی ممی نے پوچھا۔

"بروج! کے ساتھ ایسا کیا ہوا شانی کہ وہ اتنی دکھی ہے اور اس کے دکھوں نے تمہارے ہنستے مسکراتے چہرے کو اداسیوں میں ڈھال دیا ہے۔"

"ممی! بروج واقعی بہت دکھی ہے۔ موت ایک رات میں اس کا پورا خاندان نگل گئی ہے۔" شانی نے انہیں تفصیل بتائی تو بیگم کلثوم اور منزہ بھی بے حد افسردہ ہو گئی تھی۔

"شانی! میں بروج کو کنزہ کی جگہ دوں گی کنزہ کی جو خوشیاں مجھ پر قرض تھی وہ ساری میں بروج کو دے دوں گی۔"

''ہاں شانی! بروج نے ایک خاندان کھویا ہے مگر یہاں آ کر انشاء اللہ ایک خاندان پا لے گی۔ مجھے میری بہن کنزہ مل جائے گی۔''

شانی ان کی محبتیں دیکھ کرآبدیدہ ہوگیا تھا۔

بروج وعدے کے مطابق لنچ کو پہنچ گئی تھی۔ بیگم کلثوم اور منزہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ اتنا تو انہیں معلوم تھا کہ شانی کی پسند یقیناً خوبصورت ہوگی مگر بروج تو خوبصورتی کا پیکر تھی۔ وہ حسن و جمال کا حسین شہکار تھی۔ جس کے شاداب چہرے پرنظریں جم کر رہ جاتی تھی اوپر سے حد درجہ ذہین اور بااخلاق تھی۔ گفتگو میں سلیقہ تھا۔ اپنے جذبات و نظریات کا اظہار شائستہ مگر مدلل انداز میں کرتی تھی۔ بروج واقعی متاثر کن لڑکی تھی۔ بروج کو دیکھنے اور ملنے کے بعد بیگم کلثوم اور منزہ کی بے تابی شانی کی شادی کے لیے بڑھ گئی تھی مگر مقدر نے کیا لکھا ہوا تھا وہ کب جانتی تھی۔

دوسرے روز وہ لوگ اپنے مشن پر روانہ ہوگئے تھے۔ روانگی سے پہلے شانی نے ایک اچھے سپہ سالار کی طرح پرجوش لیکچر دیا تھا۔ اس کے الفاظ اس کے جذبات کے داعی بن گئے تھے۔ جو بھی لفظ منہ سے نکلا سیدھا دل میں اترا۔ شانی نے بہادر لیڈر کے روپ میں گروپ کے نوجوانوں میں نیا جوش اور ولولہ بھر دیا تھا۔ خود شانی کے انگ انگ میں جوش و جذبہ ہلکورے لے رہا تھا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ آج ہر صورت میں کامیابی حاصل کرنی ہے۔ شانی نے اپنے آدمیوں پر واضح کر دیا تھا کہ غیر ملکیوں میں سے جو بھی ہاتھ لگے زندہ پکڑ لینا باقی مقامی باشندوں کو عبرتناک بنا دینا۔ وہ روائتی تیاری کے ساتھ روانہ ہوئے تھے انہیں کوئٹہ شہر کے مضافاتی علاقے میں جانا تھا۔ وہاں کے راستے دشوار گزار اور پتھریلے تھے کیونکہ وہ مکمل پہاڑی علاقہ تھا۔ وہ پتھریلے راستوں پر مضبوطی سے قدم جمائے آگے بڑھ رہے تھے۔ شانی کے پاؤں میں بجلیاں بھرگئی تھیں اس کے ساتھ ایک طرف بروج اور دوسری طرف عبداللہ۔ باقی لوگ بھی آگے پیچھے چل رہے تھے۔ ان سے دوسو میٹر دور پختہ سڑک تھی مگر بوجہ احتیاط وہ سڑک استعمال نہیں کر رہے تھے تھوڑا آگے پانی کی بہت بڑی ندی تھی اس پر لکڑی کا خستہ حال پل بنا ہوا تھا۔ یہ پل بیس پچیس سال سے اس طرف سے سامان کی ترسیل کا ذریعہ تھا۔ مگر پختہ روڈ بننے کی وجہ سے آمد و رفت کا سلسلہ روڈ پر ہوگیا تھا۔ کیونکہ لکڑی کے پل سے تھوڑا آگے یہ راستہ خطرناک ہوجاتا تھا۔ سننے میں آیا تھا اس خطرناک راستے پر کئی جان لیوا ایکسیڈنٹ ہو چکے تھے۔ اس لیے لوگ اب لکڑی کا پل یا اس کا راستہ شاذ و نادر ہی استعمال کرتے تھے۔ شانی لکڑی کا پل کراس کر رہا تھا۔ جب اسے سرجی کا فون موصول ہوا۔ پل چونکہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اس لیے انہیں ایک ایک کر کے گزرنا تھا۔ شانی پل کراس کر کے ایک طرف ہوگیا تھا۔

''ہیلو سر جی!''

''شانی! بروج کہاں ہے؟'' سرجی کے لب و لہجہ میں غیر معمولی پن محسوس کر کے شانی چونک پڑا۔ بروج کا براہ راست ذکر آنے پر اس کا دل زور سے اچھل پڑا تھا۔ سرجی کی بات سن کر اس نے پل کی طرف دیکھا طلحہ پل کے ٹوٹی ہوئی جگہ چھلانگ لگا کر پار کر رہا تھا بروج پل کے اس طرف کھڑی تھی۔ سرجی اس کا جواب سنے بغیر کہہ رہے تھے۔

''شانی! کیا واقعی بروج تم لوگوں کے ساتھ ہے؟''

شانی کو سرجی کا سوال سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ سرجی نے خود بروج کو الوداع کیا تھا۔

''سر جی! بروج ہمارے ساتھ ہے۔'' شانی کی بات سن کر سرجی تیز لہجے میں بولے۔

''شانی بروج سے علیحدہ رہ کر بات کرو۔''

''سر جی! میں ان لوگوں سے دور الگ کھڑا ہوں۔ خیریت تو ہے؟''

''شانی! بروج نہ صرف مشکوک ہے بلکہ انتہائی پراسرار بھی ہے۔'' سرجی کی باتیں شانی کو مسلسل حیرت کی طرف دھکیل رہی تھی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''میں سمجھا نہیں سر جی......؟'' شانی باتوں کے دوران پل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ طلحہ پل کراس کر چکا تھا۔ اب بروج اس طرف آ رہی تھی۔

''شانی! میری بات دھیان اور سنبھل کر سنو۔ میں خود حیران و پریشان ہوں۔ بروج کے دو روپ ہیں ایک بروج اس وقت اسلام آباد کے اپنے فلیٹ میں موجود ہے اور دوسری تمہارے ساتھ بلوچستان میں۔''

سر جی کی بات نے شانی کو حیرت سے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''سس، سر جی...... یہ آپ...... کیا کہہ رہے ہیں۔ بیک وقت یہاں اور وہاں۔'' شانی کو یہ معاملہ گہرا اور پراسرار محسوس ہو رہا تھا۔ اس دوران طلحہ اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس نے طلحہ کو اشارے سے سمجھایا کہ تم لوگ ادھر ہی رکو اور خود موڑ مڑ کر دوسری طرف چلا گیا۔ اب وہ ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔

''شانی! بروج کے معاملے میں مجھے پہلے سے ہی شک تھا۔ اس لیے میں مسلسل اس کی نگرانی کروا رہا تھا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ بروج آبپارہ مارکیٹ میں شاپنگ کے لیے گئی ہے۔ میں اس اطلاع پر بہت حیران ہوا۔ تصدیق کے لیے میں خود آبپارہ مارکیٹ پہنچ گیا اور بروج کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ بات میرے لیے ناقابل یقین تھی کیونکہ بروج کو میں نے خود شمس اور صداقت کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ پھر بروج گئی کیوں نہیں۔ یہ سوال مجھے بری طرح کھٹک رہا تھا میں نے بروج کا تعاقب کیا وہ آبپارہ مارکیٹ سے نکل کر جانتے ہو کہاں گئی تھی؟''

''کہاں......؟ سر جی!'' شانی نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس کا دماغ گھومنے لگا تھا۔ سر جی اس بروج کا قصہ سنا رہے تھے جو اس کے ساتھ موجود تھی۔

''شانی! وہ مارکیٹ سے نکل کر سیدھا قبرستان گئی تھی۔''

''قبرستان......!'' شانی کے ہونٹوں سے قبرستان کا لفظ یوں نکلا جیسے جسم سے روح نکل رہی ہوتی ہے۔

''سنتے جاؤ شانی! وہ قبرستان پہنچ کر ایک قبر کے پاس رکی اور قبر کی مٹی کو یوں ہٹایا جیسے کسی چیز سے ڈھکن ہٹایا جاتا ہے۔ قبر کی مٹی ڈھکن کی طرح اوپر کو اٹھی اور بروج قبر میں اتر گئی۔

''او نو سر جی! یہ...... بروج......'' شانی سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ سر جی کو جواباً کیا کہے۔

''زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے تھے چند منٹ تک میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ میں حیران و پریشان ناقابل یقین نظروں سے قبر کو دیکھ رہا تھا۔ اس قبر میں بروج غائب ہوئی تھی۔ اب وہ دوسری بے شمار قبروں کی طرح عام سی قبر تھی۔ پندرہ بیس منٹ تک میں سکتے کی کیفیت میں وہیں جما رہا اور شاید اس کیفیت سے نکلنے میں ابھی وقت لگتا مگر بروج اسی طرح قبر کا ڈھکن اٹھا کر باہر نکل آئی تھی میں آنکھیں مسل کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ وہی بروج تھی عام سی نازک اور خوبصورت لڑکی جو مجھے بیسیوں مرتبہ مل چکی تھی اور جسے میں نے شمس اور صداقت کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ بروج قبرستان سے نکل کر سیدھا اپنے فلیٹ میں چلی گئی تھی اور ہنوز وہاں موجود ہے۔''

''مگر سر جی! بروج تو یہاں میرے ساتھ ہے۔ اسے میں نے کل ہی لنچ پر گھر بلا لیا تھا۔ بروج ممی، منزہ اور میں نے اکٹھے لنچ کیا تھا اس کے بعد ہم اکٹھے ہی زمینوں کی طرف نکل گئے تھے چند عزیزوں کے گھر بھی گئے تھے رات گئے ہماری واپسی ہوئی تھی۔ پھر رات بروج میری بہن منزہ کے ساتھ ہی کمرے میں سو گئی تھی۔ اب صبح سے میرے ساتھ ہے۔''

''شانی! بروج کے پس پردہ کیا ہے۔ فی الحال سمجھ سے بالاتر ہے لیکن یہ بات بہرحال طے ہے کہ بروج بیک وقت یہاں اور وہاں دو جگہوں پر موجود ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے سابقہ حملوں کی طرح اس حملے کی خبر بھی پہلے سے پہنچ گئی ہو اور وہ لوگ عارف شکیل کی طرح تم لوگوں کے منتظر ہوں۔'' سر جی کی بات میں وزن تھا ایسا

ممکن تھا۔ مگر شانی واپس جانے کو تیار نہیں تھا وہ بولا۔

''سر جی! ہمارے حملے کی اطلاع دشمنوں تک پہنچ گئی ہے یا نہیں الگ بات ہے ہمیں اپنی کارروائی کرنی چاہیے۔ واپس پلٹنے کا کوئی فائدہ اس لیے نہیں کہ ہم انہیں کھودیں گے۔ اب اگر وہ چوکنے اور ہوشیار بھی ہوں پھر بھی ملیں گے تو سہی۔'' شانی باتوں کے دوران واپس موڑ مڑ چکا تھا۔ اس کے آدمی ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف تھے شانی اور طلحہ کی نظریں ملی تو شانی نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ طلحہ کے قدم بڑھانے پر دوسرے لوگ بھی اس کی پیروی کرنا چاہ رہے تھے مگر شانی نے اشارے سے ہی باقی ساتھیوں کو روک دیا تھا۔

''تمہاری بات درست ہے شانی مگر میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔'' سر جی کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا۔

''آپ حوصلہ اور ہم پر بھروسہ رکھیے سر جی! انشاء اللہ ہم ناکام نہیں لوٹیں گے۔'' باتوں کے دوران شانی کا ذہن بری طرح انتشار کا شکار تھا۔ طلحہ اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

''طلحہ! بروج کو گن پوائنٹ پر لے لو۔''

''ج..... جی.....'' طلحہ پر شانی کی بات کسی بم کی طرح پھٹی تھی۔

''بروج کو گن پوائنٹ پر لے لو۔'' شانی کے دوبارہ دہرانے کے باوجود وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے شانی سے حیرانی سے بولا۔

''ش ش..... شانی، طلحہ! بروج کو گن پوائنٹ پر لے لو۔'' اس بار شانی نے حلق کے بل چیختے ہوئے کہا۔ طلحہ سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ تیزی سے پلٹ گیا تھا۔

''ایم سوری شانی! میں بہت مجبور ہوں۔'' سر جی کے لہجے میں حقیقی ندامت تھی۔ وہ شانی کی اندرونی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔

''نہیں سر جی! ایسی کوئی بات نہیں مجھے میرا مشن سب سے مقدم ہے۔'' شانی نے پر اعتماد لہجے میں جواباً کہا۔

''خود کو سنبھالنا شانی! میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا گو رہوں گا۔'' رابطہ کٹتے ہی شانی نے ہم نواز سے بروج کے فلیٹ میں جا کر چیک کرنے کو کہا۔ ہم نواز نے پلٹ کر سر جی کی بات کی تصدیق کر دی تھی بروج وہاں موجود تھی۔ اس کا دماغ گھومنے لگا تھا۔ وہ یہ پراسرار ماجرا سمجھنے سے قاصر تھا۔ روشن نواز اداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گیا تھا۔ عاصم نواز نے شانی کے اٹھائے گئے قدم کو سراہا تھا۔ وہ اپنے آدمیوں کے پاس پہنچا سب کے چہروں پر الجھن واضح تھی۔ بروج کی طرف طلحہ اور شمس کی گنیں اٹھی ہوئی تھی۔ بروج کے چہرے پر حیرت کے آثار ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ شانی کو دیکھتے ہی تڑپ کر بولی۔

''شانی! یہ..... یہ سب کیا ہے یہ لوگ مجھے.....؟''

''ایم سوری بروج! تمہاری ذات شک کے دائرے میں آتی ہے۔''

''ش ش..... شانی.....'' وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

''پلیز بروج۔'' شانی نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا تھا۔ بروج کے خشک لب ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے۔ آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں شانی کو دیکھنا بھی محال ہو رہا تھا۔ مگر اپنی صفائی میں کچھ کہنا اس کا حق تھا اس نے بولنے کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہنا چاہا۔

''شانی! میرا قصور.....؟''

''بروج! مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔'' اسے انتہائی سپاٹ جواب دیا گیا تھا۔ شانی کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ بروج کے لیے کائنات یک دم ویران پھیکی بے رونق اور بے معنی ہو گئی تھی۔ شانی کی بے رخی انتہا کو چھو رہی تھی۔ وہ صداقت کو ہدایت دے رہا تھا۔

''صداقت! تم اور شمس بروج کو واپس اپنے ٹھکانے پر لے جاؤ۔ مگر خیال رہے یہ چند غیر فطری صلاحیتوں کی مالکہ ہے اور اس پر گروپ سے غداری کا الزام ہے۔ اس کا پورا پورا دھیان رکھنا اگر یہ بھاگنے یا کوئی غلط حرکت کرے تو بے شک گولی مار دینا۔'' شانی نے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اباؤٹ ٹرن لیا اور تیز قدموں کے ساتھ اپنی منزل کی

طرف چل پڑا۔ بروج سے نظریں ملانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ اس نے ہم نواز کو بھی بروج پر نظر رکھنے کو کہہ دیا تھا۔

پرنم آنکھوں سے بروج اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ دل و جان سے چاہنے والا سانسوں میں تحلیل اور دل کی دھڑکن میں دھڑکنے والا ایک پل میں پرایا کر گیا۔ یہ کیسی بے وفا دنیا ہے؟

❁ ❁ ❁

شیخ منیر کے دیئے گئے کلیو کی روشنی میں جو معلومات کروائی گئی تھی اس کے مطابق یہ جگہ، ہوم منسٹر عبدالبارق کی ملکیت ہے۔ یہ بہت بڑا فارم ہاؤس تھا۔ جس میں کئی ایکڑ قابل کاشت زمین موجود تھی۔ حالانکہ اس علاقے میں ہموار زمین نہ ہونے کے برابر تھی اور جو تھی وہ بھی ازل سے بنجر پڑی ہوئی تھی۔ مگر عبدالبارق نے اپنے ذاتی اخراجات سے یہاں اپنی زمین آباد کر رکھی تھی۔ وہ کاشتکاری کے جدید طریقوں سے نئی مشینریوں سے یہاں فصل پیدا کر رہا تھا۔ فارم ہاؤس میں تین عمارتیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ ایک عمارت مویشیوں اور جانوروں کے لیے مختص تھی اور دو رہائشی عمارتیں تھیں فارم ہاؤس کے چاروں طرف باڑھ لگی ہوئی تھی۔ عبدالبارق کا جو کچھ تھا وہ باڑھ کے اندر تھا۔ جبکہ فصلیں اور درختوں کے درمیان کھڑی عمارتوں کے گرد چار دیواری موجود تھی۔ فارم ہاؤس پر عبدالبارق نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ شانی کو ایسی شاہ خرچیوں کا پس منظر بہت اچھی طرح سے پتہ تھا۔ زر پرست لوگ ملک وقوم سے غداری کے عوض اپنی جیبیں بھرتے ہیں اور ان پیسوں کے بل بوتے پر اس طرح کے ناممکن کام کر دکھاتے ہیں۔ ہوم منسٹر عبدالبارق اپنے آخری انجام کو پہنچ چکا تھا۔ مگر غیر ملکی ایجنٹ ان کے ہاتھوں کا لگایا ہوا پھل ہنوز چبا رہے تھے۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ ان کا اس پورے خاندان پر اثر ورسوخ چلتا ہے۔ ہوم منسٹر عبدالبارق کے چچا اور بھائی دونوں ایم این اے تھے۔ شانی کو تین افراد کی کمی کے باعث اپنی حکمت عملی میں تبدیلی لانا پڑی تھی۔ پہلے اس نے دو گروپوں میں دو طرف سے حملہ کرنا تھا جبکہ اب اس نے ایک دو بندوں کو فارم ہاؤس کے چاروں طرف سے حملہ کرنے کا کہہ دیا تھا۔ رابطے کے لیے ان کے پاس ٹرانسمیٹر موجود تھے۔ شانی نے اپنے ساتھ قاسم کو رکھا تھا۔ انہوں نے فرنٹ سے اندر داخل ہونا تھا۔ اس طرف کھیت اور درخت تھے ان کا پروگرام کھیتوں اور درخت کی آڑ میں بادامی عمارت تک پہنچنا تھا۔ باڑ کی اونچائی صرف پانچ میٹر تھی جسے انہوں نے ہائی جمپ لگا کر با آسانی عبور کر لیا تھا۔ یہاں درختوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کے چارے کی فصل لگی ہوئی تھی۔ وہ جھکے جھکے انداز میں بھاگتے ہوئے فصل میں گھس جانا چاہ رہے تھے۔ مگر وہ اپنے ارادے پر عمل نہیں کر سکے۔ کیونکہ اچانک ہی بہت سے افراد ادھر ادھر سے نکل کر گھیرے میں لے چکے تھے۔ شانی اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا مگر جس طرح اندر جاتے ہی انہیں گھیر لیا گیا تھا اس سے پتہ چلتا تھا انہیں اندر سے مانیٹر کیا جا رہا ہے۔ تقریباً دس گنیں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ وہ تمام افراد مقامی لوگ تھے۔ شانی کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے ہم نواز کو بھیجنا تھا مگر عجلت میں وہ غلطی کر بیٹھا تھا۔ اس غلطی کی پاداش میں وہ بے بسی کے ساتھ مارے جا سکتے تھے۔ شانی سوچ رہا تھا کہ کیا اب دشمنوں کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح گر جانا ہے سوچیں اس پر حملہ آور تھی جبکہ انہیں ہتھیار نیچے پھینکنے کا آرڈر دیا جا چکا تھا۔ فی الحال ان کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ انہوں نے سلنڈر رہونے میں تھوڑی سی تاخیر کی تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں اور داڑھی والے ایک شخص نے کڑک دار لہجے میں اسے مخاطب ہو کر کہا۔

"شانی! کوئی حماقت مت کرنا ہمیں تمہاری ذرا سی غلط حرکت پر گولی مارنے کے آرڈر ملے ہیں۔" تحکمانہ انداز میں انہیں تنبیہ کی گئی تھی۔ اپنا نام اجنبی کے منہ سے سن کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں بھی بروج یا کوئی اندر کا عزیز اپنا کام کر چکا ہے۔ دو آدمی ان کی جامہ تلاشی لینے

کے لیے آگے بڑھ آئے تھے۔ دونوں حلیے سے کم وبیش آرڈر دینے والے شخص کے مشابہ تھے۔ شانی کی تلاشی لینے والا اسمارٹ نوجوان تھا۔ شانی نے دھیمی آواز میں ''کے'' کا لفظ ادا کر کے قاسم کو کوڈ ورڈ میں تیار رہنے کا سگنل دے دیا تھا شانی کے اعصاب تن گئے تھے۔ تلاشی لینے والا نوجوان جیسے ہی جھکا شانی نے پھرتی سے اسے دبوچا اور پلک جھپکتے ہی اٹھا کر نزدیک کھڑے آدمیوں پر پھینک دیا۔ ساتھ ہی جھک کر گن اٹھاتے ہوئے الٹی قلابازی کھائی۔ قلابازی کے دوران ہی اس نے ہوا میں اڑتے ہوئے فائر کھول دیا تھا یہ چند سیکنڈ کی بات تھی۔ انہیں گھیرنے والے آدمی اس جرأت اور پھرتی کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے لاشعوری طور پر ان کے اعصاب ڈھیلے تھے۔ مگر شانی اور قاسم نے برق رفتاری دکھائی تھی۔ قاسم نے بدمقابل کو وہیں ڈھیر کر کے اسے ڈھال بنا کر فائرنگ کی تھی۔ دونوں کی بیک وقت فائرنگ سے کئی بندے ڈھیر ہو گئے تھے۔ کچھ ہمیشہ کی نیند سو گئے تھے اور کچھ کراہ رہے تھے۔ جو سنبھل گئے تھے انہوں نے جواباً فائرنگ ضرور کی تھی مگر حسب منشاء نتیجہ نہ پا سکے تھے۔ کیونکہ شانی اور قاسم اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ شانی لانگ جمپ لے کر قریبی درخت کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا دو افراد جھکے جھکے بائیں جانب بنے ہوئے کمرے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ شانی نے ان کا نشانہ لے کر فائر کیے ٹھا ٹھا کی آواز کے ساتھ ان کی چیخیں بھی فضا میں بلند ہونے لگیں۔ اس کے اندازے کے مطابق دس میں سے سات افراد ٹھکانے لگ چکے تھے باقی تین بمعہ قاسم کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ فارم ہاؤس کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

میدان گرم ہو چکا تھا۔ اسے جلد سے جلد اصل عمارت تک پہنچنا تھا۔ وہ قریبی کھیتوں میں گھس کر جھکے ہوئے انداز میں بھاگنے لگا۔ فصل اتنی بڑی نہیں تھی اگر سیدھا بھاگتا تو یقیناً تاڑ لیا جاتا۔ فصل کے اختتام پر گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ اصطبل میں بہت سے نسلی گھوڑے بندھے ہوئے تھے فائرنگ کی آواز گھوڑوں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ان کی گردنیں اور جسم کے بال کھڑے ہو گئے تھے وہ بے چینی کے ساتھ ادھر ادھر پاؤں مار رہے تھے۔ شانی نے لحظہ بھر رک کر وہاں کا جائزہ لیا یہاں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ وہ دوسری طرف باہر نکل گیا۔ اس طرف چند مویشی بندھے ہوئے تھے۔ سامنے ہی بادامی عمارت کی دیوار بھی نظر آرہی تھی۔ فائرنگ میں شدت آگئی تھی۔ بادامی عمارت کے پاس ہی دستی بم بھی پھٹا تھا۔ یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی۔ فارم کے محافظ اس کے آدمیوں سے مقابلہ کرنے میں مگن تھے۔ وہ اصل عمارت میں باآسانی داخل ہو سکتا تھا۔ اس نے دیوار کی طرف دوڑ لگا دی۔ دوڑتے ہوئے اس نے چھلانگ لگائی اور عقبی دیوار کا کونا پکڑنے میں کامیاب ہو گیا وہ دیوار پر رکنے کی بجائے فوراً اندر کود گیا۔ مگر اندر والے جیسے اس کا انتظار کر رہے تھے وہ ایک بار پھر بندوقوں کے نرغے میں تھا۔ اس بار بندوق برداروں کی تعداد دس کی بجائے پندرہ تھی۔ شانی نے طویل سانس خارج کی اپنی گن زمین پر رکھ کر ہاتھ سر سے بلند کر دیئے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

ڈیوڈ کو صدارتی محل سے بلائے جانے کی کال موصول ہوئی تو اس کے لبوں پر عجیب وغریب مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ دوسرا موقع تھا جب وہ اسرائیل کے صدر سے ملنے جا رہا تھا۔ پہلی بار وہ ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں شریک ہوا تھا۔ مگر تب صدر صاحب کے ہمراہ میٹنگ میں پندرہ دیگر سینئر وزراء بھی شریک تھے جبکہ اس بار صدر صاحب کے علاوہ صدر کے مشیر خاص نائب صدر اور وزیر دفاع موجود تھے۔ صدر صاحب نے ڈیوڈ کو مخاطب کیا۔

''مسٹر ڈیوڈ! ہم آپ کی کارکردگی کے ہمیشہ سے معترف رہے ہیں آپ نے اب تک اعلیٰ سے اعلیٰ کام کیا ہے لیکن ہم مزید تیزی چاہتے ہیں ہم اپنے ہدف کے حصول کے لیے بے چین و بے قرار ہیں۔''

''سر! ہم ہدف کے بالکل نزدیک کھڑے ہیں۔ دنیا

ہماری مٹھی میں سما چکی ہے۔ ایسا کون سا ملک ہے بشمول امریکا جسے ہم نے بوقت ضرورت استعمال نہ کیا ہو۔ برطانیہ، جاپان، فرانس، جرمنی، عرب ممالک، اسلامی وغیر اسلامی کوئی بھی ملک ایسا نہیں جو کسی نہ کسی طرح ہمارے حکم کی تعمیل کو اپنا فرض نہ سمجھتے ہوں۔ سر دنیا کو اندازہ ہی نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ ان کی تباہی کا وقت انتہائی قریب ہے اور دنیا غفلت کی نیند سو رہی ہے۔"

"مسٹر ڈیوڈ۔ جناب صدر چاہتے ہیں کہ ہم جو کچھ پس پردہ رہ کر کرتے ہیں وہ سر عام کریں۔" وزیر دفاع نے پہلے صدر صاحب کو دیکھا پھر ڈیوڈ سے بولے۔

"یعنی اب وقت آچکا ہے کہ ہم دنیا کو بتا دیں کہ کرہ ارض پر صرف اسرائیل حکمرانی کر سکتا ہے۔"

"سر! آپ یقین کیجیے یہودیوں کی مطلق العنان حکومت کرہ ارض پر قائم ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

"کیسے؟ مسٹر ڈیوڈ!" اس بار نائب صدر نے سوال کیا۔ ڈیوڈ جواباً بولا۔

"سر! ہم نے ریاستوں کو اپنے ذہین وفہیم دماغوں سے ایک جال میں پھنسا دیا ہے۔ کوئی ریاست بوجہ داخلی انتشار ہماری مدد کو تیار بیٹھی ہے کوئی اندرونی بدنظمی، معاشی و اقتصادی تباہی کا شکار ہو کر ہم پر نگاہیں جمائے ہوئے ہیں۔"

"ہمیں آپ پر پورا یقین ہے مسٹر ڈیوڈ! آپ نے آج تک جو کچھ کہا ہے وہ قابل قدر و قابل تحسین ہے۔ یہودیوں کو دوسرے تمام مذاہب پر غالب لانے کے لیے آپ کی خدمات گراں قدر ہیں۔"

"سر! میں نے ہمیشہ اقوام عالم کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ قوموں کے خیالات اور رجحانات، کردار اور عمل، سیاسی منظر نامے، معاشی و اقتصادی صورت حال سب کو نظر میں رکھا ہے۔ ہم نے ہمیشہ انہیں ملحوظ رکھ کر اپنی پالیسی مرتب کی ہے۔ دنیا کے بیشتر لیڈران ہمارے فصیح و بلیغ مشوروں پر عمل کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔"

"بے فکر رہیے سر! ہم نے سوئی قوموں کے حلق میں ایسی دوا ڈال دی ہے کہ وہ طویل عرصہ ہوش میں نہیں آسکتے۔ انہیں اپنی حالت بدلنے کی فکر ہی نہیں وہ زبانی کلامی دعوؤں ظاہری نمود و نمائش، میڈیا میں بتنگڑ بازوں، چھپے ہوئے مواد، سیاسی چالوں، بیان بازیوں اور تیز و تند خطابات کے اسیر ہو چکے ہیں۔ وہ معمول کی طرح ٹرانس میں آجاتے ہیں۔ اس لیے پاکستان جیسے اہم اسلامی ملک جسے ہم نے ہٹ لسٹ پر رکھا ہوا ہے اس میں ہمیشہ کم و بیش ایک جیسے نظریات اور تصورات اور منشور کی جماعتیں حکمرانی کرتی چلی آرہی ہیں چہرے بدل جاتے ہیں نظام نہیں بدلتے۔ وہاں جمہوریت کا نعرہ فخر سے لگایا جاتا ہے۔ جو ہماری یعنی یہودیوں کی پیداوار ہے۔"

"مسٹر ڈیوڈ! ہم نے سرکاری زبان اور پالیسیوں کو اتنی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے کہ ہم ملکوں کے مابین سیاسی نظاموں، معاشی معاہدوں، اخراجات و قرضہ جات کے زریں اصولوں پر عبور حاصل کر چکے ہیں ہم نے اپنی فراست سے اپنے اصل ادارے تو مخفی رکھے مگر دوسروں کے راز حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہم اپنی ایک گولی بھی ضائع نہیں کرتے اور عراق جیسے دشمن ممالک کو فتح کر لیتے ہیں اسی طرح ایک دن پاکستان بھی ہماری مٹھی میں ہوگا۔ مڈل ایسٹ کے کئی ممالک ہماری گود میں ہیں۔ مگر ہم فلسطین کی سرزمین پر جلد از جلد مذہبی فرائض سرانجام دینا چاہتے ہیں۔"

"سر! آپ کا اشارہ پہلے آرمیگاڈان کی طرف ہے جس کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل قائم ہو جائے۔"

"بالکل! ہم وہاں اپنا تھرڈ ٹمپل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ کو گرا کر وہاں پر تخت داؤد رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا مسیحا اسی تخت پر آکر بیٹھے گا۔"

"سر! ہم نے پوری دنیا کے شعور اور لاشعور میں اپنے آنے والے مسیحا کو کسی نہ کسی طرح بٹھا دیا ہے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت جلد تھرڈ ٹمپل تعمیر ہو جائے گا۔" ڈیوڈ نے اس کے بعد پورا آدھا گھنٹہ لیکچر دیا۔ اس کی

سحر انگیز باتیں ہمیشہ کی طرح صدر صاحب اور دیگر اسرائیلی اعلیٰ حکام کے دل و دماغ میں اتر گئی تھیں۔ ڈیوڈ وہاں چار گھنٹے طویل میٹنگ کر کے نکلا تو اس کے ذہن میں ایک حتمی فیصلہ جنم لے چکا تھا۔ صدارتی محل میں اس کی خصوصی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر مین روڈ تک آیا یہاں کافی رش تھا۔ شاپنگ مال، ہوٹل، کلب، رنگ برنگی دکانیں، سجے سجائے شوکیس اور مرد و عورتوں کا ہجوم۔ اسرائیل نے بہت جلد ترقی کی راہیں عبور کی تھیں۔ کشادہ روڈ کے کشادہ فٹ پاتھ پر بہت رش تھا۔ ڈیوڈ ہجوم میں تیز قدموں سے چلتا ہوا یوں غائب ہو گیا جیسے اسے زمین نگل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔ اس کے دائیں بائیں چلنے والے لوگوں کو بھی پتہ نہیں چلا کہ ان کے درمیان چلنے والا دراز قد اچانک ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گیا ہے۔

بحر اوقیانوس کے تین سو جزیرے تھے۔ ویران، بیابان، غیر آباد اور پراسرار جزیرے۔ ان میں سے بیس جزیروں پر انتہائی کم تعداد میں انسانی زندگی متحرک تھی۔ باقی 270 جزیرے نہ صرف غیر آباد تھے بلکہ انتہائی خطرناک، پراسرار اور انسانی عقل سے ماورا تاریخ کے حامل تھے۔ دنیا انہیں برمودا ٹرینگل کے نام سے جانتی ہے۔ جو 1140000 مربع کلومیٹر پر محیط ہیں۔ ان جزیروں کا تکون فلوریڈا میں بنتا ہے۔ یہ خطرناک جزیرے تکون کے نام سے 1945ء میں مشہور ہوئے تھے۔ برمودا تکون نے دنیا کو اپنے سحر اور پراسراریت میں لپیٹ رکھا ہے۔ وہ بھی ایسے کہ دنیا بالکل اندھی ہو چکی ہے۔ دنیا نے کبھی فلوریڈا کے معنی پر غور نہیں کیا۔ فلوریڈا یعنی وہ خدا جس کا انتظار کیا جارہا ہے۔

ہجوم سے غائب ہونے والا ڈیوڈ گرو کے روپ میں فلوریڈا کے مقام پر کھڑا ہوا پر مسرت نگاہوں سے بے کراں سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں کس قدر خوف و ہراس امڈ آتا ہے یہ سب جانتے تھے۔ مگر اس کی گہرائیوں میں کتنے راز پنہاں ہیں کوئی نہیں جانتا۔ پچھلے 4 سو سالوں سے کسی انسان نے 270 ویران جزیروں میں جا کر نہیں جھانکا۔ نہ کسی نے وہاں رہنے کی جرات کی ہے۔ ہاں البتہ 1451ء یہاں سے کرسٹوفر کولمبس نے گزر کر عجیب و غریب مشاہدات کیے تھے۔ یہاں پہنچ کر قطب نمانے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آگ کے بڑے بڑے گولے سمندر کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اس کے بعد حادثات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو وجود میں آیا ہے۔ گرو کے سامنے فلوریڈا کے معنی گردش کر رہے تھے۔ وہ خدا جس کا انتظار کیا جارہا ہے۔

”وہ خدا، وہ مسیحا میرا آخری ہتھیار ہے۔“ گرو نے بلند آواز میں کہا۔

”جس مسیحا نے دنیا میں آ کر حکمرانی کرنی ہے۔ اور دنیا کا وہ آخری طاقتور حکمران میرا تابعدار ہوگا۔“

گرو نے چشم تصور میں آنے والے اس خدا کو دیکھا اور بولا۔

”عنقریب ہے وہ وقت جب دنیا کو فتح کرنے والا مسیحا نمودار ہوگا۔ وہی ہے دنیا کا اصل حکمران میرا آخری فیصلہ کن اور کارآمد ہتھیار۔“ گرو کہتے ہوئے زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

شانی کا خیال درست تھا۔ نثار پور کی پہاڑیوں پر اس کا پیچھا کرنے والے وہ غیر ملکی مرد اور عورت اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ کل ملا کے وہاں چار غیر ملکی اور تین مقامی اشخاص موجود تھے۔ شانی کو کرسی پر باندھ دیا گیا تھا۔

”جان رائٹ! یہ وہ شانی ہے۔ جس نے ہمارے کئی بندوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اسی کی تلاش میں ہم پچھلے کئی عرصے سے سرگرداں رہے ہیں۔“ جان رائٹ کو معلومات دینے والا یہ شخص کولن تھا۔ اس کے ساتھ ڈورتھی اور ولیم کھڑے تھے۔ کولن کی بات کو ڈورتھی نے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے مشن میں بھی رکاوٹیں اور پریشانیاں آئی ہیں وہ اسی نوجوان کی مرہون منت رہی ہیں۔"

"فکر نہ کرو ڈورتھی! اب یہ اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والا ہے۔" جان نے شانی کے سپاٹ چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"حیدر عباس! سنا ہے آپ ایسے تیس ماروں کی زبان کھلوانے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔"

جان رائٹ کی بات پر شانی نے چونک کر اس شخص کی طرف دیکھا جس کی طرف جان کا روئے سخن مڑا ہوا تھا۔ حیدر عباس تن و من گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ قد میں چھوٹا مگر بہت چالاک اور چست دکھائی دیتا تھا۔ حیدر عباس کے بولنے سے بیشتر ہی شانی نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

"جان! تم لوگوں کا جو انجام جو ہوگا سو ہوگا۔ مگر حیدر عباس جیسے غدار شخص کو ایسی عبرتناک سزا دوں گا کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی کبھی پاکستان سے غداری کا تصور نہیں کریں گی۔" جان رائٹ شانی کا مضبوط پراعتماد لہجہ دیکھ کر قدم بڑھاتے ہوئے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دونوں عمر کے علاوہ قد اور باڈی میں ہم پلہ تھے۔

"جی دار لگتے ہو۔ جی دار دشمن جان کو پسند ہے۔" جان شانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"جان! تم لوگوں نے پاکستان میں داخل ہو کر اپنی زندگیوں کو مختصر کر دیا ہے۔ تم لوگ یہاں زندہ آئے ہو مگر واپس تابوت میں جاؤ گے۔ وہ بھی پتہ نہیں تم لوگوں کی قسمت میں لکھا ہے یا نہیں۔"

"تم ابھی عمر میں بہت چھوٹے ہو شانی! تمہارا گرم خون تمہیں کھلی آنکھوں سے اچھے سپنے دکھا رہا ہے۔ جو بند آنکھوں کے سپنوں میں بھی پورے نہیں ہوتے۔"

"جان! نثار پور کی پہاڑیوں پر تم نے اپنے بندوں کی لاشوں کا نظارہ تو کیا ہی ہوگا۔" شانی کے لہجے میں بھرپور طنز تھا۔

"میری آنکھیں جو مجھے سپنے دکھاتی ہیں وہ لاشیں انہیں کی تعبیر تھی۔"

"جان! اسے میرے حوالے کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں اس کی ساری اکڑ ناک کے راستے باہر نکال دوں گا۔" حیدر عباس نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"حیدر عباس! تم جیسے ضمیر فروش اور زر پرست غدار جو پیسوں کے لیے اپنی ماں، بہن بھی ان گوروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ تم میرا بال بھی بانکا نہیں کر سکتے۔" شانی کی باتوں نے حیدر عباس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اس نے غصے میں شانی کے منہ پر مکا رسید کر دیا۔ طاقتور مکا شانی کے منہ پر پڑا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اسے خون کا کڑوا ذائقہ محسوس ہوا۔ اس نے پوری قوت سے حیدر عباس کے منہ پر تھوک دیا۔

"لعنت ہے تیری زندگی پر حیدر عباس، تو اپنے ملک اور قوم کا سودا کرتا ہے۔ تو غدار ہے اس لیے صرف نفرت کے قابل ہے۔ صرف نفرت کے۔" شانی کے لہجے میں چنگاریاں اڑنے لگی تھیں۔

حیدر عباس نے آستین سے چہرہ صاف کیا اور اس پر ٹوٹ پڑا۔

"میرا خیال ہے جان! ہمیں حیدر عباس کو موقع دینا چاہیے۔ اپنی ذلت کا بدلہ لینے اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو کولن، حیدر عباس! آپ کرم خان اور جلیل کے ساتھ شانی سے اپنا بدلہ لے سکتے ہو۔ میری منشاء تو آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں جان رائٹ! جیسا آپ چاہتے ہیں یہ ویسا ہی بولے گا۔" حیدر عباس کے جسم میں اضطراب بھر گیا تھا۔ اس نے کئی تابڑ توڑ مکے شانی کے پیٹ اور چہرے پر مارے تھے۔ اب وہ جلد سے جلد شانی کو مزید سبق سکھانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے حیدر عباس! ہم اس کے دوسرے بندوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ آپ کا شکار ہے۔ اس نے آپ کے چہرے

پر تھوک کر آپ کی توہین کی ہے جس کی سزا اسے ضرور ملنی چاہیے۔ مگر خیال رکھنا جب تک یہ اندر کا سارا سچ باہر اگل نہ دے اسے موت نہیں آنی چاہیے۔''

''ایسا ہی ہوگا جان رائٹ!'' حیدر عباس کے یقین بھرے الفاظ سن کر جان نے ولیم اور ڈورتھی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

ان کے باہر نکلتے ہی حیدر عباس کے رکے ہوئے ہاتھ پھر سے چل پڑے۔ حیدر عباس کے منہ سے غصے کی حالت میں جھاگ نکل رہی تھی۔

''کمینے انسان حیدر عباس کو گالی دیتا ہے۔'' حیدر عباس نے اسے گالی دیتے ہوئے مکوں اور لاتوں کا استعمال جاری رکھا۔ شانی کو کئی شدید ضربیں لگی تھیں۔ حیدر عباس چند سے سانسیں لینے کے لیے رکا تو شانی مضبوط لہجے میں بولا۔

''حیدر عباس! میں گالی نہیں دے رہا۔ حقیقت بتا رہا ہوں۔ تم جیسے لعنتی لوگ گوروں کی وفاداری میں سب کچھ کرتے ہو۔ گوروں کی خوشامد میں انہیں بیویاں تک پیش کر دیتے ہو۔'' شانی' حیدر عباس کو طیش کی آخری حد تک لے گیا۔ حیدر عباس اسے تگڑی گالی دیتے ہوئے بولا۔

''اس بات کا جواب ابھی دیتا ہوں۔ سلمان نمک لے آؤ جلدی۔'' کہتے ہوئے حیدر عباس نے تیز دھار خنجر نکال لیا۔ شانی چاہ رہا تھا کہ وہ غصے میں اسے مزید مکے اور لاتیں مارے کیونکہ جھٹکوں کی وجہ سے اس کی رسیاں ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ مگر حیدر عباس نے اس کے بازو میں خنجر گھونپ دیا۔ خنجر کا پورا پھل بازو کی مچھلی میں اتر چکا تھا۔ شانی کے منہ سے درد کی وجہ سے چیخ نکل گئی۔ حیدر عباس نے خنجر واپس کھینچنے کے بجائے نیچے کی طرف کھینچا جس سے گوشت نیچے تک پھٹ گیا۔ خون فوارے کی طرح ابلنے لگا تھا۔ شانی کی آنکھوں میں نیلے پیلے ستارے گردش کرنے لگے۔ درد کی تیز ٹیسوں کو برداشت کرنے کے لیے اس نے ہونٹ سختی سے دبا رکھے تھے وہ ابھی درد کی تیز لہر سے سنبھلا نہیں تھا کہ حیدر عباس نے زخم میں نمک ڈال دیا۔ اب درد کی شدت نا قابل برداشت ہوگئی۔

''دھیان رکھنا حیدر عباس! یہ مر نہ جائے۔'' کرم خان نے کہا۔

''کرم خان! اتنی آسانی سے اس کتے کو نہیں مرنے دوں گا۔ میں اس کی بوٹی بوٹی نوچ لوں گا مگر مرنے نہیں دوں گا۔'' شانی سر کو جھٹک کر خود کو ہوش میں رکھنے کے جتن کر رہا تھا۔ جب حیدر عباس نے اس کے زخم پر ریوالور کے دستے سے ضربیں لگانا شروع کیں تو شانی کو محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ کھل گئے ہیں یہ حوصلہ افزا احساس تھا۔ اس احساس نے درد کی شدت کو کم کر دیا۔ اس نے بازوں کو حرکت دینا چاہی تو بائیاں بازوں جس میں خنجر کا گہرا زخم لگا تھا۔ حرکت کرنے سے معذور ہو چکا تھا۔ شانی کو دائیں بازو کی آزادانہ حرکت نے خوش کن احساس دلایا۔ رسیاں کھل گئی ہیں یا ٹوٹ گئی ہیں۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے بازو باہر نکال لیے تھے۔ حیدر عباس پر خون سوار تھا۔ جبکہ دوسرے افراد شانی پر ہونے والے تشدد سے محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ یہ اندازہ نہ کر سکے کہ شانی رسیوں سے آزاد ہو چکا ہے۔

حیدر عباس کا ہاتھ شانی کے دوسرے بازو پر وار کرنے کے لیے بلند ہو چکا تھا۔ مگر دوسرا وار کرنا اس کی حسرت بن گیا۔ وہ جیسے ہی تھوڑا سا جھکا شانی نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ شانی کے آہنی شکنجے میں حیدر عباس مچھلی بے آب کی طرح تڑپنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں اور منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ کرم خان اور سلمان چند لمحے تو صورت حال کا اندازہ ہی نہ کر سکے جب تک ماجرا ان کی سمجھ میں آتا حیدر عباس کا گلا دبا کر شانی نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ساتھ ہی کھڑے ہو کر حیدر عباس کا جھولتا ہوا جسم کرم خان اور سلمان پر اچھال دیا۔ شانی کا ایک بازو حرکت نہیں کر رہا تھا۔ مگر دوسرے ہاتھ سے وہ کمال دکھا رہا تھا۔ حیدر عباس کے جسم سے ٹکرا کر کرم خان اور سلمان دونوں نیچے گرے ان کے ہاتھوں

سے گنز بھی نکل گئی تھیں۔ شانی نے آگے بڑھ کر گن اٹھا لی۔ گن اٹھاتے ہی اس نے فائر کھول دیے تھے۔ چند منٹوں میں کمرے کا نقشہ بدل گیا تھا۔ حیدر عباس زندگی کی بازی ہار کر ٹیڑھے میڑھے انداز میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ جبکہ کرم خان اور سلمان کی خون میں لت پت لاشیں بھی ایک کونے میں پڑی ہوئی تھیں۔ شانی نے انتہائی نفرت سے حیدر عباس پر تھوکتے ہوئے کہا۔

''افسوس ہے حیدر عباس! کہ تمہیں آسان موت مل گئی ہے۔'' جوش میں شانی کو احساس نہیں ہوا تھا مگر اب اس کا پورا جسم درد سے تڑپنے لگا تھا۔ بازو کی ہلکی سی جنبش سے ناقابل برداشت درد اٹھ رہا تھا۔

''ہم نواز پوری عمارت کا جائزہ لو۔ دیکھو میرے ساتھی کہاں ہے؟ اور غیر ملکی کیا کر رہے ہیں؟''

''شانی! تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا کیونکہ بازو کا زخم بہت گہرا ہے۔''

''اتنا گہرا بھی نہیں ہے روشن نواز! اور گہرا ہوتا بھی تب بھی پروا نہیں۔ شانی کہتے ہوئے دروازے کے پاس رک گیا۔ ہم نواز نے اسے آکر بتایا۔

''جان رائٹ اسی لائن کے چوتھے کمرے میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا ہوا ہے جبکہ دوسرے غیر ملکی اوپر کی منزل پر ایک ہی کمرے میں موجود ہیں۔ شانی کے چاروں ساتھی عمارت کے تہہ خانے میں قید ہیں۔ جبکہ پوری عمارت میں سیکڑوں کی تعداد میں اسلحہ بردار لوگ موجود ہیں۔ تاہم وہ سب باہر مختلف پوزیشنیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ ایک کمرے میں شانی کے دو بندے حنیف بلوچ اور ہدایت اللہ کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ اس معرکہ میں جان کا نذرانہ دے چکے تھے۔''

''ہم نواز! تہہ خانے تک میری رہنمائی کرو مجھے جلد سے جلد اپنے بندوں کو باہر نکالنا ہے۔ غیر ملکیوں پر قابو پانے کے لیے ہم سب کا اکٹھا ہونا لازمی ہے۔''

''شانی! سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں تم لوگوں کے لیے باہر نکلنا ناممکن لگتا ہے۔''

''عاصم نواز! میں یہاں سے زندہ نکلنے کے لیے نہیں آیا۔ میں یہاں انہیں تباہ کرنے یا خود تباہ ہونے کے لیے آیا ہوں۔ تم دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔'' شانی کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی شرٹ اتاری پھر بنیان اتار کر اسے اپنے زخم پر کس کر باندھ دیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شرٹ پہن کر وہ ہم نواز کی رہنمائی میں دبے قدموں سے تہہ خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ باآسانی تہہ خانے میں پہنچ گئے تھے۔ قاسم، طلحہ، عبداللہ اور طیب اسے دیکھ کر چونک پڑے۔

''شانی بھائی! آپ تو بہت زخمی ہیں۔'' قاسم نے پریشان حال لہجے میں کہا۔ شانی کی حالت دیکھ کر ان سب کے چہروں پر فکرمندی کے آثار تھے۔ شانی قاسم کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

''میں ٹھیک ہوں، میری فکر چھوڑو تم لوگ میری بات غور سے سنو۔ اس عمارت میں سیکڑوں کی تعداد میں لوگ موجود ہیں۔ ہم سب کو ہلاک کر کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔''

''تو پھر شانی؟''

''ہمارا اصل ہدف غیر ملکی ہیں لہٰذا ہمیں انہی پر قابو پانا ہے۔ اگر وہ ہمارے ہتھے چڑھ جاتے ہیں تو ہم انہیں یرغمال بنا کر عمارت سے بھی نکل سکتے ہیں۔''

''مگر غیر ملکیوں کے ساتھ مقامی لوگ موجود تو ہوں گے۔''

''یقیناً ہیں عبداللہ لیکن اس وقت غیر ملکی مختلف کمروں میں موجود ہیں۔ ہمارے لیے یہ نادر موقع ہے کہ ہم انہیں دبوچ لیں۔''

شانی نے ہم نواز کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق عبداللہ اور طلحہ کو کون، ڈورتھی اور ولیم کے کمرے کی طرف جانے کو کہا۔ قاسم اور طیب کو نگرانی کے لیے چھوڑا اور خود جان رائٹ کے کمرے کی طرف لپکا۔ تہہ خانے کے کمرے میں انہیں اپنا سامان بھی مل گیا تھا۔ شانی کے بازو کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ تاہم اس نے کوئی پروا نہیں کی۔

وہ جان رائٹ کے کمرے میں اچانک ہی داخل ہوا تو جان اسے دیکھ کر اچھل پڑا۔

''تت...... تم......'' چند سیکنڈ وہ حیرت کے شدید ترین جھٹکے میں مبہوت شانی کو دیکھتا رہا۔ شانی اس دوران اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ جان کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔ شانی کی گن کا رخ جان کے کشادہ سینے کی طرف تھا۔

''جان! مجھے روکنا تمہارے پالتو کتوں کے بس سے باہر ہے۔''

''میں نے تمہیں سمجھنے میں واقعی غلطی کی ہے۔'' جان نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے باہر نکل آیا تھا اور اب پرسکون و مطمئن نظر آ رہا تھا۔ شانی اس کے پرسکون چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''جان! اگر تمہیں اپنے آدمیوں کے آنے کی اُمید ہے تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ سارے ٹھکانے لگ چکے ہیں اور اب تمہاری باری ہے۔'' شانی اسے نفسیاتی طور سے مرعوب اور پریشان کرنا چاہتا تھا۔ مگر جان رائٹ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ اس نے اچانک ہی شانی کی گن پر ہاتھ مار دیا۔ شانی کے لیے یہ حرکت خلاف توقع تھی۔ ہاتھوں پر نیچے کی طرف دباؤ بڑھنے سے شانی بھی جھک گیا۔ جان رائٹ نے گھٹنے کا وار اس کی ٹھوڑی پر کیا۔ ضرب شدید تھی۔ شانی کے منہ سے درد کی تیز سسکی نکلی۔ خوش قسمتی سے اس کی زبان دانتوں تلے دبی نہیں۔ ورنہ کٹ جاتی۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ جان رائٹ گن اٹھانے کے لیے فوراً ہی آگے بڑھا مگر شانی کی آگے کی جانب والی ٹانگ سے ٹکرا گیا۔ وہ ٹکرا کر آگے کی طرف بڑھا تو شانی نے الٹا بازو گھمایا اس کا ہاتھ جان رائٹ کی گردن پر پڑا۔ جان رائٹ نے اس وار کی قطعاً پروا نہیں کی اور فوراً گھوم گیا۔ مگر گھومتے ہی اس کے منہ سے اوغ کی تیز آواز خارج ہوئی۔ شانی نے اس کے سینے پر ٹکر ماری تھی۔ جان رائٹ نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا لیا۔ شانی اسے موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس نے ناک کا نشانہ لیتے ہوئے گھونسہ رسید کیا۔ مگر اس بار اسے خود دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ جان رائٹ نے بروقت چہرہ ہٹا دیا تھا۔ جس سے شانی کا مکا پچھلی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اسے اپنی انگلیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جان رائٹ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا زخمی بازو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ شانی کے بازو سے درد کی سوئیں پھوٹنے لگی تھیں۔ جب جان رائٹ نے اس کے بازو کو زور سے جھٹکا دیا تو شانی اپنی چیخ پر قابو نہ رکھ سکا تاہم اس نے خود کو سنبھالا اور انگلی کی پک بنا کر جان رائٹ کی آنکھ میں مارنا چاہی لیکن جان اب مکمل طور سے سنبھل گیا تھا۔ اس نے نہ صرف اس کا وار خالی جانے دیا بلکہ شانی کا وہ بازو جو وار خالی جانے کی وجہ سے جان کے کندے پر آ پڑا تھا جان اس بازو کو پکڑ کر جھول گیا۔ اس کے جسم کا پورا وزن شانی کے بازو پر آن پڑا تھا۔ شانی کے بازو سے کھٹک کی آواز ابھری۔ اس کے چہرے پر کرب کے شدید ترین آثار نمودار ہو چکے تھے۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور نیچے سے گھٹنا جان رائٹ کے نازک حصے پر دے مارا۔ جان رائٹ درد سے دہرا ہوتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ شانی نے اس بار زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔ اس کی ٹکر جان رائٹ کی ناک پر ایسی پڑی کہ اس کی ناک چپک گئی۔ شانی کا حوصلہ سوا ہو چکا تھا۔ اس نے جان رائٹ کی کنپٹی پر بوٹ کی ٹو مارنے کے لیے لات گھمائی مگر جان رائٹ نے اس کی لات پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ جھٹکے سے شانی اڑتا ہوا سامنے صوفے پر جا گرا۔ گرتے ہوئے اس کا سر صوفے کے پائے سے ٹکرایا تھا۔ یہ ضرب اس کی بے ہوشی کا سبب بن گئی تھی۔ اس کا جسم زخموں سے چور ہو چکا تھا۔ ایک بازو پہلے سے ہی خنجر کے گہرے گھاؤ کی وجہ سے شل تھا۔ جان رائٹ نے دوسرا بازو بھی ناکارہ کر دیا تھا۔ جان رائٹ کو بھی کافی شدید زخم آئے تھے مگر وہ مکمل ہوش میں تھا۔ اس نے ایک نظر شانی کو دیکھا جس کا آدھا جسم صوفہ پر اور آدھا نیچے فرش پر پڑا ہوا تھا جان رائٹ نے دو تین طویل سانسیں لے کر خود کو نارمل کیا اور شانی کی طرف قدم بڑھائے ہی

تھے کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ طلحہ اور عبداللہ ہاتھوں میں اسلحہ اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

"ہینڈز اپ۔" عبداللہ نے داخل ہوتے ہی انتہائی کرخت لہجے میں کہا۔

لڑائی کے دوران جان رائٹ کا اپنا ریوالور بھی کہیں گر گیا تھا۔ بحالت مجبوری اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ وہ عقابی نظروں سے عبداللہ اور طلحہ کو گھور رہا تھا۔ ان دونوں کی نظریں بھی جان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"طلحہ! اس کی تلاشی لو اور شانی کو دیکھو۔" عبداللہ نے پوزیشن سنبھالتے ہوئے کہا۔ وہ انتہائی چوکنے انداز میں جان رائٹ کو نشانے پر لیے ہوئے تھا۔ اس کی تیز نظریں جان کے چہرے پر جم سی گئی تھی۔ جان رائٹ دل ہی دل میں اسے داد دیئے بنا نہ رہ سکا۔ طلحہ نے جان کی تلاشی لی اور ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔

"باہر چلو۔" جان رائٹ کو حکم ملا تو وہ بلاتحمل دروازے کی طرف چل پڑا وہ مطمئن تھا کہ عمارت سے باہر ان لوگوں کا نکلنا ناممکن ہے۔ مگر باہر نکلتے ہی وہ بری طرح چونک پڑا۔ ولیم، ڈورتھی اور ایلن تینوں بے بسی کی تصویر بنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جان رائٹ کے گورے چہرے پر پہلی بار فکر مندی کے آثار نظر آنے لگے۔

❁.......❁.......❁

شانی کا پورا جسم سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ حیدر عباس نے اس کی بے دردی سے پٹائی کی تھی۔ خصوصاً زخمی بازو پر ریوالور کے دستے مارے تھے۔ یہی عمل اس نے پیٹ اور ٹانگوں پر بھی دہرایا تھا۔ جس سے اس کی جلد جابجا پھٹ گئی تھی۔ اوپر سے جان رائٹ جیسے منجھے ہوئے ایجنٹ سے دوبدو لڑائی کی تھی۔ وہاں جوش و جذبے میں اس نے زخموں کی کوئی پروا نہیں کی مگر بے ہوش ہو جانے کے بعد جب ہوش میں آیا تو اس کا پورا جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے سر جی، حمزہ اور عبداللہ کھڑے ہوئے تھے۔ مکمل طور سے ہوش میں آنے کے بعد اس کے اندر پرمسرت احساس جاگا۔ سر جی، حمزہ اور عبداللہ کو دیکھ کر اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ فارم ہاؤس سے بہرحال نکل آئے ہیں۔ اس کا پہلا سوال ہی جان رائٹ اور اس کے بندوں کے بارے میں تھا۔

"مبارک ہو شانی! آپ لوگوں نے جان لیوا معرکے میں کامیابی سمیٹی ہے۔" اسے تسلی بخش جواب ملا۔

"چاروں غیر ملکی ایجنٹس اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں اور ان کی مدد کرنے والے سیکڑوں افراد جہنم واصل ہو چکے ہیں۔" تفصیل بتاتے ہوئے سر جی کے چہرے سے خوشیوں کی پھواریں پھوٹ رہی تھیں۔ حمزہ اور عبداللہ بھی پرجوش نظر آ رہے تھے۔ عبداللہ ایک قدم آگے بڑھ کر جوش سے بولا۔

"شانی بھائی! آپ کی تجویز کارآمد ثابت ہوئی تھی ہم نے جان اور اس کے ساتھیوں کو باندھ کر یرغمال بنا لیا تھا۔ اس کے بعد مقامی لوگ ہاتھ باندھ کر ہمارے احکامات پر عمل کرتے رہے۔ ہم نے انہیں تین چار کمروں میں بند کر دیا۔ عمارت کی مکمل تلاشی لینے کے بعد اس میں آٹھ ٹائم بم فٹ کر دیئے تھے۔ اس وقت غدار عبدالبارق کا ناپاک فارم ہاؤس ملبے کا ڈھیر بنا ہوا ہے۔"

تفصیل سن کر شانی نے خوشی سے ہاتھ اٹھانا چاہا مگر بے سود۔ اسے احساس ہوا وہ دونوں میں سے کوئی بھی بازو اٹھانے کے قابل نہیں۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھ کر حمزہ اس پر جھکتے ہوئے بولا۔

"شانی! تمہارے بازو پر خنجر کا گہرا زخم ہے جس نے ہڈی اور بازو کی رگوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ دوسرے بازو کی ہڈی میں بھی فریکچر ہے۔ تمہیں صبر سے کام لینا ہوگا۔"

"حمزہ! میرے لیے کامیابی کی خبر سب سے قیمتی ہے۔ اس مشن کی کامیابی کے لیے میرے جسم کی بوٹی بوٹی بھی نوچ لی جاتی تب بھی کوئی غم نہ ہوتا۔" شانی کے لہجے میں حقیقی خوشی تھی۔

سر جی نے آگے جھک کر شانی کی نصف نظر آنے والی

پیشانی کو چوما اور بولے۔
''شاباش بیٹا! جب تک میرے وطن میں تم جیسے بیٹے موجود ہیں دشمنوں کو ہمیشہ ایسے ہی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔''
''سر جی! بروج......'' وہ بات جو شانی کو لحہ بہ لحہ غم سونپ رہی تھی بے اختیار ہی اس کے لبوں پر اُمڈ آئی۔ بروج کا نام لیتے ہوئے اس کے اندر کا سارا کرب باہر نکل آیا تھا اس کے کان اچھی خبر سننے کے متمنی تھے۔ دل چاہتا تھا کہ بروج کے ساتھ کبھی غداری کا لیبل نہ لگے۔ سر جی اسے بتا رہے تھے۔
''شانی! تمہیں ڈاکٹرز نے ڈیڑھ ماہ مکمل بیڈ ریسٹ کا کہا ہے۔ بروج بلڈنگ میں موجود ہے تمہاری مکمل صحت یابی تک بروج میری نگرانی میں رہے گی۔ اس کا فیصلہ تم نے خود کرنا ہے۔''
''سر جی! بروج پر غداری ثابت ہو چکی ہے؟'' شانی کو الفاظ کی ادائیگی بہت بھاری لگ رہی تھی۔ اس کی غمزدہ آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ حمزہ نے سر جی کے ساتھ نظروں ہی نظروں میں بات کی اور ساتھ ہی سر سے نفی میں اشارہ کیا۔ عبداللہ بے چینی کی کیفیت میں کھڑا ہوا تھا وہ سب جانتے تھے بروج نے ان کے ساتھ غداری کی ہے مگر یہ بات وہ زخموں سے چور شانی کو کیسے بتا دیتے۔ کیونکہ شانی اور بروج کا عشق بھی وہ جانتے تھے۔ وہ اس حالت میں شانی کو اتنا بڑا صدمہ نہیں دے سکتے تھے۔ سر جی نے شانی کے پٹیوں سے بھرے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''یہ تفتیش بھی تمہی نے کرنی ہے۔ بروج بلڈنگ میں بطور تمہاری امانت نظر بند رہے گی۔''
''اتنا بڑا امتحان مجھ سے نہ لیں سر جی!'' شانی کے لب تھرتھرا رہے تھے۔ وہ رونا نہیں چاہتا تھا مگر آنکھوں کا بے تاب پانی باہر چھلکنے کو چھلانگیں مار رہا تھا۔ ضبط کرنے کے باوجود آنکھوں کے کونوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے تھے۔

سر جی نے رومال نکال کر اس کی پرنم آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔
''شانی! بروج پر ابھی کچھ بھی ثابت نہیں ہوا ہے نہ ہم اس پر تھرڈ ڈگری استعمال کر کے کچھ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ خود بروج کا کہنا ہے کہ اس نے جو بھی بات کرنی ہے شانی سے کرے گی۔
''سر جی! ایک بروج تو اسلام آباد میں بھی موجود تھی۔ دونوں میں اصل کون ہے؟''
''وہ بروج ایک پراسرار معمہ بن گئی ہے۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے فلیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ مگر اس کے بعد اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس کا فلیٹ خالی پڑا ہوا ہے۔ میں نے قبرستان کی نگرانی بھی کروا کے دیکھ لی ہے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔''
شانی کی آنکھوں سے آنسو ایک بار پھر نکل پڑے تھے۔ اس بار حمزہ نے اس کے آنسو پونچھے۔
''شانی! میرے بھائی۔ اس معاملے کو بعد میں دیکھا جائے گا تم ابھی آرام کرو۔ ذہنی اور جسمانی راحت تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔''
''ہاں شانی بھائی! پلیز آپ اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیں۔'' عبداللہ کے لہجے میں خلوص اور محبت تھی۔
''دعا کرنا یار! بروج...... بروج کبھی غدار نہ ہو، میں اسے کھونا نہیں چاہتا......'' الفاظ شانی کے لبوں پر چنگاریاں برسا رہے تھے۔ لہجے میں اتنا کرب اور دکھ تھا کہ وہاں کھڑا ہوا ہر شخص پرنم ہو گیا۔ ماحول میں سوگواری کا پھیلاؤ بڑھ گیا تھا۔
سر جی کا موبائل فون بج اٹھا۔ اس نے موبائل سکرین پر نگاہ ڈالی تاہم انہوں نے موبائل آن نہیں کیا۔ وہ شانی سے بولے۔
''میں چلتا ہوں شانی۔ عبداللہ تمہارے پاس رہے گا۔''
''ٹھیک ہے سر جی۔''
سر جی نے حمزہ کو چلنے کا اشارہ کیا اور چلتے ہوئے

بولے۔

''اور ہاں شانی! جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ۔ ہمارا فیصلہ کن معرکہ ہونے والا ہے۔''

''انشاء اللہ سر جی! آپ فکر نہ کریں اس معرکے میں شانی صف اول میں کھڑا ہوا ملے گا۔''

''گڈ...... اللہ حافظ۔'' حمزہ اور سر جی کمرے سے باہر نکل گئے۔

پاکستان کے حالات دگرگوں تھے۔ وہ سب کچھ جو نیو ورلڈ آرڈر کے اعلیٰ دماغ چاہتے تھے۔ اب اسلامی دنیا کے اہم ترین ملک پاکستان میں ہو رہا تھا۔ پاکستان کے اہم ترین شہروں میں لوگوں کی زندگیاں اجیرن ہوگئی تھی۔ کراچی، لاہور، پشاور اور پورا بلوچستان افراتفری، انتشار، بدنظمی، قتل و غارت اور دہشت گردی کی آگ میں جل رہے تھے جبکہ سیاستدان اپنی گتھیاں سلجھانے میں مگن تھے۔ سیاستدانوں کا ہر قدم اپنے سیاسی کیریئر کے تحفظ کے لیے اٹھ رہا تھا۔ تمام سیاسی پارٹیوں کی اولین ترجیح تھی کہ قانون میں وہ تمام شقیں شامل کر دی جائیں جن سے انہیں مستقل تحفظ ملے اور آئندہ بھی چند گنے چنے چہرے پاکستان پر حکمرانی کے مزے اٹھاتے رہیں۔ پاکستان کے حب الوطن افراد کے لیے مجموعی صورت حال کافی تشویش ناک تھی۔ جبکہ اقتدار اعلیٰ کی باگ دوڑ ان لوگوں نے سنبھال لی تھی جو ملکی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔ جنہوں نے اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے عوام پر بھاری ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لیے بھاری سرمائے کی بلاشبہ ضرورت ہوتی ہے۔ بھاری سرمائے کے حصول کے لیے عوام کو ٹیکس کا بوجھ بہرحال سہنا پڑتا ہے۔ مگر پاکستان میں یہ بوجھ حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ پاکستانی عوام میں باغیانہ خیالات اور اشتعال انگیزی عروج کی طرف گامزن تھی۔ حکومت کا عوام کے ساتھ سوتیلی ماں جیسے سلوک نے ان کے اندر انقلاب کے بیج بو دیئے تھے۔ کیونکہ عوام کی بے چینی، اضطراب اور عدم اعتماد آئے روز بلندیوں کے سفر پر تھا۔ ہر محکمہ بے ضابطگیوں اور بداعمالیوں کے سبب زوال پذیر تھا۔ اقتصادی تباہی بڑھتی جارہی تھی۔ ہر سال بجٹ میں دگنا تگنا اضافہ ہو رہا تھا۔ مہنگائی حدوں کو چھونے لگی تھی۔ ملک دیوالیہ پن کی طرف گامزن تھا۔ اعلیٰ حکمران اور اپوزیشن اپنے مسائل سلجھانے میں مصروف تھے۔ عوامی مسائل کی کسی کو کوئی فکر لاحق نہیں تھی۔ میڈیا کے کچھ مخلص اور محب وطن افراد چیخ چیخ کر سیاستدانوں کی توجہ بے پناہ اور بے کراں مسائل کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کی آوازیں صحرا میں برستی بارش کی طرح تھی اور بے تحاشہ شور و غل میں دبے جا رہی تھی۔ مسائل جوں کے توں پڑے ہوئے تھے۔ عوام کو زبانی کلامی دعوؤں، سحر انگیز تقریروں سے بہلایا جا رہا تھا۔ اب ایک اور خطرناک صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ صوبہ بلوچستان میں یکدم ہی افراد لاپتہ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ قتل و غارت میں اضافہ ہو گیا تھا، مسخ شدہ لاشیں ملنے لگی تھیں، کشیدگی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ کچھ باغیانہ خیالات کے حامی افراد علیحدگی کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔

سر جی کے پاس جان رائٹ کا لیپ ٹاپ اور دیگر اہم فائلیں موجود تھیں۔ سر جی کے بندوں نے انتہائی دانشمندانہ قدم اٹھایا تھا۔ عمارت کو تباہ کرنے سے قبل اس میں سے تمام ضروری چیزیں قبضے میں کر لی تھیں۔ سر جی کو لیپ ٹاپ سے چونکا دینے والا ڈیٹا ملا تھا۔ پورے پاکستان میں جان رائٹ اور اس کے گروپ کا مشن واضح ہو گیا تھا۔ بہت سی فائلیں کوڈ ورڈ میں تھیں جنہیں ڈی کوڈ کرنا ابھی باقی تھا۔ سر جی کے لیے پریشان کن بات یہ تھی کہ جان رائٹ 90 فی صد اپنا مشن مکمل کر چکا تھا۔ مگر ان تمام گروپس اور افراد کا قلع قمع کرنا ضروری تھا جو جان رائٹ کے مددگار رہے تھے۔ غیر ملکیوں میں ابھی دو افراد باقی تھے جب کہ سر جی کو ایک رپورٹ ایسی بھی ملی تھی کہ پچھلے دو ماہ سے جان رائٹ کے ساتھ را کے بہت سے ایجنٹس بھی کام کرنے کے لیے پاکستان میں داخل

ہوئے تھے۔ سر جی نے کوڈ ورڈز میں لکھی گئی فائلیں تفتیشی سیل کے چیف بریگیڈیئر عامر محمود کو بھجوا دی تھیں۔ انہوں نے تین دن بعد سر جی کو ون ٹو ون ملاقات کے لیے بلوا لیا تھا۔

"امجد بخاری صاحب! سب سے پہلے تو مبارک باد قبول کیجئے۔ آپ نے پاکستان کے لیے انتہائی اہم کامیابی حاصل کی ہے۔"

"بہت شکریہ سر۔ میں اصل مبارک باد کا مستحق تب ہوں گا۔ جب پاکستان سے پاکستان کا ایک ایک دشمن چن چن کر ہلاک کر دوں۔ میری زندگی کا تو مقصد ہی یہی ہے سر۔"

"ہمیں آپ جیسے محبِّ وطن شخص پر فخر ہے۔"

"تھینک یو سر۔"

"امجد بخاری! آپ کو جان رائٹ کے اصل مشن کا پتہ چل ہی گیا ہوگا؟"

"جی ہاں سر! جان رائٹ بلیک واٹر کا ایجنٹ ہے، پاکستان میں بلیک واٹر، موساد اور را کے تعاون سے مکمل منصوبہ بندی کے تحت کام کر رہی ہے۔ ان کے ایک نہیں کئی خفیہ مشن ہیں۔ مثلاً پاکستان میں مذہبی فرقہ واریت پھیلانا، قوم پرستی کو ہوا دینا، دہشت گردی، پاکستانی معیشت کی تباہی، اقتصادی بحران، ایڈز، ہیپاٹائٹس سی اور کینسر جیسی مہلک بیماریوں کا فروغ اہم ایٹمی تنصیبات کی معلومات، حکومت کے ایوانوں میں اپنے ہمنواؤں کو پہنچانا مختلف این جی اوز کے ذریعے یہودی نواز ملٹی نیشنل کمپنیوں کی تشہیر اور نوجوان نسل کو مذہبی ارتداد میں مبتلا کرنا وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان مشنز میں ان کے ساتھ بہت سے مقامی مفاد پرست لوگ بھی شامل ہیں۔"

"بالکل امجد بخاری! آپ ٹھیک سمجھے ہیں اور اگر ہم عدل سے بات کریں تو ہم ناکام اور وہ کامیاب ہیں۔ پاکستان ان تمام مسائل میں گرا ہوا ہے۔"

"سر! مجھے اپنی نوجوان نسل کی بڑی فکر ہے۔ ان میں غیر محسوس طریقے سے غیر اسلامی چیزیں اور طور طریقے راسخ ہو رہے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں چل رہا کہ وہ کیا کرتے پھر رہے ہیں۔" امجد بخاری کے چہرے پر افسردگی اور پژمردگی تھی۔ بریگیڈیئر عامر محمود نے اسے دیکھا تاہم چپ رہے اور انہیں آگے بولنے دیا۔

"آج پاکستان کا مسلم معاشرہ بری طرح غیر اسلامی معاشرے میں ڈھل رہا ہے، پاکستان کا ہر دوسرا نوجوان نمود و نمائش میں مبتلا ہے، فیشن کے نام پر وہ سب کر رہا ہے جو غیر مسلم معاشرے کا وطیرہ ہے، ہم کسی بھی دکان پر جاتے ہیں تو وہاں بیسوں ایسی چیزیں لٹکی ہوئی ملتی ہیں جو صرف اور صرف غیر مسلموں کا حصہ ہیں۔ مگر آج پاکستان کا مسلمان نوجوان ان اشیاء کا استعمال قابل فخر سمجھتا ہے۔ حتیٰ کے ہندوؤں کی مذہبی نشانی کلائی پر دھاگہ باندھنے سے بھی نہیں چونکتے۔ سکھوں کی طرح کلائی میں کڑا پہنتے ہیں، لمبے بالوں میں پونی لگاتے ہیں، بازوؤں اور ہاتھوں پر ٹیٹو بناتے ہیں، انگوٹھیاں ایسے پہنتے ہیں جن پر شیطان خبیث کے دو سینگ، دجال کی آنکھ اور دوسری کئی یہودی نشانیاں پوشیدہ ہوتی ہیں اور حد یہ ہے کہ ایسی انگوٹھی شہادت کی انگلی میں پہنی جاتی ہے جس سے ہم ہر نماز میں اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کی گواہی دیتے ہیں اور سر میں نے ایک اور خطرناک بات بھی نوٹ کی ہے۔"

"وہ کیا امجد بخاری؟"

"ہمارے بہت سے نجی ٹی وی چینلز کے مونو گرامز میں دجال کی نشانی ایک آنکھ چھپی ہوئی نظر آ رہی ہے، بہت سے ایسے ڈرامے اور ٹاک شوز پیش ہو رہے ہیں جن میں کئی بار یہودی نشانات نظر آ جاتے ہیں۔ چھ کونوں والا ستارہ، تکون، شیطان کے دو سینگ، سانپ کی شبیہ وغیرہ۔ اسپیشلی ایک آنکھ جو ہر مسلمان جانتا ہے جو دجال کا مونو گرام ہے۔ ہمیں اکثر پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا پر نظر آتی ہے۔"

"امجد بخاری! یہی تو جان رائٹ جیسے لوگوں کا ہمارے ملک میں مشن ہے۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ ہم ناکام اور وہ کامیاب ہیں۔ کیونکہ ہم خود انہیں موقع

فراہم کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ کسی کو ہوا بھی لگنے نہیں دیتے اور اپنا مقصد پا لیتے ہیں۔ کیا پر مغز بحث و مباحثہ کرنے والے اینکر پرسن اس بات سے بے خبر رہتے ہیں کہ ان کے سامنے ٹیبل پر صیہونی نشانی تکون بنی ہوئی ہے۔ ان کے عقب میں چھ یا آٹھ کونوں والا ستارہ اور دجال کی آنکھ کی منظر کشی ہو رہی ہے۔''

''سر! برا مت مانیئے گا آپ لوگوں کو بھی ان باتوں کا نوٹس لینا چاہیے۔''

''امجد بخاری'' آپ نہیں جانتے ہمیں کون سے معاملات میں الجھا دیا گیا ہے۔ پھر بھی ہم بہت جلد ایک اسپیشل خفیہ گروپ تشکیل دے رہے ہیں جو ان باتوں کا تحتی سے نوٹس لے کر تفتیش کرے گا کہ آیا یہ سب دانستہ ہو رہا ہے یا نادانستگی میں اتنی بڑی غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں۔''

''میرے پاس بہت سے اہم کلیوز ہیں سر، جن کی مدد سے ایسے عناصر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ابھی جان رائٹ کے بہت سے ساتھی باقی ہیں۔ اقبال خان اور شیخ منیر جیسے بہت سے دوسرے لوگ جو ان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں میری نظروں میں ہیں مگر میرے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ میں بیک وقت پورے ملک میں آپریشن کر سکوں۔''

''ہم بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں امجد بخاری! آپ جو کچھ کر رہے ہیں اپنی بساط سے بڑھ کر کر رہے ہیں، ہم آپ سے وہ سارے کلیوز شیئر کریں گے۔ ان میں سے کچھ پر آپ نے کام کرنا ہے اور کچھ پر ہم کریں گے۔ مگر فی الحال میں نے آپ کو ایک اور مقصد کے لیے بلایا ہے۔''

''جی سر!'' امجد بخاری نے متجسس نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''امجد بخاری! جو فائل آپ نے بھجوائی تھی انہیں ہم نے ڈی کوڈ کر لیا ہے۔ ان میں ایک ایسا بھی انکشاف سامنے آیا ہے جو بلیک واٹر کو بھی معلوم نہیں ہے......'' عامر محمود چند لمحے رکے۔ تپائی پر پڑا ہوا گلاس اٹھا کر پانی کے گھونٹ پیے اور بولے۔

''جان رائٹ در اصل اسرائیلی خفیہ تنظیم موساد کا ایجنٹ ہے۔''

''اوہ!'' امجد بخاری کے منہ سے بے اختیار نکلا وہ حیرت سے عامر محمود کو دیکھے جا رہے تھے۔

''مگر جو فائلیں میرے پاس ہیں ان کے مطابق تو جان رائٹ بلیک واٹر کا قابل بھروسہ اور اہم ترین ایجنٹ ہے۔''

''ہاں بظاہر ایسا ہی ہے۔ جان رائٹ کے کئی کارنامے ہیں جو اس نے بلیک واٹر کے لیے سرانجام دیئے ہیں۔ پاکستان میں بھی اس نے را کے ساتھ مل کر کامیاب کارروائیاں کی ہیں۔ مگر جان رائٹ ڈبل کراس کر رہا ہے۔ جان رائٹ موساد کے لیے بھی کام کرتا ہے جو کام اسرائیل کے مفاد کے لیے ضروری ہو جان وہ کام صرف اسرائیل کا مفاد ملحوظ رکھ کر کرتا ہے۔ وہ اسرائیل کا مطلوبہ مواد اسرائیل کو ہی پہنچاتا ہے ایسے مواد کی بلیک واٹر کو ہوا بھی لگنے نہیں دیتا۔''

''سر! جان رائٹ بلیک واٹر کا ایجنٹ ہو یا موساد کا ہمارے لیے وہ ایک دشمن ہے۔''

''ہاں مگر جو بات میں بتانا چاہ رہا ہوں وہ انتہائی تشویش ناک ہے۔'' عامر محمود کی بات سن کر امجد بخاری نے انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھا وہ بولے۔

''پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے بہت سی اہم فائلیں جان رائٹ اسرائیل منتقل کر چکا ہے۔ ہماری ایک انتہائی اہم عمارت جو چھ سات ماہ قبل دھماکوں سے تباہ ہو گئی تھی وہ بھی جان رائٹ کا کارنامہ ہے۔ اسی عمارت سے اہم فائلیں چرائی گئی تھیں۔''

''یہ تو واقعی تشویشناک بات ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اسرائیل ہمارے اہم راز جان چکا ہے۔''

''چرائی گئی فائلیں مشکل ترین کوڈز میں تحریر کی گئی تھیں۔ ہماری کل ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ ہوئی ہے اس میں شریک آفیسرز کا خیال تھا اسرائیل انہیں ڈی کوڈ نہیں کروا سکتا۔ مگر پھر بھی ہم یوں چپ نہیں رہ سکتے۔''

''بالکل سر! ہمیں نہ صرف اپنی فائلیں واپس لینی ہوں گی بلکہ اسرائیل کو سبق بھی سکھانا ہوگا۔''

''امجد بخاری! اس معاملے کے لیے ہماری آٹھ گھنٹے طویل میٹنگ ہوئی ہے۔ پاکستان اس وقت انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ حکومت پر سفارتی سطح پر بہت دباؤ ہے۔ ان حالات میں اگر اسرائیل میں ہماری مداخلت کسی بھی صورت سامنے آ گئی تو پاکستان کے لیے بہت مشکل صورت حال بن جائے گی۔''

''مگر سر! اسرائیل بھی تو ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔''

''یہ طویل موضوع ہے امجد بخاری! اسے چھوڑو، مجھے آپ پر بے حد اعتماد ہے اس لیے میں نے محکمہ سے آپ کے گروپ کی منظوری لی ہے۔ یہ مشن آپ نے پورا کرنا ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی پکڑا بھی جائے تو بہر حال وہ کسی بھی صورت اسے ہمارا ایجنٹ ثابت نہیں کر سکیں گے۔''

''یہ آپ کی محبت ہے سر! جو آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے ہم اس پر پورا اتریں گے آپ حکم کریں۔''

''مجھے آپ کے تین قابل اعتماد آدمیوں کی فائلیں چاہیے۔''

''ٹھیک ہے سر! میں پہنچا دوں گا۔''

''ہم آپ کو اردن میں موجود ایک شخص کا نمبر دیں گے آپ کے بندے پہلے اردن جائیں گے وہاں سے انہیں فلسطین میں داخل کر دیا جائے گا۔''

''سر! ان شاء اللہ ہم اسرائیل کو وہ سبق سکھائیں گے کہ آئندہ وہ پاکستان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی ہمت بھی نہ کرے گا۔''

''انشاء اللہ۔'' بریگیڈیئر امجد محمود نے کہتے ہوئے امجد بخاری سے مصافحہ کیا۔

''مجھے آپ سے یہی اُمید ہے۔''

⁂

امجد بخاری نے رات بھر اس مشن پر کام کیا تھا۔ رات کو ہی گروپ کی جنرل باڈی کی میٹنگ بلائی گئی تھی۔ انہوں نے گروپ کے پانچ سو افراد کو ہر لحاظ سے پرکھا تھا۔ جنرل باڈی کے دس ممبران نے تین نام متفقہ طور سے منظور کر لیے تھے۔ شانی کے نام پر ان میں پورا ایک گھنٹہ ڈسکس ہوتی رہی تھی۔ کیونکہ شانی ابھی ابھی بیماری سے اٹھا تھا۔ اگلے روز امجد بخاری نے اپنے تین آدمیوں کی فائلیں پیش کر دی تھیں۔ عامر محمود نے ٹیبل پر پڑی ہوئی فائلوں کو دیکھا۔

حمزہ علی، عبداللہ، غلام رسول ہر فائل پر الگ الگ جعلی حروف میں نام لکھا ہوا تھا۔

''امجد بخاری! میں بہت جلد آپ سے رابطہ کروں گا۔ تب تک آپ تینوں نوجوانوں کو اس ایڈریس پر بھیج دو۔ یہاں ان کی خصوصی ٹریننگ ہوگی اور ان تینوں کے پاسپورٹ بھی مجھے بھجوا دیجئے۔'' عامر محمود نے انہیں ایک وزٹنگ کارڈ دیتے ہوئے کہا۔

امجد بخاری نے کارڈ جیب میں رکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو سر! میں آپ کی کال کا منتظر رہوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے مصافحہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

⁂

شانی کی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھی۔ دل و دماغ ہیجان برپا تھا۔ ایک طرف آتش عشق کے شعلے بھڑک رہے تھے دوسری طرف تقاضہ حب الوطنی عروج پر تھا۔ دروازے کے اس پار کمرے میں شانی کا پیار اس کی زندگی بروج قید تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

محبت گزیدہ

فوزیہ احسان رانا

کہتے ہیں رنج والم کی وادیوں میں بھٹکنے اور آہ و فغاں کے طوفان سے گزرنے کے بعد جب کوئی محبت اور سکون کی دنیا میں پہنچتا ہے تو وہ یا تو رفیق القلب ہو جاتا ہے یا پھر شقی القلب بن جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا' ناکام محبت اور زمانے کے ستم نے اسے محبت کرنے والوں کا دشمن بنا دیا تھا۔

اک بھٹکی ہوئی روح کا فسانہ' اسے محبت کرنے والوں سے نفرت تھی

کیتھی نے بلوجینز کے ساتھ سفید شرٹ پہن رکھی تھی' بیڈ پر بیٹھ کر اس نے نیچے جھانک کر اپنے بوٹ نکالے اور پھرتی سے پہننے لگی۔ شام گہری ہو کر رات کی دہلیز پر جا کھڑی ہوئی' چار سو ملگجا سا اندھیرا چھا رہا تھا' کیتھی اپنے کمرے سے باہر نکلی' موسم کے تیور بھانپ کر وہ حیران ہوئی کچھ دیر پہلے موسم معتدل تھا۔ اب ابر آلود ہو رہا تھا۔ بارش کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے' بادلوں کی گرج چمک ہلکی سی دہاڑ سے مشابہ تھی' کیتھی تذبذب میں کھڑی بدلتے موسم کو دیکھتی رہی پھر بے پروائی سے سر جھٹک کر گھر سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔

کشادہ سڑک پر اس کے قدم مستعدی سے رواں دواں تھے اس کے گلابی رخساروں پر برسات کی شفق پھوٹ رہی تھی' کشادہ صبیح پیشانی پر پانی کے قطرے نمودار ہو رہے تھے اس کے اردگرد لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیتھی کشاں کشاں اپنی منزل کی طرف گامزن تھی وہ روز میلوں مسافت طے کرتی تھی اس کی دوڑ کا انت سفید جھیل پر ہوتا تھا۔

کیتھی ایک نوجوان لڑکی' غضب کی مضبوط قوتِ ارادی کی مالک' بلا کی حسین' قد و قامت میں لاجواب' تندرست و صحت مند تھی مگر اپنی صحت اور فٹنس کے حوالے سے بہت احتیاط کرتی۔ مستعد و متحرک زندگی گزار رہی تھی اپنی صحت و جوانی کو برقرار رکھنے کے لیے جہاں اس نے جم جوائن کر رکھا تھا۔ وہاں صبح و شام کی دوڑ کو بھی اس نے اپنا معمول بنا رکھا تھا۔

وہ برق رفتاری سے بھاگ رہی تھی حسن و دلکشی سے مرصع سراپا میں اس سمے بجلی سی لہرا رہی تھی' بدن میں گویا پارہ سا بھر گیا تھا۔ اس وقت کیتھی کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے یاقوتی ہونٹ خشک ہو رہے تھے' سانس دھواں کی شکل میں خارج ہو رہا تھا' پیاس ہونٹوں پر مچل رہی تھی۔

سفید جھیل کے پاس وہ رکی جھیل کنارے لگی لوہے کی آہنی گرل پر کہنیاں ٹکا کر لمبے لمبے سانس لیے' اپنے خشک ہونٹوں اور لکڑی کی طرح کھردرے حلق کو زبان سے تر کیا۔ واپسی کے لیے قدم چند فرلانگ ہی بڑھائے تھے کہ کیتھی کو گمان گزرا کسی نے پکارا ہے مگر قرب و جوار میں کسی ذی نفس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ تبھی آکاش پر بادلوں کی آنکھ مچولی ہونے لگی' فضا ٹھنڈی یخ بستہ ہواؤں سے تھرتھرانے لگی' نم ہوا کے جھونکے چاروں اطراف سرسرانے لگے' بجلی

چمکی، بادل گرجے، کیتھی کے پیروں سے پہیے لگ گئے۔

''رکو...... بات سنو......'' تبھی بہت قریب سے آواز ابھری۔ آواز عجیب نڈھال اور پژمردہ سی تھی۔ کیتھی کے قدم تھم گئے، اس کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی خوشبو کیتھی کے مشام جاں سے ٹکرائی۔ وہ کیسی خوشبو تھی یہ فیصلہ مشکل امر ثابت ہو رہا تھا کوئی وجود بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آواز پھر قریب سے ابھری، کیتھی نے سوچا کہ شاید مجھے میری سماعتوں نے دھوکا دیا ہو مگر زیادہ دیر وہ اپنے آپ کو اس خیال میں گرفتار نہ رکھ سکی اس کے ذرا سے فاصلے پر آہٹ سی ہوئی، کیتھی کی بصارتوں نے اس سفید چوغے میں ملبوس کسی بدن کو تراشا جو اس کے بالکل پاس آ کر رک گیا، قریب آنے پر پتا چلا وہ ایک لڑکی ہے۔

''مجھے چونڈ نگر جانا ہے، راستہ بتا دیں۔'' اس کی آواز سے اس بات کی تصدیق میں کوئی شک نہ رہا کہ وہ ایک لڑکی ہے اس کی آواز نحیف و نزار سی تھی جیسے برسوں کے مریض کی ہوتی ہے اس اجنبی لڑکی نے ہاتھ کیتھی کی طرف بڑھایا۔ جسے کیتھی نے گرمجوشی کے ساتھ تھام لیا۔ کیتھی کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ اس سامنے کھڑی لڑکی کا چہرہ دیکھے، کیسا ہے توانا، دلنواز، یا کم روئست، تھکاوٹ زدہ، آواز جیسا۔

''جی آپ اس طرف جھیل کی طرف جائیں گی تو اس کا پل عبور کر کے پہاڑیوں کے درمیان گھری آبادی کا نام ہی چونڈ نگر ہے۔''

کیتھی نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے راستہ سمجھایا وہ اجنبی لڑکی کیتھی کا ہاتھ چھوڑ کر بغیر کوئی شکریہ جیسا لفظ ادا کیے جھیل کی طرف چل دی۔ کیتھی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی، کیتھی کو اپنا ہاتھ گیلا گیلا سا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چپچپاہٹ سی اس کے ہاتھ کے ساتھ چپکی ہو تبھی کیتھی کو فضا میں بکھری خوشبو تیز ہوتی محسوس ہوئی، ناگوار کراہیت بھری بُو اسے اپنی ناک میں گھستے ہوئے نظر آ رہی تھی۔ کیتھی نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اپنے ہونٹوں اور ناک پر رکھا، کیتھی بھاگ رہی تھی اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا اس کا بدن تھکن سے چُور ہونے لگا بہت تیز بھاگنے کے باعث روزانہ پسینے میں بھیگ جاتی، تھکن سے ہانپ جاتی تھی۔ بجلی پھر کڑکی ساتھ ساتھ بارش بھی برسنے لگی مگر فضا میں سناٹے، خاموشی کے ساتھ بو پھیلتی جا رہی تھی اسے اپنا سر گھومتا ہوا لگ رہا تھا پھر بھی اس کے قدموں کی تیزی میں کمی نہیں آئی تھی۔

اس کے بھرے بھرے بدن کے گداز نقوش اتھل پتھل ہو رہے تھے اس کے عضو عضو کی سرمستی اچھل کود کر رہی تھی، اس کی نشیلی آنکھوں سے رس چھلکتا تھا مگر اس وقت ناگوار بو اسے اس قدر نڈھال اور ادھ موا کر چکی تھی کہ اس کی آنکھیں ایسے ہو رہی تھیں جیسے گیلی لکڑی کا کڑواہٹ بھرا دھواں ان میں گھس کر آنکھوں کو بیمار کر گیا ہو، نگارے بھر گیا ہو، سانس تھرا رہی تھی، وہ اپنے جسم کا سارا زور لگا کر بھاگ رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا اس کا سارا بدن زمین میں دبا جا رہا ہے کوئی آہنی شکنجہ اپنی پوری قوت سے زمین کی طرف کھینچ رہا تھا۔ کیتھی لڑکھڑائی اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتی اس نے دانت ایک دوسرے پر

جما کر پوری توانائیاں لگا کر دوڑ لگا دی اور گھر آ کر ہی دم لیا مگر وہ اتنی بے دم ہو رہی تھی کہ باؤنڈری کی سیڑھیوں پر ہی ڈھے گئی' آنکھیں بند کر کے کیتھی سانس اندر باہر کرنے لگی مگر سکون کی گھڑیاں تب ختم ہوئیں جب کیتھی نے آنکھیں کھولیں' اس کی دلدوز چیخ نکلتے نکلتے لبوں میں ہی دم توڑ گئی اس کے ہاتھ پر خون لگا ہوا تھا۔

کیتھی حواس باختہ سی اپنا ہاتھ دیکھنے لگی پہلی بار وہ حقیقی معنوں میں سہم سی گئی تھی' وہ کوئی عام سی کمزور اعصاب کی مالک نہیں تھی مگر پے در پے واقعات نے اسے ہراساں کر دیا تھا جتنی بھی مضبوط سہی' تھی تو ایک لڑکی ہی نا۔ یک لخت اس کی نظریں اپنے لباس کی طرف اٹھیں تو وہ دنگ سی سراسیمگی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی اس کی پینٹ شرٹ پر جابجا خون کے دھبے سے بنے ہوئے تھے۔ کیتھی نے ہاتھ بڑھا کر اپنی پینٹ کو چھوا' خون اس کی پوروں سے سمیٹ لیا' خون تازہ تھا۔ کیتھی کانپنے لگی اس کا سارا جسم ایک کربناک اذیت سے دوچار ہونے لگا۔ اس نے سر کو ہلکی سی جنبش سے جیسے خود کو بیدار کیا اور بھاگ کر واش روم میں گھس گئی۔

کیتھی جدید سہولیات سے مزین واش روم کے ٹب میں آنکھیں موندے لیٹی تھی' نیم گرم پانی اسے ہشاش بشاش کر رہا تھا' کیتھی کا گورا سڈول بدن سفید شفاف پانی میں تیر رہا تھا' کیتھی کا برہنہ وجود اسے خمار آلود نشے میں مبتلا کر رہا تھا۔

وہ حسین ہے وہ جانتی تھی ایک زمانہ اس پر فدا تھا اور ملنے والے بے لاگ اس کے خدوخال اور جسمانی کشش اور سحر انگیزی کے بارے میں

''چھوٹا نمبر''

پہلے سمسٹر کا رزلٹ ملا تو فرسٹ ایئر کا طالب علم اپنے پروفیسر کے پاس گیا اور شکایتی انداز میں بولا۔

''سر! میرا پیپر اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اس پر زیرو دیا جاتا۔''

''ہاں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' پروفیسر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''لیکن دینے کے لئے میرے پاس اس سے چھوٹا نمبر نہیں تھا۔''

(ریحا بلوچ......ڈگری)

رطب اللسان رہتے تھے۔ کیتھی پر سرور چھانے لگتا' تعریف ہر لڑکی کو اچھی لگتی ہے' کیتھی کو بھی تعریف لبھاتی تھی مگر راغب ہو کر طلب کرنا قطعاً دوسری بات ہے' کیتھی طلب میں مبتلا نہیں ہوتی تھی اور مقابل کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرتی تھی۔

نیہات گریوال اس کی زندگی میں وہ پہلا ایسا شخص تھا جس سے کیتھی کو محبت تھی' محبت جو خود بخود ہو جاتی ہے۔ بغیر آہٹ کیے دبے پاؤں دل میں آن بیٹھی ہے اور پھر اسے لاکھ ہاتھ پکڑ کر باہر نکالو مانتی ہی نہیں۔ کیتھی محبت جیسے خود رو جذبے پر قطعی یقین نہیں رکھتی تھی مگر نیہات جیسے شاندار لڑکے سے ملنے کے بعد جب بار بار ملنے کو دل چاہنے لگا اس کا کسرتی بدن' دیو مالائی نقوش' مردانہ وجاہت' اس کا اکیڈمک کیریئر' نیہات گریوال کی ذہانت کچھ بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں۔ وہ دلوں کو تسخیر کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھا اور کیتھی دل سے اس کی خداداد صلاحیتوں کی معترف تھی۔

نہات گریوال سے چند ملاقاتوں کے بعد بھی کیتھی نے خود سے اعتراف کرلیا تھا کہ واقعی حقیقتاً محبت ہوتی ہے اور بے حد زورآور ہوتی ہے' سر ہی نہیں جھکاتی' محبت گزیدہ انسان سارے کا سارا اپنے محبّ کے سامنے جھک کر سرنگوں ہوجاتا ہے۔ کیتھی نے سر نہیں پٹخا تھا خود سے ہاتھا پائی نہیں کی تھی' محبت کے وجود کی منکر رہی تھی مگراب ہاتھ جوڑ کر جھک گئی تھی اس اقرار میں بھی خمار تھا نشہ تھا چاہنے اور چاہے جانے کا زعم تھا سرمستی تھی۔

دونوں طرف محبت ایک جیسی تھی اور محبت کو وصل کا مزا میسر تھا ہجر وفراق سے وہ دونوں آشنا نہیں تھے۔ کیتھی گرم گرم پانی سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ اس کے بدن میں لذت بھری سنسنی دوڑ رہی تھی' نہات کا نشاط انگیز خیال کیتھی کے دل میں پھول کھلانے لگا' محبت تازہ بارونق معطر خوشبو کی مانند اس کے ذہن ودل کو معطر کرنے لگی' محبت پانی میں مہکنے لگی' کیتھی کا تھکن زدہ بدن فریش ہوگیا۔

''میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں' جسے نہات جیسے لڑکے کا ساتھ ملا۔'' وہ نہات کو سوچتی رہی' وہ محبت کی اسیر تھی اس نہات گریوال کی جس کی دنیا مداح تھی۔

نہات گریوال نے کیتھی کو پرپوز کرکے اس یقین پر مہر ثبت کردی جسے وہ پوری شدت سے نہات کی نیلی کانچ سی آنکھوں سے جھلکتا دیکھتی تھی مگر ہلکی سی بے یقینی کیتھی کی ذات میں سر اٹھانے لگتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ فریب نظر ہو یا کوئی خوش گمانی مگر تب سارے اندیشوں نے منہ بند کرلیا جب نہات گریوال نے اسے پرپوز کیا۔ کیتھی دل سے آمادہ تھی مگر اس نے اپنی آمادگی اور بلیوں اچھلتے دل کو فی الفور ایک نکڑ میں لگا کر۔ نہات سے کچھ وقت مانگا تھا سوچ بچار کے لیے ورنہ دل تو ہمک ہمک کر اس کی ہمراہی مانگ رہا تھا۔

کیتھی نے اپنے بدن پر پھیلے شبنمی قطروں کو جو پانی کی صورت چپکے ہوئے اِدھر اُدھر پھیل رہے تھے کو محبوبیت سے دیکھا اور سفید تولیے کو اپنی کمر میں ڈال کر گھمایا چکنی سفید جلد کا پانی تولیہ جذب کرنے لگا' ایک بار پھر نہات گریوال کا پُرکیف خیال چٹکیاں لینے لگا اس کے رگ و پے میں پُرلطف سنسنی گردش کرنے لگی' اس نے بازو وا کرکے ایک بھرپور انگڑائی لی۔

''نہات گریوال......'' کیتھی کے یاقوتی ہونٹوں نے اپنے محبوب کا نام چھوا' اک شہد آگیں سا احساس اس روح وبدن میں بہتا پھر بکھرتا چلا گیا۔

نہات گریوال نے ہیرے کی نگوں والی انگوٹھی پہنا کر اسے اپنا نام لکھوالیا تھا۔

کیتھی نے صاف ستھرا لباس پہن لیا تھا' سفید براق شرٹ کے ساتھ ٹائٹ گرین پینٹ' وہ آسودہ سی واش روم سے باہر نکلی اور طویل راہداری عبور کرکے اپنے بیڈروم میں آگئی اور اپنی شرٹ کے اوپری بٹن بند کرتے ہوئے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر بالوں میں برش چلانے لگی' بالوں سے پانی قطرہ قطرہ شرٹ میں ٹپک کر دامن کو تر کررہا تھا وہ بال بناتے ہوئے بآواز بلند کوئی گانا بھی گارہی تھی' وہ بلا کی

خوش الحان تھی اس سے اس کی آواز کا ترنم کمرے کی فضا میں پھیلا ہوا تھا کہ کمرے میں بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔ کیتھی نے آنکھیں سکوڑ کر ناک پھیلائی پھر لبوں پر لپ اسٹک لگانے لگی مگر اس کا ہاتھ ایک جگہ پر ہی رک گیا۔ آئینے میں کسی اور کا عکس کیتھی کے ساتھ نظر آنے لگا' وہ سٹپٹائی اور ششدر سی ایڑیوں کے بل گھومی وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مدمقابل تھی' وہی سفید چوغے میں ملبوس لڑکی کیتھی کی سانس خشک ہوگئی' آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرزنے لگیں' بے ساختہ اس کا دایاں ہاتھ دل پر آن ٹھہرا۔

''کک...... کون ہو تم؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو' کیا چاہتی ہو؟''

''میں تمہاری موت۔'' اس کی مری مری آواز نکلی' تھکن زدہ بکھری بکھری آواز۔ کیتھی نے ہمت کر کے ذرا آگے بڑھ کر کمرے کی ساری لائٹس جلا دیں' ہر چیز تیز روشنی میں نہا گئی۔ کیتھی دیکھ رہی تھی کہ اس چوغے والی لڑکی کا چہرہ بارونق تھا' تازگی لیے ہوئے جبکہ آواز بیماروں جیسی عمر رسیدہ سی۔

''کیا چاہتی ہو؟'' کیتھی نے کمال بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

''آؤ......'' اس نے لپک کر کیتھی کی کلائی دبوچ لی اس کی گرفت میں سختی اور جارحانہ پن تھا' کیتھی کو اپنی کلائی کسی شکنجے میں دبی ہوئی لگ رہی تھی۔ لحہ بہ لحہ کمرے میں تیز بو پھیلتی جا رہی تھی اتنی تیز کہ اعصاب اس بو کے ملبے تلے دبے جا رہے تھے۔ کیتھی کو لگا بس سانسوں میں ہوا کی کمی ہو رہی ہے۔

''آؤ میرے ساتھ......'' کیتھی کو اپنا دم گھٹتا سا لگا مگر یہ لمحوں کی بات تھی' ذرا دیر بعد پھر وہی مدھم سی خوشبو اطراف میں سمائی اور کیتھی کو اپنا تن بدن اتنا ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا جیسے روئی کے سفید گالے آسمان اور زمین کے درمیان تیرتے پھرتے ہیں' بالکل یونہی کیتھی اس چوغے والی لڑکی کے ساتھ ہواؤں میں اڑتی جا رہی تھی' کوئی اڑن کھٹولا انہیں اڑائے جا رہا تھا ان کی پرواز بلند تھی مگر وہ کہاں تھی' کہاں جا رہی تھی کیتھی بے خبر تھی شاید کسی نئے جہان کی کھوج میں محو سفر تھیں وہ۔

کیتھی کے کھلی فضا میں گھومتے وجود کو جھٹکا سا لگا اور اس کی ٹانگیں زمین سے لگ گئیں' مارے حیرت واستعجاب سے کیتھی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اوہ اتنا خوب صورت سماں' جیسے کوئی جنت نظیر وادی' شاہ بلوط کے قد آور درخت' درختوں پر چہچہاتی رنگین چڑیاں اِدھر اُدھر پھدکتے ہوئے نغمہ سرا تھیں۔ کیتھی کا دل خوشی سے لبریز ہونے لگا۔ سانسوں میں ٹھنڈک سی

اجرت کے بغیر

ایک مرتبہ ابراہیم بن ادہمؒ نے حمام میں جانے کا قصد کیا۔ مالک نے یہ کہہ کر روک دیا کہ اجرت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ سن کر ابراہیمؒ رونے لگے اور فرمایا۔ ''یا اللہ! مجھے شیطان کے گھر میں بلا اجرت داخلہ کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ جنت تو انبیاء' صدیقین علیہ السلام کا گھر ہے اس میں اجرت (عمل) کے بغیر کیوں کر داخلہ ہوگا۔

(عبدالرحمان...... کراچی)

اترنے لگی۔

''اِدھر دیکھو......'' چوغے والی لڑکی کی آواز ابھری تو جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے کیتھی کا سر دوسری طرف گھما دیا۔ پوری رات کا چاند بادلوں کی اوٹ سے اپنی دودھیا چاندنی بکھیر رہا تھا ماحول میں جیسے روشنی کی دبیز چادر سی بچھی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی جھیل میں بے شمار پانی کے فوارے لگے ہوئے تھے' بہت سارے فوارے گولائی کی صورت جھیل کے وسط میں جب ایک ساتھ پانی گراتے آبشار کا ترنم' اتنا سحر انگیز منظر کیتھی سحر زدہ سی یک ٹک دیکھے گئی یوں جیسے آنکھ جھپکے گی تو سب کچھ آنکھ سے اوجھل ہو جائے گا۔

''اُدھر دیکھو......'' اجنبی لڑکی نے انگلی اٹھا کر اشارہ کیا کیتھی کی نگاہیں اس کی انگلی کی سمت مڑ گئی۔ وہ آنکھیں جھپکا نہیں سکی تھی سامنے بہت سارے پھول تھے گلاب کے' گلِ داوودی' نرگس' رات کی رانی کی مدھر خوشبو اور پودوں کے درمیان بھاگتی دوڑتی رنگ برنگی بطخیں' خوش نما خوش رنگ' تتلیاں پھولوں پر رقص کر رہی تھیں' ساری وادی نور کی کرنوں میں نہا رہی تھی۔ کیتھی پر طلسم سا چھا رہا تھا وہ اسی سحر زدہ سی کیفیت میں آگے بڑھی۔ اس کا ارادہ پھولوں کی ملاحت و نرماہٹ کو محسوس کرنے کا تھا وہ چھو کر دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ سب حقیقت ہے کہ یا کوئی طلسم کدہ یا پھر کوئی جادو کی نگری۔

کیتھی نے جیسے ہی ایک پھول کی پتیوں کو چھوا بدک کر پیچھے ہٹی' پھول کے پیچھے سے سیاہ سانپ پھن پھیلائے تن کر کھڑا تھا۔ سانپ کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کے نیم وا ہونٹوں کے اندر زبان مسلسل حرکت کر رہی تھی' کیتھی کی مارے دہشت کے چیخ نکلی تھی اس کی آنکھوں میں وحشت تیرنے لگی' وہ اندھا دھند بھاگی اس کا رخ جھیل کی طرف تھا وہ بھاگ رہی تھی مگر جھیل اس کے قدموں کی رسائی سے دور ہی دور جا رہی تھی اس سے پہلے کہ کیتھی چکرا کر گر پڑتی' جھیل جیسے ساکن ہوگئی' کیتھی بھاگ کر جھیل کے اندر جا اتری مگر یہ کیا حیرت کا مقام تھا کہ وہاں جھیل...... جھیل کا پانی' فوارے کچھ بھی نہیں تھا اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا شاہ بلوط کے درخت' پھول' جھیل کچھ بھی نہیں تھا' صرف لق دق صحرا تھا قدموں تلے ریت تھی خاردار جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ چاند کی جگہ مہیب سناٹے اور تاریکی نے لے لی تھی تبھی قریب سے اس چوغے والی لڑکی کا بے ہنگم قہقہہ سنائی دیا وہ استہزا ابھرے قہقہے لگا رہی تھی کیتھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''مجھے کیوں ستا رہی ہو' کیا پرخاش ہے تمہیں مجھ سے؟'' کیتھی کا دل پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

''تمہیں جان سے مار دینا چاہتی ہوں۔'' اس نے کھانسی زدہ نقاہت سے معمور آواز آئی۔

''وہ دلکش وادی کہاں غائب ہوگئی وہ سحر طراز وادی تو دل لبھا رہی تھی؟''

''وہ وادی تمہارے لیے نہیں ہے' دنیا کی کسی خوب صورتی پر تمہارا کوئی حق نہیں' حتیٰ کہ نیہات گریوال پر بھی نہیں۔'' وہ پھر واشگاف قہقہے لگانے لگی خوفناک ڈروانے قہقہے۔

''تت...... تم نیہات گریوال کو کیسے جانتی ہو اور تم کون ہو؟''

''نیہات گریوال ایک عیسائی لڑکا ہے اس کی ماں عیسائی جبکہ والد ہندو تھا' پیشے کے لحاظ سے نیہات ایک کرائم رپورٹر ہے' مختلف خفیہ ایجنسیوں کے لیے کام کرتا ہے۔'' یہ پہلی طویل بات تھی جو اس نے کی تھی اب وہ جتاتی ہوئی نگاہوں سے کیتھی کو دیکھ رہی تھی' کچھ سلگتا سا بھی تھا اس کے انداز میں جو محسوس تو ہو رہا تھا مگر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''تم کون ہو؟ نیہات کو کیسے جانتی ہو؟'' کیتھی نے دل کڑا کر کے کہا۔

''میرا نام نندی ہے آج سے پچاس سال پہلے ایک مسلمان لڑکے سے سچی محبت کرنے کی پاداش میں میرے باپو نے مجھے زندہ جلا دیا تھا تب سے اب تک میں ایک بھٹکی ہوئی روح ہوں اور مجھے کسی طور گوارا نہیں کہ اگر میں اپنی محبت نہیں پاسکی تو کوئی اور لڑکی کیوں اپنی سچی محبت پائے۔ میں اب تک لاتعداد لڑکیوں کو زندہ جلا کر ان کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہوں' اب تمہاری باری ہے۔'' وہ اٹک اٹک کر یوں بول رہی تھی جیسے وہ برسوں کی مریضہ ہو اور اسے اس وقت بولنے میں دشواری کا سامنا ہو۔

''مجھے مت تھکاؤ' مجھے اپنے ساتھ ان بھول بھلیوں میں کیوں لیے پھر رہی ہو' مجھے مت تھکاؤ۔'' وہ رودی اس کا بدن پے در پے صدمات سے بے جان ہو رہا تھا۔

''نیہات گریوال کو بھول جاؤ۔''

''نن...... نہیں میں نیہات کے بنا ادھوری ہوں' آج کل وہ کام کے سلسلے میں اٹلی گیا ہوا ہے اور اس کے بغیر یہ چند دن میں نے کیسے

مسلمان کا حق

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں۔

۱۔ جب ملاقات کرے تو سلام کرے۔

۲۔ جب وہ بلائے تو اس کی دعوت رد نہ کرے۔

۳۔ جب وہ مشورہ چاہے تو نیک مشورہ دے۔

۴۔ جب وہ چھینکے تو الحمد اللہ کہے۔

۵۔ جب وہ بیمار ہو تو اُس کی عیادت کرے (یعنی بیمار پرسی کرے)

۶۔ جب وہ مرجائے تو اس کے جنازے میں شرکت کرے۔

(مرسلہ: محمد ایوب...... گجرات

گزارے ہیں بس صرف میں جانتی ہوں۔ اس کے بن جینا سوہانِ روح ہے' کیسے بھول جاؤں اسے۔'' کیتھی کی ساری خود اعتمادی و مضبوطی ریت کی دیوار کی مانند ڈھے گئی۔

''ٹھیک ہے اپنی اپنی موت کا انتظار کرو۔'' اس نے کیتھی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اچھال دیا' کیتھی کا نازک بدن خاردار جھاڑیوں سے الجھا دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔

❀ ...... ❀ ...... ❀

''مجھے مت مارو...... مت مارو......'' کیتھی خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتی اٹھ بیٹھی' اس نے غائب دماغی کے عالم میں دیکھا وہ اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر ہی لیٹی ہوئی تھی اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور اس کے گورے بدن پر گہری خراشیں تھیں۔ کیتھی نے ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کے لبوں سے ایک سسکی برآمد ہوئی اس کے جسم

سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں' بھوک سے کیتھی کی انتڑیاں دھائیاں دے رہی تھیں' شدت کی پیاس نے اسے بے حال کر دیا اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر بدن سے جیسے ساری سکت کسی انجانی قوت نے نچوڑ لی تھی بالآخر اس نے تمام کوششیں ترک کر کے سر تکیہ پر گرا دیا چند ایک خراشوں میں سے خون رس رہا تھا۔

تلخ سوچوں میں الجھتی وہ سوگئی مگر تبھی فون کی تیز بیل سے اس کی آنکھ کھل گئی اس کے خوابیدہ احساسات جھنجلا اٹھے' کافی دیر تک اس کا ذہن سویا جاگا سا رہا بیل پھر بجی تھی' کیتھی نے غور کیا وہ بیل فون کی نہیں تھی کوئی داخلی دروازے پر کھڑا گھر کی بیل بجا رہا تھا کیتھی کے سارے حواس بیدار ہونے لگے تبھی نہات گریوال کمرے میں داخل ہوا۔

''ہیلو! کہاں تھی تم اگر میرے پاس چابی نہ ہوتی تو باہر ہی کھڑا رہ جاتا' میں نے تمہیں بہت یاد کیا ڈارلنگ! دیکھو تو میں اٹلی سے تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔'' وہ اپنی ہی دھن میں کیتھی کا سر سینے سے لگائے بولے جارہا تھا' کمرے میں زیرو بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

''میں نے تمہارے لیے ٹاپس خریدے ہیں جس میں ننھے ننھے ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔'' نہات گریوال نے کیتھی کا ہاتھ پکڑ کر چوما۔ یک لخت اسے عجیب سا احساس ہوا کسی انہونی کا۔ کیتھی تو بہت جوش و ولولے کے ساتھ اس کے لپٹ جایا کرتی تھی وہ تو اس کی پرحدت دکھاتی ہوئی قربتوں کا عادی تھا۔ آج کیتھی اتنی سرد کیوں ہو رہی تھی اس کی طرف سے گرمجوشی مفقود تھی۔ نہات گریوال نے اچنبھے سے اٹھ کر کمرے کی لائٹس آن کر دیں اس کے ہونٹوں سے سسکی نما چیخ برآمد ہوئی تھی۔

''کیتھی تمہیں کیا ہوا' تمہارے بدن پر خراشیں کیسے آئیں اور تمہاری ذہنی حالت بھی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' نہات بوکھلا کر کبھی کیتھی کے گال چھوتا کبھی ہونٹ۔

''مجھے کیا ہونا ہے میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' کیتھی کی آنکھوں میں موت جیسی منجمد کر دینے والی سرد مہری تھی اس کا بدن سرد ہو رہا تھا' موت جیسی سفاکی کی حد تک ٹھنڈا۔

نہات گریوال نے اسے بازوؤں میں بھر کر آئینے کے سامنے کر دیا' کیتھی خود کو دیکھ کر چیخنے لگی۔

''کیا میں تمہیں ایسا چھوڑ کر گیا تھا' تمہارا یہ حال کس نے کیا' تمہارے حواس کس نے چھین لیے کس نے زخمی کیا۔ تم اتنی زرد ہو رہی ہو' تم تم نہیں رہیں؟'' نہات گریوال کی آواز شدتِ رنج سے پھٹ پڑی' آنسو اس کی آنکھوں سے ضبط کے باوجود نکل پڑے۔

''مجھے کیا ہوگیا ہے' مگر مجھے کیا ہوگیا...... نہات گریوال کچھ ہوگیا ہے......'' کیتھی کا بدن نہات گریوال کے کسرتی بازوؤں میں جھول گیا۔

سیاہ گلاب

شہناز بانو

اس مخلوق کا احوال جو ہمارے درمیان رہتی ہے مگر ہمیں نظر نہیں آتی لیکن اگر ہم ان کے نظام میں مداخلت کریں تو وہ اپنا احساس ضرور کراتی ہے۔
ایسی ہی ایک ہستی کا فسانہ، اسے ایک لڑکی سے پیار ہوگیا تھا وہ روزانہ ایک سیاہ گلاب اپنی محبوبہ کو دیتا تھا۔

وہ نہا کر آئی تو بہت دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی اپنے دلکش اور حسین سراپا کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی پھر گیلے بالوں کو تولیے سے اچھی طرح سے خشک کر کے آہستہ آہستہ ان میں کنگھا کرتی رہی، ساتھ ہی وہ گنگناتی بھی جا رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے آمنہ کو بے پناہ حسن سے نوازا تھا، سرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، فراخ پیشانی اور گلابوں جیسے ہونٹ اور ان سب کے ساتھ اس کے وجود میں سب سے بڑی خوب صورتی اس کے سیاہ گھنے اور لمبے بال تھے۔

اسے اپنی خوب صورتی کا بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا، وہ میٹرک میں پڑھتی تھی اسکول کی لڑکیاں تو لڑکیاں اس کی ٹیچرز بھی اس کی تعریف کیا کرتی تھیں۔

اس کی سہیلیاں اسے کہا کرتی تھیں کہ اس کے لیے تو آسمان سے اتر کر کوئی شہزادہ ہی بیاہنے کے لیے آئے گا کیوں کہ اتنی حسین لڑکی کے لائق تو کوئی شہزادہ ہی ہوسکتا ہے۔

اس وقت اس نے سیاہ رنگ کا کڑھائی والا لباس پہنا ہوا تھا جو اس کی گوری رنگت پر بہت سج رہا تھا۔

آمنہ اپنے والدین کی ایک ہی بیٹی تھی البتہ اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا، چند سال پہلے اس کے والد کا انتقال ہوگیا تھا اس لیے وہ اپنے بھائی اور والدہ کے ساتھ رہتی تھی۔

ان کا شمار ایک متوسط طبقے سے تھا، دو سو گز کا یہ مکان ابا نے اپنی زندگی میں ہی بنالیا تھا، وہ گورنمنٹ ملازم تھے اس لیے ان کے انتقال کے بعد ان کی پینشن بھی آجاتی تھی۔

اماں بہت سلیقہ شعار تھیں، بہت احتیاط سے گھر کے اخراجات ان محدود پیسوں میں پورے کرتی تھیں۔ البتہ اگر کبھی ضرورت ہوتی عید بقرعید کے موقع پر وہ لوگوں کے کپڑے سلائی کرتی تھیں جس سے اضافی آمدنی ہوجاتی اور رمضان اور عید کے اضافی اخراجات بآسانی پورے ہوجاتے اس کے ساتھ ساتھ وہ آمنہ کی شادی کے لیے بھی رقم جوڑ رہی تھیں۔

دو سو گز کے اس گھر میں صرف تین کمرے تھے، آگے کافی بڑا صحن تھا جہاں ابا نے بہت شوق سے پھلوں کے درخت لگائے تھے، ان میں ایک گھنا درخت بیری کا تھا۔ بقول اماں کے جب ہم نے یہ پلاٹ خریدا تھا بیری کا یہ پیڑ پہلے سے موجود تھا۔ اماں اور ابا نے فیصلہ کیا کہ اس درخت کو نہیں کٹوایا جائے سو وہ لگا رہا، اس کے ساتھ ہی وہاں ایک انار کا درخت اور ایک آم کا درخت بھی تھا۔

بیری کا درخت سب سے اونچا اور گھنا تھا، اس میں بیر بھی خوب آتے تھے۔ آمنہ کو اس درخت کے کھٹے میٹھے بیر بہت پسند تھے، وہ شوق سے کھایا کرتی، ساتھ ہی اس نے بھائی سے اس درخت میں جھولا بھی ڈلوالیا تھا شام کے وقت وہ خوب جھولا جھولتی تھی۔

کمرے سے نکل کر وہ سیدھی جھولے پر آ کر بیٹھ گئی اور جھولا جھولنے لگی، وہ آہستہ آہستہ جھولا لے رہی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اس خیالی شہزادے کے تصور میں کھوگئی جو بقول اس کی سہیلیوں کے اسے بیاہنے کے لیے آنے والا تھا۔ اماں اس وقت کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں، شام گہری ہوگئی تھی درختوں کے سائے

لمبے ہوگئے تھے اماں نے آمنہ کو کسی کام کے لیے آواز دی مگر آمنہ کوان کی آواز سنائی نہ دی اس لیے اس نے کوئی جواب نہ دیا۔اماں نے آمنہ کی جانب سے کوئی جواب نہ آنے پر کچن سے باہر نکل کر آواز دی پھران کی نگاہ پر جھولے پرآنکھیں موندے بیٹھی آمنہ پر پڑی وہ جھولے ہلکورے لے رہی تھی اوراس کے کھلے ہوئے سیاہ گھنے بال ہوا میں لہرا رہے تھے درخت کے نیچے اب اندھیرا ہو چلا تھا دونوں وقت مل رہے تھے نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر اماں کا دل ہول گیا۔

''آمنہ......اری اوآمنہ......'' انہوں نے چیخ کر اسے آواز دی۔

''آں......ہاں......ہاں اماں کیا بات ہے؟'' اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور بولی۔

''میں نے تجھے کتنی بار منع کیا ہے کہ اس وقت جھولا نہ جھولا کر دونوں وقت مل رہے ہیں اور تو نہا کر اور بال کھول کر یہاں درختوں کے نیچے آگئی ہے۔ چل اندر آ' بُری گھڑی کا پتا نہیں ہوتا میرا بچہ۔'' غصے میں بولتے بولتے اماں نے آخری جملہ پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''اماں آپ تو یوں ہی ڈانٹتی رہتی ہیں' کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے تو اس درخت سے بہت پیار ہے' میرا سارا بچپن اس کے سائے میں کھیل کر گزرا ہے۔'' آمنہ نے پیار بھری نگاہیں درخت کی جانب اوپر اٹھا کر جواب دیا۔

اسی وقت باہر گلی والا دروازہ کھلا اور زاہد اندر آ گیا' وہ پڑوس میں موجود آمنہ کی خالہ کا بیٹا تھا' لمبا دبلا پتلا اور سانولہ......زاہد آمنہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا' اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو زاہد آمنہ کو خوب صورت نہیں لگتا تھا اپنے سانولے رنگ اور دبلے جسم کی وجہ سے۔ دوسرے یہ کہ خالہ کی زبانی وہ یہی سنا کرتی کہ وہ تو آمنہ کو اپنے زاہد کی دلہن بنائیں گی اور زاہد جس کی نگاہوں کی وارفتگی اور والہانہ پن آمنہ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ زاہد کی آنکھیں بڑی اور روشن تھیں اور ان سے ذہانت جیسے ٹپکتی رہتی تھی لیکن اسے ان ذہین آنکھوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ گھر آتا تھا اور اس کی یہ ذہین آنکھیں آمنہ کے وجود کے ساتھ چپک سی جاتی تھیں۔

''السلام علیکم خالہ جان!'' اس نے ایک پیار بھری نگاہ آمنہ پر ڈالی اور خالہ کو سلام کیا۔

''جیتے رہو' کیسے ہو بیٹا!'' اماں نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''شکیل کو دیکھ رہے ہو' وہ تو ٹیوشن سینٹر گیا ہوا ہے۔'' اماں نے اس کی اِدھر اُدھر ڈولتی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی خالہ جان مجھے اس سے ایک کام تھا۔''

''وہ آجائے گا تو میں اسے تمہاری طرف بھیج دوں گی' تم بیٹھو چائے پیو گے۔'' اماں نے کہا تو وہ سامنے رکھے لکڑی کے تختے پر بیٹھ گیا' اماں کچن کی جانب پلٹ گئیں اور آمنہ زاہد کی نگاہوں سے بچنے کے لیے جھولے سے اتر کر جانے لگی۔

''آمنہ......!'' زاہد نے جاتی ہوئی آمنہ کو آواز دی۔

''کیا ہے؟'' وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

''تمہارے ٹیسٹ ہو رہے تھے ناں' کیسے ہوئے اگر میں مدد کی ضرورت ہو تو میں......''

''جی نہیں شکریہ! میری تیاری ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چھپاک سے کمرے میں داخل ہوگئی اور زاہد ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ دل ہی دل میں تاسف سے کہہ رہا تھا۔

''تم کب سمجھوگی میرے دل کی چاہت کو......یہ آواز کب تمہارے دل کے تاروں کو چھوئے گی کہ زاہد تم سے کتنی محبت کرتا ہے' کتنا تڑپتا ہے تمہاری ایک نگاہ کے لیے۔'' وہ اور بھی کتنی ہی باتیں سوچے جا رہا تھا کہ اماں چائے کا کپ تھامے آتی ہوئی دکھائی دیں تو وہ ان کی جانب متوجہ ہوگیا۔

❁......❁......❁

دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے وہ اپنی دوست کے ساتھ پیدل اسکول سے گھر کی جانب آرہی تھی' رانی ان کی گلی میں ہی رہتی تھی اس کے بچپن کی دوست تھی۔

دونوں شروع سے ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس میں پڑھ رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے اپنے دل کی ہر بات بتایا کرتی تھیں، آمنہ اسے زاہد کے بارے میں بتارہی تھی کہ کل شام بھی...... اچانک اس کی نگاہ ایک گھر کے باہر کیاری میں لگے گلابی رنگ کے گلابوں پر پڑی، تین گلاب گچھے کی صورت میں لگے تھے اور بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

"اوہ مائی گاڈ! کتنے حسین گلاب ہیں، دیکھو تو سہی رانی۔" آمنہ نے پُرشوق لہجے میں کہا۔

"ہاں واقعی بہت خوب صورت لگ رہے ہیں۔" رانی نے تائید میں سر ہلایا۔

"میں توڑ لوں؟" اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

"پاگل ہوگئی ہے جن کا گھر ہے اگر وہ باہر نکل آئے تو ڈانٹ پڑے گی۔" رانی نے منع کیا۔

"بس چند سیکنڈ لگیں گے میں بس ابھی توڑ کر لائی۔" آمنہ نے رانی سے کہا اور رانی کے آواز دینے کو نظر انداز کرکے بھاگ کر پھول توڑ لائی۔

"تم بھی اپنی مرضی کی مالک ہو، کیا مجال جو کسی کی بات سن لو۔ اب تیز تیز چلو یہاں سے کیا پتا اس گھر سے کوئی باہر نکل آئے۔" رانی نے اپنے قدموں میں تیزی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ وہ گھبرا رہی تھی جبکہ آمنہ بہت خوش تھی، وہ بار بار ناک کے قریب پھول لاتی اور انہیں سونگھتی اور کہتی۔

"کیا زبردست خوشبو ہے۔"

حالانکہ رنگین گلابوں میں اتنی خوشبو نہیں ہوتی، سرخ اور دیسی گلابوں میں تیز مہک ہوتی ہے لیکن آمنہ کو ان گلابوں سے بہت اچھی خوشبو آرہی تھی اسے نہیں معلوم تھا کہ دو آنکھیں اس کے جسم کے ساتھ چپکی ہوئی ہیں۔

❀......❀......❀

دوسرے دن وہ پھر اس گھر کے سامنے سے گزریں، آمنہ کی نگاہیں بے ساختہ کیاری کی جانب اٹھ گئیں، آج وہاں پانچ گلابوں کا گچھا لگا ہوا تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آج گلاب سرخ رنگ کے تھے۔

آج آمنہ نے رانی سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور تیزی سے کیاری کی جانب بڑھ گئی اور ہاتھ بڑھا کر جیسے ہی پھول توڑنے لگی اسے اپنے ہاتھ پر کسی اور کے ہاتھ کے لمس کا احساس ہوا، بالکل ایسے جیسے کسی اور ہاتھ سے اس کا ہاتھ ٹچ ہوا ہو۔ وہ ایک لمحے کو رکی پھر ہنستے ہوئے پھول توڑ لیے اس نے سوچا کہ رانی نے اسے ڈرا دیا ہے کہ گھر سے کوئی نکل آئے گا شاید اس لیے مجھے ایسا محسوس ہوا ہے پھر اسے اپنے پیچھے دروازہ کھل کے بند ہونے کی آواز آئی اس نے پلٹ کر دیکھا تو دروازے پر تو تالا پڑا ہوا تھا اس نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا اور ان کے پاس آ کر بولی۔

"آج ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے گھر پر تو تالا لگا ہوا ہے۔"

"بھئی تم عجیب لڑکی ہو، عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہو۔ گلاب مجھے بھی پسند ہیں لیکن میں تو کبھی بھی اس طرح پھول نہ توڑوں۔" رانی نے کہا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے گھر کی جانب آنے لگیں، آج بھی دو آنکھیں آمنہ کا پیچھا کررہی تھیں پھر تو جیسے یہ روز کا معمول بن گیا، ان پودوں میں آمنہ کو روزانہ مختلف کلر کے گلاب دکھائی دیتے۔ اس روز جب وہ اسکول سے آرہی تھی تو اس نے ایک سیاہ گلاب دیکھا جو خلاف معمول تنہا اور بڑا تھا۔

"واؤ......" وہ وارفتگی سے بھاگتی ہوئی کیاری کے قریب گئی اور پھول کی ٹہنی کو جیسے ہی اپنی دو انگلیوں میں تھاما اسے کسی کی گہری سانس سنائی دی اس نے چونک کر پیچھے دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں بے ساختہ گھر کے دروازے کی جانب اٹھ گئیں، وہاں حسب معمول تالا لگا ہوا تھا اس نے اپنے وہم کو جھٹکا اور آہستگی سے پھول توڑ لیا۔

راستے بھر رانی اسے اس حرکت سے باز رہنے کی نصیحتیں کرتی رہی اور وہ ہنس ہنس کر ٹالتی رہی لیکن...... آج دو آنکھیں اس کا پیچھا نہیں کررہی تھیں، وہ اس کے ساتھ

ساتھ تھیں۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو آنکھیں بھی گھر میں داخل ہوگئیں' اماں نے دروازہ کھولتے ہی اسے ڈانٹا کہ آج پھر بھری دوپہر میں گلاب کا پھول ہاتھ میں لیے چلی آئی ہے۔

''میں نے کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ دوپہر میں پھول ہاتھ میں نہیں لیتے' تو باز کیوں نہیں آتی۔''

''کیا ہے بھئی اماں! آپ کے لیے تو سارے وقت بُرے ہیں' کبھی شام کو جھولا مت جھولو دونوں وقت مل رہے ہیں۔ کبھی دوپہر میں پھول مت ہاتھ میں لو زوال کا وقت ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوتا سارے وقت اچھے ہوتے ہیں آپ پریشان نہ ہوا کریں۔'' آمنہ نے پیار سے اماں سے کہا۔

''کیا کروں بیٹا ماں ہوں ناں' جوان جہان ہے تو۔ اوپر سے باپ بھی سر پر نہیں ہے' مجھے تو ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہیں کچھ بُرا نہ ہو جائے۔'' اماں نے فکر مندی سے کہا۔

''کچھ بُرا نہیں ہوگا اماں! آپ کی دعائیں ہیں ناں میرے ساتھ۔'' آمنہ نے بے پروائی سے کہا اور اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔

''جلدی سے نہا کر آجاؤ بیٹا! میں کھانا لگا رہی ہوں' شکیل بھی آنے والا ہے۔'' اسے پیچھے سے اماں کی آواز سنائی دی۔

''جی اچھا اماں!'' اس نے کہا پھر سب سے پہلے گلاب کا پھول اپنی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا پھر جاتے جاتے پلٹی اسے ہاتھ میں اٹھایا اور بولی۔ ''کتنے کیوٹ کتنے پیارے ہو تم۔'' پھر بے ساختہ اس نے گلاب پر اپنے لب رکھ دیئے پھر اسے ہٹانا چاہا تو پھول تو جیسے اس کے ہونٹوں سے چپک گیا۔ اس کی پتیاں بہت نرم اور مخملیں تھیں' کتنا جاں فزا تھا اس کا لمس' وہ یوں ہی بیڈ پر لیٹ گئی آہستہ آہستہ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے لبوں پر کسی اور کے لب ہیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور خود ہی شرما کر ہنس پڑی' اس نے پھول تکیے پر رکھ دیا اور غسل کرنے چلی گئی۔

غسل کے دوران اسے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا تھا' کبھی اسے اپنے قریب کسی کی گہری سانسیں محسوس ہوتیں پھر اس نے خود ہی اپنے وہم کو جھٹک دیا اور شرما گئی' یہ سوچ کر کہ اپنے خوابوں کے شہزادے کے بارے میں زیادہ ہی سوچنے لگی ہے۔

وہ نہا کر آئی تو بجائے فریش ہونے کے اپنے آپ کو تھکا ہوا محسوس کرنے لگی۔ سر بھی بہت بھاری ہو رہا تھا اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ نڈھال سی ہو کر بیڈ پر لیٹ گئی' اس کا انتظار کرنے کے بعد اماں اندر آئیں اور اسے لیٹے ہوئے دیکھا تو فکر مندی سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے' اس نے آنکھیں کھول کر اماں کو دیکھا تو اماں بُری طرح چونک گئیں۔

''ارے تیری تو آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں' کیا آنکھوں میں صابن چلا گیا ہے۔''

''نہیں تو اماں! بس ذرا سر بھاری ہو رہا ہے۔'' اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

''اتنی تو گرمی ہو رہی ہے' کہیں پسینے والے جسم پر ٹھنڈا پانی تو نہیں ڈال لیا؟'' اماں نے پوچھا۔

''شاید اماں ایسا ہی ہوا ہو۔'' اس نے کہا۔

''تھوڑا سا کچھ کھا تو لو صبح ناشتا بھی ڈھنگ سے نہیں کرتی ہو'' اماں نے کہا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے' تھوڑا سا سو جاؤں' اٹھ کر کھا لوں گی۔ آپ اور شکیل کھا لیں۔'' اس نے کہا اور کروٹ لے لی تو اماں فکر مندی سے سر ہلاتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔

❁ ❁ ❁

اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اس کے قریب تھا بہت ہی قریب...... اسے وارفتگی سے تکے جا رہا تھا۔

کمر کے نیچے دبے آمنہ کے لمبے بال آہستہ آہستہ خود بخود نکلتے ہوئے بیڈ سے نیچے لٹک گئے اور پھر نہ جانے کہاں سے زرد آنکھوں والا ایک سیاہ بلا اس کے کمرے میں آ گیا اور اس کے بالوں کے ساتھ کھیلنے لگا' کبھی وہ اپنا منہ اس کے بالوں سے رگڑتا' کبھی لوٹنے لگتا پھر اس بلے کا اگلا ہاتھ لمبا ہوتا گیا اور اس کے سر پر پہنچ

گیا۔ وہ سر سے لے کر بالوں کے سروں تک اپنے دونوں پنجے پھیر رہا تھا پھر وہ تکیے پر چڑھ کر آمنہ کے چہرے کی جانب آیا اور اپنی سرخ زبان نکال کر اس کے چہرے کو چاٹنے لگا۔

گلاب کا سیاہ پھول اس دوران کہیں نہیں تھا' آمنہ بے سدھ سو رہی تھی' اس کا جسم بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔

سیاہ بلے کی زبان کی چپچپاہٹ محسوس کر کے آمنہ کسمسائی تو بلا منظر سے غائب ہو گیا۔ دوسرے لمحے وہ پھر بے سدھ ہو گئی' بلا پھر آن موجود ہوا۔ سارا چہرہ زبان سے چاٹنے کے بعد بلا گردن پر زبان پھیرنے لگا' اس کی زبان کی چپڑ چپڑ کی آواز کمرے میں سنائی دے رہی تھی۔ اچانک قدموں کی آہٹ سنائی دی تو بلا پھر غائب ہو گیا اور اس کی جگہ تکیے پر سیاہ گلاب دکھائی دینے لگا۔

اماں اندر آئیں انہوں نے آمنہ کو سیدھا کیا تو ان کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی' انہیں آمنہ کے چہرے اور گردن پر سرخ سرخ گہرے اور لمبے نشان دکھائی دیئے۔

''ارے یہ کیا ہوا؟ آمنہ...... آمنہ......!'' وہ آمنہ کو جھنجوڑنے لگیں' آمنہ کا جسم آگ کی مانند تپ رہا تھا۔

''ارے یہ کیا ہو گیا میری بچی کو' اچھی بھلی تو اسکول سے آئی تھی اور یہ منحوس کالا گلاب یہاں کیوں رکھا ہے اس نے۔ نہ جانے کہاں سے لائی ہے اسے۔'' اماں نے غصے سے کالا گلاب اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور آمنہ پر آیت الکرسی پڑھ کر دم کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد آمنہ نے آنکھیں کھول دیں اس کا بخار بھی کم ہو گیا تھا۔ سر کا درد بھی ہلکا تھا' چہرے سے سرخ نشان بھی تھوڑی دیر بعد ختم ہو گئے۔

''شکر الحمدللہ کہ اب میری بچی کی طبیعت بہتر ہے' میں تو ڈر ہی گئی تھی۔'' اماں نے آمنہ کو بہتر دیکھ کر کہا۔

''اماں میری پیاری اماں! آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونا چھوڑ دیں' شاید آپ ٹھیک کہہ رہی تھیں کہ شدید گرمی اور پسینے کی وجہ سے میری ایسی طبیعت ہو گئی ہو گی' جسم کا ٹمپریچر بڑھ گیا ہو گا۔ نقاہت سی تو محسوس ہو رہی تھی لیکن میں کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں۔'' آمنہ نے اماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا تو اماں اس کے لیے کھانا لینے چلی گئیں۔

کھانے کے دوران وہ اماں سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی' شکیل بھی آمنہ کے کمرے میں آ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد اماں اسے آرام کرنے کی ہدایت کر کے کمرے سے چلی گئیں تو وہ اپنا اسکول بیگ کھول کر بیٹھ گئی' ٹیسٹ تو ہو چکے تھے وہ ہوم ورک کرنا چاہتی تھی یکا یک اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا۔ اس نے بے دلی سے کتابیں اٹھا کر رکھ دیں پھر کتاب لے کر لیٹ گئی مگر کتاب پڑھنے میں بھی اس کا دل نہ لگا اسے ایک عجیب طرح کی گھبراہٹ اور بے چینی نے آن گھیرا۔ کمرے میں شدید گھٹن محسوس ہونے لگی اس کا دل شدت سے چاہا کہ وہ باہر نکلے اور اپنے جھولے پر جا کر بیٹھ جائے' وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

اس وقت عصر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں' اس نے اپنے لمبے بالوں کو سمیٹ کر انہیں جوڑے کی شکل میں لپیٹ لیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ اماں کے کمرے میں جھانکا' اماں کروٹ بدلے لیٹی تھیں شاید سو گئی تھیں۔ شکیل اپنے ٹیوشن سینٹر جا چکا تھا' وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جھولے کے پاس آ گئی۔ وہ جھولے پر بیٹھنا چاہتی تھی کہ اس کی نگاہ جھولے پر رکھے سیاہ گلاب پر پڑی تو وہ چونک گئی۔

''ارے یہ گلاب یہاں کس نے رکھ دیا' میں نے تو اسے اپنے کمرے میں رکھا تھا۔'' اس نے سوچا اور گلاب اٹھا لیا اور جھولے پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ہلکورے لیے' گلاب اس کے ہاتھ میں تھا اس نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر جھولے کی رسّی سے ٹکا دیا' اس ہاتھ میں گلاب تھا۔

اسے محسوس ہوا جیسے کسی کی گرم گرم سانسیں اس کے گالوں کو چھو رہی ہیں پھر اس کے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی۔

''تم مجھے یاد کرتی تھیں ناں' دیکھو میں آ گیا ہوں تمہارے خوابوں کا شہزادہ۔ تمہیں اپنی ملکہ بنانے کے لیے' کیا تم میری ملکہ بنو گی؟''

''ہوں۔'' اس نے بے خودی میں جواب دیا۔ پھر اسے وہ مخمل جیسا گلاب اپنے گالوں پر محسوس ہوا' وہ مسکرانے لگی۔

''آؤ میں تمہیں جھولا جھولاؤں۔'' اور پھر کوئی اسے جھولے دینے لگا' وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی پھر اس کے کان میں گرم گرم سانسوں کے ساتھ سرگوشی گونجی۔ ''تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو' کیا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟''

''ہوں......'' اس نے پھر بند آنکھوں کے ساتھ بے خودی میں جواب دیا۔

''اچھا ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے' بس تم اس گلاب کو کبھی خود سے جدا نہ کرنا۔ میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گا' تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم سب سے ملنا چھوڑ دو گی۔ صرف میری بن کر رہو گی۔'' پھر سرگوشی گونجی۔

''کیا رانی سے بھی نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں رانی سے بھی نہیں۔'' اس کے سیاہ اور لمبے بال کھل کر اس کی پشت پر لہرا رہے تھے۔

''مجھے تمہارے بال بہت پسند ہیں' بہت خوب صورت ہیں۔ تم بھی بہت خوب صورت ہو' اب جب تم کمرے میں جاؤ تو اپنی اماں کو کمرے میں مت آنے دینا۔''

''کیوں؟''

''ان کے آنے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے' بہت زیادہ تکلیف...... کیا تم چاہو گی کہ مجھے تکلیف پہنچے؟''

''نہیں تو......''

''تو پھر جیسا میں کہوں تم ویسا ہی کرنا۔''

''ہاں جیسا تم کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔'' وہ بند آنکھوں کے ساتھ بے خودی میں اس کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی' اس کا شہزادہ اس کے پاس تھا' وہ آج بہت خوش تھی۔

اچانک اماں کی تیز چیخ سے اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اماں تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اور اسے جھولے سے اتارتے ہوئے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے آئیں۔

آمنہ کی آنکھیں سرخ دہکتے ہوئے انگارے کی مانند ہو رہی تھیں اور نرم ریشم جیسے بال' سخت کانٹوں کی مانند ہو رہے تھے۔

''کیا ہے اماں! کیوں مجھے اس طرح جھولے سے اتار کر لائی ہو۔'' وہ بھاری آواز میں اماں کے اوپر غرائی۔

''وہ...... وہ...... ادھر تیرے اوپر......'' مارے خوف کے اماں کے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔

''کیا...... کیا تھا میرے اوپر...... اتنا اچھا لگ رہا تھا مجھے......''

''بے...... بیٹا! میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ بلا تیرے کندھوں پر سوار تھا' میں نے...... میں نے چی...... چیخ ماری...... تو...... تو...... وہ بیری کے درخت پر چڑھ گیا۔ اللہ میری بچی پر رحم کر......'' اماں نے بے ساختہ رونے لگیں۔

''اماں تم میرے کمرے سے جاؤ' یہاں مت آنا۔ ورنہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔''

''ارے...... ک...... کون...... کون ناراض ہو جائے گا؟'' مارے دہشت اور خوف کے اماں کی گھگھی بندھ گئی۔

''وہ سیاہ بلا......''

''پاگل ہو گئی ہو کیا...... میرے شہزادے کو سیاہ بلا کہہ رہی ہو۔'' آمنہ نے شرماتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہا......'' ایک انجانے خوفناک خدشے کے سبب اماں کا منہ پھٹ گیا۔ انہوں نے جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھنی شروع کی تو آمنہ نے اماں کو دونوں ہاتھوں سے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ کمرے سے باہر جا گریں اور وہاں رکھی میز سے اماں کی کمر ٹکرائی اور وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئیں۔

آمنہ چند لمحوں تک کھڑی اماں کو گرا ہوا دیکھ کر مسکراتی رہی پھر دروازہ بند کر کے آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تب اسے اپنی پشت پر دو بڑی بڑی زرد آنکھیں دکھائی دیں' صرف لمحوں کے لیے آمنہ کی آنکھیں ان زرد آنکھوں سے ملیں' دوسرے ہی لمحے آمنہ تیورا کر بیڈ پر گر پڑی۔

اس وقت مغرب کی اذانیں مسجدوں سے بلند ہونے لگیں اور وہ سیاہ بلا کمرے میں نمودار ہوگیا' اس وقت اس بلے کی جسامت ایک کتے کے برابر تھی' وہ ایک ہی جست میں بیڈ پر چڑھ گیا۔

بے ہوش آمنہ کا وجود خود بخود سرک کر بیڈ پر ایک سرے ہوگیا' وہ سیدھے ہاتھ پاؤں کیے بیڈ پر لیٹی تھی' وہ کتے کی جسامت والا سیاہ بلا اس کے بیڈ پر اس کے چاروں جانب گھوم رہا تھا پھر وہ اس کے پیروں کے پاس آیا اور اس کے تلوے اپنی زبان سے چاٹنے لگا۔ وہ مسلسل اس کے پیروں کے تلوے چاٹ رہا تھا حد یہ کہ آمنہ کے تلوؤں سے خون رسنے لگا اس کی کھال غائب ہوگئی اور اس کے پیر شدید زخمی ہوگئے۔

شکیل جب ٹیوشن سے واپس آیا تو اس نے اماں کو بے ہوشی کی حالت میں پایا' گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے وہ اندر آ گیا۔

اماں پتا نہیں کیسے بے ہوش ہوگئیں' آمنہ آپی بھی پتا نہیں کہاں گئی ہے یقیناً رانی باجی کے ہاں گئی ہوں گی۔ میں اکیلا اماں کو کیسے اٹھا سکتا ہوں' کیا کروں...... اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا اسے زاہد کا خیال آیا تو وہ بھاگ کر زاہد کے گھر گیا اور اسے بلا کر لایا۔ دونوں نے مل کر اماں کو بستر پر لٹایا' خالہ بھی پیچھے پیچھے آ گئیں' زاہد اور خالہ دونوں نے آمنہ کا پوچھا تو شکیل نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہے شاید رانی باجی کے پاس گئی ہیں۔

''لیکن رانی کو تو ابھی میں نے اپنی امی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا ہے آمنہ وہاں نہیں ہوگی۔'' زاہد نے کہا۔

''تم نے گھر میں اچھی طرح سے دیکھا ہے آمنہ کو۔'' خالہ نے بوکھلا کر پوچھا۔

''نہیں تو......'' شکیل نے معصومیت سے سر ہلا دیا۔

''پاگل ہو تم' اس کے کمرے میں تو دیکھو وہ کیوں نہیں آئی۔'' خالہ نے کہا اور تیزی سے چلتے ہوئے آمنہ کے کمرے کی جانب آئیں جیسے ہی بند دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ لگا وہ زور سے بند دروازے سے ٹکرائیں' انہیں ایسا لگا جیسے زور سے کسی نے انہیں دھکا مارا ہو مگر گھبراہٹ میں انہوں نے اس کی پروا نہیں کی اور آمنہ کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی' اچانک ہی ان کا چہرہ زور سے دروازے سے ٹکرایا اور ان کی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

اور کمرے کے اندر سیاہ بلا جو زبان سے آمنہ کے تلوؤں سے رسنے والا خون شڑاپ شڑاپ چاٹ رہا تھا' کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز سے ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ اس نے ناگواری سے منہ اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

اپنی امی کی دردناک آواز سن کر زاہد جو خالہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا' بھاگ کر باہر آیا اور امی کو دیکھا جن کا سارا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اور جو درد و اذیت سے کراہ رہی تھیں۔

''امی...... امی...... کیا ہوا' او مائی گاڈ یہ سب کیسے ہوا؟'' چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ چیخ اٹھا۔

''اللہ جانے یہ کیا چکر ہے' پہلے باجی اس دروازے کے سامنے بے ہوش پڑی تھیں اور اب میرے ساتھ یہ سب ہوگیا' آمنہ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اندر ہی ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آمنہ دروازہ بند کرکے اندر بیٹھی ہو۔'' زاہد نے کہا اور بند دروازے کی جانب بڑھا۔

''زاہد بیٹا رہنے......'' ابھی خالہ کا جملہ منہ میں ہی تھا کہ زاہد نے دروازے پر دستک دے ڈالی اور اس کے ساتھ ہی اسے لگا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر زور سے دور پھینک دیا ہو' زاہد جیسے ہوا میں اڑتا ہوا دور صحن میں جا کر گرا۔

''ہائے اللہ...... میرا بچہ! یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' خالہ اپنی تکلیف بھول کر زاہد کی جانب بڑھیں جو خود اس سارے واقعے پر شدید حیران و پریشان تھا' زور سے گرنے سے اسے کافی چوٹیں آئی تھیں لیکن وہ جوان لڑکا تھا' کراہتا ہوا آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

شور شرابا سن کر شکیل بھی اٹھ کر باہر آ گیا' وہ تیرہ سالہ

بچہ تھا۔ ساری بات سن کر وہ سخت خوف زدہ رہ گیا' یہ بات تو سب کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہ معاملہ کافی گمبھیر اور پُراسرار ہے لیکن انہیں آمنہ کی فکر تھی' وہ بند کمرے میں تھی اور کوئی بھی اس دروازے کو کھول نہیں پا رہا تھا

تینوں باتیں کرتے ہوئے اماں کے کمرے میں آ گئے' انہیں ہوش آ گیا تھا اور وہ گم صم لیٹی چھت کو تک رہی تھیں۔

''یہ سب کیا ہے باجی! آمنہ اندر کمرے میں بند ہے اور میں نے اور زاہد نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو ہمارا یہ حشر ہوا ہے۔'' خالہ نے پریشان اور فکر مند لہجے میں اماں سے پوچھا تو اماں نے سارا واقعہ انہیں سنا دیا۔

ساری بات سن کر وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں' شکیل کے چہرے پر خوف و دہشت سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں تو زاہد کی پیشانی پر فکر کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔

''اب کیا کریں' کمرے کا دروازہ کیسے کھلے گا' اماں نے کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے' ہم دروازہ توڑ دیں گے۔'' زاہد نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''ہنہہ دروازہ توڑ دیں گے۔'' خالہ نے زاہد کے لہجے کی نقل اتاری۔ ''دروازہ ٹوٹے اس سے پہلے تم خود اچھی طرح ٹوٹ پھوٹ جاؤ گے' ایک ذرا سا دروازہ کھولنے کی کوشش میں دیکھا نہیں کہ کیا حشر ہوا ہے۔''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' زاہد کے لہجے میں شرمندگی گھلی تھی۔

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور اندر سیاہ بلا آمنہ کا خون پینے کے بعد مزے سے بیٹھا اپنا جسم چاٹ چاٹ کر صاف کر رہا تھا اور پھر ایک ہی لمحہ میں وہ غائب ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھل گیا اور گلاب کا سیاہ پھول بالکل تر و تازہ حالت میں ایک بار پھر آمنہ کے تکیے پر نمودار ہو چکا تھا۔

دروازے کی آواز سن کر اندر وہ تینوں باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے' چند لمحوں کی اس گمبھیر خاموشی کو زاہد نے توڑا۔

''میرا خیال ہے کہ آمنہ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے' میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

''ٹھہرو...... '' خالہ نے اسے روکا۔ ''تم اکیلے نہیں جاؤ گے' ہم سب تمہارے ساتھ چلیں گے۔''

''یااللہ میری بچی خیریت سے ہو' یا ربّ العالمین تو رحم فرما' کرم کر دے میرے مالک۔'' اماں بلک بلک کر رونے لگیں۔

''باجی گھبرائیں مت' اللہ ضرور کرم کرے گا' ہم سب آیت الکرسی پڑھتے ہوئے اندر جائیں گے لیکن پہلے اپنے اپنے اوپر آیت الکرسی کا دم کر کے حصار کر لو۔'' خالہ نے کہا تو سب جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھنے لگے پھر اپنے اوپر اچھی طرح دم کر کے وہ محتاط قدموں سے آمنہ کے کمرے کی جانب بڑھے۔ شکیل شدید خوف زدہ تھا اور اماں کے بازو کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔

سب لوگ آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے آمنہ کے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ آمنہ سیدھے ہاتھ پاؤں کیے چت بیڈ پر لیٹی ہے اور اس کی آنکھیں بند ہیں۔

''ہائے میری بچی...... '' اماں نے ایک چیخ ماری اور بھاگ کر آمنہ کے بیڈ کی جانب بھاگی۔

''رک جائیں خالہ...... میں دیکھتا ہوں۔'' زاہد نے اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں پیچھے کیا اور خود بغور آمنہ کا جائزہ لیتا ہوا بیڈ کی جانب بڑھا۔

''آمنہ...... آمنہ...... '' نزدیک جا کر اس نے آمنہ کے سینے پر سانسوں کا زیر و بم محسوس کر کے اسے آوازیں دیں تو اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

''تم ٹھیک تو ہو......؟'' زاہد نے آمنہ کو آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تو خوشی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''ہوں......'' اس نے آہستہ سے جواب دیا اور گردن موڑ کر اماں کی جانب دیکھا تو اماں تیزی سے آگے بڑھیں۔

''تو کیسی ہے میری بچی......''

''کیا ہوا آپ سب اتنے پریشان کیوں ہیں، مجھے ذرا سا بخار ہی تو ہوا تھا اب نہیں ہے لیکن میرے پیروں میں بڑی جلن ہورہی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اماں نے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا لیکن جب آمنہ کے پیروں پر سب کی نگاہ پڑی تو حیرت سے سب کی آنکھیں پھٹ گئیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے چھری لے کر آمنہ کے تلوؤں کی کھال علیحدہ کردی ہو۔

''ہائے اللہ یہ سب کیسے ہوا؟''

''اماں بہت سخت تکلیف ہورہی ہے۔'' آمنہ نے رونا شروع کردیا۔

''تمہیں کچھ یاد ہے کہ کیا ہوا تھا، تم جھولا جھول رہی تھیں؟'' زاہد نے پوچھا

''جھولا...... میں تو...... میں تو آج جھولے پر بیٹھی ہی نہیں۔ مجھے بخار تھا تو میں اپنے کمرے میں ہی تھی۔'' آمنہ نے اپنے پاؤں پکڑ رکھے تھے اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

اچانک اماں کی نگاہ تکیے پر رکھے سیاہ گلاب پر پڑی تو وہ تنتناتی ہوئی آگے بڑھیں اور سیاہ گلاب ہاتھ میں لیتے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں بولیں۔

''یہ سب کچھ اس منحوس سیاہ گلاب کی وجہ سے ہوا ہے، اسے تو میں نے ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا تُو نے پھر اسے اٹھا کر رکھ لیا۔''

''نہیں تو اماں! میں نے اسے ڈسٹ بن سے نہیں اٹھایا یہ تو یہیں رکھا ہے۔'' آمنہ نے کہا۔

''میں اسے باہر پھینک کر آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر جانے لگیں تو زاہد نے ان کے ہاتھ سے سیاہ گلاب لے لیا اور کہا۔

''خالہ جان میں اسے باہر کوڑے دان میں پھینک دوں گا۔''

''کمال کرتی ہیں اماں! بھلا گلاب کا پھول بھی کبھی منحوس ہوا ہے۔'' آمنہ نے کہا۔

''تجھے پتا نہیں کب عقل آئے گی۔'' اماں نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اچھا ساری باتیں چھوڑیں، میرے پاؤں میں سخت تکلیف اور جلن ہورہی ہے، پہلے یہاں کوئی دوا لگائیں۔''

اماں گھر میں رکھی ہوئی کوئی کریم لے آئیں اور اس نے زخموں پر لگانے لگیں، دوا لگنے سے آمنہ کو مزید تکلیف ہونے لگی اور وہ بُری طرح کراہنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا سر بھی پکڑ رہی تھی۔

''اماں سر میں بہت درد ہورہا ہے، کندھوں میں بھی شدید درد ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہاں بہت بھاری وزن رکھا ہے۔''

''میں جانتی ہوں یہ کیوں ہورہا ہے وہ منحوس سیاہ بلا......''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ اچانک سیاہ بلا کہاں سے آگیا۔ آپ کبھی گلاب کو منحوس کہہ رہی ہیں، کبھی سیاہ بلے کا ذکر کررہی ہیں پلیز مجھے بھی تو بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟'' آمنہ نے پریشان ہوکر کہا۔

''کچھ نہیں آمنہ! خالہ جان پریشان ہیں اس لیے ایسی باتیں کررہی ہیں۔'' زاہد نے کہا۔

''نہیں زاہد بھائی! کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، آپ لوگ مجھ سے چھپا رہے ہیں، خالہ کی ناک سوجی ہوئی ہے آپ اور امی بھی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں اور شکیل بھی خوف زدہ دکھائی دے رہا ہے۔ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے، آپ لوگ کہہ رہے ہیں کہ میں جھولے پر بیٹھی تھی لیکن مجھے تو کچھ یاد نہیں ہے اور پھر میرے پیروں پر یہ کیسے زخم آگئے، پلیز مجھے بتائیں درد سے میرا سر ویسے ہی پھٹا جارہا ہے۔'' آمنہ پریشان ہوکر چیخ اٹھی۔

سب نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے سے پوچھا کہ آمنہ کو بتایا جائے یا نہ بتایا جائے تب خالہ بولیں۔

''میرا خیال ہے باجی کہ ہمیں آمنہ کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تاکہ یہ خود احتیاط کرے۔'' تو اماں نے آہستہ سے سر ہلایا اور آہستہ آہستہ ساری بات آمنہ کو بتادی۔

ساری بات سننے کے بعد آمنہ نے خوف اور دہشت

سے بُری طرح رونا شروع کر دیا پھر وہ اماں کے گلے لگ گئی۔

"مجھے چھپالیں اماں! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"میں ہوں ناں' تُو کیوں فکر کرتی ہے میں اپنی جان دے دوں گی تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔" اماں نے زور سے آمنہ کو اپنے سینے میں سموتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

"بڑوں کی بات نہ ماننے کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے' جب خالہ تمہیں منع کرتی تھیں کہ دوپہر میں پھول نہیں توڑتے تو تم نے ان کا کہنا کیوں نہیں مانا۔" زاہد نے تپ کر کہا۔

"میں مانتی ہوں کہ میری غلطی تھی' آئندہ میں امی کی ہر بات مانوں گی۔"

"وعدہ......" زاہد نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

اماں نے رات کا کھانا نہیں بنایا تھا اس لیے خالہ گھر سے کھانا لے آئیں اور سب نے کھانا کھایا اور جاتے ہوئے ہدایت کر گئیں کہ اگر کوئی غیر معمولی بات ہو تو انہیں فوراً بلالیا جائے۔

"اماں آج رات آپ میرے پاس ہی سو جائیں' مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" آمنہ نے اماں سے کہا تو اماں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"اماں کیا میں زاہد بھائی کے ہاں جا کر سو جاؤں' مجھے تو یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے۔" شکیل نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"بے شرم اپنی ماں اور بہن کو پریشانی کے عالم میں تنہا چھوڑ کر جا رہا ہے۔" اماں نے کہا۔

"اس میں بے شرمی کی کیا بات ہے' بچہ ہی تو ہے اسے جانے دیں۔" آمنہ نے کہا پھر بھائی سے بولی۔ "جاؤ تم خالہ کے گھر چلے جاؤ۔" اور شکیل وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

رات کو اماں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور آمنہ کے پاس آ کر لیٹ گئیں' ان کا ارادہ تھا کہ سونے سے پہلے آیت الکرسی کا حصار کریں گی پھر بولیں۔

"ارے میں تسبیح تو کمرے میں بھول آئی' ابھی لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں گئیں بیڈ کے سرہانے سے تسبیح اٹھا رہی تھیں کہ اوندھے منہ بیڈ پر گر پڑیں اور پھر انہیں ہوش نہیں آیا۔

ادھر آمنہ کے کمرے کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا' آمنہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

وہ اماں کو آواز دینا چاہتی تھی مگر اس کی آواز سینے میں گھٹ کے رہ گئی' وہ اپنے بیڈ کے ساتھ ایک زرد آنکھوں والے سیاہ رنگ کے بلے کو دیکھ رہی تھی' جو دیکھتے ہی دیکھتے کسی کتے کی جسامت اختیار کر گیا۔

آمنہ نے بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا' وہ کسی خزاں رسیدہ سوکھے پتے کی مانند لرز رہی تھی۔

"میری شہزادی...... مجھ سے مت ڈرو' آنکھیں کھولو دیکھو میں ہوں تمہارا شہزادہ!" آمنہ کے کانوں میں ایک بھاری مردانہ آواز آئی تو اس نے انگلیوں کی جھرّی بنا کر دیکھا سیاہ بلا اپنے اگلے دونوں پاؤں بیڈ پر رکھے اس کے قریب تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ ہوش وحواس کی دنیا سے بے گانہ ہو چکی تھی پھر مڑی تڑی حالت میں پڑی آمنہ خود بخود سیدھی ہوتی چلی گئی۔ اس کے سیاہ بال سارے تکیے پر بکھر گئے۔

سیاہ بلا پھر بیڈ پر چڑھ گیا' وہ بے تابی کے ساتھ آمنہ کے گرد چکر کاٹ رہا تھا' آج اس کا نشانہ آمنہ کے ہاتھ تھے۔ وہ آمنہ کی ہتھیلیاں اپنی زبان سے چاٹ رہا تھا۔ آج بھی اس نے چاٹ چاٹ کر ہتھیلیوں کی کھال صاف کر دی پھر اس میں سے رسنے والے خون سے وہ اپنی پیاس بجھاتا رہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دیر تک آمنہ کے بالوں سے کھیلتا رہا' آمنہ کے بال بُری طرح اس کے پنجوں کی وجہ سے الجھ گئے تھے۔ جی بھر کر کھیلنے کے بعد وہ آمنہ کے چہرے کی جانب آیا' اب اس کی زبان آمنہ کے رخساروں پر تھی۔

آمنہ نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں' خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی' اس کے چہرے اور ہاتھوں میں شدید جلن

ہو رہی تھی۔

''کک..... کون ہو تم.....؟'' اس نے بند آنکھوں کے ساتھ بمشکل پوچھا۔

''بتایا تو تھا کہ تمہارا شہزادہ ہوں' تم نے کہا تھا ناں کہ ہمیشہ ہم اور تم ساتھ رہیں گے۔'' سیاہ بلا اس کے منہ کے قریب ہو کر بول رہا تھا۔

''نہیں.....'' آمنہ نے نفرت سے کہا۔ ''تم شیطان ہو' مجھے نفرت اور کراہت ہو رہی ہے تم سے۔ تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔''

''خاموش.....'' ایک بھاری آواز گونجی اور آمنہ کو اپنے بال بُری طرح کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے' اس نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنے بالوں کی جانب دیکھا' اس کے بال کسی نے اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور وہ ایسے ہو گئے جیسے کسی نے گوند لگا کر سارے بال جوڑ دیئے ہوں' وہ الجھے ہوئے لوہے کے تاروں کو گچھا دکھائی دے رہے تھے۔

''تم میری ہو اور ہمیشہ میری ہی رہو گی۔ میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا' میں خود تمہارے پاس نہیں آیا تھا بلکہ تم خود میرے پاس آئی تھیں اور مجھ سے روز پھولوں کے تحفے لے کر جاتی تھیں پھر میں خود آ گیا۔''

''مجھے معاف کر دو' مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی۔'' آمنہ کے لبوں سے بمشکل نکلا۔

وہ شدید غصے میں غضبناک انداز میں اسے گھور رہا تھا' اس کی زرد آنکھیں دہکتا ہوا انگارہ بن گئیں' اچانک مسجدوں سے فجر کی اذانیں بلند ہونے لگیں تو وہ اچانک ہی غائب ہو گیا اور سیاہ رنگ کا وہ گلاب جیسے زاہد خود اپنے ہاتھوں سے سڑک کے کنارے بنے سرکاری کوڑے دان میں پھینک کر آیا تھا' آمنہ کے تکیے پر نمودار ہوا۔

آمنہ نے اس گلاب کو ہاتھ میں اٹھانا چاہا لیکن تکلیف کی شدت سے وہ ایسا نہ کر سکی اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کا بھی وہی حشر ہوا تھا جیسا اس کے پیروں کے تلوؤں کا ہوا تھا اس کا شدت سے جی چاہا کہ وہ اس گلاب کی پتی پتی نوچ کر علیحدہ کر کے اور اسے اپنے پیروں سے مسل دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

اچانک کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا اور اماں بوکھلائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''آمنہ..... آمنہ میری بچی..... تُو ٹھیک تو ہے۔ یا اللہ میں کمرے میں جا کر سو گئی' اب آنکھ کھلی ہے' فجر کی اذانیں ہو رہی ہیں۔'' آمنہ نے روتے ہوئے اپنی دونوں ہتھیلیاں اماں کے سامنے کر دیں۔

''ہائے اللہ یہ کیسے ہوا؟ اماں نے سینے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا پھر ان کی نگاہ آمنہ کے بالوں پر پڑی۔

تب آمنہ نے ساری بات اماں کو بتا دی' دونوں ماں بیٹی گلے مل کر رو رہی تھیں۔

''اماں جب اذانیں شروع ہوئیں تو وہ غائب ہو گیا اور یہ منحوس گلاب یہاں آ گیا۔'' آمنہ نے بتایا۔

''ارے یہ کیسے آ گیا اسے زاہد.....'' اماں نے حیرت سے کہا پھر خود ہی بولیں۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ اسے یہیں بھول گیا ہو۔''

اور پھر تین چار دنوں ہی میں آمنہ کا وہ حشر ہوا کہ کلیجہ منہ کو آنے لگتا' نہ صرف اس کے ہاتھ پاؤں بلکہ اس کے سارے جسم کا یہی حال ہوا' چہرے پر بھی جگہ جگہ ایسے ہی نشان پڑ گئے تھے۔ اس کی شکل انتہائی بھیانک ہو گئی اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اس کی سرخ وسفید رنگت سیاہ ہوتی جا رہی تھی' سر کے بال جو لوہے کے تاروں کی مانند ایک دوسرے میں الجھے ہوئے تھے۔ اماں نے انہیں کاٹ دیا تھا اب صرف آمنہ کے سر پر بہت تھوڑے سے بال رہ گئے تھے جن کی لمبائی ایک انچ تھی وہ بھی سر پر کھڑے رہتے تھے۔

دن بہ دن وہ موت کے منہ میں جا رہی تھی' نہ چل پھر سکتا تھا نہ اپنے ہاتھ سے کچھ کر سکتی تھی۔ زاہد ان دنوں کسی اچھے عامل کی تلاش میں تھا' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سے رجوع کرے کیوں کہ جعلی عامل تو یہاں قدم قدم پر بکھرے ہوئے تھے ان لوگوں نے عام لوگوں سے آمنہ کا یہ حال چھپایا ہوا تھا۔

اب وہ بلا مکمل طور پر آمنہ کے جسم میں داخل ہو چکا تھا' آمنہ کسی سے بھی بات نہیں کرتی تھی اگر بات کرتی تو بھاری مردانہ آواز میں کہتی۔

"جاؤ میرے پاس سے...... سب چلے جاؤ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

اس روز زاہد کو کسی نے ایک عامل کا پتا بتایا تو وہ بائیک پر بیٹھ کر وہاں جا رہا تھا کہ راستے میں اسے اس کا دوست شعیب مل گیا۔

"کیا بات ہے یار تُو کئی دنوں سے کالج نہیں آ رہا ہے' پریشان بھی لگ رہا ہے۔ گھر میں خالہ تو ٹھیک ہیں؟"

زاہد سوچنے لگا کہ شعیب سے اس بات کا ذکر کرے یا نہ کرے اس لیے خاموش رہا اس کی خاموشی کو محسوس کر کے شعیب نے پھر پوچھا اور کہا۔

"اگر کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتا تو میں ضد نہیں کروں گا لیکن ہو سکتا ہے کہ اگر تم بتا دو تو میں تمہارے کسی کام آ جاؤں۔" تب زاہد نے اپنے پُرخلوص دوست شعیب کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ کیا وہ کسی ایسے عامل کو جانتا ہے جو صحیح معنوں میں علم رکھتا ہو۔ شعیب نے خاموشی سے ساری بات سنی اور پھر بولا۔

"میں کسی عامل کو تو نہیں جانتا البتہ میرے دادا جان ایسی باتوں کا علم رکھتے ہیں اگر تم مناسب سمجھو تو میں دادا جان کو آمنہ کے گھر لے کر آ جاؤں' وہ عام لوگوں میں مشہور نہیں لیکن علم رکھتے ہیں۔ اس طرح کا علاج انہوں نے میری خالہ جان کا کیا تھا' ان پر بھی کوئی جن عاشق ہو گیا تھا۔"

"کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو اگر ایسا ہے تو اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' تم جاؤ میں تھوڑی دیر میں دادا جان کو آمنہ کے گھر لے کر آتا ہوں۔" شعیب نے زاہد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی تو زاہد نے اپنی بائیک گھر کی جانب موڑ لی۔

وہ سیدھا آمنہ کے گھر گیا اور اماں کو اس بارے میں بتایا حالاں کہ وہ بہت آہستہ اور دھیمی آواز میں دوسرے کمرے میں اماں سے بات کر رہا تھا لیکن دوسرے کمرے میں موجود آمنہ کے اندر وہ بولنے لگا۔

"اگر کوئی اس گھر میں آیا تو میں ایک ایک کی جان لے لوں گا۔ مجھے آمنہ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

زاہد بناء کچھ کہے خاموشی سے گھر سے نکل گیا' وہ شام ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا' اماں بھی پریشان بیٹھی تھیں۔ آمنہ کے کمرے کا دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا تھا' وہ سوچ رہی تھیں کہ یہ بند دروازہ کس طرح کھلے گا اور شعیب کے دادا جان کس طرح سے آمنہ کو دیکھیں گے۔

عصر کی نماز کے بعد شعیب اپنی کار میں دادا جان کو لے کر زاہد کے گھر پہنچا ادھر آمنہ نے کمرے کی ایک ایک چیز اٹھا اٹھا کر پھینکنی شروع کر دی' وہ بُری طرح چیخ رہی تھی۔

زاہد شعیب اور دادا جان کو لے کر آمنہ کے گھر پہنچا' اماں بُری طرح رو رہی تھیں۔ دادا جان نے اماں کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی اور کہا۔

"الرحمٰن سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں ہے' وہ ہر شے پر قادر ہے۔ تمام مخلوقات اسی کے تابع ہیں' تم فکر نہ کرو اللہ سب ٹھیک کر دے گا' تم مجھے بچی کے پاس لے چلو۔"

"اس کے کمرے کا دروازہ بند ہے اور اسے کوئی نہیں کھول سکتا۔" اماں نے بے بسی سے کہا۔

"اچھا دروازہ بند ہے...... ہم ابھی کھلوا لیتے ہیں۔" دادا جان نے ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا پھر زاہد کی جانب استفساری نگاہوں سے دیکھا گویا وہ پوچھ رہے تھے۔ "کدھر ہے وہ نہ کھلنے والا بند دروازہ۔"

ان کی نگاہوں میں چھپا پوشیدہ سوال محسوس کر کے زاہد نے کہا۔ "آیئے میرے ساتھ چلیے۔" چند ہی لمحوں کے بعد وہ آمنہ کے کمرے کے دروازے پر موجود تھے اب اندر کمرے میں مکمل خاموشی تھی آمنہ کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔

دادا جان زیرِ لب کچھ پڑھتے رہے اور آہستہ سے بولے۔

''اس دروازے کو کھولو......''

دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا تو دادا جان پھر قرآنی آیات پڑھتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے' ان کے پیچھے پیچھے زاہد اور شعیب تھے آخر میں اماں تھیں۔

دادا جان نے کمرے میں داخل ہو کر سب کو اندر آنے سے روک دیا اور کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر باآواز بلند اذان کہنی شروع کی۔

''چپ ہو جا بڈھے...... ورنہ میں تجھ جان سے مار دوں گا۔''

لیکن دادا جان خاموش نہیں ہوئے انہوں نے اطمینان سے تین مرتبہ باآواز بلند پوری اذان کہی پھر مصلیٰ لانے کا اشارہ کیا زاہد نے جلدی سے انہیں مصلیٰ لا کر دیا۔ وہ مصلیٰ بچھا کر اس پر بیٹھ گئے اور قرآنی آیتوں کا ورد کرنے لگے اس دوران آمنہ مردانہ آواز میں چیختی چلاتی رہی۔

تقریباً پندرہ منٹ دادا جان کو پڑھنے میں لگے پھر کچھ دیر وہ مراقبے کی سی کیفیت میں رہے پھر مصلے سے اٹھ کر آمنہ کی جانب بڑھے۔ آمنہ بیڈ پر پڑی بڑی اذیت ناک آوازیں نکال رہی تھی' اس کا سارا جسم لکڑی کی مانند اکڑا ہوا تھا۔

دادا جان نے پہلے تو تکیے پر رکھا ہوا سیاہ گلاب اٹھا کر اپنی مٹھی میں بند کر لیا' پھر آمنہ کی پیشانی سے بالوں کی ایک لٹ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لی۔ جیسے ہی دادا جان نے یہ عمل کیا آمنہ بُری طرح تڑپنے لگی' اس کے حلق سے بڑی بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں پھر وہ اذیت ناک آواز میں بولی۔

''مجھے چھوڑ دے ورنہ میں اس گھر کے ایک ایک فرد کو ختم کر دوں گا۔''

''تُو اب میرے قبضے میں ہے میں تجھے چھوڑوں گا تو تُو کچھ کرنے کے قابل رہے گا۔'' دادا جان نے دبنگ لہجے کہا۔

''میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟'' وہ درد میں ڈوبی آواز میں بولا۔

''میرا تو تُو کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتا لیکن اس بچی کا کیا قصور تھا جو تم نے اسے اتنی اذیت دی ہے۔ اس کا جیتا جاگتا وجود تُو نے زندہ لاش میں تبدیل کر دیا ہے' یہ مرنے کے قریب ہو گئی ہے۔ تُو اسے چھوڑ کر دور چلا جا' میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے چھوڑ دوں گا لیکن اس سے پہلے تجھے بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ آئندہ تُو اس کے قریب بھی نہیں آئے گا۔'' دادا جان نے کہا۔

''نہیں...... میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اس وقت تک جب تک اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے' جب قطرہ قطرہ کر کے اس کا خون مجھے مل جائے گا تب میں اپنی اصل طاقت حاصل کر لوں گا۔ مجھے ایک بدذات ہندو پنڈت نے قبضے میں کرنے کے لیے عمل پڑھا تھا' اس کا عمل تھوڑا ہی سا باقی تھا کہ اس سے ایک غلطی ہو گئی اس لیے اس کا عمل بے کار ہو گیا۔ میں تو آزاد ہو گیا لیکن میری اصل طاقت ختم ہو گئی' اب اس کا خون ہی میری طاقت ہے۔ ایک جوان' کنواری اور مسلمان لڑکی کا خون......'' اس نے کہا۔

''اگر تُو اسے نہیں چھوڑے گا تو میں تجھے جلا کر خاک کر دوں گا۔'' دادا جان نے کڑک لہجے میں کہا۔

''اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تب بھی یہ صحت یاب نہیں ہو سکے گی' کسی ڈاکٹر اور حکیم کے پاس اس کا علاج نہیں ہے۔ اسے تو ویسے بھی مرنا ہے اس کے علاوہ مجھے پھر نئے سرے سے کسی اور جوان کنواری اور مسلمان لڑکی کو تلاش کرنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''تُو ایسا نہیں کر سکے گا خبیث......!'' دادا جان زور سے چیخے اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی زور سے بھینچ لی تو آمنہ پھر بُری طرح تڑپنے لگی۔ اس کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے' آنکھیں جو سیاہ حلقوم میں دھنس گئی تھیں۔ سرخ انگارہ ہو کر باہر کو ابل پڑیں' ناک ٹیڑھی ہو کر آگے کو جھک گئی اور ہونٹ بگڑ کر دائیں جانب ہو گئے' ہاتھوں کی انگلیاں پھیل کر اور اکڑ کر پنجے کی شکل

اختیار کر گئی تھیں۔

پھر دادا جان بائیں ہاتھ میں رکھے سیاہ گلاب کو مسلتے رہے اور ساتھ ساتھ پڑھتے بھی جا رہے تھے' ان کے ہونٹ بہت تیزی سے ہل رہے تھے اس دوران آمنہ کی شکل بالکل تبدیل ہوگئی۔ اس کی آنکھوں' ناک اور منہ سے سیاہ رنگ کا بدبودار مادہ بہنے لگا۔ اس کا جسم مزید اکڑتا جا رہا تھا اور حلق سے ذبح ہونے والے بکرے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

آہستہ آہستہ اس کا اکڑا ہوا جسم ڈھیلا ہونا شروع ہوگیا' چہرے کے نقوش اپنی جگہ واپس آ گئے وہ کسی مردے کی طرح بیڈ پر پڑی تھی۔ دادا جان نے پانی مانگا اب انہوں نے اس کے بال چھوڑ دیئے تھے' کچھ پڑھ کر پانی پر دم کیا اور اس کے اوپر چھڑکتے رہے' آہستہ آہستہ آمنہ نے آنکھیں کھول دیں اور بہت نحیف آواز میں پکارا۔

''اماں......''

دادا جان کے اشارے پر اماں اس کے پاس گئیں اس کے کپڑے اور بستر اس سیاہ مادے کی وجہ سے' جو آمنہ کے جسم سے نکلا تھا' گندے ہوگئے تھے اور اس میں سے شدید بدبو آ رہی تھی لیکن ممتا کی ماری اماں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور اس کے دوپٹے سے اس کا سارا چہرہ صاف کیا اور اسے پیار سے چمکارا۔

وہ حیرت سے دادا جان کو دیکھ رہی تھی اس نے ان کے بارے میں پوچھا تو اماں نے مختصراً اسے بتا دیا۔

''وہ چلا گیا اماں؟'' آمنہ نے کمزور لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بیٹی اس کا وجود ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے' تم فکر نہ کرو۔ اب وہ تمہیں کبھی تنگ نہیں کرے گا۔'' دادا جان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر بولے۔

''مجھے آپ لوگوں سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں لیکن اس سے پہلے جو ضروری کام ہیں وہ کرلیں' میں کل پھر آؤں گا۔'' انہوں نے ہدایت دی کہ وہ اپنا پانی دم کر کے دیں گے' وہ غسل کے پانی میں شامل کر کے آمنہ کو غسل کروایا جائے اس کا یہ لباس اور بستر کی چادر اور تکیے کا غلاف باہر کوڑے کے ڈھیر پر رکھ کر جلا دیا جائے۔ وہ خبیث ٹھیک کہہ رہا تھا کہ آمنہ کے زخموں کا علاج کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس نہیں ہے بلکہ میرے پاس ہے' مجھے زیتون کا تیل دیا جائے اور ایک سلور یا اسٹیل کی پلیٹ دی جائے ساتھ میں ماچس بھی۔

دادا جان کی ہدایت پر انہیں پلیٹ اور ماچس دے دی گئی' دادا جان نے تب اپنی مٹھی کھولی تو ان کے ہاتھ میں سیاہ گلاب کی جگہ ایک چھپکلی نما چھوٹا سا جانور مردہ حالت میں تھا۔ دادا جان نے اسے پلیٹ میں رکھا اور ماچس کی تیلی جلا کر اس میں آگ لگا دی' ساتھ ہی وہ زیرلب کچھ پڑھتے بھی جا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ جل کر سیاہ راکھ میں تبدیل ہوگیا تب دادا جان نے ایک کاغذ میں وہ راکھ سمیٹ لی اور کہا۔

''میں جو تیل پڑھ کر دوں گا اس میں یہ راکھ ملا کر اس کے زخموں پر لگاتی رہنا' سارے زخم ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ باقی کا تیل اس کے سر میں لگا دینا' بال اپنی گزشتہ حالت میں آ جائیں گے اس کے علاوہ کل عصر کے بعد میں آؤں گا تو اس کے لیے پینے کا پانی دم کر کے لیتا آؤں گا ان شاءاللہ بچی ٹھیک ہو جائے گی۔''

اس دوران مغرب کی اذان ہو چکی تھی اس لیے ساری ہدایت دینے کے بعد دادا جان چلے گئے' دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے۔

اماں نے آمنہ کو کسی بچی کی مانند گود میں اٹھا لیا اور اسے غسل خانے میں لے گئیں وہاں اسے دم کے پانی سے غسل دیا اور اس کے کپڑے اور بستر کی چادر وغیرہ اتار کر زاہد کے حوالے کر دیں کہ وہ انہیں کوڑے دان میں جا کر جلا دے۔

دادا جان نے آمنہ کو ایک بہت بُری بلا سے نجات دلائی تھی' وہ حقیقت میں ایک بڑے عامل تھے لیکن عام لوگوں کو ان کی اس صلاحیت کا علم نہیں تھا صرف جو لوگ

انہیں جانتے تھے وہی ان سے استفادہ حاصل کرلیتے تھے۔ان کے دم کیے پانی سے غسل کرنے کے بعد آمنہ کی حالت کافی بہتر تھی اماں نے سیاہ گلاب کی راکھ تیل میں ملا کر اس کے جسم کے تمام زخموں پر لگائی تو فوری طور پر اسے فائدہ ہوا کہ ان زخموں میں ہونے والی شدید جلن اور تکلیف سے اسے نجات مل گئی۔اس نے ہلکی نرم غذا بھی لی اب وہ اپنے پورے ہوش وحواس میں تھی۔اس نے ضد کر کے آئینہ منگوایا اور اپنی شکل دیکھ کر دیر تک روتی رہی اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ اس کی شکل ہے کہاں گئے اس کے سیاہ گھنے ریشمی اور لمبے بال۔ چہرے کی سرخ وسفید رنگت جو بڑی بڑی آنکھوں میں جلتے ہوئے قمقمے......سب کچھ کھو گیا اور یہ سب نتیجہ تھا اپنے حسن پر غرور وتکبر کا۔اسے کالی رنگت سے نفرت تھی دبلے لوگوں کو وہ دیکھ کر کراہیت سے منہ پھیر لیتی تھی اور بڑوں کی نصیحت کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا ڈالتی تھی۔

اماں نے اسے بتایا کہ زاہد نے اس مصیبت کے موقع پر ان کا کتنا ساتھ دیا ہے پورے ایک ماہ میں اس نے کالج کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ کتنے عاملوں سے رابطے کیے ان کی منہ مانگی رقم اپنے پاس سے ان کے حوالے کی۔ وہ دن رات ان کے لیے پریشان رہا صرف اس لیے کہ وہ آمنہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

محلے بھر میں رانی کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ اس پر آسیب کا سایہ ہے اس کی تمام سہیلیوں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا تھا سب سے بڑے افسوس اور دکھ کی بات یہ تھی کہ رانی ایک مرتبہ بھی اس کے پاس نہیں آئی تھی۔ اس نے سنجیدگی سے سوچا کہ حقیقی دوست صرف وہی ہوتا ہے جو مصیبت میں اس کا ساتھ نہ چھوڑے اور اس کے کام آئے۔

اماں نے کہا کہ حنیفہ (زاہد کی والدہ) اور زاہد کی خواہش تھی کہ وہ تمہیں اپنی بہو بنائے لیکن اب......اب صورت حال بدل گئی ہے پتا نہیں اب ان کا کیا فیصلہ ہوگا۔

انمول موتی

علم آدمی کے لیے اس کی تنہائی کا ساتھی ہے۔ پردیس میں اس کا دوست ہے۔خوشی اور غم میں اس کا رہنما ہے۔ یہ ایسا ہتھیار ہے جسے وہ دشمن کے خلاف استعمال کر سکتا ہے اور ایسی زینت ہے جس کی دوستوں میں نمائش کر سکتا ہے۔

(انیلا شاہین......حجرہ شاہ مقیم)

حج

حج ادا کرنے گیا تھا قوم کا لیڈر کوئی\
سنگباری کے لیے شیطان تک جانا پڑا\
ایک کنکر پھینکنے پر یہ ندا آئی اسے\
تم تو اپنے آدمی تھے تم کو آخر کیا ہوا

(فوزیہ سحر کائنات......کراچی)

"اماں آپ ایسی بات مت سوچیں زاہد بھائی بہت اچھے انسان ہیں اور ان کی کسی بہت ہی اچھی لڑکی سے شادی ہونی چاہیے۔ میں اب ان کے قابل نہیں ہوں بلکہ جب تک میری سانسیں چل رہی ہیں ان کی مشکور رہوں گی۔آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ کبھی بھی خالہ کو ان کی پرانی خواہش یاد نہیں دلائیں گی۔" آمنہ نے گلوگیر لہجے میں کہا تو اماں رونے لگیں۔

اس ایک ماہ میں سب کچھ بدل گیا تھا وہ تو یہ سب خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھیں لیکن جو کچھ ہوا وہ خواب نہیں ایک تلخ حقیقت تھی۔وہ نہیں ہوتا جو انسان چاہتا ہے بلکہ وہ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "میں نے اللہ کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔"

دوسرے دن عصر کی نماز کے بعد دادا جان خود ہی آگئے آج شعیب ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑی پانی کی بوتل لائے تھے جو دم کی ہوئی تھی۔ یہ پانی اسے پورے چالیس دن پینا تھا انہوں نے آمنہ پر بھی دم کیا پھر اماں کو آمنہ کے قریب بٹھایا اور بولے۔

"مجھے تم دونوں سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔"
آمنہ سے مخاطب ہوکر پوچھا۔ "بیٹی تم ناپاکی کی حالت میں تھیں؟" تو آمنہ نے اثبات میں سر ہلا کر سر جھکالیا پھر دادا جان نے اماں سے پوچھا۔ "بیٹی کیا تمہارے گھر میں قرآن پاک کی تلاوت ہوتی ہے اور کیا تم سب گھر والے نماز کے پابند ہو؟" پھر خود ہی جواب دیا "یقیناً ایسا نہیں ہے۔" پھر دوسرا سوال کیا "کیا تم دونوں پردہ کرتی ہو؟ اس کا جواب بھی یقیناً انکار ہی ہوگا۔"

آمنہ اور اماں نے شرمندگی سے سر جھکالیا تو دادا جان بولے۔

"بیٹا! اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں افضل ترین مخلوق انسان ہی ہے اور انسان کو یہ برتری اور فضیلت علم کی بنا پر ہوئی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے دنیا کے دیگر تمام علوم سے افضل ترین علم "العلم" قرآن کی صورت میں امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا۔ وہ قرآن جو کسی پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا لیکن ہم انسان امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کتنے احمق ہیں بے وقوف اور ناقدرے ہیں اس قرآن کو صرف کسی کے مرنے پر اس کی بخشش کے لیے یا کبھی کبھار گھر میں خیر و برکت کے لیے لوگوں کو اکٹھا کر کے ختم قرآن کروا دیتے ہیں جب کہ اس کے نزول کے اصل مقصد کو فراموش کر دیتے ہیں۔ قرآن ایک دستور ہے ایک ضابطہ حیات ہے، زندگی گزارنے کے اصول وضوابط پر مشتمل اللہ کے احکامات کا مجموعہ ہے۔"

ہمارے بیٹے اور بیٹیاں نہ خود قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور نہ اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ انسان کے ساتھ شیطان کو بھی اللہ نے دنیا میں اتارا، قرآن شیطان کو "عدو مبین" کہتا ہے۔ جب ہم ناپاکی کی حالت میں باہر نکلتے ہیں تو شیاطین کے لیے آسان شکار بن جاتے ہیں۔

بیٹا! اگر آپ شیطان کی شیطانیت سے ہر لحاظ سے بچنا چاہتی ہو تو تمہیں قرآن کا سہارا تھامنا ہوگا۔ ہمارے معاشرے میں ماشاء اللہ بہت سی خواتین قرآن کی عالمہ ہیں، آپ ان سے قرآن کا علم حاصل کریں۔ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور خاص طور پر مسلمان خواتین کی پہچان اپنے چہرے کو حجاب سے چھپائیں تاکہ جب بھی آپ گھر سے نکلیں تو آپ کے ساتھ اللہ کی رحمت ہو، شیطان نہ ہو۔

آج تم لوگ مجھ سے وعدہ کرو کہ نماز کی پابندی کروگی۔ قرآن کی تلاوت کو اپنا معمول بنالوگی اور کسی بھی نامحرم کے سائے سے بھی بچوگی۔ میری دعا ہے ہمیشہ اللہ کی رحمت تمہاری حامی اور مددگار رہو۔"

اس دن کے بعد سے آمنہ اور اماں نے اللہ سے سچی توبہ کا عہد کیا کہ وہ دادا جان کی ہر ہدایت پر سختی سے عمل کریں گی۔

آمنہ اب زاہد کے سامنے بھی نہیں آتی تھی، وہ تیزی سے رو بصحت ہو رہی تھی، واقعی اللہ نے اس کی توبہ قبول کرلی تھی۔ اس کا کھویا ہوا حسن دوبارہ لوٹ آیا تھا۔

اس دن وہ عصر کی نماز پڑھ کر اٹھی، جائے نماز طے کر رہی تھی کہ آئینے کی جانب نگاہ اٹھ گئی وہ ایک سال پہلے والی آمنہ کو دیکھ رہی تھی "اللہ تیرا شکر ہے" کہتے ہی دو ندامت کے آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک پڑے۔

تب ہی اماں اور خالہ ایک ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں، دونوں کے چہرے خوشی سے جگمگا رہے تھے۔ خالہ کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی اور اس میں گلاب جامن رکھے تھے، خالہ نے ایک گلاب جامن آمنہ کے منہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آج تمہاری اور زاہد کی بات پکی ہوگئی ہے، مبارک ہو۔" اور آمنہ نے شرما کر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا۔

انجانا خوف

محمد اعظم خان

گو یہ تحریر صرف ایک کہانی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس کے باوجود یہ تحریر آج ہمارے ہر شہر' ہر گاؤں اور ہر دیہات کے گلی کوچوں میں کھیلے جانے والے ڈرامے کی روداد ہے' جہاں قانون کے رکھوالے اپنے سیاسی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے بے گناہوں کو دہشت گرد قرار دے کر ہلاک کرکے اپنے اس ظالمانہ فعل کو مقابلہ قرار دے دیتے ہیں۔

ترقی اور انعام کے لالچ میں معصوم جانوں سے کھیلنے والے انسان نما درندوں کی روداد۔

علم کی روشنی کے تعاقب میں بھٹکنے والی روحوں کا فسانہ۔

وہ دونوں ایف۔ ایس۔ سی۔ کے سٹوڈنٹ تھے اور کالج کے ہاسٹل میں بھی ایک ہی کمرے میں رہتے تھے، وہ گرمیوں کی تعطیلات گزارنے کے بعد بس میں ایک ہی سیٹ پر بیٹھے پھر سے اسی دنیا کی طرف لوٹ رہے تھے، جہاں اگلے روز سے کلاسز کا آغاز ہونے جا رہا تھا، جہاں پڑھائی کے ساتھ ساتھ خوب موج مستی تھی، دوستیاں تھیں، ہر پل ایک نیا ہنگامہ تھا اور خوابوں سے سجی خوبصورت دنیا آباد تھی، جہاں وہ اپنی مرضی کے خود مالک تھے، اسی لیے پڑھائی سے زیادہ انہیں اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ ایک طویل وقفے کے بعد دوستوں سے ملاقات ہونے جا رہی تھی۔

شام ڈھل چکی تھی، رات کا اندھیرا دن کے اجالے پر غالب آنے لگا تھا، جب بس ان دونوں کو کالج کے قریب ہی اتار کر آگے بڑھ گئی تھی، عارف اور اعجاز اپنے اپنے کاندھوں پر کتابوں اور ضروری اشیاء سے بھرے بیگ لٹکائے، بات بات پر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنستے مسکراتے آگے بڑھ رہے تھے، جب کسی نے ان دونوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیا، ان دونوں نے ہی خوف اور حیرانی کے عالم میں ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا، جہاں ان کا روم میٹ، صداقت چہرے پر مسکراہٹ سجائے، بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔

''تم نے تو جان ہی نکال دی تھی......'' عارف نے صداقت کے گلے لگتے ہوئے پیار سے شکوہ کیا تھا۔

''مگر جان نکلی تو نہیں ناں؟'' صداقت نے عارف کو مزید چڑانے کے لیے کہا تھا اور ساتھ ہی اعجاز کو بھی بانہوں میں بھر کر زور سے بھینچ لیا تھا۔

''سچ پوچھو تو ایک لمحے کے لیے میں بھی ڈر گیا تھا لیکن تمہیں سامنے دیکھ کر کچھ حوصلہ ہو گیا'' اعجاز نے بھی اپنی دلی کیفیت بیان کر ڈالی تھی۔

''چلو اسی بہانے یہ بات تو سامنے آئی کہ تم دونوں ہی کتنے ڈرپوک ہو'' صداقت نے ہنستے ہوئے بات کی تھی۔

''اور جتنے تم بہادر ہو، وہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ کمرے میں کوئی چوہا بھی دیکھ لو تو تب تک تمہارے پاؤں بیڈ سے زمین پر نہیں لگتے، جب تک تمہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ چوہا کمرے سے نکل گیا ہے۔'' اعجاز نے فوراً جواب دیا تھا۔

ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کرتے ہوئے باتوں باتوں میں ہی وہ کالج کے گیٹ پر پہنچ گئے تھے، کالج کی عمارت میں ہی ہاسٹل تھا، اب تک ان کی نگاہ کالج کی عمارت کی طرف نہیں اٹھی تھی، گیٹ بند تھا اور اس پر اندر

کی طرف ایک بڑا سا تالہ لٹکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، گیٹ کے پاس ہی کالج کا چوکیدار، مہربان خان کرسی پر بیٹھا تھا، جس نے اپنی بندوق کرسی کے ساتھ کھڑی کر رکھی تھی اور منہ میں نسوار ڈالے بائیں ہاتھ سے ریڈیو پکڑ کر اپنے کان کو لگا رکھا تھا، جس پر پشتو گانے چل رہے تھے اور اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا، وہ تینوں کچھ دیر تک اس انتظار میں کھڑے رہے کہ مہربان خان اٹھ کر ان کے لیے دروازہ کھول دے گا۔

''مہربان خان! گیٹ تو کھولو، ہمیں اندر آنا ہے۔'' کچھ دیر انتظار کے بعد صداقت نے چوکیدار کو آواز دی تھی۔

''گیٹ نہیں کھل سکتا۔'' مہربان خان نے اپنی جگہ پر بیٹھے جواب دیا تھا۔

''لیکن کیوں؟'' مہربان خان کے جواب پر صداقت نے حیران ہو کر دریافت کیا تھا۔

مہربان خان نے جب بات بنتی نہ دیکھی تو اسے مجبوراً اٹھ کر ان کے قریب آنا پڑا تھا، اس کے قریب آتے ہی نسوار کا ایک تیز بھبکا کا مہربان خان کی سانسوں سے نکل کر ان کے نتھنوں میں گھس گیا تھا، جس کی وجہ سے ان تینوں نے ہی اپنا اپنا دایاں ہاتھ اپنے ناک اور منہ پر رکھ لیا تھا، پھر اس بات سے بچنے کے لیے کہ کہیں مہربان خان ان کی اس حرکت سے شرمندہ ہی نہ ہو جائے، فوری طور پر اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹا لیے تھے مگر پھر کمال ہوشیاری سے احتیاطاً دو دو قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔

''تم کو اطلاع نہیں ملی کیا؟'' ان کے کسی سوال کا جواب دینے کی بجائے مہربان خان نے الٹا سوال کر ڈالا تھا۔

''کیسی اطلاع؟'' مہربان خان کی بات پر حیران ہو کر ان تینوں نے ایک ساتھ دریافت کیا تھا۔

''دو روز قبل دہشت گردوں نے یہاں ایک ساتھ کئی بم دھماکے کیے، جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ مارے گئے اور کچھ زخمی بھی ہوئے، اس لیے تمام اسکول اور کالج مزید پندرہ روز تک بند رہیں گے۔''

''لیکن ہمیں تو ایسی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔'' اعجاز نے قدرے خفگی سے بات کی تھی۔

''کالج والوں نے تو موبائل میسیج کے ذریعے کل صبح ہی سب کو خبر کر دی تھی۔ اب تم لوگوں کو پیغام نہیں ملا تو یہ الگ بات ہے۔'' مہربان خان نے تسلی سے جواب دیا تھا۔

''ہمیں پیغام ملا ہوتا تو ہم بھلا کیوں آتے۔'' عارف نے مسکین سی شکل بنا کر کہا تھا۔

''میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' مہربان خان نے بے رخی سے بات کی تھی۔

''مگر تم ہمیں اندر تو آنے دو، ہم رات یہاں گزار کر کل صبح ہی اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔'' اس بار صداقت بولا تھا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتا' کالج والوں نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ دن میں تمہاری طرح کچھ اور طالب علم بھی آئے تھے، لیکن میرے سمجھانے پر وہ واپس چلے گئے تھے۔ اس لیے تم لوگ بھی جاؤ۔''

''لیکن ہم اس وقت کہاں جائیں؟'' صداقت نے معصومیت سے دریافت کیا تھا۔

''یہ سوچنا میرا کام نہیں تمہارا ہے، جیسے جا سکتے ہو جاؤ مگر مجھے تنگ مت کرو۔'' اس بار مہربان خان نے قدرے سخت لہجے میں بات کی تھی اور بات کرتے ہی پھر سے اپنی سیٹ پر جا بیٹھا تھا۔

مہربان خان کے رویے سے وہ جان گئے تھے کہ وہ کسی بھی صورت میں راضی نہیں ہوگا، اس لیے گیٹ سے ہٹ گئے تھے۔

تعلیم کے میدان میں اس کالج کا نام نیا نہیں تھا،

اس کالج سے کامیاب ہوکر ہر سال سیکڑوں طالب علم میڈیکل کالجوں، انجینئرنگ یونیورسٹیوں اور ملک کی دیگر بہترین یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوتے تھے، لیکن جہاں کالج کی عمارت تعمیر کی گئی تھی وہاں شام کے بعد گاڑیوں کی آمدورفت بند ہو کر رہ جاتی تھی، عام حالات میں تو پھر بھی کسی نہ کسی طرح کوئی ٹرانسپورٹ میسر آ ہی جاتی تھی، لیکن وہاں ہونے والے بم دھماکوں نے شام ہوتے ہی لوگوں کو اپنے اپنے گھروں میں قید ہو کر بیٹھنے پر مجبور کر ڈالا تھا، اسی دہشت گردی کی وجہ سے پولیس نے جگہ جگہ ناکے لگا لیے تھے، جہاں سے کسی بھی عام شہری کا گزرنا انتہائی مشکل ہو گیا تھا۔

وہ مہربان خان سے مایوس ہو کر کالج کی عمارت سے چند قدم دور جا کھڑے ہوئے تھے، وہاں چاروں طرف پھیلا ہوا اندھیرا دیکھ کر ان کے بدن میں خوف و دہشت کی لہر سرائیت کر گئی تھی، وہاں دور دور تک پھیلا ہوا سناٹا ان کی جان لینے کے لیے کافی تھا، ایسے میں ان کا وہاں سے پیدل چل پڑنا بھی کسی خطرے کو دعوت دینے کے مترادف تھا، اسی لیے وہ بے یار و مددگار کھڑے بے بسی کی زندہ مثال دکھائی دے رہے تھے، عجب ہو کا عالم تھا، کوئی انسانی آواز تک ان کے کانوں کے پردوں سے نہیں ٹکرا رہی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ انسانوں کی بستی میں نہیں کسی قبرستان میں آ کھڑے ہوئے تھے۔

کچھ دیر اسی کیفیت میں وہیں کھڑے گزر گئی تھی، وہاں کھڑے اچانک ان کی نظر مہربان خان پر پڑی تھی، جو ڈیوٹی ختم کر کے اپنے کوارٹر میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا، اب ان تینوں کی نگاہیں اس پر جم گئی تھیں، جیسے ہی مہربان خان اپنے کوارٹر کی طرف بڑھا، ان تینوں نے ایک ساتھ اس پہلو پر غور کرنا شروع کر دیا تھا کہ کوئی اور خطرہ مول لینے سے بہتر ہے کہ وہ دیوار پھلانگ کر کالج کے اندر کسی کمرے میں جا بیٹھیں اور جیسے تیسے رات گزار لیں۔

❁ ❁ ❁

مہربان خان نے عادت بنا رکھی تھی کہ سردی ہو یا گرمی وہ ہمیشہ مغرب کی نماز کے فوراً بعد رات کا کھانا کھا لیا کرتا تھا، آج ان تینوں سے بحث و تکرار کی وجہ سے وہ اپنے کوارٹر میں کچھ تاخیر سے پہنچا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آج تم نے آنے میں کافی دیر کر دی۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" کوارٹر میں داخل ہوتے ہی مہربان خان کی بیوی، یاسمین نے پریشانی کے عالم میں اس کے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا تھا۔

"ایسی پریشانی کی کوئی بات نہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے کالج کے تین بچے آئے تھے، جو ادھر ہاسٹل میں ہی رہتے ہیں، کہہ رہے تھے انہیں کالج کے بند ہونے کی اطلاع نہیں ملی تھی، اس لیے آ گئے ہیں۔ ہمیں رات یہیں گزار لینے دو، صبح ہوتے ہی ہم اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے......"

"تو تم نے کیا کیا؟"

"وہ بہت منت سماجت کر رہے تھے کہ ہم رات کو یہاں سے کیسے جائیں گے لیکن میں نے بھی ان کی ایک نہیں سنی اور ان سے کہہ دیا کہ یہ کام ان کے سوچنے کا ہے میرا نہیں۔ میں کسی بھی صورت میں انہیں گیٹ کے اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" مہربان خان نے فخریہ انداز میں اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بتایا تھا۔

"اسی لیے تو خدا نے تمہیں اولاد نہیں دی کیونکہ جسے دوسروں کے بچوں کا احساس نہیں۔ وہ اپنے بچوں کا بھی کیا خیال کرے گا۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں، دس سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو، مگر ہم ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے

محروم ہیں۔"

"مجھے جو صحیح لگا، میں نے وہی کیا۔ اب تم ہی بتاؤ میری جگہ اگر تم ہوتی تو کیا کرتی؟"

"میں تمہاری طرح انہیں ڈاکوؤں اور لٹیروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے آج کی رات کالج کی چار دیواری کے اندر گزارنے کی اجازت دے دیتی۔"

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے اب تو وہ جا چکے ہوں گے۔"

"لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ ابھی تک کہیں نہیں گئے ہوں گے۔ وہ وہیں کھڑے اس انتظار میں ہوں گے کہ شاید تمہارے دل میں ان کے لیے کوئی رحم پیدا ہو جائے۔"

"اچھا میں کھانا کھالوں، پھر دیکھتا ہوں۔"

"کیا ان معصوم بچوں پر ظلم کر کے تمہارے حلق سے نوالہ اتر جائے گا؟"

"پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

"تم میری مانو اور مزید وقت ضائع کیے بغیر انہیں جا کر تلاش کرو اور پیار سے انہیں کسی کمرے میں رات گزارنے کی اجازت دے دو پھر دیکھنا تمہارے اندر تک سکون کی لہر دوڑ جائے گی اور تمہیں کھانا کھانے میں بھی لذت محسوس ہوگی۔"

بیوی کی باتیں مہربان خان پر اثر کر گئی تھیں اور وہ جن قدموں سے آیا تھا انہی قدموں سے تیزی سے وہاں سے نکل کر گیٹ کی طرف چل پڑا تھا۔

❁ ❁ ❁

شہر میں ہونے والے بم دھماکوں میں جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین میں شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا، وہ لوگ دو بار حکومت کے خلاف نہ صرف جلوس نکال چکے تھے بلکہ توڑ پھوڑ بھی کی گئی تھی، جس کی وجہ سے بہت سی گاڑیوں اور املاک کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ حکومت کی طرف سے پولیس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی صورت میں نہ صرف ترقی ملے گی اور سرکاری اعزازات سے نوازا جائے گا بلکہ نقد انعام بھی دیا جائے گا۔

یہ بات یقینی تھی کہ بم دھماکے کرنے کے بعد دہشت گرد شہر سے باہر نہیں نکل پائے تھے، اسی لیے مختلف شاہراہوں اور چوراہوں پر نہ صرف ناکے لگا دیے گئے تھے بلکہ ان کی گرفتاری کے لیے اعلیٰ افسران کی سرکردگی میں جگہ جگہ چھاپے بھی مارے جا رہے تھے، مگر ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

مخبر نے تین دہشت گردوں کو کاندھوں پر اسلحہ و بارود سے بھرے بیگ لٹکائے کالج کی دیوار پھلانگ کر عمارت میں داخل ہونے کی اطلاع دی تھی، خبر ملتے ہی پولیس کی دوڑیں لگ گئی تھیں اور وہ فوری طور پر کالج کی طرف چل پڑے تھے۔

❁ ❁ ❁

وہ تینوں آہستہ آہستہ دبے پاؤں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے ایک کلاس روم میں پہنچ گئے تھے، مہربان خان کے ادھر آنکلنے اور پکڑے جانے کا خوف انہیں کمرے میں روشنی کرنے سے روکے ہوئے تھا، ورنہ ان کی حالت ایسی تھی کہ اندھیرے کی وجہ سے انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، وہ کچھ دیر تک یونہی بلا مقصد کمرے میں کھڑے سوچتے رہے، کچھ دیر اندھیرے میں کھڑے رہنے اور کچھ کھڑکیوں کے راستے چاند کی روشنی چھن چھن کر آنے کی وجہ سے ان کی آنکھیں اس قابل ہو گئی تھیں کہ وہ کمرے کو باآسانی دیکھنے کے علاوہ، ایک دوسرے کو بھی دیکھ سکتے تھے، کلاس روم میں پڑی کرسیوں اور فرش پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں، وہ رات وہیں قیام کرنے کا ارادہ تو پہلے ہی سے کر چکے تھے، اس لیے کرسیوں کی اوٹ میں فرش پر بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح رات گزاری جا سکتی تھی، عارف نے اپنے بیگ میں سے ایک بیڈ شیٹ نکال کر فرش پر

بچھادی تھی، جس پر ان تینوں نے اپنے اپنے کندھوں پر لٹکنے والے بیگ کی شکل میں بوجھ کو اتار پھینکا تھا اور پھر خود بھی وہیں ڈھیر ہو گئے تھے۔

انہیں وہاں آئے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بھوک ستانے لگی تھی، کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور بھاگم بھاگ باہر جا کر کہیں سے بھی کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے ڈھونڈ ہی لاتے، مگر حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ان کا اس عمارت سے نکلنا خطرے سے خالی نہ تھا، وہ جانے انجانے میں حالات سے مجبور ہو کر ایک ایسا قدم اٹھا بیٹھے تھے، جس کی وجہ سے کسی بھی لمحے انہیں کسی بھی طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا، عارف اور اعجاز عام حالات میں بھی بھوک لگنے پر کسی خاص ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا کرتے تھے، لیکن صداقت کو جب کبھی بھی اچانک بے وقت بھوک لگ جایا کرتی تھی تو ہر طرف ایک شور مچ جایا کرتا تھا، اب بھی وہی صورت حال تھی، انہیں پہلے سے علم ہوتا کہ انہیں اس طرح کے حالات پیش آجائیں گے تو وہ کھانے پینے کا انتظام کر کے آتے۔

''مجھے تو بہت زوروں کی بھوک لگی ہے......''
صداقت نے معصوم سا منہ بنا کر اپنا دایاں ہاتھ پیٹ پر پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں ان حالات میں بھی بھوک لگی ہے؟'' اعجاز نے قدرے خفگی سے دریافت کیا تھا۔

''بھوک تو کبھی بھی لگ سکتی ہے، اور میری بھوک کے بارے میں تو تم جانتے ہی ہو۔ ایک بار بھڑک اٹھے تو جب تک پیٹ کے اس دوزخ میں کچھ نہ کچھ چلا نہ جائے، بھوک قابو میں ہی نہیں آتی۔'' صداقت ابھی تک بضد تھا اور کسی بھی طرح ٹلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اس وقت وہ تینوں ہی بھوک کے ستائے ہوئے تھے، مگر عارف اور اعجاز کسی نہ کسی طرح جبر کیے بیٹھے تھے جبکہ صداقت سے صبر نہیں ہو پا رہا تھا، جب کوئی اور راہ دکھائی نہ دی تو ان تینوں نے ہی اپنے اپنے بیگ میں پڑے نمکو، بسکٹ اور چپس کے پیکٹ نکال کر سامنے رکھ لیے تھے، اعجاز کے بیگ سے وہ آدھی بچی ہوئی پانی کی بوتل بھی نکل آئی تھی جو اس نے راستے میں لی تھی، اب کھانے کے لیے ان کے پاس وہی کل کائنات تھی، جس سے ڈنر کا کام لیا جا سکتا تھا، پھر وہ کسی بھوکے شیر کی طرح کھانے پینے کی ان اشیاء پر ٹوٹ پڑے تھے، مگر اسی لمحے کسی کے قدموں کی آہٹ ان کے کانوں کے پردوں سے ٹکرا گئی تھی۔

ان تینوں نے پہلے سے ہی احتیاطاً اپنے موبائل آف کر رکھے تھے، تاکہ کسی وقت آنے والی کال ان کے لیے کوئی خطرہ ثابت نہ ہو جائے، مگر رات کے سناٹے میں اچانک ان کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ نے انہیں خوف زدہ کر ڈالا تھا، انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا، ان تینوں کی ہی آنکھوں میں سوالیہ نشان تھا، وہ مزید سمٹ کر بیٹھ گئے تھے اور اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر ایک دوسرے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا، جیسے جیسے قدموں کی آواز قریب آتی جاتی تھی، ویسے ویسے ان کے دل کی دھڑکنوں میں تیزی آتی جاتی تھی، وہ ڈرے سہمے بیٹھے تھے مگر اس کے باوجود کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

کسی کے قدموں سے پیدا ہونے والی آہٹ ان کے کمرے کے سامنے آ کر رک گئی تھی، آنے والے نے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ جلا رکھی تھی، جس کی وجہ سے آنے والے شخص کا چہرہ دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی، چاروں طرف پھیلے اندھیرے کو چیرتی ہوئی ٹارچ عجیب سماں پیدا کر رہی تھی، انہیں اپنے پکڑے جانے کا خوف تھا ورنہ ان تینوں کا مل کر اس اکیلے شخص کو دبوچنا کوئی مشکل کام نہ تھا، وہ شخص کچھ پل کے لیے اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر اچانک جن قدموں سے وہاں آیا تھا، انہی

قدموں پر وہاں سے لوٹ گیا تھا، اس شخص کے جانے پر ان تینوں نے سکھ کا سانس لیا تھا، یہ آفت تو کسی نہ کسی طرح خود ہی ٹل گئی تھی، مگر ابھی رات باقی تھی۔

"لگتا ہے آج کی رات ہمیں جاگ کر گزارنی ہو گی۔" عارف نے سرگوشی کی تھی۔

"مگر یوں خاموش بیٹھے رہنے سے تو رات نہیں کٹے گی۔" صداقت نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

"کیوں نہ ہم تینوں ہی اپنی اپنی کہانی سنائیں اس طرح نہ صرف رات با آسانی کٹ جائے گی بلکہ ہمیں ایک دوسرے کو جاننے کا موقع بھی مل جائے گا۔" عارف نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

"آئیڈیا برا نہیں۔ اس بار اعجاز بولا تھا۔

"تو پھر ہو جاؤ شروع۔" صداقت نے عارف کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

"مگر میں ہی کیوں، تم کیوں نہیں؟" عارف نے صداقت سے سوال کیا تھا۔

"کہانی سنانے کی تجویز بھی تمہاری تھی، اس لیے ابتدا بھی تم ہی سے ہوگی۔" اعجاز نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے، میں سنا دیتا ہوں۔" عارف نے اعجاز کے کہنے پر سب سے پہلے کہانی سنانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کہا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوبتا چلا گیا تھا اور الفاظ کہانی کا روپ دھار کر اس کے لبوں سے ادا ہونے لگے تھے۔

❁ ❁ ❁

"ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چودہ سو سال قبل غلامی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا، لیکن اس کے باوجود ایک اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے بھی میرا خاندان کئی نسلوں سے غلامی کرتا چلا آرہا ہے، کیونکہ میرا باپ ایک پتھیرے کا بیٹا تھا اور بھٹہ مالکان کی غلامی میرے خاندان میں پیدا ہونے والے ہر شخص کو ورثے میں ملتی ہے، اس لیے برسوں پرانا غلامی کا پٹہ اس کے گلے میں بھی ڈال دیا گیا تھا۔"

"پتھیرا کون ہوتا ہے؟" صداقت نے عارف کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جو لوگ بھٹے میں پکانے سے پہلے مٹی کی کچی اینٹیں تیار کرتے ہیں، انہیں پتھیرے کہتے ہیں۔" صداقت کے دریافت کرنے پر عارف نے وضاحت کر دی تھی، اس لیے اس نے گردن ہلا دی تھی اور عارف نے پھر سے کہانی سنانی شروع کر دی تھی۔

میں چھوٹا سا تھا، میری عمر لوریاں سننے کی تھی، مگر میری ماں مجھے ہر رات بھٹہ مالکان کے مظالم کی داستاں سنا کر سلایا کرتی تھی، اس وقت مجھ میں اتنی سوجھ بوجھ نہیں تھی لیکن ماں کی زبان سے داستانیں سن کر مجھ پر کپکپی طاری ہو جایا کرتی تھی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے تھے، برسوں سے غلامی کی زندگی گزارنے کے باوجود نہ جانے میرے باپ کے دماغ میں کہاں سے یہ بات سما گئی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم دلوا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس غلامی کی زندگی سے چھٹکارا دلا دے گا، شاید اسی سوچ کو بدلنے کے لیے بھٹہ مالکان نے گاؤں میں اسکول ہی بننے نہیں دیا تھا، بھٹہ مالکان نہ صرف ہمارے مردوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بناتے ہیں، بلکہ ہماری بہو بیٹیوں کی عزتوں کو پامال کرنا بھی اپنا حق سمجھتے ہیں، ہمارا خاندان کئی نسلوں سے بھٹہ مالکان کے مظالم برداشت کرتا چلا آرہا ہے، وہ تھوڑے سے پیسوں اور اناج کے عوض خاندان کے تمام افراد سے غلاموں کی طرح کام لیتے ہیں۔

میری عمر ابھی ماں کی چھاتی سے لپٹ کر سونے کی تھی، اس سے قبل کہ بھٹہ مالکان کی نظر مجھ پر پڑتی، میرے باپ نے مجھے گاؤں بدر کر دیا تھا، گاؤں سے نکلتے وقت میرے باپ نے میرے کانوں میں ایک ہی بات ڈالی تھی کہ وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر

اس کی تعلیم کے اخراجات پورے کرے گا مگر وہ تب تک گاؤں میں قدم نہ رکھے جب تک پڑھ لکھ کر کسی سرکاری محکمے میں بڑا افسر نہ لگ جائے، پہلے پہل مجھے تعلیم میں کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن جب میں نے اپنے خاندان والوں پر بھٹہ مالکان کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے مظالم کی داستانیں سنیں تو جہاں مجھ میں بھٹہ مالکان سے نفرت بڑھی وہیں تعلیم سے محبت بڑھتی چلی گئی۔

تب سے مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی کسی کلاس میں دوسری پوزیشن حاصل کی ہو، لیکن اس کا سارا کریڈٹ میرے والدین کو جاتا ہے، جنہوں نے خود تو بھوکے رہ لیا ہو گا مگر میری ہر ضرورت کا احساس کسی فرض کی طرح کیا، میرے اسکول اور اکیڈمی کی فیس بر وقت پہنچانے میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔"

"کیا تم چھٹیوں میں بھی ان سے ملنے گاؤں نہیں جاتے؟" اعجاز نے حیران ہو کر دریافت کیا تھا۔

"نہیں......" عارف نے افسردہ لہجے میں جواب دیا تھا۔

"تو پھر چھٹیاں کہاں گزارتے ہو؟"

"میں چھٹیوں میں اپنی بہن کے ہاں چلا جاتا ہوں۔ میرے والدین اور بہن بھائی مجھے وہیں آ کر مل لیتے ہیں لیکن مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالی ہے، کبھی ایک بار بھی اپنے خاندان کے تمام افراد کو ایک ساتھ نہیں دیکھا۔"

"تم بہت خوش نصیب ہو کہ تمہیں اس طرح کے والدین ملے جو تمہارے بھلے کے لیے اپنے دل پر پتھر رکھ کر تمہیں تعلیم دلوا رہے ہیں۔ اب تم بھی کبھی ان کا مان نہ ٹوٹنے دینا۔"

"میں شاید اس قابل تو نہ بن پاؤں کہ بھٹہ مالکان سے اپنی نسلوں پر کی جانے والی زیادتیوں کا بدلہ لے سکوں لیکن مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ میں اپنے خاندان کے افراد کو اس ظلمت کدے سے ضرور نکال لاؤں گا۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔" اعجاز اور صداقت نے ایک ساتھ کہا تھا۔

❁ ❁ ❁

مہربان خان کی ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود اس رات وہ گیٹ پر موجود تھا، تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے اونگھ آنے لگتی تھی مگر وہ پھر سے الرٹ ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتا تھا، اس نے کئی بار اٹھ کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے بھی اپنی آنکھوں پر مارے تھے، مگر نیند پھر بھی اس پر غالب آ جاتی تھی، نیند کو بھگانے کے لیے تھک ہار کر وہ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا، اچانک آنکھوں میں تیز روشنی پڑنے سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں، اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا، آنکھوں میں پڑنے والی تیز روشنی نے اسے کچھ پل کے لیے دہشت زدہ کر ڈالا تھا، لیکن وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا، اس لیے کسی پریشانی کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا تھا، کچھ دیر بعد اس کی آنکھوں میں پڑنے والی تیز روشنی ختم ہو گئی تھی، جب وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو اسے بہت سے پولیس اہلکار گاڑیوں سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دیے تھے، وہ فوری طور پر اس وقت ان کی وہاں آمد کا سبب نہیں جان سکا تھا مگر ان کے حکم پر گیٹ کا تالا کھول دیا تھا۔

"ادھر کیسے آنا ہوا سرکار؟" پولیس والوں کے اندر آنے پر مہربان خان نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔

"ہمیں خبر ملی ہے کہ تم نے یہاں دہشت گردوں کو پناہ دے رکھی ہے" پولیس آفیسر نے سخت لہجے میں بات کی تھی۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں سرکار دہشت گردوں کا مجھ سے کیا واسطہ؟"

"ہمارے آدمی نے اپنی آنکھوں سے تین دہشت

گردوں کو دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"وہ ......وہ تو کھیلتے ہوئے بچوں کی گیند اندر آ گری تھی، کچھ بچے گیند اٹھانے کے لیے دیوار پھلانگنے کی کوشش کررہے تھے، مگر میں نے انہیں اسی وقت بھگا دیا تھا۔"

"لیکن ہمارے مخبر کی اطلاع غلط نہیں ہوسکتی کیونکہ اس نے رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، جن جوانوں کو دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھا تھا انہوں نے اسلحہ بارود سے بھرے بیگ اپنے کاندھوں پر لٹکا رکھے تھے۔"

"ایسا ہو نہیں سکتا۔"

"ذرا دیکھو تو سہی اسے، کتنی صفائی سے جھوٹ بول رہا ہے مگر ہمیں کیا خبر تھی کہ جن دہشت گردوں کی گرفتاری کے لیے ہم نے جگہ جگہ ناکے لگا رکھے ہیں اور کتوں کی طرح جگہ جگہ ان کی خوشبو سونگھتے پھرتے ہیں، وہ یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اگر میری بات کا یقین نہیں تو اپنی تسلی کے لیے تم بلڈنگ کی تلاشی لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔"

"اس کے لیے ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔ تلاشی تو ہم لیں گے ہی لیکن اتنا یاد رکھنا اگر دہشت گرد اس عمارت میں کہیں بھی چھپے ہوئے پائے گئے تو ان کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی خیر نہیں۔"

"میں پچھلے کئی سالوں سے یہاں کام کرتا ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمیشہ اپنی ڈیوٹی پوری ایمانداری اور نیک نیتی سے کی ہے اگر تمہاری کوئی بھی بات سچ نکلی تو میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔" پولیس کی بھاری نفری اور پولیس افسران کی موجودگی نے کچھ لمحوں کے لیے مہربان خان کو خوفزدہ کر ڈالا تھا اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا، مگر اس کے باوجود اس نے انسپکٹر کے ہر سوال کا جواب انتہائی حوصلے سے دیا تھا اور کسی بھی پل خوف کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ تین مجبور نوجوانوں کو کسی طرح رات گزارنا تھی، ایک شخص کو ان کی مدد کرکے خدا تعالیٰ کی خوشنودی درکار تھی، جبکہ پولیس اہلکاروں اور افسران کو محکمانہ ترقی کے علاوہ نقد انعام کا لالچ چین سے سونے نہیں دے رہا تھا۔

❁......❁......❁

پروگرام کے مطابق اب صداقت کو اپنی کہانی سنانی تھی، مگر وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے الفاظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

"تم خاموش کیوں ہو؟" اعجاز نے صداقت کی خاموشی کا سبب جاننے کے لیے سوال کیا تھا۔

"سوچتا ہوں کہیں میری اصلیت جان کر تم مجھے اپنی نظروں سے ہی نہ گرا دو یا میں خود کو تمہاری نظروں میں نہ گرا لوں۔" صداقت نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا تھا۔

"تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟ دوست ایک دوسرے کا دکھ بانٹنے کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ ان کے دکھوں کے بارے میں جان کر قہقہے لگانے والے۔" اعجاز نے صداقت کو تسلی دی تھی۔

اعجاز کی باتوں نے صداقت کو حوصلہ دیا تھا اور وہ ہمت کرکے اپنی کہانی بیان کرنے لگا تھا۔

میرے باپ کے مرنے کے بعد کسی نہ کسی طرح کئی سال تک ماں نے گھر کی ذمہ داریاں نبھائی تھیں، مگر جب وہ بھی اپنی تین جوان بیٹیوں اور چھوٹے بیٹے کو زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ کر منوں مٹی تلے جا سوئیں تو ہمیں ایسا لگا جیسے ہماری زندگی میں روشنی اور امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہی تھی، ہم چاروں بہن بھائی گھنٹوں بیٹھے اپنے والدین کی باتیں کرکے روتے رہتے تھے، لیکن ایسا کب تک چل سکتا تھا، گھر کا چولہا

جلانے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کچھ تو کرنا تھا، آخر کار تینوں بہنوں نے باہمی مشورے سے فیصلہ کرلیا کہ بڑی بہن عشرت ملازمت کرے گی اور دونوں چھوٹی بہنیں، نصرت اور مسرت گھر داری سنبھالیں گی۔

چند دن کی بھاگ دوڑ اور کوششوں کے بعد میری بہن کو ایک پرائیویٹ ادارے میں ٹیلی فون آپریٹر کی ملازمت مل گئی تھی، بہن کو ملازمت ملنے سے زندگی کی گاڑی ایک بار پھر سے چلنے لگی تھی، میں اسکول کے لیے گھر سے نکلتا تو عشرت بھی میرے ساتھ ہی گھر سے نکل پڑتی تھی، میرے اسکول کے راستے میں ہی بس سٹاپ تھا، جب تک کوئی بس یا ویگن نہ آجاتی میں بھی وہیں بس سٹاپ پر کھڑا رہتا تھا، جیسے ہی کوئی سواری مل جاتی اور وہ اس میں سوار ہو جاتی تو میں اسکول کی طرف چل پڑتا تھا۔

شام کو بہن گھر لوٹتی تو ہم اس کے انتظار میں بیٹھے ہوتے تھے، ہم سب کو زوروں کی بھوک لگ رہی ہوتی تھی لیکن ہم اس کے آنے پر ہی ایک ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے، کچھ ماہ تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، پھر ہر دوسرے تیسرے روز بہن آفس سے لیٹ گھر آنے لگی، اس کے لیٹ آنے پر ہم سب کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوال جنم لینے لگے تھے، لیکن ہم میں سے کسی نے بھی اتنی جرات نہیں کی تھی کہ بڑی بہن کے لیٹ آنے پر اس سے کوئی سوال کر سکے، جب یہ سلسلہ کچھ زیادہ ہی طویل ہونے لگا تو نصرت نے ہمت کر کے پوچھا تھا۔

''باجی آپ آفس سے کچھ زیادہ ہی لیٹ نہیں آنے لگیں؟''

''آفس میں باس بیٹھے ہوں تو مجھے بھی بیٹھنا پڑتا ہے اسی وجہ سے لیٹ ہو جاتی ہوں۔'' نصرت کے سوال کرنے پر عشرت نے جواب دیا تھا۔

''چلیں وہ تو مجبوری ہے ورنہ ہم آپ کے دیر سے آنے پر بہت پریشان تھے مگر پوچھ نہیں پا رہے تھے۔''

''نہیں ایسی کوئی پریشانی والی بات نہیں بلکہ جس روز میں لیٹ ہو جاؤں تو تم لوگ میرے انتظار میں بھوکے بیٹھے رہنے کی بجائے کھانا کھا لیا کرو۔'' باجی کی وضاحت کے بعد کسی اور سوال کی ضرورت نہیں رہی تھی، اس لیے سب خاموشی سے کھانا کھانے لگے تھے۔

اس بات کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک رات اچانک عشرت باجی کے رونے کی آواز کانوں میں پڑنے سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔

''پہلے پہل تو میں باس کے ارادوں کو بھانپ نہیں پائی تھی، مگر جب اس نے اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کے لیے میرے سامنے اپنی شرائط رکھیں تو میں کچھ پل کے لیے سکتے کی حالت میں چلی گئی تھی پھر میں اپنے کیبن میں آ کر اس سوچ میں ڈوبتی چلی گئی تھی کہ کیا باس جیسا باریش انسان، جس کی شاید مجھ سے بھی بڑی بیٹیاں ہوں گی، کبھی اس طرح کی گری ہوئی بات بھی کر سکتا ہے؟''

''باس نے شرائط کیا رکھی تھیں؟'' مسرت نے سوال کیا تھا۔

''اس کا کہنا ہے کہ اگر وہ اس کے ہاں جاب کرنا چاہتی ہے تو وہی کرے جیسا وہ چاہتا ہے، ورنہ اس کے لیے اس آفس میں کوئی جگہ نہیں۔'' عشرت باجی بات کرتے ہوئے ایک بار پھر رو پڑی تھی اور اس نے اپنی گردن جھکا دی تھی۔

''باجی! ایسے گھٹیا شخص کے پاس جاب کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم بھوکے رہ لیں۔'' نصرت اور مسرت نے ایک ساتھ کہا تھا اور روتے ہوئے عشرت باجی سے لپٹ گئی تھیں۔

میری تینوں بہنیں رو رہی تھیں، مجھ سے ان کا رونا برداشت نہیں ہو رہا تھا اور میرا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا، میں اس وقت چھٹی کلاس کا طالب علم تھا اور بہنوں کی نظر میں ابھی

چھوٹا سا بچہ تھا، مگر وقت نے ایک ہی پل میں مجھ سے میرا بچپن چھین کر مرد بنا دیا تھا، میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ چارپائی چھوڑ دی تھی اور مرد بن کر بہنوں کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا، مجھے اچانک اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر بہنوں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے اور خاموشی اختیار کرلی تھی، مگر میں بول پڑا تھا۔

"ابھی میں ہوں ناں میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی پریشانی کیسے آسکتی ہے۔"

میری بات سن کر تینوں بہنیں سکتے میں آ گئی تھیں اور وہ پلک جھپکے بغیر مجھے دیکھے جا رہی تھیں، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی قوت گویائی چھین لی گئی تھی، کچھ پل کے لیے ان کی یہی کیفیت رہی، پھر جیسے عشرت باجی کو ہوش آ گیا اور بولیں۔ "تم ایسا کچھ بھی مت سوچو، تمہیں بس اپنی تعلیم جاری رکھنی ہے۔"

"تعلیم سے زیادہ مجھے تم تینوں کی عزت پیاری ہے اور میں اپنے گھر کی عزت کو جگہ جگہ رسوا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"اپنی عمر سے بڑی باتیں مت کرو۔ میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ اب اس سے آگے میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔" عشرت باجی نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مار کر روتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے چمٹا کر کہا تھا۔

"لیکن مرد ہی کماتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔" میں باجی کے سینے سے لگا رو رہا تھا مگر ابھی تک اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"مگر تم مرد نہیں بچے ہو، اور ابھی تمہارے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں اور کیا تمہیں بھول گیا، ماں کی کس قدر شدید خواہش تھی کہ تم پڑھ لکھ کر اس گھر کے لیے ڈھیر ساری خوشیوں کا سامان پیدا کرو۔" عشرت باجی نے میرے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا، ہم دونوں کو روتا دیکھ کر مسرت اور نصرت بھی رونے لگی تھیں، پھر نہ جانے ہم کب تک ایک دوسرے سے چمٹے آنسو بہاتے رہے اور کب ہماری آنکھ لگی۔

کچھ روز بعد میری تینوں بہنوں نے مل کر گھر میں لیڈیز کپڑوں کی سلائی کا کام شروع کر دیا تھا اور مجھے ہاسٹل بھجوا دیا گیا تھا، اس روز میں بہت رویا تھا مگر بہنوں کا کہنا تھا "اگر تم گھر میں رہے تو آئے روز کسی نہ کسی بات پر تمہارا خون کھولنے لگے گا اور ہمیں ڈر ہے کہ کسی روز تم جوش میں آ کر تعلیم کو خیر باد ہی نہ کہہ دو۔"

تب سے میں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور محض اپنی بہنوں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھنے کے لیے ان کی دوری بھی برداشت کیے جا رہا ہوں، اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے صداقت کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے، اعجاز اور عارف اسے تسلی دینے لگے تھے مگر ان کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

❁ ❁ ❁

جس سلسلے کی ابتدا عارف سے ہوئی تھی، اس کی وجہ سے رات کا کچھ حصہ باآسانی گزر گیا تھا، عارف کے بعد صداقت بھی اپنی کہانی سنا چکا تھا، اب اعجاز کی باری تھی، عارف اور صداقت منتظر تھے کہ وہ اپنی کہانی سنانا شروع کرے، مگر اعجاز اس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ اپنی کہانی کا آغاز کہاں سے کرے، اس لیے کمرے میں مکمل خاموشی تھی، دور کہیں سے کچھ آوازیں ان کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی تھیں لیکن انہوں نے یہ سوچ کر اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی کہ انہی کی طرح کچھ اور لوگ بھی کہیں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہوں گے۔

"تمہاری کہانی سننے کے لیے ہمیں اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟" عارف نے اعجاز سے سوال کر کے خاموشی کو توڑا تھا۔

"سناتا ہوں یار۔" اعجاز نے آہستہ سے جواب دیا تھا۔

"تو بسم اللہ کرو پھر۔" عارف نے مسکراتے ہوئے

بات کی تھی، جس کا اثر یہ ہوا کہ اعجاز نے اپنے لب کھول دیے تھے۔

میرے والد پولیس میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر تھے، ان کی تنخواہ کے علاوہ کوئی اور آمدنی کا ذریعہ نہ تھا، اس لیے گھر کے اخراجات بمشکل کھینچ تان کر پورے ہو پاتے تھے، ہمارے گھر میں بہت پرانے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کے علاوہ فرج تک نہ تھی، گرمیوں کے دنوں میں ہم اکثر ہمسایوں کے گھر سے برف مانگ کر لایا کرتے تھے، اگر کبھی وہ مہمانوں کا بہانہ بنا کر یا برف نہ جمنے کا کہہ کر ٹال دیتے تو اس روز بازار سے برف آتی تھی۔

ادھر ہمارے گھر کے حالات ایسے تھے، مگر دوسری طرف ہمارے گھر سے دو گھر چھوڑ کر ابو کے تھانے کے حولدار کا گھر تھا، جس کے ہاں جانا ہوتا تو گھر میں پڑی دنیا جہان کی نعمتیں دیکھ کر ہم حیران ہوتے تھے، حولدار کی بیوی ہفتے دو ہفتے میں ہمارے ہاں ضرور چکر لگا جاتی تھی اور اپنا پہنا ہوا سوٹ اور میچنگ جیولری دکھا کر کہتی "حولدار صاحب ابھی پچھلے ہی ہفتے میرے لیے گرمیوں کے دس سوٹ لائے تھے، کل آئے تو چار سوٹ اور ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے، بس کیا بتاؤں بہن میں جتنا چاہے انہیں منع کر لوں وہ میری سنتے ہی نہیں، پھل ہے تو وہ اتنا گھر میں آتا ہے کہ ہر وقت فریج بھرا رہتا ہے، بچوں کے منہ سے ابھی کوئی فرمائش پوری طرح نکلتی نہیں کہ فوراً پوری کر ڈالتے ہیں۔" وہ جب بھی آتی اسی طرح کی باتیں کر کے چلی جاتی مگر اس روز ہمارے گھر میں جنگ چھڑ جاتی تھی۔

ابو ابھی گھر میں قدم ہی رکھتے تھے کہ امی انہیں جلی کٹی سنانے لگتی تھیں "تم نہ جانے کون سی دنیا کی انوکھی نوکری کرتے ہو، دو دو سال تک اس گھر میں میرے یا میرے بچوں کے پہننے کے لیے کوئی ڈھنگ کا کپڑا تک نہیں آتا، کبھی کسی موسمی پھل کی شکل تو کیا دیکھنی ہے، پکانے کے لیے کبھی گھر میں گوشت تک نہیں آیا، بس گھر میں کسی مہمان کے آنے پر مرغی کا گوشت پک جائے تو میرے بچوں کے نصیب میں بھی ایک ایک بوٹی آ جاتی ہے"۔

اس روز امی کے دل میں جو آتا کہے جاتی تھیں اور ابو خاموشی سے گردن جھکائے سنتے جاتے تھے، اس سلسلے میں ہم سبھی بہن بھائی بھی امی کا ساتھ دیا کرتے تھے اور لگے ہاتھوں اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال لیا کرتے تھے، ابو سبھی کی سننے کے بعد ایک لمبی سانس کھینچ کر چھوڑتے ہوئے کہتے تھے "جو لذت حق حلال کی کھانے میں ہے وہ کسی اور میں نہیں، جب ہمارا ایمان ہے کہ جو ہمارے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے وہ ہمیں ہر حال میں مل کر رہے گا تو پھر شکوہ گلہ کس بات کا، ہمیں ہر حال میں اپنے خالق کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے اور ہمیشہ صبر کا دامن تھامے رکھنا چاہیے۔"

ابو کی وعظ و نصیحت شروع ہوتی تو ہم ایک ایک کر کے وہاں سے سرک جاتے تھے اور ہمیشہ ابو وہاں اکیلے بیٹھے رہ جایا کرتے تھے، پھر ابو گھنٹوں وہیں بیٹھے سوچتے رہتے تھے مگر ہم میں سے ان کے یہاں کوئی نہیں جاتا تھا، امی اپنے کاموں میں لگ جاتی تھیں مگر پھر انہیں احساس ہونے لگتا کہ انہوں نے خوامخواہ شوہر کو اتنی باتیں سنا ڈالی تھیں تو کسی نہ کسی بہانے ابو کے پاس جا بیٹھتی تھیں، ابو بھی جیسے اسی انتظار میں ہوتے تھے، امی کے پاس آتے ہی ساری باتیں بھلا کر مسکرانے لگتے تھے، ہم ابو سے تو کبھی کچھ کہہ نہیں پاتے تھے مگر ہم سبھی بہن بھائی گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھے ابو کے خلاف اپنے اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالا کرتے تھے۔

حولدار انکل کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی، بیٹی بڑی تھی اور گریجویشن کے بعد گھر میں بیٹھی تھی، ان کے دونوں بیٹے مجھ سے عمر میں بڑے تھے مگر بار بار فیل ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ہی میرے کلاس فیلو تھے، بریک کے دوران ہر روز سموسوں، دہی بھلوں، برگر اور

شوارمے کے ساتھ کولڈ ڈرنکس پر سو دو سو روپے خرچ کرنا ان کے لیے معمولی بات تھی مگر جیب خالی ہونے کی وجہ سے میں اسکول کے گراؤنڈ میں گھاس پر بیٹھا انہیں دور سے دیکھ کر نہ صرف کڑھتا رہتا تھا بلکہ دل ہی دل میں اپنے ابو کو بھی برا بھلا کہہ ڈالتا تھا، جب میٹرک کے امتحان کی وجہ سے ہمیں اسکول سے فارغ کر دیا گیا تو حولدار انکل کے بیٹوں کی عیاشیوں کو دیکھ کر روز روز کڑھنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

میٹرک کا رزلٹ آیا تو میں نہ صرف انتہائی شاندار نمبروں کے ساتھ کامیاب ہوا تھا بلکہ بورڈ کی طرف سے اسکالرشپ بھی ملا تھا، جبکہ حولدار انکل کے دونوں بیٹے کوئی ایک مضمون بھی پاس نہیں کر پائے تھے، مجھے اسکالرشپ ملنے پر امی اور میرے بہن بھائی بہت خوش تھے لیکن اس روز ابو کی خوشی دیدنی تھی، انہوں نے مجھے کھینچ کر اس قدر پیار سے اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا کہ ان کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔

اسکالرشپ کی بنیاد پر میں نے یہاں ایڈمشن لے لیا اور ہاسٹل میں ہی رہنے لگا، گھر سے نکلتے وقت ابو نے ایک ہی نصیحت کی تھی

”بیٹا خوب پڑھنا اور پڑھ لکھ کر ایماندار پولیس آفیسر بننا۔“ تب سے ابو کی وہ بات میں نے اپنے پلے باندھ رکھی ہے، اس وقت ہمیں ان کی باتیں بری لگا کرتی تھیں مگر اب احساس ہوتا ہے کہ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سچا اور کھرا تھا۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اعجاز خاموش ہو گیا تھا، مگر عارف اور صداقت کا تجسس ابھی باقی تھا۔

”تمہارے والد اب بھی اے ایس آئی ہیں کیا؟“ عارف نے اپنے اندر سے اٹھنے والے سوالوں کا جواب جاننے کے لیے بات کی تھی۔

”نہیں......اب وہ ترقی پا کر سب انسپکٹر بن چکے ہیں اور مجھ سے بڑے بھائی نے ایم بی اے کے بعد بینک میں ملازمت کر لی ہے اس لیے اب گھر کے حالات پہلے سے بہت بہتر ہو گئے ہیں۔“

”اور اس حولدار کے کیسے حالات جا رہے ہیں؟“ عارف کی تشنگی ابھی تک باقی تھی، اس لیے اس نے ایک اور سوال کر ڈالا تھا۔

”وہ بیچارے جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں۔“

”مگر کیوں......؟“

”انہوں نے شہر میں بہت سے قیمتی پلاٹ اور گھر خرید لیے تھے مگر کسی سائل سے رشوت لیتے ہوئے ایسے گرفت میں آئے کہ ساری جائیداد ضبط ہو گئی اور انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ مقدمہ چلا تو گھر کی ایک ایک چیز مقدمے کی نذر ہو گئی، مزید دکھ کی بات یہ ہے کہ ان کی بیٹی مناسب رشتے کی آس میں ابھی تک گھر بیٹھی ہے، دونوں بیٹوں کو آوارگی کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں اور وہ اپنی جائز و ناجائز ضروریات کے لیے ماں اور بہن کو برا بھلا کہنے کے علاوہ ان کی پٹائی بھی کر ڈالتے ہیں اور ماں بیٹی گھر کے کونے میں پڑی روتی رہتی ہیں۔“ اس بار اعجاز نے قدرے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

عارف کے دماغ میں کئی اور سوال جنم لے رہے تھے مگر اچانک بہت سے بوٹوں کی دھمک کانوں میں پڑنے پر ان کے لب خاموش ہو گئے تھے اور کان بوٹوں کی آواز پر لگ گئے تھے، وہ بار بار کلاس روم میں پڑی کرسیوں کی اوٹ سے گردن نکال کر باہر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کے سوا انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، پھر جیسے جیسے بوٹوں کی آواز قریب ہوتی چلی گئی تو ساتھ ہی سرچ لائٹ بھی قریب آنے لگی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ لوگ ہاتھوں میں سرچ لائٹ تھامے کسی کی تلاش میں نکلے تھے، یہ خیال آتے ہی ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل

گئی تھی کہ ہونہ ہو وہ لوگ انہی کی تلاش میں ہوں۔

جوں جوں روشنی قریب آتی جاتی تھی ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، جس طرح وہ ایک ایک کمرے میں ٹارچ کی روشنی سے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اسی قدر ان کے پکڑے جانے کے چانس بھی بڑھتے جاتے تھے، اب وہ لوگ ان کے انتہائی قریب پہنچ چکے تھے وہاں سے بھاگ کر کسی اور جگہ چھپنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا، اس سے پہلے کہ سرچ لائٹ کی تیز روشنی ان پر پڑتی اور وہ پکڑے جاتے، وہ جلدی سے زمین پر لیٹ گئے تھے، ان کا بروقت فیصلہ درست ثابت ہوا تھا اور تیز روشنی ان کے اوپر سے گزر گئی تھی، لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ضرور پکڑے جاتے۔

بھاری تعداد میں پولیس اہلکاروں اور افسران کو دیکھ کر ان کے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے سوال اٹھے تھے، مگر وہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ رات گئے وہ لوگ کس سلسلے میں ادھر آئے تھے، وہ تینوں مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگے تھے لیکن ان کی سوچ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہر پائی تھی۔

''ہونہ ہو وہ لوگ ہماری ہی تلاش میں نکلے ہوں۔'' اچانک اعجاز نے اپنے طور پر کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے خوف سے کانپتے ہوئے کہا تھا۔

''مگر ہم نے ایسا کیا کیا ہے کہ وہ پاگلوں کی طرح ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔'' اعجاز کی بات سن کر عارف اور صداقت کے اندر بھونچال آ گیا تھا مگر اس کے باوجود صداقت نے حوصلے سے بات کی تھی۔

''ایسا بھی تو ہوسکتا ہے، مہربان خان نے ہمیں دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھ لیا ہو اور پھر پولیس کو اطلاع کردی ہو۔'' عارف نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

''لیکن مہربان خان ایسا نہیں کرسکتا۔'' صداقت نے مکمل یقین کے ساتھ کہا تھا۔

''تم یہ بات اس قدر یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' عارف نے وضاحت چاہی تھی۔

''بس میرا دل کہتا ہے۔'' صداقت نے انتہائی سادگی سے جواب دیا تھا۔

''فی الحال تم اپنے دل کو مضبوط کرو اور یہ سوچو کہ اگر پکڑے گئے تو وہ لوگ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟'' عارف نے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔

وہ دیر تک اسی بحث میں الجھے رہے مگر بات کسی کنارے نہیں لگ پائی تھی، یہ بلا وجہ کی تکرار اس قدر طویل ہوتی گئی تھی کہ ان کے پاس دلائل بھی ختم ہو گئے تھے اور بالآخر تھک ہار کر خاموش ہو گئے تھے اور ہر کوئی اپنے طور پر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے غور کرنے لگا تھا، رات کافی بیت گئی تھی، ذرا سی خاموشی ہوتے ہی ان کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ سب غم بھول کر سو چکے تھے۔

❖ ❖ ❖

کھڑکیوں اور روشن دانوں کے راستے پڑنے والی سورج کی کرنوں سے عارف کی آنکھ کھل گئی تھی، آنکھ کھلنے پر اس نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا تھا، کچھ پل کے لیے اسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے، جیسے ہی اسے احساس ہوا تو اس نے فوری طور پر اعجاز اور صداقت کو جھنجوڑ ڈالا تھا، ایسا کرنے سے وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے۔

''اس سے پہلے کہ ہم پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے، جلدی سے اپنی چیزیں سمیٹو اور یہاں سے نکلو.....'' عارف نے ان دونوں کی آنکھیں کھلتے ہی اس قدر آہستہ بات کی تھی کہ کہیں ان کے سوا کوئی اور اس کی آواز نہ سن لے۔

''ہاں یار پہلے ہی ہم نے اٹھنے میں دیر کردی لیکن ابھی تو مہربان خان بھی اپنے کوارٹر میں سو رہا ہوگا مگر اس سے پہلے کہ وہ ادھر آ نکلے، جس راستے سے یہاں آئے تھے، ہمیں اسی راستے سے بھاگ جانا چاہیے۔'' اعجاز

نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

عجیب افراتفری کا عالم تھا، انہوں نے جلدی سے اپنی چیزیں بیگوں میں ٹھونسیں اور انتہائی احتیاط سے وہاں سے نکل پڑے، اب وہ تینوں ایک دوسرے کے پیچھے اس قدر محتاط ہو کر چل رہے تھے کہ وہ نہ صرف سامنے نظر رکھے ہوئے تھے بلکہ اپنے دائیں بائیں بھی دیکھتے جاتے تھے، اعجاز سب سے آگے آگے چل رہا تھا، صداقت اس کے پیچھے، جبکہ عارف سب سے پیچھے تھا، ابھی وہ کمرے سے نکل کر تھوڑا سا ہی آگے بڑھے تھے کہ ان کا ایک ساتھی جدا ہو چکا تھا اور وہ دو رہ گئے تھے، عارف غائب ہو چکا تھا، مگر صداقت اور اعجاز کو اس کی خبر تک نہیں ہوئی تھی، کچھ ہی لمحے بعد صداقت بھی اعجاز کے پیچھے نہیں رہا تھا، اب صرف اعجاز ہی تھا جو اکیلا ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

اعجاز کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچ چکا تھا، مگر ابھی تک اس بات سے بے خبر تھا کہ وہ تنہا رہ گیا ہے اور اس کے دونوں ساتھی اس کے پیچھے سے غائب ہو چکے ہیں، اس نے بلا وجہ اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھیوں کی بجائے کوئی شخص شلوار قمیض پہنے کاندھے پر بندوق لٹکائے اس کے سامنے کھڑا تھا، اس شخص نے چہرے پر نقاب کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے اسے پہچاننا بھی ممکن نہیں تھا، اعجاز چیخنے کے لیے تیار تھا، اسی لمحے اس نقاب پوش شخص نے تیزی سے اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا تھا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

نقاب پوش شخص اعجاز کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کے نقاب کی وجہ سے پریشان ہے، اسی لیے اس نے چہرے سے نقاب اتارنے میں ذرا تاخیر نہیں کی تھی، چہرے سے نقاب اترنے پر اعجاز نے مہربان خان کو اپنے سامنے کھڑا پایا تو حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور میرے دونوں دوست کہاں ہیں؟'' اعجاز نے عارف اور صداقت کو اپنے ساتھ نہ پا کر پریشانی کے عالم میں دریافت کیا تھا۔

''فکر نہ کرو تمہارے دونوں دوست محفوظ ہیں اور میں تم لوگوں کی مدد کے لیے یہاں آیا ہوں۔'' مہربان خان نے آہستہ سے اعجاز کی بات کا جواب دیا تھا۔

''تم ہماری مدد کیا کرو گے...... تم نے تو ہماری منت سماجت کے باوجود ہمیں سیدھے راستے سے عمارت میں داخل ہونے کی اجازت تک نہیں دی تھی۔''

''لیکن جیسے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں اسی وقت دوڑتا ہوا گیٹ پر واپس آ گیا تھا، تب تم تینوں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو رہے تھے لیکن میں جان بوجھ کر خاموش اور انجان بنا رہا، جب تم تینوں اس کمرے میں آ بیٹھے تو میں نے سکھ کا سانس لیا تھا پھر مجھے یہ احساس بار بار بے چین کرنے لگا کہ تمہیں بھوک اور پیاس لگی ہوگی...... میں دو بار تم سے کھانے کا پوچھنے یہاں تک آیا بھی مگر دونوں بار یہ سوچ کر لوٹ گیا کہ کہیں اندھیرے میں میری موجودگی کی وجہ سے تم لوگ ڈر ہی نہ جاؤ۔''

''اگر ہم تمہاری اجازت سے یہیں کسی کونے میں پڑے رہتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔''

''کاش میں نے وہ بھول نہ کی ہوتی تو یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ بھی نہ ہوتا۔''

''ایسا کیا ہو گیا۔''

''کسی مخبر نے تمہیں دیوار پھلانگ کر اندر آتے دیکھ لیا اور پولیس کو اطلاع کر دی کہ دہشت گرد اس عمارت میں چھپے بیٹھے ہیں۔ اسی وقت پولیس کی بھاری نفری یہاں پہنچ گئی تھی۔ میرے لاکھ سمجھانے، یقین دلانے اور سبھی کمروں کی تلاشی لینے کے باوجود وہ رات بھر یہاں سے نہیں ہلے۔ جب سے وہ لوگ یہاں آئے ہیں تب سے مجھ پر ان کی گہری نظر تھی۔ رات بھر جاگتے

رہنے کی وجہ سے وہ گاڑیوں میں ہی بے سدھ پڑے تھے، اس لیے میں کسی طرح ان سے آنکھ بچا کر یہاں چلا آیا تاکہ تمہیں پولیس کی شکل میں ٹوٹنے والی آفت سے بچا کر کسی محفوظ جگہ پر چھپا سکوں۔"

اب ساری بات اعجاز کی سمجھ میں آ چکی تھی اور وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ خاموشی سے مہربان خان کے ساتھ ساتھ چل پڑا تھا، مہربان خان اسے کمرے کے عقبی دروازے سے نکال کر عمارت کی پچھلی طرف لے آیا تھا، ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ اپنے سامنے پولیس انسپکٹر کے ہمراہ بہت سے اہلکاروں کو اسلحہ تانے کھڑے پایا، انسپکٹر کے ہاتھ میں دبے ریوالور کا رخ اعجاز کی طرف تھا، جو کمرے سے نکلتے ہوئے بری طرح کانپ رہا تھا لیکن پولیس کو دیکھ کر اس کی رنگت زرد پڑ گئی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی رگوں میں دوڑنے والا سارے کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔

"تم نے سمجھا کہ پولیس سو گئی۔ اب تم جیسے چاہو اپنی من مانی کر لو۔" انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

"نہیں سرکار! ایسا تو نہیں، میں تو ان بچوں کی مدد کے لیے یہاں آیا تھا۔" مہربان خان نے نرم لہجے میں بات کی تھی۔

"ارے بیوقوف ہم چاہتے تو رات کو ہی آپریشن کر سکتے تھے لیکن ہمیں اس بات کا بھی ڈر تھا کہ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دہشت گرد کہیں بھاگ نہ جائیں اس لیے ہم صبح ہونے کے انتظار میں تھے۔"

"لیکن یہ بیچارے دہشت گرد نہیں، کالج کے سٹوڈنٹ ہیں۔"

"سیانے کہتے ہیں سنپولیے سے پہلے سانپ کو مارنا چاہیے۔ اس لیے مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" انسپکٹر نے اعجاز سے ریوالور ہٹا کر مہربان خان کا نشانہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن میرا قصور کیا ہے؟" مہربان خان نے حوصلے سے بات کی تھی۔

"کیا دہشت گردوں کو پناہ دینا تمہارے نزدیک کوئی جرم نہیں؟" انسپکٹر نے پارعب آواز میں سوال کیا تھا۔

"مگر یہ دہشت گرد نہیں معصوم ہیں"

"کچھ دیر بعد تم خود کو بھی معصوم کہنے لگو گے۔"

"تم مجھے جو چاہے کہہ لو مگر میری بات کا یقین کرو کہ یہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔"

"بہت بول رہا ہے یہ اس کی گن قبضے میں لے لو اور اس کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر تھانے لے چلو۔" انسپکٹر نے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا تھا۔

انسپکٹر کا حکم ملتے ہی ایک ساتھ کئی سپاہی مہربان

خاموشی

خاموش رہنا بھی کبھی کبھی سوال بن جاتا ہے اگر یوں کہا جائے کہ خاموشی ہے ہی سوال تو غلط نہ ہوگا۔ خاموشی جہاں دوسروں کے لیے سوال بن جاتی ہے وہاں آپ کے لیے اس سوال کا جواب جو کوئی دوسرا فرد آپ کو نہیں دے سکتا۔ خاموشی تنہائی میں آپ کو وقت دیتی ہے خود کو جاننے پہچاننے کا۔ جہاں یہ آپ کا تعلق دوسروں سے توڑ دیتی ہے وہیں آپ سے آپ کا تعلق بے حد مضبوط بنا دیتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ سب سے اپنا تعلق توڑ لو اور خود میں ہی کھوئے رہو یوں تو ایسا ہوگا کہ آپ ہو یا نہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا اور کبھی کبھی خاموش رہنا بے وقوفی کہلاتا ہے بولو ضرور پر وہاں جہاں بولنا ضروری ہو۔ آپ کے لیے اور سب کے لیے اس طرح خاموشی سوال نہیں بلکہ جواب کے روپ میں سوال بن جاتی ہے۔

اسرار علی...... ملتان

خان پر پل پڑے تھے، انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے مہربان خان کی گن اپنے قبضے میں لے کر اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے باندھ دیے تھے، مہربان خان کو پولیس والوں کی یہ حرکت انتہائی ناگوار گزری تھی اور غصے سے اس کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے تھے۔

''آنکھیں مت دکھاؤ۔ انہیں نیچے کرو، ورنہ تمہاری آنکھیں ہی نکال دوں گا۔'' انسپکٹر نے آگے بڑھ کر مہربان خان کے گالوں پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا تھا۔

ادھر انسپکٹر اور مہربان خان میں بحث جاری تھی، ادھر اعجاز کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی، اب اس میں اتنی بھی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے کاندھے پر لٹکے ہوئے بیگ کا بوجھ بھی برداشت کر لیتا، اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کسی نے اس کے بدن میں دوڑنے والا سارے کا سارا خون نچوڑ ڈالا تھا، اس نے اپنے کاندھوں سے بوجھ اتار پھینکنے کے لیے بمشکل ذرا سی کوشش کی تھی کہ انسپکٹر کو شک گزرا کہ وہ ان پر حملہ کرنے کے لیے بیگ سے اسلحہ نکالنے والا ہے۔

''کوئی بھی حرکت کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تم ہم سب کے نشانے پر ہو۔'' انسپکٹر پھرتی سے اعجاز کا نشانہ لیتے ہوئے چیخا تھا۔

''خدا کے لیے ان بے گناہوں پر گولی مت چلاؤ۔ میں تمہارے مطلوبہ دہشت گرد تمہارے حوالے کر دوں گا۔'' مہربان خان نے بھرپور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو پولیس کے سپاہیوں خود کو سے چھڑوا کر انسپکٹر کی طرف دوڑتے ہوئے کہا تھا۔

مہربان خان بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود بہت سے پولیس اہلکاروں کو دھکیل کر پوری قوت سے انسپکٹر کی طرف دوڑا تھا، مگر انسپکٹر کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی ریوالور سے گولی نکل کر اعجاز کا سینہ چھلنی کر چکی تھی، پھر اگلے ہی لمحے اوپر نیچے دو گولیاں اور فائر ہوئی تھیں جو مہربان خان کی دونوں ٹانگوں کے آر پار ہو گئی تھیں، ٹانگوں میں گولیاں لگنے سے مہربان خان زمین پر گر پڑا تھا۔

مہربان خان نے عارف اور صداقت کو وقتی طور پر اسی کمرے کے واش روم میں چھپا دیا تھا، جیسے ہی گولیاں چلنے کی آواز ان کے کانوں میں پڑی وہ اپنی جان بچانے کے لیے گھبرا کر پچھلے دروازے سے باہر کی طرف دوڑ پڑے تھے، لیکن پولیس کی شکل میں موت ان کے سامنے کھڑی تھی، پولیس کے اہلکاروں اور افسران نے جیسے ہی دونوں نوجوانوں کو کاندھوں پر اسلحہ و بارود سے بھرے بیگ لٹکائے تیزی سے اپنی طرف بڑھتے ہوئے پایا تو ایک ساتھ بہت سی بندوقوں اور پستولوں نے انہیں اپنے نشانے پر لے لیا تھا، مہربان خان اپنے زخموں کو بھول کر انہیں فائر نہ کرنے کی التجا کرتا رہا مگر کسی نے بھی اس کی ایک نہیں سنی تھی اور ان پر فائر کھول دیا گیا تھا، بہت سی گولیاں عارف اور صداقت کے جسم میں پیوست ہوتی چلی گئی تھیں اور انہیں ابدی نیند سلا گئی تھیں اور ان کے کاندھوں سے لٹکے ہوئے بیگوں سے بہت سی کتابیں نکل کر ادھر ادھر بکھر گئی تھیں۔

انسپکٹر کو اس بات کا ذرا سا بھی دکھ نہیں تھا کہ اس نے تین بے گناہ نوجوانوں کی جان لے لی تھی، بلکہ سینے پر سجنے والے تمغوں اور نقد انعام کا سوچ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی تھی۔

ختم

قسط نمبر 19

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو نات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو نات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

گرباج کی پوری توجہ میری طرف تھی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں ہی میں نہیں بلکہ اس کے چہرے سے ٹپکتی نفرت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں اور میرے ساتھی نہتا ہو چکے تھے۔

''چند منٹ اگر تم لیٹ ہو جاتے تو شاید ہم کبھی نہ ملتے۔ خیر، یہ اچھا ہوا یا برا، تم لوگوں نے میری مہمان نوازی کی اب ہم تمہاری مہمان نوازی کریں گے' چلو۔'' اس نے کاریڈور میں اس طرف چلنے کا اشارہ کیا، جدھر سے دو بندے تیزی سے آئے تھے۔ میں ایک لفظ بولے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔ مجھے یہ پوری طرح احساس تھا کہ جب انہوں نے ہماری تلاشی لی تھی، اس وقت ان کی توجہ اس آلے کی طرف نہیں گئی، جس سے ہم سبھی ایک دوسرے کی بات سن سکتے تھے۔ وہ گردن کے پیچھے تھا اور اس کا مہین سا مائیک ہمارے کانوں میں لگا ہوا تھا۔ یہی احساس مجھے اطمینان دے رہا تھا کہ یہاں ہونے والی باتیں بانیتا کور کے ساتھ ان ساتھیوں نے بھی سن لی ہوں گی، جو سیڑھیوں کے ذریعے اوپر آرہے تھے۔ بانیتا کور ان کے ساتھ تھی۔ اس سمیت سبھی محتاط ہو گئے ہوں گے یا نہیں، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ ہمیں لیتے ہوئے بالکل سامنے والے دروازے پر آن رُکے۔ انہوں نے دروازے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک لمبے قد والی لڑکی کھڑی تھی، جس نے سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سفید شرٹ پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی تھی اور اس کے بال بندھے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں وہ بزنس وویمن دکھائی دے رہی تھی، لیکن اس کی نیلی آنکھوں میں سے سفاکیت جھلک رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے میرے ساتھیوں کو وہیں رکنے اور مجھے اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ پشت پر دروازہ بند ہو گیا اور اس لڑکی نے پسٹل نکال کر مجھ پر تان لیا۔

''چلو، آگے بڑھو۔'' اس نے انگریزی میں تحکمانہ انداز میں حقارت سے کہا۔

وہ ڈرائنگ روم تھا، جس کے آگے ایک اسٹڈی روم تھا۔ وہ مجھے وہاں لے گئی، سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ جھریوں بھرے چہرے پر کسی جذبے کا کوئی احساس تک نہیں تھا۔ اس نے جو لباس پہنا ہوا تھا، اس سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ وہ یہودی ہے۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''بہادر ہو لیکن اپنی مسلمان قوم کی طرح بے وقوف

بھی ہو۔ اتنی بڑی آفر تم ٹھکرا چکے ہو۔ ہم چاہتے......"

"تم یہودی ہو، تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے، اس لیے تمہیں گالی دینے کی ضرورت نہیں۔ تم ابلیس کے سچے پیروکار ہو، اس آدمی کے گھٹیا ہونے میں کوئی شک نہیں جو انسانیت کے مقام سے گر کر ابلیسیت کی دلدل میں گر جائے۔" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا جو میری بات سن کر بھی سپاٹ رہا۔ چند لمحے بعد بولا۔

"تم لوگ وہی کرتے ہو جو ہم چاہتے ہیں۔ اسی بر صغیر پر کتنے انگریز تھے؟ تمہارے ہی بھائی بند ایک دوسرے کو مارتے رہے اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ بولو کامیاب کون ہے، ہم یا تمہاری احمق قوم، گھٹیا ہم ہوئے یا تم؟"

"یہ تو اپنی اپنی سوچ ہے نا کہ کون کس چیز کو کامیابی سمجھتا ہے۔ تم ابلیسیت کو پھیلانا چاہتے ہو اور ہم انسانیت کو اس کا اعلیٰ مقام دینا چاہتے ہیں۔ تم مجھ سے اپنی بات منوا سکے؟ نہیں نا، یہ میری کامیابی ہے۔" میں نے انتہائی طنز سے کہا۔ اس پر وہ ذرا سا مسکرا دیا۔ پھر حقارت بھرے لہجے میں بولا۔

"تم ...... اور تمہاری کامیابی...... ہماری گریٹ گیم میں تیرے جیسے تنکے ذرا سی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہماری بچھائی ہوئی بساط پر تیرے جیسے مہرے نہیں ہوتے، ہاں مہروں کو بساط تک لانے میں ایندھن کی طرح کام آتے ہیں۔ تیری کامیابی اس لڑکی کے پسٹل کی چند روپے والی گولی میں تحلیل ہو جائے گی، وہ بھی چند لمحوں میں۔"

"تو دیر کس بات کی ہے۔" میں نے کہا تو اسی لمحے پسٹل کی نال میرے سر پر رکھ دی گئی۔

"بس دو لمحے ...... لیکن ہم یہ بلٹ بھی ضائع نہیں کریں گے۔ ابھی فورسز کے لوگ یہاں آ جائیں گے اور وہی سب کچھ تم لوگوں کے ساتھ کریں گے۔ یہ ہے کامیابی۔ تم بھی اپنے وطن سے دور ہو اور میں بھی۔ تم ایک دہشت گرد بن کر یہاں کی جیلوں میں اذیت ناک زندگی گذارو گے اور میں، میرے ایک اشارے پر ممبئی کرائم برانچ، خفیہ ایجنسیاں، آئی بی، را ان سب کے لوگ دوڑے چلے آئیں گے۔ بھارتی قانون "ٹاڈا" تو کیا، تم مہاراشٹر کا قانون "مکوکا" ہی برداشت نہیں کر پاؤ گے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"دیر مت کرو، میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"میرے ساتھ کیا ہوگا، میں یہ بھی جانتا ہوں۔ بھارتی حکومت پر میرا احسان ہوگا۔ ایک پاکستانی دہشت گرد اور اس کا نیٹ ورک ان کے حوالے کر رہا ہوں۔ رامیش پانڈے میرا احسان مند ہوگا۔ دنیا کو یہ خبر ہی نہیں ہوگی کہ تم میرے ہی لائے ہوئے کاٹھ کے وہ الّو ہو، جو ہمارے اس زمین ہاؤس سے نہیں بلکہ کسی سڑک سے پکڑے گئے ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن کچھ لوگوں کی آنکھیں بند نہیں ہیں۔ میری کوئی حیثیت نہیں، لیکن میری جگہ کوئی دوسرا آ جائے گا اور......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔ دیکھو احمق۔ یہاں بھارت میں اپنا اثر رسوخ بنانے کے لیے ہم نے کتنی محنت کی۔ سوڈے کی بوتلوں سے کام شروع کر کے آج انہیں اسلحہ فروخت کر رہے ہیں، جو آخر کار تیرے ملک پر چلایا جانا ہے۔ اتنا سب کچھ چند لوگوں کے ذریعے نہیں ہوتا، اوپر سے لے کر نیچے تک گرفت کرنا پڑتی ہے اور وہ ہم نے کر لی۔ بھارت اپنے یوم آزادی پر ہمارے اسلحے کی نمائش کر رہا ہے۔ تمہیں تمہارے ملک سے اٹھایا اور جزیرے تک لے کر گئے، کیا خیال ہے، وہ راڈار میں نہیں آیا؟ یہ سمجھ لو، ہماری طرف سے آنکھیں بند ہیں۔"

"تم باتیں ہی کرو گے یا مجھے گولی بھی مارو گے۔ اتنی تفصیل بتا کر مجھے مرعوب کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔" میں نے حقارت سے کہا۔

"نہیں، تمہیں اب بھی ایک چانس دے رہا ہوں۔

سنو۔ یہیں برصغیر میں راجے مہاراجے، نواب، جاگیردار اور وڈیرے ہیں نا، ان میں سے ایک تمہیں بھی بنا دوں گا، یہ میرا یعنی ڈیوڈ ربینز کا وعدہ ہے۔ ہمارے لیے کام کرو۔ قوت ہم دیں گے، عیش تم کرنا۔'' اس نے چمکتی آنکھوں سے کہا۔

''تم تو بہت بڑے احمق ہو، مجھے زندہ......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

''اپنے سوا، اپنے ہر ساتھی کو خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کرنا ہوگا، وہ بھی جنھوں نے رامیش پانڈے پر حملہ کیا ہے۔ صرف تم رہو گے، یہی ایک راستہ ہوگا تم پر اعتماد کرنے کا، بولو۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ تو میں ایک لمحے کے لیے سوچنے لگا۔ اس دوران میں نے جائزہ لے لیا کہ اس لڑکی کے سوا کوئی اور اس کمرے میں تو نہیں تھا لیکن اس اپارٹمنٹ اور اس بلڈنگ میں تو ہو سکتے تھے۔ پسٹل میرے سر پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''پہلے یہ پسٹل ہٹاؤ۔'' میرے کہنے پر اس نے اشارہ کیا اور لڑکی نے پسٹل ہٹا لیا۔ تب میں نے کہا۔

''دیکھو، یہ ایک بہت بڑا فیصلہ ہے۔ اپنی منحوس شکل ہٹا کر اس حسین لڑکی کو میرے سامنے بٹھاؤ تاکہ میں کچھ اچھا سوچ سکوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر اس لڑکی کے گالوں کو چھوا، جس پر اس لڑکی نے برا مناتے ہوئے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

''تم کتنا وقت لو گے سوچنے کے لیے؟'' ڈیوڈ ربینز نے پوچھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس اس حسینہ کے انتظار میں ہوں۔''

میرے اتنا کہتے ہی باہر سے میرے کانوں میں منمناہٹ ہوئی کہ جانی بھائی اپنے لوگوں کے ساتھ پہنچ چکا ہے اور بانیتا کور تیار ہے۔ سیڑھیوں والے لوگ محفوظ ہیں۔ کہو تو دھاوا بولیں۔

''ایسی بکواس مت کرو۔ تم نہیں جانتے کہ یہ کون ہے۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''کوئی بھی ہو۔ میرے لیے تو ایک خوبصورت حسینہ ہے۔ بس ذرا سا وقت دو، اس اسٹڈی روم سے بیڈ روم تک کا سفر طے کرنا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اشارہ دے دیا، اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر پھر سے اس کے گال چھوئے تو اس نے پھر میرا ہاتھ جھٹکا لیکن اس بار میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بجائے اسے میز پر پھینکنے کے، اس کا سہارا لے کر میں اٹھا ایک ٹانگ سے کرسی کو دھکا دیا اور دوسری ٹانگ کا پیر سیدھا ڈیوڈ ربینز کے منہ پر مارا۔ ایک دم سے ہلچل مچ گئی۔ میری ساری توجہ پسٹل پر تھی۔ تب تک وہ لڑکی میری بغل میں گھونسہ مار چکی تھی۔ میں نے پسٹل پر ہاتھ مارا تو وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ تبھی میں نے اس کی ناک پر پنچ مارا، وہ لڑکھڑائی۔ میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ ڈیوڈ ربینز پسٹل کی جانب بڑھا۔ میں اس سے پہلے ہی اس پر جا پڑا۔ تبھی اس لڑکی نے میری پسلیوں میں زوردار ٹھوکر ماری۔ ایک لمحے کے لیے میرا بدن سُن ہو گیا۔ میں پلٹا تو ایک اور ٹھوکر میرے سینے پر پڑی۔ میرے ایک ہاتھ میں پسٹل تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، فطری طور پر اس نے اپنی ٹانگ کھینچی، تب میں نے زور سے دھکا دیا تو وہ کولہوں کے بل جا گری۔ میں نے تیزی سے اٹھنا چاہا تو ڈیوڈ ربینز نے مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ تب تک وہ لڑکی کسی اسپرنگ کی مانند اٹھ کھڑی ہوئی اور کسی ماہر ریسلر کی طرح اپنی کہنی میری سینے پر مارنے کے لیے مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میں ہٹ گیا تو اس کی کہنی فرش پر لگی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ وہیں ساکت ہو گئی۔ مجھے بس اتنا ہی سا وقت چاہیے تھا۔ میں نے پسٹل کی نال اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھی اور ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور اس کے سر سے گولی نکل گئی۔ اسی لمحے ڈیوڈ ربینز کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر اٹھایا اور اسی کرسی لے جا کر بیٹھا دیا جہاں بیٹھا وہ حقارت بھرے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

اس میں ڈیڑھ منٹ سے بھی کم وقت لگا تھا کہ تبھی دروازہ کھلا اور دو کمانڈو ٹائپ نوجوان تیزی سے اندر آ گئے۔ میں نے پسٹل ڈیوڈ ربینز کے سر پر رکھ دیا تو وہ جہاں تھے، وہیں رک گئے۔ انہوں نے لمحوں میں صورت حال کا جائزہ لے لیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کمرے میں کیمرے لگے ہوئے ہیں اور ہمیں کسی جگہ پر دیکھا جا رہا تھا۔ میں نے باہر لوگوں کو سنانے کے لیے کہا۔

''یہ دونوں نوجوان جو یہاں تجھے بچانے آ گئے ہیں، نہیں بچا پائیں گے۔ اس کمرے میں لگے کیمرے بھی نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ یہیں کسی کمرے میں مجھے دیکھا جا رہا ہوگا لیکن اب تجھے مرنا ہے۔''

''تم مجھے مار بھی دو گے تو زندہ بچ کر نہیں جا سکتے ہو۔'' ڈیوڈ ربینز نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے یہاں سے زندہ جانا ہی نہیں ہے۔ تم نے مجھ پر ہاتھ ڈال کر اپنی موت کو دعوت دے دی ہے۔ اب میرے ساتھ باہر چلو گے یا یہیں مرنا پسند کرو گے؟'' میں نے سرد سے لہجے میں پوچھا۔

''دیکھو۔ اب بھی سوچ لو، دولت کا ایک ڈھیر تمہارا منتظر ہے۔ طاقت ایسی کہ تم......'' وہ بولا تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''تم ابلیسیت کے لیے یہاں ہو اور میں انسانیت کے لیے، تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم نے یہاں کے لوگوں کے بارے میں غلط اندازہ لگا لیا ہے۔ اب رامیش پانڈے سمیت ہر اس بندے کو پیغام مل جائے گا۔ چلو''

''میں مر جاؤں گا، تو کیا ہوا، ہماری جڑیں اتنی مضبوط ہو گئی ہیں کہ تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں نے جو نیٹ ورک یہاں بنا دیا ہے، تمہیں اس کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔'' اس نے غصے میں کہا۔

''اور میں نے فیصلہ کر لیا، تجھے اور تیرے نیٹ ورک کو میں نے ہی تباہ کرنا ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''ہونہہ......'' اس نے حقارت سے ہنکارا بھرا، پھر نفرت سے بولا۔

''تم ایک گھٹیا چیونٹی سے بھی زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، یہ خواب تو ہو سکتا ہے لیکن تیرے جیسے کمزور لوگ یہ خواب دیکھنے کی اوقات بھی نہیں رکھتے۔ میں چاہے مر جاؤں، لیکن شام ہونے سے پہلے تیرا خون کسی سڑک پر بہہ جائے گا۔ کیا تجھے یاد نہیں تمہیں تنکے کی طرح اٹھا لیا گیا تھا۔ ایک تنکا طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب چاہے مجھے مار دو۔''

''نیچے جا کر سڑک پر ماروں گا، اٹھو۔'' میں نے اس کا کالر پکڑ کر اٹھانا چاہا تو وہ کمانڈو نوجوان حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے مجھے کور کیا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ ڈیوڈ ربینز کے دائیں کاندھے کے اوپر گردن کے پاس تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے تھے۔ ان باتوں کے دوران میں پسٹل کو اس پوزیشن میں لے آیا تھا کہ ایک نوجوان کے چہرے کا نشانہ لے سکوں۔ جیسے ہی انہوں نے حرکت کی میں نے فائر کر دیا۔ گولی اس کی ناک اور آنکھوں کے درمیان لگی تھی اس کی تیز چیخ کمرے میں گونج گئی۔ میں نیچے بیٹھ گیا۔ دوسرے نوجوان نے اس تذبذب میں گولی نہ چلائی کہ کہیں ڈیوڈ ربینز کو نہ لگ جائے۔ یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں نے اس پر بھی فائر جھونک دیا۔ وہ تڑپ کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اسی لمحے دروازے کے باہر کاریڈور میں تیز فائرنگ ہونے لگی۔ ڈیوڈ ربینز کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ ہذیانی انداز میں بکواس کرنے لگا۔

''تم...... تم ایسا نہیں کر سکتے...... میں تمہاری قوم سے بدلہ لوں گا۔ ایک کے بدلے سو مریں گے۔''

میں نے اسے گردن سے پکڑ کر دروازے میں دے مارا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا چاہا، مگر وہ کسی میکنیزم سے بند تھا۔ میں اس دروازے پر فائرنگ کر کے گولیاں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ڈیوڈ کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اگر تم مجھے نہ مارو تو میں تمہیں جانے کا محفوظ راستہ دے سکتا ہوں۔''

”بولو......“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ جیب سے کارڈ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولا۔

”اسے دروازے پر لگاؤ۔“

میں نے کارڈ پکڑا اور دروازے پر لگایا۔ دروازہ تو کھل گیا، لیکن سامنے کا منظر کسی میدان کارزار سے کم نہیں تھا۔ تین لاشیں کاریڈور میں تھیں۔ اسی لمحے بانیتا کور ایک کمرے سے نکل کر باہر آئی اور مجھے دیکھ کر تیزی سے بولی۔

”نکلو، پولیس آرہی ہے۔“ میں نے ایک نگاہ ڈیوڈ کو دیکھا اور آگے کی جانب بڑھا۔ میں جیسے ہی بانیتا کور کے پاس پہنچا، اس نے پسٹل سیدھا کیا اور ڈیوڈ پر فائر کر دیا۔ میں نے دیکھا فائر اس کے چہرے پر لگا تھا۔

”باقی لوگ......؟“ میں نے آگے کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا تو میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگتے ہوئے بولی۔

”وہ نکل چکے ہیں۔ ان بے غیرتوں نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ یہاں پورا ایک کنٹرول روم تھا۔ نکل، میں نے بم رکھا ہے وہاں۔“

ہم سیڑھیوں ہی میں تھے کہ اوپر ایک دھماکا ہوا۔ ہم انتہائی تیزی سے نیچے پہنچے ہی تھے کہ سامنے کھڑے ایک نوجوان نے بلڈنگ کی پچھلی طرف سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ ہم وہاں سے نکلے تو سامنے ایک چھوٹی سی دیوار تھی۔ ہم نے وہ پار کی تو دوسری جانب ایک مصروف سڑک تھی۔ ہم نے اپنے ہتھیار چھپا لیے لیکن اس طرح رکھے کہ جیسے ہی ضرورت پڑے انہیں استعمال کر لیا جائے۔ وہاں ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ ہم تینوں نے بالکل نارمل حالت میں وہاں سے چلتے ہوئے سڑک پار کی۔ وہ ڈیسائی روڈ کا آف لنک روڈ تھا۔ اس کے سامنے ایک گلی تھی۔ جانی بھائی سے ہمارا مسلسل رابطہ تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے چار لڑکے بری طرح زخمی ہیں، جنہیں ٹریٹمنٹ کے لیے اسپتال کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ یہ اس نے اچھا کیا تھا کہ لڑکوں کی صورت میں اپنی شناخت نہیں چھوڑی، ورنہ اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتی۔ ہم نے محتاط انداز میں کچھ ہی فاصلہ پیدل طے کیا اور جیسے ہی اس گلی کی طرف بڑھے بائیں جانب سے ایک سیاہ فور وہیل کچھ فاصلے پر تیزی سے آرکی۔ اس کے رکتے ہی فطری طور پر ہم تینوں کی ادھر نگاہ گئی۔ اس میں سے ایک دم دو لوگ نکلے اور گنیں سیدھی کر لیں۔ ان کی گنوں کا رخ اپنی طرف دیکھ کر بلاشبہ ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ ہمارا شکار کرنے آن پہنچے تھے۔ لاشعوری طور پر ہم نے بھی ہتھیار نکال لیے۔

گلی کے پاس پرسکون ماحول میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہاں اگر فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو بہت سارے بے گناہ لوگ مارے جا سکتے تھے۔ میں نے بانیتا کور کی جانب دیکھا۔ ہمارے پاس فیصلے کے لیے لمحے سے بھی کم وقت تھا۔ اس نے وہاں سے نکل جانے کو ترجیح دی۔ ہم پوری قوت سے بھاگ کر گلی میں داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ سے فضا تڑتڑا اٹھی۔

ہم اس گلی سے نکل جانا چاہتے تھے۔ گلی بند بھی ہو سکتی تھی یا دوسری طرف سے دشمن کے لوگوں سے آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ ہمارے پیچھے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے بھاگتے ہوئے جانی بھائی کے لڑکے سے کہا کہ وہ گلی سے نکلتے ہی مخالف سمت میں نکل جائے۔ وہ سمجھ گیا۔ ہم جیسے ہی گلی سے نکلے، وہ ایک جانب مڑا اور لوگوں میں غائب ہو گیا۔ ہم نے ٹریفک کے بہاؤ کی پروا نہ کرتے ہوئے روڈ پار کرنے کی کوشش کی۔

فائرنگ رُکی ہوئی تھی۔ ہم نے روڈ پار کیا اور دوسری طرف جا کر دیکھا، چند لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ میں جلد از جلد اس چوہے بلی کے کھیل کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے چند منٹ چاہئے تھے غائب ہونے کے لیے، وہ ہمیں نگاہوں میں رکھے ہوئے تھے۔ وہاں ٹھہرنے کے باعث مزید فورسز آ کر ہمیں دبوچ سکتی تھیں۔ میں سڑک کنارے درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ میرے سامنے چار لوگ تھے جو تیزی سے روڈ پار کرنے کی کوشش میں تھے۔

مجھے فقط چار فائر کرنے کا وقت لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔

''نکلو بانیتا!'' میں نے بے ساختہ کہا اور روڈ کی دوسری جانب ایک گلی میں گھس گیا۔ گلی کی دوسری جانب ریلوے ٹریک تھا۔ جس کے پار جھونپڑیوں کی ایک پوری بستی آباد تھی۔

''کہاں ہو، یہ فائر......'' جانی بھائی نے پوچھا تو میں نے لوکیشن بتادی۔

''دیکھ برج کس طرف ہے۔'' اس نے پوچھا تو میں نے برج دیکھ کر اسے بتایا تو وہ بولا۔

''چل بڑو ٹریک پار کر کے بھاگ، برج کے نیچے پہنچ۔''

ہم دونوں نے ٹریک پار کیا برج کی طرف بھاگنے لگے، جو تقریباً آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس طرف برج کے نیچے چند لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، جو ایک دم سے کھڑے ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو ایک نے کہا۔

''ہم جانی بھائی کا دوست ہے، چل ہمارے ساتھ۔''

وہ ہمیں لیتا ہوا اس جھونپڑ پٹی کی جانب چل دیا۔ اس کے ساتھ دوسرے لڑکے بھی تھے۔ وہ ہمیں ٹین اور لکڑی سے بنے ایک چھوٹے سے گھر میں لے گیا۔ جہاں ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک جانب گنیش دیوتا کی مورتی کے سامنے دیا جل رہا تھا۔ جب تک ہماری سانس بحال ہوئیں وہ پانی کی بوتلیں لے آیا۔

''ادھر کا پانی آپ لوگ ہجم نا ئیں کر سکت ہے، یہ پیور واٹر پیؤ۔''

''کب نکلیں گے یہاں سے؟'' بانیتا نے پوچھا تو جانی بھائی کی آواز آئی۔

''ابھی آپ آرام کرو، اکھا ممبئی میں تم لوگن کی تلاش کے لیے فورسز لگ گیا ہے۔''

''وہ ہمیں اسی علاقے میں ڈھونڈیں گے جانی بھائی؟'' میں نے کہا۔

''لیکن اس طرح نکلنا بھی خطرناک ہے، ذرا ویٹ۔'' اس نے تیزی سے جواب دیا

''آج جس شے نے ہمیں بچایا ہے نا، وہ ہمارے درمیان رابطہ تھا، ورنہ ہم کب کے دھر لیے گئے ہوتے۔'' بانیتا کور نے سکون سے تبصرہ کیا

''وہ سالا گر باج بچ گیا۔'' میں نے دُکھ سے کہا۔

''نہیں بڑو، وہ سب سے پہلے مرا ہے، وہ کاریڈور میں تھا، جب ہم نے حملہ کیا۔'' جانی بھائی نے کہا، پھر لمحہ بعد بانیتا کہنے لگی

''اس بلڈنگ میں آٹھ اپارٹمنٹ تھے، یہ سارے انہی لوگوں کے پاس تھے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ان پر اس طرح حملہ ہو سکتا ہے، پورا کنٹرول روم تھا، تیری باتوں سے پتہ چلا......''

''اب نکلنا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''کہا نا تھوڑا ویٹ۔'' جانی بھائی نے کہا اور اُس طرف سے خاموشی ہوگئی۔ چند لمحے انتظار کے بعد بانیتا کور مجھے تفصیلات بتانے لگی جبکہ میں ڈیوڈ ریبنز سے ہونے والی باتیں یاد کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی باتیں مجھے کھائے جارہی تھیں۔

ساری رات جاگتے رہنے کے باوجود اس وقت بھی نیند میری آنکھوں میں نہیں تھی۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہم جتنا وقت یہاں رہے، اتنا ہی خطرہ بڑھتا چلا جائے گا۔ ہم فورسز کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے تو شاید انہیں ہمارا سراپتہ نہ ملتا لیکن ہم ان کی ناک کے نیچے سے ہی نکلے تھے اور اس علاقے میں موجود تھے۔ گذرتے لمحات کے ساتھ اسی علاقے پر ان کا فوکس ہو جانا تھا اور ہمارے لیے نکلنا بہت مشکل ہو جانا تھا۔ اس وقت میرے اندر بے چینی پورے عروج پر تھی۔

❁......❁......❁

گوا میں سب سے پہلے جسپال اور رونیت کور ہی ساحل کی طرف سے اس گیراج کی جانب نکلے تھے، جہاں ان کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ پیدل ہی وہاں سے نکلے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک جگہ اکٹھے ہو کر وہ گیراج تک جا پہنچیں گے لیکن ایک دم ہی سے ناکہ بندی ہونا شروع ہو گئی تو فرینڈس نے سب کو الگ الگ نکل جانے کا مشورہ دیا۔

جسپال اور رونیت اس وقت ساحل سے شہر کی طرف جانے والی مصروف سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ مقامی اور غیر ملکی لوگوں کی وہاں پر گہما گہمی تھی۔ سڑک کنارے کافی اسٹال لگے ہوئے تھے، جہاں مختلف چیزیں مل رہی تھیں۔ رونیت وہاں چیزیں دیکھنے لگی۔ تبھی انہیں سندو کا فون ملا۔

''جسپال! ایک بری خبر ہے۔''

''کیا؟'' اس نے مرتعش لہجے میں پوچھا۔

''چندی گڑھ میں کچھ لوگ پروفیسر کو اٹھانے آئے تھے۔ مقابلے میں تین لڑکوں کے ساتھ پروفیسر بھی مارا گیا ہے۔ ظاہر ہے ان کے نیٹ ورک کی نشاندہی گرباج نے کی ہوگی۔'' اس نے رنجیدہ لہجے میں بتایا تو جسپال سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔ اس کا مطلب ہے اب چندی گڑھ محفوظ نہیں۔''

یہاں اور وہاں چندی گڑھ میں بھی پولیس ہی نہیں اور بہت سارے لوگ بھی پوری طرح الرٹ ہو چکے ہیں۔ تم لوگ جس قدر جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل جاؤ۔ ہم بعد میں آتے رہیں گے۔ تم جہاں بھی جاؤ، رابطہ ضرور کرنا، مجھے جمال کا بھی کچھ پتہ نہیں چل رہا۔''

''تم لوگ ہو کہاں پر؟'' جسپال نے پوچھا۔

''ہم یہاں ساحل پر ہی ہیں۔ یہاں کے سارے راستے بند ہیں۔ سخت چھان بین ہو رہی ہے۔ ہمیں نکلتے ہوئے وقت لگ سکتا ہے، اتنی دیر میں تم لوگ...... '' اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی

''اوکے، تم لوگ اپنا خیال رکھنا۔'' جسپال نے کہا تو رابطہ کٹ گیا۔

جسپال نے رونیت کی طرف دیکھا، وہ چیزیں خریدنے میں محو تھی۔ جسپال نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا تو وہ فوراً ہی پلٹ کر جسپال کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جو سپاٹ تھا۔ اس نے رونیت کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر چل دیا۔ جسپال کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ پروفیسر کے بارے میں اسے کیسے بتائے۔ کافی دور تک چلتے رہنے کے بعد رونیت نے تجسس سے پوچھا۔

''کوئی بات ہے جسپال؟''

''ہاں۔ لیکن تمہیں یہ بہت حوصلے سے برداشت بھی کرنا ہوگا۔'' وہ باوجود کوشش کے اپنے مرتعش لہجے پر قابو نہ رکھ سکا تو وہ بولی۔

''کہہ دو۔'' اس پر اس نے وہ ساری بات بتا دی۔ ایک لمحے کے لیے رونیت کور حواس باختہ ہوئی۔ پھر ایک دم سے جسپال کے گلے لگ کر رونے لگی، یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس نے رونیت کو رونے دیا۔ کچھ دیر وہ اس سے الگ ہوئی تو یوں ہو رہی تھی جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ پھر سسکتے ہوئے بولی۔

''وہ میرا باپ تھا اور وہی میری ماں، ہمیں فوراً چندی گڑھ نکلنا ہوگا۔''

''یہ دیکھ لو کہ وہاں رسک ہے۔'' جسپال نے کہا تو وہ ضد کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں، جو کچھ بھی ہو، میں انتم سنسکار میں ضرور شامل ہوں گی۔''

''اوکے۔'' جسپال نے کہا اور ائیر پورٹ کے لیے ٹیکسی دیکھنے لگا۔

❁......❁......❁

سہ پہر ہو گئی تھی اور ہم اسی جھونپڑی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس دوران جانی بھائی نے ہم سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ہمارے کانوں کے ساتھ لگے آلات خاموش ہو چکے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری بے

چینی بڑھتی چلی جارہی تھی کہ وہی لڑکا فون لے کر آ گیا۔ دوسری طرف جانی بھائی تھا۔ وہ سکون سے بولا۔

"بڑو۔ ادھر اپنا حلیہ بدل اور ساتھ والی چھمیا (حسین لڑکی) کو بھی کہہ۔ تم دونوں اپن کے پاس آ جاؤ۔ ہوٹل پر نجر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ تبھی میری نگاہ ایک پیکٹ پر پڑی جو وہ لڑکا لے کے آیا تھا۔ ہم نے کپڑے بدلے اور کچھ دیر بعد میزبان لڑکے سمیت ہم اس جھونپڑ پٹی سے پیدل نکل پڑے۔ تقریباً دو کلومیٹر آگے ایک ٹیکسی ہمارے انتظار میں تھی۔ لڑکا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور ہم پیچھے، ٹیکسی چل دی۔ کافی دیر تک سفر کرتے رہنے کے بعد ہم ممبئی کے تجارتی اور پرانے علاقے کولابہ میں موجود ایک پرانی بلڈنگ کے پورچ میں آ رکے۔ ہم چھٹی منزل کے ایک اپارٹمنٹ تک جا پہنچے۔ اندر ڈرائنگ روم میں جانی بھائی بیٹھا ہوا تھا۔

کچھ دیر باتوں کے بعد میں اور بانیتا فریش ہوئے، پھر کھانے کے بعد جانی بھائی نے پوچھا۔

"جمال، اب تیرا پروگرام کیا ہے؟"

"یہیں ممبئی میں رہ کر اس ڈیوڈ کا سارا نیٹ ورک تباہ کرنا ہے۔ بس یہی میری......"

"شاید ابھی تو ایسا نہ کر سکے۔ ابھی کھانا کھا، سکون کر، ادھر لڑکا لوگ ہے، سیفٹی ہے۔ چاہے تو گھوم پھر لے۔ پھر بات ہوگی۔ لمبا لفڑا ہے۔ کچھ دن انڈر گراؤنڈ رہنا ہوگا۔" جان بھائی نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"دیکھ جانی بھائی، تو میرا محسن ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تجھے کوئی خطرہ ہو، وہ بھی میری وجہ سے۔ میں کوئی اور ٹھکانہ کر لوں گا تم......"

"ارے کیسن بات کرتا ہے بڑو، یہ دھول مٹی جو اٹھی ہے نا، دو چار دن میں بیٹھ جائے گا۔ پھر تم جو کرنا۔ ابھی آرام کر، پھر ملتے ہیں۔" یہ کہہ وہ اٹھا اور اپنا سیل فون مجھے دے کر اپنے لوگوں کے ساتھ چلا گیا۔ ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ دو تین لڑکے تھے، جو باہر تھے۔ میں اور بانیتا کور بیڈ روم میں آ گئے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا، یہ وہی علاقہ تھا جہاں انڈیا گیٹ، تاج محل ہوٹل اور دیگر مشہور عمارتیں تھیں۔ میرے دائیں جانب انڈیا گیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ میں واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ تو بانیتا کور نے لیٹتے ہوئے کہا۔

"جانی بھائی ٹھیک کہہ رہا تھا، بس سکون کرو۔ پھر میں بتاؤں گی کہ کیا کرنا ہے۔"

"کیا ہے تیرے ذہن میں؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"زوردار سنگھ کے پاس کوئی نہ کوئی......" اس نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

"چل ابھی سکون کرتے ہیں، پھر دیکھا جائے گا۔"

میں لیٹنے کو تو بانیتا کے پہلو میں لیٹ گیا مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ڈیوڈ ربنز کی باتیں میرا دماغ خراب کر رہی تھیں۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ بانیتا سو چکی تھی۔ میں اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ میں نے ایک لڑکے سے نیٹ کے بارے پوچھا۔ اس نے ایک کمرے میں پڑے کمپیوٹر کے بارے میں بتایا۔ میں اسے کھول کر بیٹھ گیا۔ روہی سے کافی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ انہوں نے ڈیوڈ کے بارے میں کچھ بھی نہ کرنے اور ایک نمبر پر بات کرنے کی بابت ہدایت دی ہوئی تھی کہ جو وہ کہے اس پر عمل کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی جسپال کا نمبر تھا۔ مجھے کافی حوصلہ مل گیا کہ اب جس نئی راہ کے بارے بتایا جا رہا ہے۔ ضرور اس کے ڈانڈے ڈیوڈ تک جاتے ہوں گے۔ میں نے پہلے جسپال سے رابطہ کیا۔ وہ چندی گڑھ پہنچ چکا تھا اور رونیت کے ساتھ پروفیسر کے انتم سنسکار میں مصروف تھا۔ میں نے دوسرا نمبر ٹرائی کیا۔ کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف ایک بھاری آواز سننے کو ملی۔ کوڈ ورڈ کے تبادلے کے بعد میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے کہا۔

"مجھے پتہ ہے، تم اس وقت انڈیا گیٹ کے پاس ہو۔ سورج ڈھلنے کے بعد، مجھے وہیں ملو۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی شناخت بتائی۔ میں نے جواباً ڈن کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں پہنچتا ہوں وہاں۔"

"اور ہاں، تمہارے ساتھ جو لڑکی ہے، اسے مت لانا، اسے کہو وہ واپس اپنے شہر چلی جائے۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ اب واپس اس اپارٹمنٹ میں نہیں آنا۔"

اس کے ساتھ ہی اس کا فون بند ہو گیا۔ میں کمپیوٹر کے پاس سے اٹھا اور بانیتا کور کے پاس گیا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ میں سوچ چکا تھا کہ اس سے کیا کہنا ہے۔

"بانیتا! ہمیں یہاں سے ابھی نکلنا ہے، فوراً۔"

"کیا ہوا؟" اس نے تیزی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تم یہاں سے سیدھی زور آور سنگھ کے پاس چلی جاؤ یا پھر امرتسر، ہمیں اب غائب ہونا ہے۔" میں نے تشویش سے کہا۔

"پر ہوا کیا ہے؟" اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے لیے فورسز اس علاقے میں پہنچ چکی ہیں۔ وہ لڑکا جو ہمیں یہاں چھوڑ گیا تھا، وہ پکڑا گیا ہے۔" میں نے کہا تو بانیتا کے چہرے پر تشویش لہرا گئی۔ زور دار سنگھ کا نمبر اسے یاد تھا۔ اس نے رابطہ کیا۔ اگلے چند منٹوں میں ہم وہاں سے نکل پڑے۔ بانیتا کور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر نکل گئی اور میں پیدل ہی انڈیا گیٹ کی جانب چل پڑا۔ سورج مغرب کی اوٹ میں جانے کو تیار تھا۔

میرے پیچھے سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہریں تھیں۔ انڈیا گیٹ سے مشرق کی جانب کافی فاصلے پر میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں لوگوں کا کافی رش تھا۔ ہر طرف لوگ سیر سپاٹے اور موج مستی کے لیے پھر رہے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد جوڑوں کی تھی۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک موٹا سا شخص گٹار پر اپنی بھدی آواز میں نجانے کس زبان میں کوئی گیت گا رہا تھا۔ میں اندر سے بے چین اور بظاہر پرسکون تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا کہ میرا اسیل فون بجا۔ وہی نمبر تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، وہیں موجود تھا۔ چند منٹوں میں وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ چھریرے بدن کا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ موٹے نقوش، سیاہ رنگ اور سرخ آنکھیں۔ غیر معمولی طور پر اس کی آواز بھاری تھی۔

"تم مجھے شیوا کے نام سے پکار سکتے ہو اور تمہیں آج رات یہاں سے نکلنا ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر یہاں تو ڈیوڈ......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

"اس کے لیے ابھی وقت چاہئے۔ وہ صرف ایک چھوٹا سا گروہ یا کسی مافیا کا نیٹ ورک نہیں ہے۔ اس میں حکومتیں شامل ہیں۔ حکومت کا مطلب، تمام فورسز اور اس کے پیچھے ان کی پوری قوت۔"

"تم مجھے ڈرا رہے ہو یا ان سے مرعوب کر رہے ہو؟" میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے، یہ نیٹ ورک توڑنا ہے، مگر اس کے لیے تھوڑا صبر، گہری پلاننگ اور طاقت کی ضرورت ہے۔ وہ اکٹھی کر لو، میں تمہیں یہیں ملوں گا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تو میں ایک دم سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میرے پاس اگر ارادہ اور حوصلہ ہے تو قوت بھی ہونی چاہئے۔ ابھی تو مجھے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ ڈیوڈ ربینز سے بات کہاں تک پہنچی ہوئی ہے۔ زمینی سطح سے لیکر حکومتی ایوانوں تک کتنی مضبوط چین ہے۔ جب تک مجھے ان کے بارے پتہ نہیں ہوگا، تب تک ہوا میں تیر مارنے کا کائی فائدہ نہیں تھا۔

"کیا کہتے ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو میں کہہ چکا۔ تجھے آج رات یہاں سے نکلنا ہے۔ اٹھو اور چلو میرے ساتھ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پھر سے میری آنکھوں میں دیکھا۔ میں اٹھ گیا۔

ہم وہاں سے پیدل ہی نکلے تھے۔ مختلف سڑکیں پار کرتے، گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم ایک گھر میں چلے

گئے۔ وہاں مجھے مقامی ماہی گیروں کے جیسے کپڑے دیئے گئے۔ وہاں کچھ لوگ اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب وہاں سے نکلے اور ممبئی ڈیک پر آ گئے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے چھوٹے بڑے جہاز، اسٹیمر، ماہی گیروں کی کشتیاں سمندر میں جاتی تھیں۔ سامنے لوہے کا پھاٹک تھا، جس پر دو سنتری کھڑے تھے۔ وہ ان ماہی گیروں کا اجازت نامہ دیکھ رہے تھے۔ شیوا ان سب سے آگے تھا۔ اسے دیکھتے ہی دونوں سنتری خوش ہو گئے۔ اس نے جاتے ہی ایک سنتری کے ہاتھ پر کچھ نوٹ رکھے، جو اس نے فوراً چھپا لیے۔ اجازت نامہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور ہم بڑے آرام سے آگے بڑھ گئے۔ ڈیک پر مختلف اقسام کی کشتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں نسبتاً ایک بڑی کشتی جسے وہ چھوٹا جہاز کہہ رہے تھے، اس میں جا بیٹھے۔ کچھ دیر بعد انجن اسٹارٹ ہوا اور ہم ممبئی سے بحیرہ عرب کے گہرے پانیوں کی طرف چل پڑے۔ شیوا میرے پاس نہیں آیا۔ وہ اپنے ساتھی ماہی گیروں کے ساتھ مصروف رہا۔ میں انجن والے کیبن میں پڑا تھا اور اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے بھارت سے نکل جانے کا اندازہ ہو گیا تھا۔

تقریباً رات کے دو بجے کا وقت ہوگا جب گہرے پانیوں میں ایک دوسری کشتی کے قریب جا پہنچے۔ دھیرے دھیرے وہ ساتھ لگی تو شیوا نے مجھے کیبن سے باہر آنے کو کہا۔ سب لوگ سوئے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے ساتھ لگی کشتی میں جانے کو کہا، جس میں چند لوگ کھڑے منتظر تھے۔ میں اس میں کود گیا۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور پھر کیبن میں چلا گیا۔ میرے والی کشتی چل پڑی۔ نئی کشتی والے لوگ مجھے کیبن میں لے گئے جہاں تیز روشنی تھی۔ میں ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ میرے سامنے کرنل سرفراز بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ گئے۔

''کرنل آپ؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا

''ہاں میں، آؤ بیٹھو۔'' انہوں نے مجھے گلے لگایا اور پھر ایک بیڈ نما جگہ پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ باقی لوگ باہر نکل گئے۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ یہاں پر ہو گے۔'' میرے کہنے پر وہ ذرا سا مسکراتے ہوئے بولے۔

''یہ دنیا ہے، اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن تم اس وقت سے میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو، جب سے تم میرے پاس تھے۔ تم میری ذمے داری میں ہو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر بولے۔

''تمہیں میلے سے اٹھا لیا گیا، یہ بے پروائی نہیں تھی۔ بس تجھے خبر نہیں کی گئی تھی۔ تجھے جال میں سے اٹھانے سے قبل تیری حفاظت پر مامور لوگ آ گئے تھے، مگر ان کا پلان بہت مضبوط تھا۔ اب تمہارا گھر محفوظ ہے۔ کیونکہ یہ اب میری ذمے داری میں ہے۔''

''یہ ذمے داری کس نے دی کرنل؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھا تو گہری سنجیدگی سے بولے

''میں نے خود لی ہے یہ ذمہ داری، جس طرح نیکی اور بدی کے درمیان ایک واضح لکیر ہے اسی طرح انسانیت اور شیطانیت کے درمیان بھی لکیر ہے۔ کون کس طرف ہے، یہ اب تم اچھی طرح جانتے ہو، اسی باعث ذمہ داری لی ہے میں نے۔''

''میری بس اب یہی آرزو ہے کہ میں ڈیوڈ ریبنز کا نیٹ ورک تباہ کر دوں۔ اس نے بہت غلط......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے انتہائی جذباتی لہجے میں بولے۔

''اس جیسے نجانے کتنے ہیں اس وقت بھارت میں ہیں، تم کس کس سے لڑو گے۔ اسے بھول جاؤ اور اب ہمیں کچھ ایسا کرنا ہے، جس سے ان سب کی ہمت جواب دے جائے، ان پر ہمارا خوف مسلط ہو جائے۔ یہودیوں نے تو یہاں جگہ بنائی ہے، اصل قصور وار تو وہ ہیں جنہوں نے انہیں یہاں جگہ دی۔ اگر جگہ دے بھی تو ان کا ملک ہے، جو چاہیں کریں، لیکن وہاں بیٹھ کر اگر میرے وطن کے بارے میں بری سوچ رکھیں گے تو وہ

دماغ ہی ختم کر دینا ہمارا فرض ہے۔ ہم یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔"

میں نے پہلی بار انہیں یوں جذباتی دیکھا تھا۔ اس لیے بڑی احتیاط سے پوچھا۔

"تو پھر مجھے یوں واپس کیوں؟"

دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رُکے اور پھر کچھ کھانے پینے کی چیزیں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں کھانے لگا۔ اس دوران وہ مجھ سے مختلف سوال کر کے بھارت میں ہونے والے واقعات پوچھتے رہے۔ کیبن میں انجن کا شور تھا۔ ہم باہر کھلی فضا میں پڑی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ تب میں نے پوچھا۔

"کرنل، آپ یہاں کیسے؟"

"میرا ایک مقصد ہے اور میں اسی کی حفاظت میں ہوں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مقصد اور حفاظت؟" میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

"دیکھو۔ مقصد کی حفاظت اصل حقیقت ہے، اس کے لیے جان دینی پڑے یا لینی پڑے، ایک ہی بات ہے۔ اب یہ مقصد ہمارے اندر کس قدر راسخ ہے، یہ ہمارے عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ عمل بتا دیتا ہے کہ ہم لکیر کے کس طرف کھڑے ہیں۔ انسان میں اچھائی اور برائی کی تمیز رکھی ہوئی ہے، اسی سے پتہ چلتا ہے۔ یہ ہمارے کردار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری آرزو کیا ہے۔ اس کا اظہار ہماری ذات نے کرنا ہے کیونکہ یہ ہمارے اندر ہی پڑا ہوا ہے۔ مقصد اسی وقت راسخ ہوتا ہے جب آرزو پیدا ہوتی ہے۔"

"یہ کس طرح ہو جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہر اکائی اپنے اندر کائنات چھپائے ہوئے ہے۔ جیسے ایک بیج سے پورا درخت وجود میں آتا ہے۔ اکائی ہے تو اس کا ظہور ہے۔ اکائی وہ قوت ہے جس میں ہر قوت جذب، پنہاں اور سموئی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بات میں تمہیں ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ دیکھو۔ پوری انسانی صورت ایک قطرے میں پڑی ہوئی ہے۔ ایک قطرے سے صورت اور صورت میں پھر سے قطرے کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں تخلیق کی آرزو ہوتی ہے۔ یہ سارا پراسس یا عمل، لذت کے باعث اپنی تکمیل کرتا ہے۔ سمجھو، تخلیق کی آرزو کی لذت قطرہ بن جاتی ہے۔ یہی جسم و جان کا ملاپ ہے۔ اس سارے پراسس یا عمل میں لذّت ہی اہم ہے۔ یہ لذّت وہ ہے جس میں تمام سراپا لذتیں پڑی ہوئی ہیں۔ جیسے کھانا پینا، سونا، دیکھنا۔ جب یہ لذت ظہور میں آتی ہے تو سراپا لذت ظہور میں آ جاتا ہے۔ کیا ہم اپنے حواس کی لذتیں نہیں جانتے۔"

"مطلب، آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی پراسس یا عمل اس وقت آگے بڑھتا ہے جب اس میں لذت ہوتی ہے۔" میں نے ان کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"اب دیکھو، دل، عقل اور جسم رُو بہ عمل ہیں۔ عقل کے پاس تصور ہے، جسم کے ساتھ کردار ہے اور دل کے پاس عشق ہے۔ جب ان تینوں کا میل ہو جاتا ہے تو عمل وجود میں آتا ہے۔ تصور، کردار اور عشق کی لذتیں آرزو سے پیدا ہوتی ہیں۔ آرزو ہی مقصد کو وجود میں لاتی ہے۔ یہی مقصد انسان کو عمل کے ذریعے تمام جہد اور پوری جانفشانی سے اسے، اس کے مقام انسانی تک پہنچاتا ہے۔ اسی میں انسان کی عظمت ہے کہ وہ انسان ہے۔ وہ انسان جو خدائی کا دعویٰ کرتا ہے، وہ مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ اب انسان خود دیکھ لے کہ اس کی آرزو کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔"

"مقام انسان کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے لیے تمہیں پھر سے اکائی کو سمجھنا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے، پھر کہتے چلے گئے۔ "اکائی کی ضد کثرت نہیں بلکہ تفرقہ ہے۔ یہ تفرقہ کیا ہے؟ صورت میں موجود ہر طرح کی سوچ پڑی ہے۔ اس میں حسد، منافقت، دوئی، غیر، ہوس، بے غیرتی، فساد، ظلم، تکبر، غرور، جیسی انسانی تذلیل والی سوچوں کو نکال کے باہر

پھینک دیا جائے اور اس کی جگہ اکائی سے یکتائی حاصل کی جائے، انسان وحدت میں آئے۔ وحدت پیدا کرنے والی قوت عشق ہے۔ جس میں غیر نہیں ہوتا، عاشق کی نگاہ اپنے محبوب پر رہتی ہے، وہی اس کا مرکز و محور ہوتا ہے۔ سارے مجاہدے، کوششیں اور جہاد انسانی صورت کی وحدت میں عین ہونے کے لیے ہیں۔ یہی مقام انسانیت ہے۔'' انہوں نے پورے جذب سے کہا۔

''اسے میں یوں سمجھا ہوں کہ آرزو ہی مقصد بناتی ہے، جسے لذت رُوبہ عمل کرتی ہے۔ تبھی اس کے کردار کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس مقام پر ہے۔'' میں نے کہا۔

''آرزو سے مقام تک کے سفر میں ریاضت سب سے ضروری ہے۔ مثلاً کمپیوٹر ہی کو لے لو، ایک آرزو پیدا ہوئی، اسے حقیقت تک لانے میں نجانے کتنے مرحلے درپیش ہوئے، کتنا وقت لگا اور کتنی کوششیں ہوئیں، اس کے بعد کیا ہوا، اب پوری دنیا انسان کی انگلی پر ہے۔ اب اس میں کتنی برائیاں ہیں اور کتنی اچھائیاں، وہی اس کے مقام کا تعین کرتا ہے لیکن انسان پھر بھی اس سے ماورا ہے۔ کیونکہ یہ سب انسان کر رہا ہے۔ یہ انسان کی آرزو کی تخلیق ہے۔ یہ انسانی آرزو کی گنتی میں آئے گا۔'' انہوں نے کہا، پھر لمحہ بھر کے لیے رُکے اور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر بولے، ''یہ بہت بڑی بات ہے کہ تمہارے اندر آرزو پیدا ہو گئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے ہی تھے کہ اندر سے ایک لڑکے نے فون آنے کی بابت بتایا۔ وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ اندھیرے میں سمندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کیبن سے چھن کر آتی ہوئی روشنی میں پانی نظر آ رہا تھا۔ میں اب تک کرنل سرفراز کے یہاں ہونے پر حیران تھا۔

کشتی کی رفتار کیا تھی اور ہم کس طرف جا رہے تھے، میں نے یہ کرنل سے پوچھا ہی نہیں تھا۔ وہ کافی دیر تک کیبن میں مصروف رہے تھے۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ اس وقت صبح کے آثار واضح ہونے لگے تھے، جب کرنل میرے پاس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کے دو مگ تھے۔ انہوں نے ایک مجھے دیا اور مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

سورج طلوع ہونے کو بے تاب تھا۔ مشرق کے ماتھے پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ سیاہ اور سرمئی بادل افق پر پھیلے ہوئے تھے۔ تبھی کرنل نے چائے کا سپ لیتے ہوئے گہرے لہجے میں کہا۔

''انقلاب کا سورج طلوع ہونے سے پہلے، اتنی سرخی پھیل جاتی ہے۔ آزادی کی سحر یونہی نہیں مل جاتی۔ پتہ نہیں کتنے سیکڑوں ہزاروں ستاروں کا خون ہوتا ہے تو سحر نصیب ہوتی ہے۔''

''بے شک آزادی یونہی نصیب نہیں ہوتی، یہ قربانی مانگتی ہے۔'' میں نے ان کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور اگر، اس آزادی کو ضائع کر دیا جائے، یا اس کا غلط استعمال کیا جائے، یا آزادی کے اصل ثمرات سلب کر لیے جائیں، تو پھر کیا کرنا چاہیے؟''

''آزادی کی حفاظت زندہ قومیں کرتی ہیں۔'' میں نے جوش سے کہا۔

''قوم، افراد سے بنتی ہے اور ہر فرد اپنی اکائی میں ایک پوری قوم ہے۔ کیا ہمارے اندر یہ آرزو ہے کہ ہم اپنی آزادی کی حفاظت کریں، کیا ہمیں یقین ہے کہ ہم اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتے ہیں؟ اپنی ہی قوم کا ہر فرد، اپنے اندر جھانک کر دیکھے کہ وہ اس آزادی کی، کس قدر حفاظت کر رہا ہے، یا آزادی کی حفاظت کرنے کی آرزو اس میں ہے؟ پتہ چل جائے گا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔'' انہوں نے بھیگے لہجے میں کہا۔

''میں نے تو اب تک جو دیکھا ہے، ایسا بہت کم ہے۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''یہی تو المیہ ہے، وہ سوچ جو اس قوم میں ہونی چاہیے تھی، وہ ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ جو ایک وطن کا مقصد تھا، یہ اپنے مقصد سے آشنا ہی نہیں ہوئے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے دور آسمان پر نگاہیں ٹکا دیں، پھر چائے کا ایک

طویل سپ لے کر بولے۔" زندگی کی بقا، واضح مقصد میں اور مقصد آرزو میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ آرزو میں جس قدر تڑپ ہوتی ہے، انسان کی پوشیدہ صلاحیتیں اتنی ہی بیدار ہوتی ہیں۔ ترقی کی نئی راہیں، کامیابی کی نئی تدبیریں اور عقل کی رسائیاں آرزو ہی کے بطن سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی سے انسان کے اندر وحدت افکار پیدا ہوتی ہے جو بالآخر وحدت کردار میں ظاہر ہوتی ہے۔"

"زندگی، مقاصد کی تخلیق کرتی ہے اور کسی بھی مقصد میں کامیابی آرزو کی شدت میں ہے" میں نے اپنا سبق دہرادیا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔

"آرزو تڑپ ہی نہیں رکھتی بلکہ وہ لذّت بھی رکھتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جس کے اندر آرزو کی تڑپ ہے، وہی اس کی لذّت سے واقف ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور لحہ بھر دیکھتے رہنے کے بعد بولے۔

"تم اکائی سے سفر کر کے یکتائی کی طرف جارہے ہو، یہ میں جانتا ہوں، اس لیے تم پر بھاری ذمے داری عائد ہوگئی ہے۔ تم نے سوال کیا تھا نا کہ میں یہاں پر کیوں ہوں، تو اسی مقصد کے لیے۔ یہ جو ممبئی سے کراچی تک کا سفر ہے، میں اس میں تم پر واضح کردوں۔ چاہو تو اپنے گاؤں جا کر پرسکون زندگی گذارو، یا پھر اپنی آرزو کے اپنے مقصد کا تعین کرلو۔"

"میرے مقصد کا تعین تو ہوچکا کرنل۔" میں نے کہا تو وہ بولے

"کیا ہے؟ میں سننا چاہتا ہوں۔"

"ہم نے عظیم قربانیاں دیں، یہ افق پر سرخی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، آزادی کا سورج طلوع ہو گیا۔ اس لیے کہ پاکستان کا مطلب ہے لا الہ الا اللہ۔ اور اب پاکستان کا مقصد ہے محمد رسول اللہ۔ یہی میری آرزو ہے، یہی میرا مقصد۔" میں نے پورے دل سے کہا۔ تب انہوں نے طویل سانس لی اور گہری سنجیدگی سے بولے

"کراچی پہنچ جائیں، باقی باتیں وہیں چل کر ہوں گی۔" یہ کہہ کر انہوں میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کردبایا اور کیبن کی جانب چل پڑے۔ میں اپنے سامنے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔

دوپہر ہونے کو تھی جب کشتی کراچی کے مضافات میں سمندر کنارے لگی۔ وہاں پہلے سے کئی لوگ موجود تھے۔ وہ چھوٹی کشتیاں لے کر تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ کرنل سرفراز اور میں ایک کشتی میں بیٹھ کر خشکی پر آگئے۔ سامنے ہی ایک فوروہیل جیپ کھڑی تھی ہم اس میں بیٹھے تو جیپ چل دی۔ تقریباً پندرہ منٹ چلنے کے بعد ہم ایک فارم ہاؤس کی طرز پر بنے گھر میں آگئے۔ وہاں موجود ملازمین نے مجھے ایک کمرے میں پہنچادیا۔ کچھ دیر فریش ہونے میں لگی تھی کہ مجھے کھانے پر بلالیا گیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر چھ لوگ موجود تھے، جن میں مختلف عمروں کے جوان مرد وخواتین تھیں۔ ساتواں میں وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد کرنل سرفراز وہیں آ گئے۔ نہایت خاموشی میں کھانا کھایا گیا۔ فقط برتنوں کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ کھانا ختم ہوتے ہی تیزی سے برتن اٹھالیے گئے اور چائے سرو کردی گئی۔ تبھی کرنل سرفراز بولے۔

"الحمدللہ۔ ہم سب خیریت سے یہاں پہنچ گئے۔ سب سے پہلے اپنا تعارف کرائیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر کرنل نے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ تیکھے نقوش والا، جس کی ہلکی ہلکی مونچھیں اور داڑھی جیسے ابھی اُگی نہیں تھی، مگر بال سیاہ اور گھنے تھے۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں جنید ہوں، تعلق پاکستان کے شہر پشاور کے نزدیک گاؤں سے ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا طالب علم ہوں، اتنی ڈگریاں تو میرے پاس نہیں ہیں لیکن اس زمانے کے جو مسائل ہیں انہیں حل کرنے کی صلاحیت ہے مجھ میں۔ امریکہ میں تھا، صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ذلیل کیا گیا۔ بہت سارے لوگ ابھی وہاں بھگت رہے ہیں لیکن میں اپنے آپ سے سمجھوتہ نہیں کرپایا ہوں۔"

اس سے آگے سانولے رنگ کا لمبا تڑنگا، متناسب جسم اور موٹی گردن والا نوجوان تھا، اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور سنجیدگی سے بولا۔

''میں اکبر علی ہوں، لوگ مجھے انٹیلی جنٹ کہتے ہیں۔ فارن افیئر اور سماجی بہبود میرا شعبہ ہے۔ معذرت خواہ ہوں کہ میں کوئی مذہبی آدمی نہیں لیکن وطن پرست ہوں۔ آئرلینڈ سے تعلیم لی، دنیا کے بیشتر ممالک میں رہا ہوں۔ ہمیشہ اپنے ملک میں انسانی تذلیل کے نظام پر کڑھتا رہا ہوں۔ میرا تعلق سندھ کے علاقے جامشورو سے ہے۔''

سخت چہرے اور سانولے رنگ کے اس نوجوان نے اپنا تعارف کرایا جس کے نقوش کافی حد تک موٹے تھے اور اچھا خاصا صحت مند تھا۔

''میں فہیم الحق ہوں لاہور کے نزدیک ایک گاؤں سے ہوں۔ آئی ٹی انجینئر ہوں۔ میں نے تعلیم تو امریکہ میں حاصل کی ہے لیکن کام اپنے وطن میں کرنا چاہتا ہوں۔ مختلف سوفٹ وئیر بنانے اور ہیک کرنا مجھے آتا ہے۔ یہاں نہ آتا تو چین چلا گیا ہوتا۔''

اس کے دائیں گال پر تل تھا اور شاید مسکراتے رہنا اس کی عادت تھی۔ کافی حد تک فربہ مائل، موٹے موٹے گالوں، غلافی آنکھوں، موٹے اور رسیلے لبوں والی اس لڑکی نے لب وا کیئے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں مہوش ہوں۔ ابھی حال ہی میں ملائیشیا سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ مائیکرو اکنامکس میں بہت آگے تک جانا چاہتی ہوں۔ پنجاب کے شہر ساہیوال سے میرا تعلق ہے۔''

اس کے ساتھ ہی ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت زیادہ سفید اور سرخ رنگ کی۔ انتہائی سرخ گال، پتلے پتلے ہونٹ اور گہری سیاہ آنکھیں جبکہ اس کے بال بھورے مائل تھے۔ اس نے سب کی طرف دیکھا اور کافی حد تک دھیمی آواز میں کہا۔

''زویا میرا نام ہے۔ اسلام آباد سے تعلق رکھتی ہوں۔ تحقیق و ترقی اور انسانی وسائل میرا شعبہ ہے لیکن کمپیوٹر میرا شوق ہے۔ برطانیہ سے تعلیم لی ہے۔ اب یہیں رہنا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے۔''

خوبصورت اور اسٹائلش، اس کے لباس میں رنگوں کا امتزاج آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ چہرے پر سرخی، سفید رنگت۔ وہ بولی تو اس کی آنکھیں زیادہ باتیں کر رہی تھیں۔

''میں گیت ہوں۔ فیشن ڈیزائنر، مگر میڈیا میرا کام ہے۔ میں اتنی مذہبی نہیں ہوں سمجھ لیں کہ سیکولر ہوں۔ کراچی سے ہی تعلق ہے۔''

''میں جمال ہوں، پاکستان کے شہر بہاول پور سے تعلق ہے مسلمان ہوں لیکن آپ سب جیسا پڑھا لکھا نہیں ہوں۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا تو کرنل سرفراز نے سب کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یہ جتنے بھی شعبے ہیں، ان کے علاوہ یہ سب تربیت یافتہ ہیں۔ پچھلے ایک برس سے یہ سب مختلف جگہوں پر وہی تربیت حاصل کر رہے ہیں، جو تم نے روہی میں حاصل کی ہے۔ ابھی ایک ماہ سے یہ روہی میں تھے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ جان لیا ہے۔ یہ پچھلے ایک ماہ سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ وہ جو تم کرتے رہے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئے، ایسے میں ایک نوجوان اندر آ گیا۔ مجھے وہ جانا پہچانا لگا۔ اس پر کرنل نے کہا۔

''یہ ایک ماہی گیر کے روپ میں ہمارے ساتھ فیری میں آیا ہے۔ سلمان صغیر نام ہے اس کا۔ ہر طرح کے اسلحے اور بلیک مارکیٹ کی پوری معلومات اس پاس ہوتی ہیں، یہ مستونگ بلوچستان سے ہے۔''

سلمان نے سب کی طرف دیکھا اور خوشدلی سے سب کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہم سب کے درمیان اگر کوئی مشترک چیز ہے تو وہ ہے پاکستان، جو ہمارا وطن ہے۔ پاکستان وجود میں آیا، یہ خوش قسمتی ہے، لیکن اس کے ساتھ بدقسمتی یہ ہوئی کہ یہ ان ہاتھوں میں آ گیا جو اس نظریاتی مملکت کے خلاف رہے

اور فقط اپنی مرضی کا نظام مسلط کرنے پر پوری طرح ڈٹے ہوئے ہیں۔ اسے ایک فلاحی اسلامی ریاست بننا تھا۔ مگر ہوا کیا؟ یہاں پر کسی نہ کسی صورت میں آمریت مسلط رہی۔ وہ نظام جس کے لیے یہ پاکستان تخلیق ہوا تھا، اب تک خواب ہے۔ یہ سب اسی جاگیرداری نظام کی وجہ سے ہے، جو سفید انگریزوں کے بعد کالے انگریزوں کو منتقل ہوا۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس ملک کے سارے ثمرات چند خاندان سمیٹ کر لے جائیں اور انسانی تذلیل کا نظام اس کے عوام پر مسلط کر دیا جائے۔ سینتالیس سے لیکر اب تک حکمرانی کرنے والے جو ادارے ہیں، اسمبلیاں ہیں، ان میں کتنے انہی خاندانوں سے ہیں اور کتنے عوام میں سے۔ اس ملک کی نام نہاد اشرافیہ ہی اس ملک کو کتوں کی مانند بھنبھوڑ رہی ہے۔ انہی کتوں کے باعث کئی گدھ اس ملک کو نوچنے کے لیے رال ٹپکا رہے ہیں، اس کے ساتھ مل کر کئی چوہے اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ دیمک زدہ سوچ والے بے غیرت سیاست دان مفاد پرستی کی انتہا کیے ہوئے ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ وہی انگریز والا اصول کہ تقسیم کرو اور حکمرانی کرو، اپنایا ہوا ہے۔ انہوں نے پاکستانی قوم کو لسانیت، مذہبی تفرقہ بازی، صوبائی عصبیت اور اس طرح کے کئی خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہ دراصل ان کے بیریئر ہیں، تاکہ عوام انہی میں الجھی رہے اور وہ مزے سے حکمرانی کریں۔ ان سے نکلیں گے تو سوچیں گے لیکن ہم نے پاکستان کی حفاظت کرنی ہے۔ یہ کیسے ہوگا، یہ تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ مجھے تم لوگوں کو لیکچر دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"کرنل! امریکیوں نے ووٹ کے ذریعے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کس ملٹی نیشنل کمپنی کو خود پر حکومت کرنے کی اجازت دے۔ سو اس وقت جمہوریت کا تماشہ یہ ہے کہ اپنے اوپر سرمایہ داروں یا پھر جاگیرداروں کو مسلط کر لیں۔ یہ جمہوریت اور اس کا تماشہ ہم سمجھتے ہیں۔ آپ ہمیں یہ بتائیں، ہمارے کام کرنے کی سمت کیا ہوگی؟" سب سے پہلے جنید نے پوچھا۔

"اس وقت بیرونی طاقتیں پوری طرح پاکستان کو کمزور نہیں ختم کرنے کے درپے ہیں۔ ہندو کی سازش سے ہمارا ایک بازو کٹ گیا لیکن ایٹمی طاقت سے زور حیدری ہمیں عطا ہوگیا۔ پاکستان پہلا اسلامی ملک ہے جس نے یہ قوت حاصل کی۔ جس دن اس طاقت کا اعلان کیا تھا، اسی دن سے امریکن اس کی مخالفت میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ قوت ان سے چھین لی جائے اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک ہم سے یہ طاقت چھین نہیں لی جاتی۔ شاید دنیا کو ابھی معلوم نہیں کہ ہم زندہ قوم ہیں۔ اگر بے غیرت اور نام نہاد اشرافیہ اس ملک کو کمزور کرنے کے درپے ہیں، بیرونی ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، اپنے مفادات کے لیے ملک سے کھیل رہے ہیں تو یہاں غیور اور غیرت مند لوگ بھی ہیں جو اپنے ملک کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ ہم نے ہر اس قوت سے لڑنا ہے، اسے ختم کرنا ہے جو ہمارے ملک کو نقصان پہنچا رہی ہے اور اس ملک کے لیے وہ کچھ کرنا جو یہاں وہی نظام لے آئے جس مقصد کے لیے یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ تاکہ یہ وہی اسلامی فلاحی ریاست بن سکے، جس کا نمونہ حضرت عمرؓ نے ہمیں دیا ہوا ہے۔ ہمارا نعرہ ہوگا۔ پاکستان کا مقصد کیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

"کرنل! میں سمجھ گیا کہ آپ مجھے ممبئی سے یہاں کیوں لائے ہیں۔ ہمیں حکم دیں تاکہ ہم ابھی سے اس پر عمل کریں۔" میں نے پورے جذب سے کہا۔

"نہیں۔ مجھے حکم نہیں دینا، یہ سب تم لوگ خود طے کرو گے۔ آج اور ابھی سے یہ سب تمہارے ساتھی ہیں اور تم انہیں لیڈ کرو گے۔ تم لوگوں کا رابطہ رہی سے رہے گا۔ میں تم سب کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔" کرنل سرفراز نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا اور اٹھ گیا۔

یہ وہ لمحہ تھا، جب میں اس بھاری ذمہ داری کے لیے پوری جان سے لرز گیا۔ یہ لرزہ کسی خوف سے نہیں تھا،

بلکہ وہ سرخوشی تھی کہ میں بھی کسی مقصد کے لیے چن لیا گیا ہوں۔ میں نے سب کی طرف دیکھا، تو مسکرا دیا۔ انہوں ایک جاندار اور بااعتماد مسکراہٹ مجھے دی تو میں سرشار ہوگیا۔ مقصد واضح تھا۔

✽ ...... ✽ ...... ✽

جسپال اور رونیت نے پیتل کا وہ گڑوا میز پر رکھ دیا، جس کا منہ سرخ کپڑے سے بندھا ہوا تھا۔ اس میں پروفیسر کی راکھ اور ان جلے ناخن تھے، جسے وہ ''پھول یا استھیاں'' کہتے ہیں۔ میز کی دوسری طرف پروفیسر کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اگرچہ ایک عورت ہونے کے ناتے رونیت کو اس کا دکھ سمجھ سکتی تھی لیکن اسے یہ حیرت ضرور تھی اس کی آنکھ سے ایک قطرہ بھی آنسو کا نہیں بہا تھا۔ وہ چند لمحے ''استھیاں'' والے گڑوے کو دیکھتی رہی، پھر ہولے سے بولی۔

''رونیت پتر! اسے اسٹڈی روم میں رکھ آؤ۔ پھر آ کر میری بات سنو۔''

''جی بہتر۔'' رونیت کور نے فرمانبرداری سے کہا اور برتن اٹھا کر اسٹڈی روم کی جانب چلی گئی۔ پروفیسر کی بیوی اٹھی اور وہ بھی اندر کی جانب چلی گئی۔ جسپال وہاں اکیلا رہ گیا۔ وہ خود پروفیسر کی بیوی کے رویے پر حیران تھا۔ اس وقت اس کی حیرت مزید بڑھ گئی جب اس نے ناشتے کی ٹرے لا کر میز پر رکھ دی۔ اتنے میں رونیت کور بھی واپس آ گئی تھی۔ اس نے بھی حیرت سے دیکھا۔ پروفیسر کی بیوی نے ناشتہ رکھا، فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر رکھی، پھر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آؤ، پترو، پرشادے شکھ لو، تم لوگوں نے رات کا کچھ نہیں کھایا۔''

''ابھی دل نہیں کر رہا، میں بعد......'' رونیت نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

''کب تک پتر، کب تک کچھ نہیں کھاؤ گی۔ آؤ، ناشتہ کرو، پھر کچھ دوسرے کام بھی کرنے ہیں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ تینوں ناشتہ کرنے لگے۔ اس وقت وہ ناشتہ کر کے چائے پی رہے تھے کہ ابھیت سنگھ، گرلین کور، اور دوسرے جو سات تھے، وہیں آ گئے۔ ان سے چند لمحے بعد سندو بھی آ گیا۔ سب خاموش تھے لیکن ان کی آنکھیں بتا رہیں تھیں کہ ان میں سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ تبھی پروفیسر کی بیوی استھیوں والا برتن لے کر آئی، اس نے وہ درمیان میں پڑی ہوئی میز پر رکھا اور پھر ایک طرف صوفے پر بیٹھ کر سب کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھیں اشک بار تھیں، سوائے جسپال کے۔ وہ ان سب کو دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ ان کی پروفیسر کے ساتھ جذباتی وابستگی کس حد تک ہے۔ چند لمحے یونہی خاموشی میں گزر گئے، تبھی پروفیسر کی بیوی نے اپنے پلّو سے بندھا ہوا ایک کاغذ نکالا اور رونیت کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ پڑھ کر سب کو سنا دے پتر۔ یہ خط مجھے انہوں نے دو دن پہلے دیا تھا اور ساری بات سمجھا دی تھی۔''

رونیت کور نے وہ خط پکڑ کر کھولا اور پڑھنے لگی۔ وہ سب یوں متوجہ ہوگئے جیسے گرنتھ صاحب کی کوئی ''بانی'' پڑھی جانے والی ہو۔

''میرے بیٹوں اور بیٹیوں۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔ مجھے اگر کسی نے گولی نہ ماری تو میں ان دھمکیوں کے دباؤ میں مر جاؤں گا جو مجھے دی جا رہی ہیں۔ میرا یہ خط تم لوگوں کو اس وقت ملے گا جب میں نہیں ہوں گا۔ مجھے یہ یقین ہے کہ میرے اَنتم سنسکار کے بعد تم لوگوں کو جس پر ذرا سا بھی شک ہوا، تم اسے مار دو گے یا خود مر جاؤ گے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ تم لوگوں کے پاس دو راستے ہیں۔ نمبر ایک۔ خاموشی سے چپ چاپ اپنی دنیا میں کھو جاؤ۔ یہ بھول جانا کہ کسی پروفیسر نے تم لوگوں کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔ اپنی زندگی جیو۔ نمبر دو۔ انتقام لو، لیکن وہ ذاتی نہ ہو، ہم نے دھرم کے نام پر اپنی زندگی وقف کی ہے۔ اور دھرم ہی کے لیے کام کرنا ہے۔ تم لوگ جتھا بنا کر دھرم کے لیے ایک جُٹ کام کرو گے، تو سمجھو میری آتما شانت رہے

گی۔ میں سمجھوں کا میرا مشن آگے بڑھا ہے۔ اپنا ایک لیڈر چن کر اس کی تابعداری کسی گرو کی مانند کرنا۔ اسی میں تم لوگوں کی فتح ہے۔ ان دو راستوں کے علاوہ اگر کوئی اور بات کسی کے ذہن میں ہے تو وہ میری استھیوں کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ آگے جو کچھ کرنا ہے وہ تمہارا لیڈر یا گرو تمہیں بتا دے گا۔ واہگرو جی کا خالصہ، واہ گرو جی کی فتح۔'' ایک دم سے خاموشی چھا گئی تھی۔ کتنی دیر تک کوئی نہیں بولا۔ آخر رونیت کور ہی نے کہا۔

''بولو، کیا کہتے ہو، میں نے تو دوسرا راستہ چن لیا ہے۔ جسے پہلا راستہ پسند ہے، وہ ابھی جا سکتا ہے، اس پر کوئی گلہ نہیں ہوگا۔''

''دھرم کو کون چھوڑ سکتا ہے رونیت۔ ہمارا جینا مرنا اسی کے لیے ہے۔'' ابھیت نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا اور اپنا ہاتھ استھیوں والے گڑوے پر رکھ دیا۔ اگلے چند لمحوں میں سبھی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ایک طرح سے حلف دے دیا۔ ''قسم ہے مجھے اپنے گرو کی جو بھی اب ہمارا گرو ہوگا، اس کا حکم ہم پر فرض ہے۔''

سبھی نے اس کے ساتھ اونچی آواز میں دہرا دیا۔ وہ قسم دے کر اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھے تو چند لمحے بعد پروفیسر کی بیوی نے کہا۔

''پتر! یہ استھیاں اب تم لوگوں کے حوالے جب وقت ملے تو اسے فتح گڑھ صاحب لے جا کر جل پروا کر دینا۔''

''نہیں آپ ہمارے ساتھ جائیں گی۔'' رونیت نے تیزی سے کہا۔

''وہ تم جب جاؤ اور ہو سکے تو مجھے بھی لے جانا۔'' یہ کہہ کر وہ ان کے درمیان سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''دیکھو۔ اب ہم نے اپنا لیڈر چننا ہے، یہ کیسے ہوگا، اگر گرو جی کوئی اشارہ دے جاتے تو......'' ابھیت نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ تبھی اب تک خاموش بیٹھا ہوا ہرپال بولا۔

''ایک حل تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر بندہ اس شوٹر کو تلاش کرے جس نے پروفیسر پر گولی چلائی، جو پہلے تلاش کر لے گا، وہی لیڈر۔''

''یہ ٹھیک نہیں، اس کا مطلب ہے ہر بندہ لیڈر بننے کی خواہش لے کر نکلے گا۔ ایسا نہیں۔ میرے خیال میں ہر بندہ ایک کاغذ لے اور اس پر اپنے سوا اس کا نام لکھے، جسے وہ لیڈر مان سکتا ہے۔ جسے زیادہ مانیں گے، وہی لیڈر رہو گا۔'' ابھیت سنگھ نے گہری سنجیدگی سے کہا تو سبھی مان گئے۔ رونیت کاغذ لے آئی۔ کچھ دیر بعد جب چھ لوگوں کی طرف سے جسپال کا نام آیا تو وہ چونک گیا۔

''ہم تمہیں اپنا لیڈر مانتے ہیں۔'' ہرپال نے کہا۔

''وجہ۔ میں تو تم لوگوں کے درمیان......'' اس نے کہنا چاہا تو ابھیت بولا۔

''کم از کم میں اپنے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ میں نے تم میں وہ دیکھا ہے، جو کم از کم ہم میں نہیں۔''

''تمہیں ماننا ہوگا۔'' رونیت نے کہا۔

''یہ بحث نہیں ہے، میں ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا۔ لیڈر تو وہ ہو جو ایک جگہ ٹھہر کر تم لوگوں کی لیڈ کر سکے۔ اگر میں کہوں کہ سندیپ کو لیڈر بنا لو تو یہ بہتر رہے گا۔'' جسپال نے کہا تو سندو بولا۔

''میں کیسے، میں تو......''

''فی الحال تو یہ ذمہ داری لو، پھر بعد میں دیکھیں گے۔'' جسپال نے کہا تو ابھیت سنگھ نے اسی وقت استھیوں والے گڑوے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہارا وفادار رہوں گا اور سکھ دھرم کے لیے جان بھی دینی پڑی تو دوں گا۔''

اس کے بعد سبھی نے یہی عمل دہرایا تو سندو کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بڑے ہی گمبھیر لہجے میں بولا۔

''تو پھر سنو۔ ہم آج ہی چندی گڑھ چھوڑ دیں گے، مگر ہمارے کان اور آنکھیں ادھر ہی رہیں گے۔ کرتار پور صاحب میں استھیاں جل پروا (راکھ پانی کی نذر) کرنے کے بعد ہمارا ٹھکانہ کون سا ہوگا، یہ میں بعد میں

بتاؤں گا۔ فوراً نکلنے کی تیاری کی جائے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سب باہر جانے لگے۔

جسپال رونیت کور کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ رونیت کور تیزی سے سامان کے نام پر اپنے کپڑے اور لیپ ٹاپ کے ساتھ کچھ دیگر الیکٹرونکس کی چیزیں اٹھا رہی تھی۔ وہ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وہ تیار ہو چکی تو جسپال نے پوچھا۔

''چلیں۔''

''اوکے۔'' رونیت نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے رہے، تبھی رونیت ایک دم سے پلٹ گئی۔ اس نے بیگ اٹھایا، اور جسپال کے ساتھ باہر نکل گئی۔ پروفیسر کی بیوی اس کے انتظار میں تھی۔

کرتار پور تک کوئی ایسا واقعہ سامنے نہیں آیا جس سے انہیں شک ہو کہ دشمن ان کے پیچھے ہے۔ وہ چار گاڑیوں میں کرتار پور صاحب کے گردوارے جا پہنچے۔ انہوں نے پہلے جا کر ماتھا ٹیکا اور پھر پروفیسر کی استھیاں قریب بہتے ہوئے دریائے ستلج میں بہا دیں۔ جل پروا، رسم کے بعد سندیپ عرف سندو نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''اب ہم واپس چندی گڑھ نہیں جائیں گے۔ ہمارا ٹھکانہ اب جالندھر ہوگا۔ یہاں سے ہر بندہ اکیلا اکیلا نکلے گا اور مختلف وقت میں جالندھر پہنچے گا۔ اگر اس وقت دشمن ہماری تاک میں ہے تو اسے لگے کہ ہم جالندھر میں گم ہو گئے ہیں، یا یہیں سے کہیں دوسری طرف نکل گئے ہیں۔ سمجھو جالندھر ہی میں دشمن کی نگاہوں سے اوجھل ہونا ہے۔ کہاں ملنا ہے، یہ میں تمہیں ایس ایم ایس کر دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

رونیت کار چلا رہی تھی۔ جسپال پچھلی نشست پر اور پروفیسر کی بیوی اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ اس کی سندو سے بات ہو چکی تھی اور جالندھر بالکل نزدیک آ گیا۔ تبھی اس نے ایک دم سے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

''رونیت، میں جس مقصد کے لیے چندی گڑھ گیا تھا، وہ تو ہو چکا۔ وقت آ گیا ہے کہ مجھے اب جانا ہوگا۔''

اس پر رونیت کور نے شدت حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔

''تم اکیلے کون ہوتے ہو یہ فیصلہ کرنے والے؟ ہم تمہیں اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ اپنا لیڈر مان رہے ہیں، اب جبکہ وقت آ گیا ہے تو ہمیں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو؟ تم نہیں جا سکتے۔''

''میں تم لوگوں سے الگ نہیں ہو رہا ہوں، بلکہ جہاں کہیں بھی ہوں گا تم لوگوں سے جڑا رہوں گا، ایسی ہی توقع میں تم لوگوں سے بھی رکھوں گا۔ اب مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں روک نہیں سکتی لیکن اگر تم ہمارے ساتھ رہو تو یہ زیادہ اچھا ہوگا۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''تم مجھے اپنے قریب ہی پاؤ گی۔'' جسپال نے کہا تو وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''تمہیں یہ بات اب سندو کو بتانا چاہئے۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا اور سندو کو فون ملا دیا۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

کراچی شہر پر شام ڈھل کر رات اتر آئی تھی۔ ہم سبھی کلفٹن کے اس بنگلے میں تھے جو گیت کا تھا۔ ہم سب ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ملگجا اندھیرا تھا۔ سامنے سفید اسکرین تھی، جس کے پاس گیت کسی لیکچرار کی طرح کھڑی لیپ ٹاپ پر کچھ دکھانے کو تیار تھی۔ اس نے بٹن پریس کیا اور اسکرین کی جانب دیکھنے لگی۔ اسکرین پر ایک کچی بستی کے مناظر نمودار ہوئے۔ ایک مکان کی چھت پر لوگ ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے ہاتھ میں تاش کے پتے تھے۔ پاس ہی نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ وہ سب ''تین پتہ'' پر جوا کھیل رہے تھے۔ منظر بدلا تو ایک کمرے کا منظر دکھائی دینے لگا، اس میں ''چھکا'' پر جوا کھیلا جا رہا تھا۔ تبھی وہ فلم روک بولی۔

''یہ صرف ایک علاقے کا منظر نہیں ہے، یہ جوا کراچی

کے غریب علاقوں میں کینسر کی طرح پھیل رہا ہے۔ لاکھوں نہیں کروڑوں روپے روزانہ ادھر سے ادھر ہوتے ہیں۔ اب دوسرا منظر دیکھیں۔'' اس منظر میں لوگ پر چیاں لے رہے تھے۔ شہر کے مختلف علاقوں کی یکے بعد دیگرے کئی تصویریں سامنے لائی گئیں۔ تبھی اس نے کہا۔

''یہ سٹہ کھیلا جا رہا ہے۔ پرائز بانڈ کے نام پر چیاں دی جاتی ہیں اور کروڑوں روپے لگائے جاتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی منظر بدلا اور ایک شخص کو دکھایا گیا جو فون پر بات کر رہا تھا۔ وہ ساتھ میں تیزی سے لکھ بھی رہا تھا۔ اس کے پاس کمپیوٹر آپریٹر تھے، جو اس میں فیڈ کرتے چلے جا رہا تھے۔ ''یہ کرکٹ پر جوا کھیلا جا رہا ہے۔ یہ کام اب زیادہ بڑھ کر دیگر کھیلوں پر بھی ہونے لگا ہے۔ اس میں بات کروڑوں سے بھی اوپر تک چلی گئی ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر بولی۔

''آپ یہ سوال ضرور کریں گے، یہ میری نظر میں آسکتا ہے اور عوامی سطح پر چل رہا ہے اور عوام دیکھ رہے ہیں یا تو پولیس سوئی پڑی ہے جو اس جرم کو نہیں دیکھ رہی؟ تو میرا جواب یہ ہوگا کہ نہیں پولیس سوئی ہوئی نہیں ہے، وہ جاگ رہی ہے اور پوری طرح اس دھندے میں ملوث ہے۔ یہ دیکھیں یہ پولیس کا ادنیٰ سا ملازم ہے، ساجد نام ہے اس کا۔'' اسکرین پر ایک بھاری بھر کم شخص کا چہرہ ابھرا، جس پر خاصی کرختگی تھی۔ ''یہ ادنیٰ سا ملازم اس جوئے کی دیکھ بھال پر مامور ہے خود اپنی نگرانی میں کرواتا ہے لیکن یہ اس قدر طاقت ور آدمی سمجھا جاتا ہے کہ جس علاقے سے چاہے اپنی مرضی کے پولیس افسران کو تبدیل کروا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسے یہ طاقت کس نے دی؟''

''ظاہر ہے یہ مافیا ہوگا اور یہ ادنیٰ ملازم ایک مہرہ جو عوام کے سامنے ہے۔'' اکبر علی نے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا، اس کی سرپرستی یہ ایم این اے کر رہا ہے۔ جس کا تمام تر خرچ یہ ساجد نامی آدمی اٹھا رہا ہے۔ یہ معاملہ یہیں تک نہیں رکتا، یہ چند سیاسی لوگوں کو ایک کمپنی اپنی مرضی سے چلا رہی ہے۔ جو بظاہر کرنسی کا کام کرتی ہے۔ زمینی سطح سے اٹھایا جانے والا سارا سرمایہ یہاں تک آ کر پہنچتا ہے اور پھر یہی لوگ ہنڈی کے ذریعے سرمایہ باہر منتقل کر رہے ہیں۔ اور اس کے عوض باہر سے اسلحہ اور منشیات یہاں پہنچ رہی ہے۔ اس مافیا کو چلانے والے کچھ لوگ دوبئی میں ہیں اور کچھ دوسرے ممالک میں۔ انہی کے ہاتھ میں یہاں کی ڈوریں ہیں۔ وہ جب چاہیں یہاں کے حالات خراب کر دیں اور جب چاہیں امن اور سکون رہے۔'' گیت یہ کہہ کر خاموش ہو گئی تو اکبر علی نے پوچھا۔

''ان کے تو دوسرے ذرائع بھی ہوں گے؟''

''بالکل ہیں، لیکن ابھی میں انہیں چھیڑنا نہیں چاہتی، میں یہاں آپ کو پلان یہ دے رہی ہوں کہ یہی منی ایکس چینج والی کمپنی درمیانی پل کا کام دے رہی ہے۔ یہیں سے اگر ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں تو چھپے ہوئے لوگ سامنے آتے چلے جائیں گے جو اس سارے دھندے میں ملوث ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو پیغام دینا ہے۔'' گیت نے جذباتی انداز میں اپنی بات کہی

''گیت! یہ وقتی طور پر ہوگا۔ یہ پھر شروع ہو جائے گا۔ جب تک عوام خود جوا کھیلنا نہیں چھوڑیں گے۔'' جنید نے اپنی رائے دی۔

''زمینی سطح پر اگر جوا کھیلنے کے مواقع نہیں رہیں گے تو یہ کم ضرور ہو جائے گا، لیکن اس سے ہمیں طاقت مل جائے گی۔'' سلمان نے کہا۔

''بے شک ایسا ہی ہے، لیکن آپ ایک خوف مسلط کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی کوشش سے غرض ہے۔ نتیجہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔ ہدایت تو اس کے ہاتھ میں ہے نا۔'' فہیم نے تائید کی۔

''پلان کیا ہے؟'' میں نے پوچھا تو گیت نے اسکرین کی مدد سے پورا پلان اور اس کی تمام تر جزئیات بتا دیں۔ کچھ سوال جواب ہوئے۔ سب متفق ہونے کے ساتھ اپنی اپنی ذمے داری لے لی۔ کمرہ روشن ہو

گیا۔ تبھی جنید نے ایک بیگ سے کافی سارے سیل فون نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ عام سے دکھائی دینے والے سیل فون نہیں بلکہ خاص ہیں۔ میں نے اس سیل فون میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ یہ کسی جگہ بھی ٹریس نہیں ہو سکتے۔ صرف ایک بٹن دبانے سے یہ عام سیل فون بن جائے گا۔''

''واؤ! امیزنگ، بلیک مارکیٹ میں ابھی اس کی بازگشت تو ہے لیکن آیا نہیں۔'' سلمان نے حیرت سے کہا۔

''میری پٹاری میں اور بہت کچھ ہے۔ جو تمہیں بلیک مارکیٹ میں بھی نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں بہت کچھ ہے۔ اب فہیم اور زویا سے مل کر کوشش کروں گا۔ فی الحال یہ تو کریں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو سب تیار ہو گئے۔ میں ان کے ساتھ جانے لگا تو سلمان نے تیزی سے کہا۔

''نہیں آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ یہ کام ہمارے لیے کس قدر معمولی سا ہے۔ یہاں رہ کر آپ ہمیں پل پل محسوس کر سکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''بس دیکھتے جائیں۔'' زویا نے کہا تو میں وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔ زویا کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جنید، اکبر علی اور مہوش ایک گاڑی میں وہاں سے نکل چکے تھے۔ زویا اسی اسکرین پر لیپ ٹاپ کی شبیہہ دکھانے لگی جہاں گیت نے مناظر دکھائے تھے۔ ان کی تصویر تو میں نہیں دیکھ پا رہا تھا مگر ان کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی حرکات و سکنات چھوٹے چھوٹے رنگین دائروں کی صورت میں سامنے اسکرین پر واضح تھی۔

جنید، اکبر علی اور مہوش، اس کئی منزلہ عمارت کے سامنے جا رُکے۔ جہاں اس منی ایکس چینج کا مرکزی آفس تھا۔ وہ تینوں لفٹ کے ذریعے اس فلور پر چلے گئے۔ لفٹ سے نکلتے ہی ان کی تلاشی لی گئی۔ ان کے پاس سے کوئی ہتھیار نہیں نکلا سامنے ہی ڈیسک تھا۔ وہاں ایک خوبصورت لڑکی ان کی طرف متوجہ تھی۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔''

''ہمیں یہاں کے ذمے دار بندے سے ملواؤ، ہمیں معلوم ہے کہ مالک یہاں نہیں ہوتا۔'' جنید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس پر لڑکی نے حیرت اور پریشانی میں ان تینوں کو دیکھا، پھر فون پر کسی سے وہی بات دہرا دی، جو انہوں نے کہی تھی۔

''آپ ذرا انتظار کریں۔ رضوی صاحب بزی ہیں۔ وہ ابھی آپ سے ملتے ہیں۔''

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ یہیں فون پر بات کروا دو۔'' جنید نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو اس نے فون ملا کر پھر بات کی اور ریسور اس کی جانب بڑھا دیا

''ہیلو۔ کون بات کرنا چاہتا ہے؟'' رضوی نے پوچھا۔

''میں جنید ہوں۔ تمہیں نام سے نہیں کام سے غرض ہونی چاہئے۔ ایک دس کروڑ کی ڈیل ہے، کرنا چاہتے ہو تو ابھی مل لو، ورنہ ہم کسی دوسرے سے مل لیتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

''کیسی ڈیل؟'' رضوی نے پوچھا۔

''کیا فون پر ہی بات کرو گے یا سامنے بھی آؤ گے۔ اگر تمہارا رویہ ایسا ہی ہے تو ہم چلے جاتے ہیں۔'' جنید نے غصے بھرے لہجے میں کہا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔

''نہیں نہیں، آپ آؤ۔ میں انہیں کہتا ہوں وہ لے کے آتے ہیں۔''

ایک بار پھر ان کی تلاشی لی گئی اور انہیں رضوی کے آفس میں پہنچا دیا۔ وہ آدھے سے زیادہ گنجے سر والا تھا، موٹے نقش اور فربہ مائل ڈھیلی پتلون اس نے گیلس سے باندھی ہوئی تھی۔ اس نے کاروباری مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیا ہے دس کروڑ کی ڈیل؟''

مہوش نے اپنا لیپ ٹاپ اس کے لیپ ٹاپ کے پاس رکھ دیا۔تب تک جنید نے کہا۔

''بلیک منی ،دس کروڑ ہے، برطانیہ یا فرانس میں دینی ہے، کیا لوگے؟اور ہاں رقم کہیں سے لینی ہوگی۔''

''ایک کروڑ ،سیدھا حساب ہے۔'' رضوی نے سنجیدگی سے کہا۔

''ڈن، کرنسی کیسے لوگے، اپنے بندے بھیجو گے یا ہم ادھر ٹھہریں۔دوسری طرف رقم کب پہنچے گی؟'' جنید نے تیزی سے کہا۔

''رقم کہاں سے لینی ہے؟''

''ہوٹل فائن سے۔وہاں ہمارا ایک بندہ موجود ہے ،یہاں سے نزدیک ہی ہے۔''

''اوکے آپ ان کے ساتھ چلے جائیں اور رقم دے دیں۔رقم ملتے ہی دس منٹ بعد دوسری طرف پہنچ جائے گی۔ادھر کا پتہ کیا ہے۔''

''میں بتاتی ہوں۔'' مہوش نے کہا اور تیزی سے لیپ ٹاپ کھول لیا۔ ذرا سی دیر بعد اس نے پوچھا، آپکا ای میل پلیز تاکہ میں ساری معلومات آپ کو دے دوں؟'' رضوی نے ای میل بتا دیا۔مہوش نے تیزی سے لیپ ٹاپ پر کام کرتی رہی۔پھر دو منٹ بعد بولی۔

''آپ دیکھ لیں معلومات آپ کو مل گئیں؟''

رضوی نے اپنے لیپ ٹاپ پر نگاہ دوڑائی۔میل دیکھی اور کنفرم کر دی۔وہ تینوں اٹھ گئے۔

''میں ایک گھنٹے تک ہوٹل فائن میں انتظار کروں گا۔'' جنید نے کہا اور چل دیا باقی دونوں بھی اس کے پیچھے چل دیئے۔مہوش نے وہاں کی ساری معلومات اپنے پاس ٹرانسفر کر لی تھیں۔

دوسری کار میں سلمان، فہیم اور گیت تھے۔ان کا رخ نپئیر روڈ کی طرف تھا جہاں وہ منی ایکس چینج کا مرکزی دفتر تھا۔اس کے ساتھ ملحقہ ایک دو منزلہ عمارت تھی۔جہاں سارا کالا دھن لیا اور دیا جاتا تھا۔وہ عمارت پوری طرح روشن تھی۔اگر گیت نے اس عمارت کی جزئیات نہ بتائی ہوتیں تو پہلی نگاہ میں یہی لگتا تھا کہ اجازت کے بغیر اس عمارت میں گھسنا، ناممکن تھا۔فہیم گاڑی میں بیٹھا رہا۔ سلمان بڑے اعتماد سے نیچے اُترا اور اس نے وہ فرضی نام بتایا جو وہ کمپیوٹر سے دیکھ چکے تھے۔ضروری کارروائی اور تلاشی کے بعد انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ان کی کار وہیں روک لی گئی تھی اس لیے وہ تینوں پیدل چلتے ہوئے اس دفتر تک جا پہنچے۔انہیں معلوم تھا کہ اعجاز صدیقی اپنے دفتر میں ہے، جو ساری رقم کا حساب کتاب رکھتا ہے۔فہیم اس کا سب کچھ ہیک کر چکا تھا۔عملے کے باقی لوگ اس کے دفتر سے ملحقہ ایک ہال میں تھے۔اس وقت وہاں صرف چار لوگ موجود تھے۔

''جی ، بولیں ،آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟'' صدیقی نے تیزی سے اکتائے ہوئے لہجے میں یوں کہا جیسے اس کے پاس وقت نہ ہو

''ہم یہاں سے رقم لوٹنے آئے ہیں۔روک سکتے ہو تو روک لو۔'' گیت نے دھیمے مگر سرد لہجے میں کہا تو صدیقی ان کی طرف یوں دیکھنے لگا کہ جیسے وہ دونوں کسی دوسرے جہان کی مخلوق ہوں۔پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''پاگل ہو یا کسی دوسرے جہان کی مخلوق۔ایک منٹ سے پہلے تم پکڑے جاؤ گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے پاؤں کے نیچے لگا الارم کا بٹن دبا دیا۔کہیں بھی کچھ نہیں ہوا تو وہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔

''تمہارا یہاں کا سارا نظام ہم جام کر چکے ہیں۔تم کچھ بھی کر لو، کچھ نہیں ہوگا۔سامنے دیکھو، باہر لگے کیمرے اور تمہاری یہ اسکرین تاریک ہے، کسی کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے، باہر والوں کے لیے اندر سب سکون ہے۔یہ کہتے ہوئے سلمان نے اس کی دراز میں پڑا پسٹل نکالا، اس کا میگزین دیکھا، پھر صدیقی پر فائر کرنے کے لیے سیدھا کہا۔

''تمہارا پسٹل اور اب تم، کہو کیا کہتے ہو؟''

''مجھے مت مارو، تم جو چاہے یہاں سے لے جا سکتے ہو، میں کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔'' صدیقی نے دہشت

زدہ لہجے میں کہا۔

"اس دیوار گیر الماری کا نمبر بھی نہیں دو گے، جس میں کرنسی موجود ہے؟" سلمان نے کہا۔

"یہ...... یہ...... لو" اس نے سامنے رکھے کاغذ پر نمبر لکھ دیا۔ تب سلمان نے اسے گولی مارنے کی بجائے پسٹل کا دستہ زور سے اس کے سر پر مار دیا۔ وہ پہلے ہی دہشت زدہ تھا اگلے ہی لمحے وہ ڈھیر ہو گیا۔

گیت اور سلمان دونوں محتاط انداز میں باہر کی جانب لپکے۔ سامنے دو گارڈ پہرہ دے رہے تھے۔ دونوں کو گیت نے نشانے پر لیا تو سلمان نے پلٹ گیا۔ اس نے دیوار گیر الماری کو کھولا تو اندر سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ اس نے پہلے میز سے اٹھائیں ہوئی کچھ چیزیں اندر پھینکیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لیزر شعاعیں ختم ہو گئی ہیں یا نہیں۔ لیزر شعاعیں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ تیزی سے نیچے پہنچا۔ ہر طرف کرنسی نوٹ کی گڈیاں اوپر سے نیچے تک لگی ہوئی تھیں۔ سلمان تیزی سے کرنسی نوٹوں کو بیگوں میں بھرنے لگا۔

اس دوران جنید، اکبر اور مہوش وہاں پہنچ چکے تھے۔ جیسے ہی اندر سے انہیں کہا گیا کہ رقم کے تھیلے تیار ہیں۔ اسی وقت انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور گیٹ پر جا پہنچے۔ انہیں دیکھتے ہی سیکورٹی گارڈ الرٹ ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں جا کر بات کرتے، انہوں نے سائیلنسر لگے پسٹل سے فائر کر دیئے۔ ٹھک ٹھک کی آواز آئی اور وہاں موجود بندے زمین پر آ رہے۔ وہ تیزی سے اندر چلے گئے۔ ان کی راہ میں جو بھی آیا، وہ انہیں ڈھیر کرتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ صدیقی کے کمرے تک جا پہنچے۔ ہال میں موجود لوگ باہر کی صورت حال سے بالکل بے خبر تھے۔ وہ جیسے ہی ہال میں گئے تب انہیں پتہ چلا کہ باہر تو صورت حال ہی بدل چکی ہے۔ ایک بوڑھے آدمی نے فوراً اپنے ہاتھ سر پر رکھ لیے، باقیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ مہوش نے انہیں ایک جگہ اکٹھے ہو جانے کو کہا۔ وہ کونے میں لگ گئے۔ اس دوران وہ اپنے بیگ سے اسپرے کی بوتل نکال چکی تھی۔ وہ اس نے وقفے وقفے سے دو تین بار ان پر چھڑکا تو وہ بے ہوش ہوتے چلے گئے۔ ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ صدیقی کے کمرے میں آئے۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ مہوش نے اس کے منہ پر چھڑکاؤ کر دیا۔ جنید اکبر نیچے جا چکے تھے، جبکہ گیت اور مہوش باہر نگاہ رکھے ہوئے تھیں۔ جیسے ہی نکلنے کا راستہ صاف ہو چکا، فہیم اپنی فور وہیل اندر لے گیا۔ ذرا سی دیر میں وہ سولہ تھیلے انہوں نے فور وہیل میں رکھے اور باہر آ گئے۔ جنید اور مہوش دوسری کار میں بیٹھے اور وہ سب وہاں سے نکل پڑے۔

ٹیپو روڈ سے کلفٹن تک کا راستہ زیادہ سے زیادہ آدھے یا پون گھنٹے کا تھا۔ اگر اس میں ٹریفک نہ ہو تو وہ با آسانی اتنے وقت میں پہنچ سکتے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ وہاں سے نکلے اور چل پڑے تھے۔ دونوں گاڑیاں دو نقطوں کی صورت میں حرکت کر رہی تھیں۔ میرے بدن میں سنسنی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ یہی راستہ ان کے لیے خطرناک تھا۔ جبکہ وہ آگے پیچھے گاڑیاں دوڑاتے ہوئے آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ٹریفک اشارے پر رک بھی جاتے تھے۔ زویا نے شاید میری توجہ بٹانے کے لیے بتایا

"ان دونوں عمارتوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ سیکورٹی کے لحاظ سے۔ اگر ایک میں کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو دوسری میں فوراً پتہ چل جاتا ہے۔ اسی لیے انہیں دونوں طرف جانا پڑا۔ اس وقت وہ دونوں عمارتیں فہیم کی مرضی پر ہیں۔ وہ جیسے ہی ادھر یہاں پہنچیں گے۔ تب انہیں آزاد کر دیا جائے گا، مطلب ان کا سارا نظام معمول کے مطابق کام کرے گا، تب انہیں پتہ چلے گا کہ کیا ہو گیا ہے۔"

اس کے بتانے پر میں نے ایک طویل سانس لی۔ سامنے اسکرین سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اب تیزی سے قریب پہنچ رہے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ سب اسی کمرے میں تھے اور ساری بات بتا چکے تھے۔

''تو یہ مشن چند گھنٹوں میں ختم ہو گیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اکبر نے تیزی سے کہا۔

''نہیں، یہ مشن اب شروع ہوا ہے۔ ایک گھنٹے بعد جب اس سے جڑے سارے لوگوں کو پتہ چلے گا، ایک ایک کر کے وہ سب ہمارے جال میں آتے چلے جائیں گے۔ پھر یہاں بیٹھ کر ہم ان سے کھیلیں گے۔''

''میں رقم تہہ خانے میں پھینک آؤں، آؤ سب میری ہیلپ کرو۔'' سلمان نے کہا تو وہ سب باہر چلے گئے۔ میں زیر لب مسکرا دیا۔ ان کی سوچ وہی تھی، جو میری تھی۔ روہی نے انہیں ہیرا بنا دیا تھا۔

❁ ❁ ❁

جسپال سنگھ، جالندھر کے بائی پاس پر موجود، اسی موٹیل کے سامنے کھڑا تھا، جہاں وہ اور ہرپریت ایک رات گزار چکے۔ اس نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور اس موٹیل کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو سامنے ہرپریت کور بیٹھی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کا کڑھائی والا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ کس کر باندھی ہوئی چوٹی، ہلکا ہلکا میک اپ، پیروں میں اسی رنگ کا کھسّہ پہنے وہ پنجابن اس کی راہ تک رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہرپریت کے چہرے پر خوشی کے دیے روشن ہو گئے۔ وہ وہاں پر کسی کی بھی پروا نہ کرتے ہوئی اٹھی اور والہانہ انداز میں اس کے گلے لگ گئی۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ جسپال نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''پھوپھو کیسی ہے، انوجیت کیسا ہے؟''

''دونوں ہی ٹھیک ہیں اور تجھے بڑا یاد کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئی تو وہ بھی اس کے سامنے والی میز پر بیٹھ گیا۔ تبھی وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''تیری سب سے بری عادت یہ ہے کہ تم اپنے بارے میں نہیں بتاتے ہو کہ تم کہاں ہو، کیسے ہو، کوئی رابطہ نہیں ہوتا، کوئی پتہ نہیں ہوتا تمہارا۔'' اس پر جسپال بالکل خاموش رہا اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا

رہا۔ ہرپریت چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر غصے میں بولی۔

''میری بات کا جواب دو، میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے، کیا میں بک بک کر رہی ہوں، ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟''

''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم ابھی سے بیوی بن گئی ہو۔ یار...... جب تک لاواں (شادی) نہیں لگتیں، کم از کم دوست بن کر تو رہو۔''

''بہت دوست ہیں تیری، میں جانتی ہوں، ابھی جو تجھے چھوڑ کر گئی ہے، کون تھی وہ؟'' اس نے غصے بھرے لہجے میں تیزی سے پوچھا۔

''تم دیکھ رہی تھیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تو دو گھنٹے سے اس سڑک پر نظریں جمائے ہوئے ہوں۔'' ہرپریت نے تیزی سے کہا تو جسپال کو اس پر بڑا پیار آیا۔

''رونیت کور تھی وہ، تمہیں بھی اس سے دوستی کرنا ہو گی، تجھے اس سے ملاؤں گا۔ بڑے کام کی چیز ہے، ہیرا ہے وہ ہیرا۔'' جسپال نے کہا تو ہرپریت منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''وہ واقعی ہی ایسی چیز ہے یا مجھے چڑا رہے ہو۔''

''وہ ایسی ہے، جب تم ملو گی تو مان جاؤ گی۔''

''یہ جو یہاں جالندھر میں تین چار جگہوں کا انتظام کیا ہے میں نے' کیا یہ انہی لوگوں کے لیے تھا؟ کیا یہ وہی لوگ ہیں، جنہوں نے وہاں......'' وہ کہتے کہتے رک گئی

''بالکل، انہی لوگوں نے ٹھہرنا ہے وہاں۔ اپنے لوگ ہیں۔ خیر' کچھ کھلاؤ پلاؤ گی یا بھوکے ہی رکھو گی۔'' جسپال نے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کر دیا۔ وہ کھانے اور ڈھیر ساری باتیں کرنے کے بعد وہاں سے اٹھے اور اوگی پنڈ کی طرف چل پڑے۔ ہرپریت کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ بائی پاس سے اوگی پنڈ کی جانب بڑھے، جسپال نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہرپریت! کیا اب بھی تمہارا خالصہ جتھے کے ساتھ رابطہ ہے؟''

''ہاں ہے، ان سے رابطہ کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ کسی ایسے بندے سے جو ذمے دار ہو اور کسی بھی قسم کا فیصلہ کر سکتا ہو۔'' جسپال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

''جسپال سچ پوچھو نا، وہ تم سے خود ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں صاف بتا دیا ہوا ہے۔ وہ سب کچھ جو میں جانتی ہوں۔ مجھے نہیں پتہ تم ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو، مگر میرا دل کہتا ہے کہ تمہارے ملنے سے ان کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔'' ہرپریت کے لہجے میں کافی حد تک جوش تھا۔

''ہرپریت! میں اب ایک طویل عرصے تک ادھر رہنا چاہتا ہوں۔ صرف دھرم کی سیوا کے لیے۔ مجھے نہیں معلوم میں نے کب پورا (مرنا) ہو جانا ہے۔ ایک سنگھ کی شان یہی ہے کہ وہ دھرم کی خاطر لڑتا رہے۔'' جسپال نے دور کہیں خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

''اور میرے ساتھ شادی؟'' ہرپریت نے کہا۔

''تم جانتی ہو کہ شادی ایک کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے، شادی کر لوں یا سیوا کر لوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہرپریت اس کی بات سمجھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس دی۔

اوگی پنڈ پہنچتے ہوئے انہیں سہ پہر ہو گئی۔ کلجیت کور ان کی راہ تک رہی تھی۔ انوجیت بھی گھر پر تھا۔ بنتا سنگھ اور جوتی بھی تھی۔ شام تک وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا انہی سے گپ شپ کرتا رہا۔ شام ڈھل چکی تو کلجیت کور نے جوتی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''اے جوتی! کچھ عقل کر، یہاں بیٹھی ہے، کچھ کھانے کو بنا۔''

''بے بے، جوتی کو میں نے روکا ہے۔ ہم کھانا باہر کھائیں گے، ہمارے ساتھ انوجیت ویر بھی جائے گا۔'' ہرپریت نے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ اس نے رابطہ کر کے طے کر لیا تھا۔

"چل، پھر ٹھیک ہے، کرتو اپنے جسپال ویرے سے باتیں۔ میں تو چلی۔" کلجیت کوراٹھ کر اندر چلی گئی۔ تب جسپال نے جیب سے کافی سارے نوٹ نکال کر آدھے آدھے کیے۔ ایک ہاتھ سے بنتا سنگھ کو اور دوسرے ہاتھ سے جُوتی کو دیتے ہوئے بولا۔

"میں تم دونوں کے لیے کوئی شے نہیں لا سکا۔ تم اپنی پسند سے لے آنا۔"

"جسپال ویرے مجھے تو کچھ نہیں چاہئے، میری ہر ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔" جُوتی نے جلدی سے کہا۔

"اُو، رکھ لو، پکڑو۔"

دونوں نے وہ نوٹ لے لیے اور خوشی خوشی وہاں سے چلے گئے۔ جسپال کافی دیر تک مسرور وہیں بیٹھا رہا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بندے کو کتنا سرور دیتی ہیں۔

رات کا پہلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ جسپال فریش ہو کر کار میں آ بیٹھا۔ اس کے ساتھ پہلو میں ہرپریت تھی۔ انوجیت پہلے ہی نکل چکا تھا۔ ان کا رخ رسول پور کلاں کی جانب تھا۔ تمام راستے ہرپریت کور خاموش رہی۔ جیسے ہی وہ رسول پور کلاں کے قریب پہنچے، تب اس کے لب وا ہوئے۔

"وہاں سردار ویر سنگھ ہے۔ اس وقت خالصہ جتھہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وہ بندہ ہے جو بہت عرصے سے تمہارے ساتھ ملنا چاہتا ہے۔ بہت ٹھنڈا اور تنظیمی بندہ ہے۔ بہت سیوا کی ہے اس نے دھرم کی۔"

"چل دیکھتے ہیں۔" جسپال نے دھیرے سے کہا اور سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔

گاؤں میں وہ سب سے بڑی پیلے رنگ کی حویلی تھی۔ حویلی کے سامنے کافی ساری زمین خالی تھی۔ وہاں ایک طرف کافی سارے لوگ چارپائیاں ڈال کر بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔ عام آدمی کے لیے وہ گپ شپ تھی لیکن جسپال سمجھ گیا تھا کہ وہ سب سیکورٹی کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے دیکھنے کا انداز ہی ایسا تھا۔ انہوں کار پورچ میں لے جا کر روکی تو سردار ویر سنگھ بڑے دروازے سے باہر آ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر لمبے قد اور بھاری جثے والا گرانڈیل شخص تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی شلوار قمیص اور زعفرانی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ مہمان آ گئے ہیں۔

"ست سری اکال سرادر جسپال سنگھ جی، جی آیاں نوں۔" اس نے دونوں بازو پھیلا کر اس کا استقبال کیا اور پھر اسے گلے لگا لیا۔

"ست سری اکال سردار ویر سنگھ جی۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" جسپال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ تشریف لے آؤ۔" ویر سنگھ نے کہا اور پھر ہرپریت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دعائیں دینے لگا۔ وہ تینوں آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں جا پہنچے۔ وہاں دو نوجوان مزید بیٹھے ہوئے تھے۔ ویر سنگھ نے بیٹھتے ہی ان کا تعارف کرایا۔

"یہ دونوں، میرے سگے بیٹے تو نہیں، لیکن انہوں بیٹوں سے بڑھ کر سیوا کی ہے۔ سردار جوگندر سنگھ اور سردار سریندر سنگھ۔ یہ دونوں خالصہ جتھہ کے سرخیل ہیں۔" اس نے کہا تو دونوں نے ہاتھ جوڑ کر اسے فتح بلائی۔ تب وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"سردار جی! ہرپریت نے مجھے پہلے بھی کہا تھا کہ میں آپ سے مل لوں لیکن میں ایسے ہی نہیں ملنا چاہتا تھا۔ اور سچ پوچھیں تو میرا یہاں رہنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ میں نے جن سے انتقام لینا تھا، وہ لے لیا، اپنی زمین جائیداد واپس لے لی۔ جس کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ اس سے زیادہ میرے پاس کینیڈا میں ہے۔ مطلب مجھے کوئی معاشی پرابلم نہیں ہے۔ لیکن اب میں یہاں رہنا چاہتا ہوں، اپنے دھرم کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ جیسی بھی ہو سکے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"پتر! جو تیرے ساتھ بیتی ہے نا، یہاں کے ہر گھر کے ساتھ وہی بیتی ہے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، بھائی، بہن، زندہ جلائے گئے ہیں۔ اتنی بڑی قربانی دینے کے

بعد بھی یہ ملک اب ہمارے لیے اجنبی ہے۔ اب ہر سکھ یہ سوچ رہا ہے کہ ہم سنتالیس میں آزاد ہو گئے تھے لیکن ایسا نہیں چوراسی میں ہمیں یہ پوری طرح جتا دیا کہ ہم اس ملک میں غلام ہیں۔ پہلے انگریزوں کے اب ہندوؤں کے۔ اب یہ نئی بات نہیں ہے۔ یہ رونا تو اب تک چلتا آیا ہے لیکن خوف ناک بات سکھ پنتھ کے لیے یہ ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو کیا دے کر جا رہے ہیں؟ غلامی کا خوف ناک احساس؟ شرمناک اتحاس؟'' سردار ویر سنگھ نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ کہانیاں میں نے بہت سن لیں، اب آگے کی دیکھیں، کیا کرنا ہے ہمیں؟ کیا کرنا ہوگا ہمیں؟'' جسپال نے متانت سے پوچھا۔

''خالصتان، یہی ہماری منزل ہے، اپنی زندگی میں حاصل نہیں کر پائے تو کم از کم اپنی نسلوں کو یہ جدو جہد تو دے کر جا سکتے ہیں۔ کسی کامیابی کی کوئی بنیاد تو ہو جس پر ہماری نسلیں فخر کر سکیں۔'' سردار ویر سنگھ نے جوش بھرے لہجے میں کہا تو جوگندر سنگھ بولا۔

''ہمارے بندے ٹاڈا کے تحت اندر ہیں، کوئی کہیں پر قتل ہو جاتا ہے، سب سے پہلے ہمارے بندوں سے تفتیش شروع ہوتی ہے۔ کوئی واردات بھی ہو۔''

''دنیا بہت آگے نکل گئی ہے سردار جی، اب جنگ صرف گولی چلانے سے نہیں جیتی جا سکتی۔ لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بڑے میدان ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ طاقت کے بنا کچھ نہیں ہو سکتا، مگر جتنے بھی محاذ ہیں ان پر ہمیں لڑنا ہوگا۔ وہ میدان چاہے میڈیا کا ہے، تعلیم کا، لوگوں کو شعور دینے کا ہے۔ انہیں یہ بتانا ہوگا کہ آزادی اُن کا حق ہے۔'' جسپال نے گہری سنجیدگی سے کہا تو سردار ویر سنگھ بولا۔

''میری تو عمر گذر گئی پتر، اب جو کرنا ہے تمہی لوگوں نے کرنا ہے۔ جو تم لوگوں کی عقل سمجھ میں آئے۔''

''تو پھر آپ مجھ پر یقین رکھیں، باقی واہگرو جانے کیا ہوتا ہے۔'' جسپال نے حتمی لہجے میں کہا۔

''میں چاہتا ہوں، جتھے کو نیا خون ملے، ڈر اور خوف سے نکل کر اپنی بات منوانے کی جرات پیدا ہو۔'' ویر سنگھ نے کہا تو جسپال نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت جتھے کے معاملات کون دیکھ رہا ہے؟''

''یہ جوگندر سنگھ۔'' ویر سنگھ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے یہ سرداری رہے اسی کے پاس، لیکن اس کا کام کئے گئے فیصلوں پر عمل درآمد کروانا ہے۔ یہ فیصلہ کون کرے گا، آپ بہتر سمجھتے ہیں۔'' جسپال نے کہا۔

''میں تیری بات سمجھ گیا ہوں۔ ایسے ہی ہوگا۔'' ویر سنگھ نے جوش سے کہا۔

''بس تو پھر آپ کل ہی سے دھرم سیوا کے لیے اٹھیں۔ اپنے علاقے میں جتنے بھی گرودوارے آتے ہیں، ان پر جا کر ماتھا ٹیکیں، ان کے مسائل معلوم کریں۔ باقی کام ہمارا ہے۔ کیوں جوگندر سنگھ۔'' جسپال نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جیسے کہو بائی جی، میں حاضر ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''آؤ، پرشادے شکھیں۔'' ویر سنگھ نے کہا اور اٹھ گیا۔

جسپال نے اپنی سوچ کے مطابق عمل شروع کر دیا تھا۔

رات گئے جب وہ ایک ساتھ واپس آئے تو ڈرائنگ روم میں انوجیت کا پہلا سوال ہی یہی تھا

''اب کیا کرنا ہوگا؟''

''مجھے جتھے کے ساتھ منسلک دو چار نوجوان ملا دو، سمجھ دار ہوں، دلیر ہوں اور کسی کالج یا یونیورسٹی میں پڑھتے ہوں۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔'' جسپال نے جواب دیا تو انوجیت نے کہا۔

''میں کل ہی ایسے نوجوان تلاش کر لوں گا۔ میں اب چلتا ہوں۔ صبح مجھے جالندھر جانا ہوگا۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

جسپال اپنے کمرے میں جا کر ایزی ہوا اور ابھی اس

نے بیڈ پر بیٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ کھولا ہی تھا کہ ہر پریت چھوٹی سے ٹرے میں چائے کے دو مگ رکھے آ گئی۔ اس نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''جسّی! آخر تم ان نوجوانوں کا کرنا کیا چاہتے ہو؟''

اس پر جسپال نے اس کا ہاتھ پکڑا اور زور سے اپنی طرف کھینچا، وہ سیدھی اس کے اوپر آ گری۔ اس نے اپنی ناک ہر پریت کی ناک سے رگڑتے ہوئے کہا۔

''ہر وقت ایسی باتیں ٹھیک نہیں ہوتی ہیں پریتو۔ اب ہم ہیں اور اب ہماری ہی باتیں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا اور اس کے سامنے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں چائے پینے لگے۔ وہ اسے سمجھانے لگا کہ کل اس نے کیا کرنا ہے۔

اگلے دن کا سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ جسپال نے گاڑی نکالی تو ہر پریت بھی اس کے ساتھ آ بیٹھی۔ وہ جالندھر کی جانب چل دیئے۔ جسپال کا سندو سے رابطہ تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی مختلف جگہوں پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ سندو پوری طرح تیار بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

''یار! میں تیرے کہنے پر یہاں آ تو گیا ہوں، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہاں رہنے سے میں بہت جلد حالات پر قابو پا لوں گا۔ لیکن یہاں فوری طور پر پیسہ......'' سندو نے کہا تو جسپال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''پیسہ بہت ہے، آج ہی تمہیں بہت زیادہ رقم مل جائے گی، اس کی فکر چھوڑ، یہ بتا پروفیسر کے قاتلوں کا کچھ پتہ چلا؟''

''میں نے چندی گڑھ میں موجود اپنے سارے ذرائع اس کام پر لگا دیئے ہیں۔ جیسے ہی پتہ چلے گا، اس کے مطابق پلان کر لیں گے۔'' سندو نے کافی حد تک بے بسی سے کہا تو جسپال سوچ میں پڑ گیا۔

''سندو، کہیں تو حوصلہ تو نہیں چھوڑ گیا۔ وہ جس طرح کہتے ہیں کہ ہاتھی اپنے استھان پر ہی بھلا لگتا ہے؟ چندی گڑھ چھوڑ کے تم خود کو کمزور تو نہیں سمجھ رہے ہو؟''

جسپال نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

''ایسا نہیں ہے یار، اُدھر کالے سفید سارے دھندے تھے، مال بھی تھا اور طاقت بھی۔ یہاں تو ماحول سمجھوں گا تو معاملہ چلے گا نا تھوڑا وقت لگے گا۔''

''چل اٹھ، تجھے ماحول سمجھاؤں۔'' جسپال نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''وہ رونیت کو تو بتا دو۔''

رونیت کور اور پروفیسر کی بیوی اوپری منزل پر تھیں۔ جسپال نے ہر پریت کی طرف دیکھا اور ان کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اوپر چلی گئی تو یہ باہر نکل آئے۔ وہ ابھی کار میں بیٹھے نہیں تھے کہ رونیت کور کی کال آ گئی۔

''یہ رونیت کی کال......'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا۔ ادھر سے چند لفظوں ہی میں بات ہوئی تھی کہ سندو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

''جسپال، پروفیسر کے قاتلوں کا پتہ چل گیا ہے، چل جلدی رونیت کے پاس۔''

وہ دونوں تیزی سے اندر جا کر اوپری منزل پر گئے۔ رونیت کور اپنے لیپ ٹاپ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ہی گرلین کور اور ہر پریت کور تھیں۔ ان کے آتے ہی رونیت نے بتایا

''انہیں کسی انڈر ورلڈ کے بندے یا کرائم پیشہ نے قتل نہیں کیا بلکہ قتل ''را'' کے اُن ایجنٹوں نے کیا ہے، جو باقاعدہ ملازم نہیں ہیں، مگر ان کے لیے کام کرتے ہیں۔''

''کون ہیں اور وہ کہاں رہتے ہیں؟'' سندو نے تیزی سے پوچھا۔

''یہ دیکھو، یہ میری ایک صحافی دوست کی ای میل ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے لیپ ٹاپ اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ کل سے میرے رابطے میں ہے۔ رات اس نے ڈانس کلب میں کچھ لوگوں کو دیکھا جو بہت زیادہ شراب

پی رہے تھے اور بہت زیادہ مستی کر رہے تھے۔ ان کا جھگڑا وہاں کی سیکورٹی سے ہو گیا۔ سیکورٹی والے انہیں باہر نکالنا چاہتے تھے اور یہ نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ اس پر سیکورٹی والوں نے انہیں خوب مارا پیٹا۔ کلب والوں نے پولیس کو بلوایا تاکہ انہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے لیکن پولیس کے آنے سے پہلے ہی سادہ لباس میں دو لوگ آئے انہوں نے ان شرابیوں کو لے جانا چاہا۔ انتظامیہ نہیں مانی۔ وہ انہیں پولیس ہی کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ پولیس آئی تو انتظامیہ نے وہ دونوں شرابی ان کے حوالے کر دیئے۔'' اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کو رکی تو سندو نے بے صبری سے پوچھا۔

''لیکن اس سے پروفیسر کے قاتلوں......''

''بتا رہی ہوں نا۔'' رونیت نے کہا۔

''اوکے اوکے۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس سارے ہنگامے کے دوران میری صحافی دوست کو یہ معمول سے ہٹ کر لگا۔ اس نے تصویریں لے لیں اور اپنے دوست صحافی کو بتا دیا کہ کلب میں کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔ انہوں نے پولیس آفیسر سے بات کی۔ پولیس آفیسر صاف مکر گیا کہ گرفتاری کا ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ کلب میں دو شرابی اودھم مچا رہے تھے انہیں وہیں ڈانٹ ڈپٹ کر ان کے گھر والوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ ابھی وہیں تھانے میں تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ وہ دونوں شرابی پار ہو چکے ہیں۔ ان کی لاشیں سڑک پر پڑی ہیں۔ اس وقت پولیس آفیسر دیکھنے لائق تھا۔ اس نے فوری ردعمل میں فون کیا اور نجانے کسے کہا کہ پہلے ایک بڈھے کا قتل رفع دفع کیا۔ اب انہیں کس کھاتے میں ڈالوں۔ میرے پاس پریس بیٹھا ہوا ہے انہیں کیا جواب دوں۔ یہ دو تین فقرے ہی سارا پول کھول رہے تھے۔ صحافی ان کے سر ہو گئی کہ اگر وہ دو شرابی ان کے گھر والے لے گئے تھے تو کیا انہوں نے یہ قتل کر دیئے؟ رات سے یہ معاملہ چل رہا ہے۔ لاشیں پوسٹ مارٹم کے بعد سرد خانے میں ہیں۔ ابھی صبح میری سہیلی کو اس کے دوست نے بتایا تو اس نے مجھے یہ تفصیل ای میل کر دی ہے اور اُن دو سادہ لباس فوجیوں کی تصویریں بھی ہیں، یہ دیکھو۔'' یہ کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ان دونوں فوجیوں کی تصویریں دکھائیں جو سادہ لباس میں تھے۔

''ان فوجیوں کا سراغ لگانا ہوگا۔'' سندو نے زیر لب کہا تو رونیت بولی۔

''ابھی کچھ دیر میں پتہ چل جائے گا۔''

''وہ کیسے؟'' سندو نے پوچھا۔

''اسی پولیس سے پتہ چلے گا اور میرے دوسرے ذرائع بھی تو ہیں۔ آؤ اتنی دیر میں ناشتہ کرتے ہیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔'' ہرپریت کور نے ستائش بھری نگاہوں سے رونیت کو دیکھتے ہوئے کہا تو جسپال ہنس دیا پھر بولا۔

''ابھی تو مزید کھلے گی۔''

''یہ کیا جسپال، تعارف تو کراؤ۔'' وہ قدرے حیرت سے بولی۔

''یہی ہے وہ میرا حوصلہ، میری محبت اور میرا جنون۔'' جسپال نے ہرپریت کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تو ہرپریت سرشار ہو گئی۔

''واؤ! بھابی......'' گرلین کور نے کہا اور ہرپریت کے گلے لگ گئی۔ رونیت کور بھی اس کے گلے لگی۔

''یہ جذباتی سین پھر دکھانا، آؤ ناشتہ کر لو۔'' سندو نے کہا تو سب باہر والے کمرے میں چلے گئے۔

سندو ناشتہ نہیں کر سکا۔ وہ چھت پر چلا گیا۔ اس نے چندی گڑھ میں اپنوں سے رابطہ کرنا شروع کر دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ سب ایک کمرے میں جمع تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ فوجی کون ہیں؟ وہ کہاں رہتے ہیں اور ان کا تعلق کس ادارے سے ہے؟ یہ تصدیق ہو جانے کے بعد سندو نے پوچھا۔

''بول جسپال اب کیا کرنا ہے؟''

"مجھے اسی وقت شک ہو گیا تھا کہ یہ کام "را" کا ہے۔ اصل میں انہوں نے ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ وہ جب چاہیں ہمیں مسل کر رکھ دیں۔ میں نے آتے ہوئے پروفیسر کو کہا بھی تھا کہ وہ محتاط رہے۔ پروفیسر کا قتل ہر نیک سنگھ کے ردعمل میں تھا۔ اور سندو یہ جان لو کہ ممبئی میں تمہیں دیکھا گیا ہو گا۔ کیونکہ گرباج نے سب کچھ بتایا ہے تو ان کی توجہ اس طرف ہوئی۔"

"مجھے لگتا ہے، جسپال کا یہاں آنے کا فیصلہ بالکل درست ہے۔ کیونکہ اگر ہم بھی وہیں رہتے تو ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچتا۔" رونیت کور نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" اس نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔

"وہی کچھ جو انہوں نے کیا، انہیں واپس لوٹا دیں گے۔ کتنے لوگ لگائے ہیں اور اب تک کی اپ ڈیٹ کیا ہے؟" جسپال نے پوچھا۔

"دو لوگ پوری طرح ان کے پیچھے ہیں۔ باقی چار لوگ بھی ان کے آس پاس ہیں۔" سندو نے کہا۔

"انہیں فوراً ہٹا لو، وہ گھیرے میں آ جائیں گے۔ وہ بندے بھی گنوا لو گے، میں بتاتا ہوں کیا کرنا ہے۔" جسپال نے تشویش سے کہا پھر رونیت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ان کا آفیسر کون ہے؟ مطلب اس کا رابطہ نمبر کچھ معلوم ہوا؟"

"یہ دونوں ایک ہی بندے کو کال کرتے ہیں اور لگتا ہے کہ وہ اس وقت اپنے گھر میں۔ کافی دیر سے اس کا فون ایک ہی جگہ پر پڑا ہے، حرکت نہیں کر رہا ہے۔"

"میں سمجھ گیا کہ کیا کرنا ہے۔" سندو نے کہا اور اپنے بندوں کے ساتھ رابطہ کرنے لگا۔ ایک دم سے ماحول سخت ہو گیا تھا۔ تبھی جسپال کو خیال آیا، وہ فوراً سندو کے پاس چلا گیا۔

"اپنے لوگوں کو ہٹانے کے بعد انہیں کہو فون ضائع کر دیں۔ کسی صورت میں بھی فون نہ رکھے جائیں، ورنہ ہم یہاں پکڑے جائیں گے۔ بلکہ اس کے بعد وہ شہر ہی چھوڑ دیں۔"

بات سندو کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سب کو ہدایات دیں اور پھر بتایا۔

"اس آفیسر پر دو بندے لگا دیئے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں خبر آ جائے گی کہ کیا ہوتا ہے۔"

انہوں نے وہ آدھا گھنٹہ بہت مشکل سے گزارا۔ ان دو فوجیوں پر جو بندے تھے وہ ہٹ گئے تھے، ٹیلی فون بوتھ سے انہوں نے اشارے میں بات کی تھی اور وہ شہر سے نکل گئے تھے۔ ان کے پکڑے جانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

اسی دوران ٹی وی پر خبر نشر ہونے لگی کہ محکمہ داخلہ کے ایک اہم آفیسر کو اس کے چار بندوں کے ساتھ اُڑا دیا گیا۔ حملہ آوروں نے اس وقت راکٹ لانچر سے فائر کر دیا تھا جب وہ اپنی سرکاری جیپ میں گھر سے نکلا تھا۔ اس دہشت گردی کے حملہ میں دہشت گرد پکڑے نہیں گئے۔ تاہم فورسز پوری کوشش میں مصروف ہیں کہ وہ پکڑے جائیں۔ شہر بھر میں ناکہ بندی کر دی ہے۔

"لو جی اپنے پروفیسر صاحب کا بدلہ لے لیا ہے۔" سندو نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو اس کی بیوی بولی۔

"انہوں نے دھرم کی سیوا کا کہا تھا، یوں دہشت گردی کرنے کو نہیں کہا تھا۔"

"ماں جی، دھرم کی سیوا آزادی سے ہوتی ہے۔ ہم میں سے جو بھی چندی گڑھ جائے گا، یا انہیں یہاں کی بھنک مل گئی تو انہوں نے ہمیں مارنے کو کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا۔" سندو نے کہا۔

"بیٹا! وہ "را" ہے۔ اس کے پیچھے حکومت اور فوج ہے۔ کب تک؟" اس نے کہا۔

"جب تک واہ گرو چاہے گا۔" سندو نے بڑے حوصلے سے کہا۔ بہت دنوں بعد اس کے چہرے پر سرخی آئی تھی۔ وہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی جسپال نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا وہ اسے لمبی رقم دینا چاہتا تھا۔

سندو اور ابھیت ایک گاڑی میں، جبکہ ہرپریت کور اور رونیت کور جسپال دوسری گاڑی میں آ بیٹھے۔ وہ آگے

پیچھے چلتے ہوئے جالندھر شہر کے اس مصروف بازار میں آ گئے جہاں کی جلیبیاں پورے علاقے میں مشہور تھیں۔ وہ سبھی اکٹھے ہوکر دوکان کے سامنے کھڑے ہوگئے۔

''یار یہ تو سنا تھا کہ پنجاب کے میلے ٹھیلوں میں جٹ جلیبیاں کھایا کرتے تھے، یوں اس طرح تازہ جلیبیاں کھائیں گے تو کیسا لگے لگا۔'' سندو نے کہا تو اس پر باتیں کرنے لگے جبکہ جسپال کی پوری توجہ بازار کے دونوں اطراف میں تھی۔ اچانک اسے دائیں طرف سے دو سکوٹر سوار دکھائی دیئے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے کے پاس ایک بڑا سارا گتے کا کارٹن تھا۔ وہ دونوں کار کے پاس آ کر یوں رکے جیسے لڑکھڑا گئے ہوں۔ جب وہ سیدھے ہو کر چلے تو وہ کارٹن وہیں دو گاڑیوں کے درمیان چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے۔ جسپال نے دھیمی آواز میں کہا۔

''ابھیت! جاؤ کارٹن سنبھالو۔''

یہ سنتے ہی وہ سکون سے آگے بڑھا، کار کی ڈگی کھولی اور کارٹن اس میں رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑے رہے۔ پھر ابھیت کے ساتھ سندو جا بیٹھا۔

''رونیت آ تجھے اپنا گاؤں دکھاؤں، کل چھوڑ دوں گی یہاں۔'' ہرپریت نے کہا تو وہ فوراً مان گئی۔

سندو اور ابھیت چلے گئے تو یہ تینوں بھی بازار سے نکلے۔ ہرپریت کی خواہش تھی کہ وہ تھوڑی شاپنگ کر لے، اسی لیے گاڑی کا رخ مین مارکیٹ کی طرف کر دیا۔

وہ کافی دیر تک شاپنگ کرتے رہے۔ وہ سٹور سے باہر نکلے تو ان کی گاڑی کے پاس کچھ لوگ کھڑے دیکھ کر ہرپریت نے جسپال سے کہا۔

''جسپال! وہ دیکھو، لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔''

''اب یہاں تو کھڑے نہیں رہ سکتے، چل دیکھتے ہیں۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ جسپال انہیں نظر انداز کرتا ہوا اپنی کار کے پاس گیا اور چابی سے دروازہ کھولنے لگا۔ تبھی مختلف عمر کے آٹھ دس لڑکے اس کی طرف بڑھے۔ وہ سارے اس کے اردگرد کھڑے ہوگئے تو ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''جسپال سنگھ تیرا نام ہے اور تو اُوگی میں رہتا ہے جو کینیڈا سے آیا ہے۔''

''میں جسپال سنگھ بھی ہوں اور اوگی میں بھی رہتا ہوں۔ میں ہی کینیڈا سے آیا، مگر لگتا ہے تم لوگوں کو کسی نے تمیز نہیں سکھائی بات کرنے کی۔'' اس نے دبے دبے غصے میں کہا تو وہی طنزیہ انداز میں بولا۔

''وہی تمیز ہی تو سکھانے آئے ہیں تمہیں۔''

''اوئے سیدھی بات کر اس سے، اگر مانتا ہے تو ٹھیک ورنہ اسے یہیں...... '' ایک دوسرے لڑکے نے کہا۔

''چل تو ہی کہہ دے۔'' پہلے والے نے جسپال کو گھورتے ہوئے کہا۔

''سن اُو جسپال! تو نے یہاں رہنا ہے تو سکون سے رہ، سیاست میں منہ مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تیرا ابھی ہم لوگوں سے پالا نہیں پڑا، بڑی کہانیاں سن لی ہیں تیری دلیری کی۔ اب اگر اوگی میں زندہ رہنا ہے تو اپنی اس معشوق سے شادی کر اور سکون سے رہ۔'' دوسرے نے حقارت بھرے لہجے میں اسے انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔

''اور اگر میں تیری بات نہ مانوں تو؟'' جسپال نے غراتے ہوئے کہا تو رونیت کور نے شاپنگ بیگ کار میں پھینکے اس لڑکے کا بازو پکڑ لیا جس نے انگلی اٹھائی تھی۔

''اوئے، اگر تو نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو پہلے میرے اس تھپڑ کا جواب دے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے زناٹے کا تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ ہرپریت بھی ماحول کو سمجھ چکی تھی۔ اس نے بھی بیگ پھینک دیئے۔ اس نے پہلے کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ سبھی ایک دم سے حیران ہوئے اور ان تینوں پر پل پڑے۔

انہیں یقیناً یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کن لوگوں سے بھڑ بیٹھے ہیں۔ جو بھی ان کے نزدیک جاتا اس کی چیخ بلند ہوتی۔ جسپال کو اپنا پسٹل نکالنے کا وقت نہیں مل رہا تھا۔ مارکیٹ میں ایک دم سے شور ہوگیا۔ ہرپریت اور رونیت کے لڑنے کا انداز ہی مختلف تھا۔ وہ تینوں ایک جُٹ ہوکر

لڑ رہے تھے، تین یا چار منٹ میں کئی سارے زین بوس ہو چکے تھے۔ ان لڑکوں کو جب سب کچھ الٹا پڑتا دکھائی دیا تو وہ ایک دم سے بھاگ نکلے۔ جسپال نے ان کے پیچھے بھاگ کر ان دو کو پکڑ لیا، جنہوں نے اس سے انتہائی بدتمیزی سے بات کی تھی۔ اس نے دونوں کو کالر سے پکڑا اور اپنی کار کے پاس لا کر سڑک پر دے مارا۔ پھر اپنا پسٹل نکال کے بولا۔

''بولو۔ کس نے بھیجا ہے تم لوگوں کو؟''

''سردار مان سنگھ باجوہ نے۔'' ایک نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا

''وہ کون ہے؟'' جسپال نے پوچھا تو ہرپریت نے تیزی سے کہا۔

''ہمارے دشمنوں کے خاندان ہی کا ہے، اس الیکشن میں ایم ایل اے کا امیدوار ہے۔''

''اوہ!'' جسپال فوراً سمجھ گیا۔ یہ رات سردار ویر سنگھ سے ملاقات کا نتیجہ سامنے آ گیا تھا۔ اس نے سڑک پر پڑے دونوں لڑکوں کے ایک ایک بازو پر اپنے پاؤں مارے تو ان کے بازو کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ ان کی تیز چیخ فضا میں بلند ہوئی تو جسپال نے کہا۔

''بتا دینا اپنے اس باجوہ کو، میں تو کب سے کوئی نیا دشمن تلاش کر رہا ہوں۔''

اس نے کہا اور کار میں جا بیٹھا۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ آ بیٹھیں تو اس نے کار بڑھا دی۔

❁......❁......❁

میری توقع کے مطابق مختلف ٹی وی چینلوں پر جو خبر چلی تھی، اس میں ڈکیتی کی واردات میں نامعلوم افراد ہی بتائے گئے تھے۔ پہلی عمارت میں گئے لوگوں کا کوئی ذکر نہیں تھا اور نہ ہی وہاں کے نظام کو جام کرنے کی کوئی بات کی گئی تھی۔ انہوں نے سارا زور اسی پر دیا تھا کہ دو سیکورٹی والے مارے گئے ہیں اور جو زخمی تھے ان کی تعداد بڑھ کے بتائی جا رہی تھی۔ ناشتے کی میز پر جنید نے بتایا کہ اس کمپنی کے مالک سیٹھ نیلا کے فون پر بہت زیادہ فون آئے تھے۔ ان میں ملکی بھی ہیں اور غیر ملکی بھی۔ کچھ دیر تک ان کی چھان بین ہو جائے گی۔

''تم لوگ کرنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ محض ایک واردات نہیں ہے، اور ہم کوئی ایک مقصد حاصل نہیں کرنا چاہتے ہیں، ابھی ہم چار سمتوں میں بڑھیں گے۔'' اکبر نے پوری سنجیدگی سے بتایا

''وہ کون کون سی ہیں؟''

''نمبر ایک، پولیس کا وہ طاقتور بندہ جو کھلے عام جوا کروا رہا ہے، اسے کسی نہ کسی طرح قانون کے شکنجے میں لانا ہے، تاکہ پولیس میں موجود وہ چہرے بے نقاب ہوں جو اس قسم کے دھندوں میں براہ راست ملوث ہیں اور انہیں بھی احساس ہو جائے کہ انہیں کسی کا خوف لاحق ہو سکتا ہے۔'' اکبر نے وضاحت کی

''یہ کیسے ہوگا؟'' میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔

''ان کی مخالف قوت میں یقیناً لوگ موجود ہوں گے، وہ کہتے ہیں نا جب نظام ٹوٹتا ہے تو طاقت سر اٹھاتی ہے۔ ان کے مخالفین بھی تو کچھ نہ کچھ طاقت رکھتے ہوں گے۔ وہ لازماً حرکت میں آئیں گے۔''

''دوسرا یہ ہے کہ سیٹھ نیلا کو یہ باور کرایا جائے کہ یہ سب کچھ ان کے مخالفین نے کرایا ہے۔ ظاہر ہے اس

غزل

وہ کون مسیحا ہے کچھ تو بتاؤ؟
کچھ درد ہمارے لو، کچھ اپنی سناؤ
کچھ دیر پاس بیٹھو اور ہنس کے ہم سے بولو
کچھ دل میں ہمارے محبت کو جگاؤ
کیا چاہتے ہیں ہم، کبھی تو یہ بھی پوچھو
ایسے تو نہیں تم دل میرا چراؤ
کیا ہم کو تیرے دل پہ دستک پڑے گی دینی
یوں تو نہ ہمیں اپنی نظروں سے گراؤ
ہم آ گئے ہیں اب تو دروازہ دل کا کھولو
اب ساری زندگی ہمیں کرنا ہے پڑاؤ

(رابعہ اسلم رابی، رحیم یار خان)

سے ان کے درمیان ایک نئی قسم کی مخاصمت شروع ہو جائے گی۔ ممکن ہے اس سے وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی طاقت بھی استعمال کریں۔ اس سے حالات میں کشیدگی تو آئے گی لیکن اس سے ان کی طاقت کے علاقے اور طریقہ کار سمجھ میں آ جائے گا۔'' جنید نے بتایا

''یہ جو دھندہ کر رہے ہیں، یہ پاکستان کے خلاف جاتا ہے، ہنڈی کے ذریعے رقم باہر جاتی ہے۔ جس سے ملک کو نقصان تو ہو ہی رہا ہے، اس سے چند لوگ اپنی بلیک منی محفوظ کر رہے ہیں۔ یہ بلیک منی پاکستانی عوام کا استحصال ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ وہ کیسے دھندہ کرتے ہیں، ان کا سارا ثبوت میرے پاس ہے، یہ سارے ثبوت چند ڈی وی ڈیز مختلف اداروں کو بھیج دی جائیں گی اور انہیں مجبور کیا جائے گا کہ ان کو پکڑا جائے۔'' زویا نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ جو لوٹی ہوئی دولت ہے یہ ہمارے نئے سیٹ اپ کے لیے کام آئے گی۔ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔'' سلمان نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ وہ سب ایک دم سے ہلچل مچا دینا چاہتے تھے۔ وہ مجھے ہی نہیں روہی کو بھی یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں۔

''ٹھیک ہے، یہ یاد رکھیں کہ ہم نے اپنا مستقل ٹھکانہ یہاں نہیں بنانا۔ میں آج یہاں سے نکل رہا ہوں۔ دو چار دن میں یہ سب ختم کر کے تم لوگ وہیں آ جانا جہاں میں تم لوگوں کو بلاؤں۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا وہ سب کافی حد تک میرے اس فیصلے کو قبول نہیں کر پائے۔ میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے ان سے پوچھ لیا، ''کیا میری تجویز پسند نہیں آئی؟''

''بات پسند اور ناپسند کی نہیں، اب تو ہمارا اور تمہارا ساتھ ایک ہے، یہ ہم الگ الگ کیسے؟'' گیت نے پوچھا۔

''ہمیں صرف یہی نہیں کرنا ہے کہ دولت لوٹتے رہیں اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے رہیں۔ ہمیں اپنے وطن کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس کے لیے ہم کہیں بھی ایک جگہ مستقل نہیں رہ سکتے ہیں۔'' میں نے انہیں کہا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے مگر ہر جگہ ہماری رسائی نہیں ہو سکتی، ہمیں اپنے نیٹ ورک کے لیے، زمینی حقائق جاننے کے لیے لوگ چاہئے ہوتے ہیں۔'' مہوش بولی تو ایک دم سے سلمان بول اٹھا۔

''او کے۔ تم جہاں بھی رہو، ہمارے رابطے ہی میں رہو گے۔ کہاں جانا ہے، میں بندوبست کر دوں۔''

''میں چلا جاؤں گا، تم سب لوگ اپنے اپنے کام پر لگ جاؤ، میری فکر مت کرو۔'' میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

وہ کراچی کی ایک خوشگوار شام تھی جب میں کلفٹن کے اس گھر سے نکلا جو بن قاسم باغ کے پاس تھا۔ دن ختم ہونے کو تھا جب میں ائیرپورٹ پہنچ گیا۔ میرا وہاں سے نکلنا کرنل سرفراز کے ساتھ طے تھا۔ میرے فون کے جواب میں ایک شخص نمودار ہوا اور سیدھا میرے پاس آ گیا۔ وہ مجھے ٹکٹ دے کر پلٹ گیا۔ میں نے بورڈنگ کارڈ لیا اور لاؤنج میں آ بیٹھا۔

مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ بالکل میرے سامنے والی نشست پر ایک لڑکی آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے سیاہ جینز کے ساتھ گرے ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں لمبا سا سیاہ رنگ کا سکارف تھا۔ بوائے کٹ بالوں کے ساتھ اس کی غلافی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے کہیں پہلے دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے، یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ جبکہ وہ مسلسل میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی کے چہرے پر موجود شناسائی مجھے بے چین کر رہی تھی۔ ایک دم سے میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

انوکھا تجربہ

نوشاد عادل

دو دوستوں کا احوال' وہ نت نئے تجربات کرنے کے شوقین تھے۔
ایک روز انہوں نے بھوک کے موضوع کو تجربے کے لیے چنا تو آدم خور بن گئے۔
ایک عجیب و غریب کہانی جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی۔

ایسا لگتا تھا کہ پروفیسر امجد کہیں جانے کی تیاری کررہے تھے۔ انہوں نے بہت ہی نفیس اور اعلیٰ تراش کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ یوں بھی امجد صاحب لباس کے معاملے میں بہت محتاط تھے نا صرف محتاط بلکہ ان کا انتخاب اور ذوق بھی بہت عمدہ ہوتا تھا۔ لباس شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس عام مقولے پر وہ خاص طور پر عمل پیرا رہتے تھے۔ اچھے لباس سے شخصیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے اور دیکھنے والوں پر اچھا تاثر پڑتا ہے یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے حلقۂ احباب میں ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ اس وقت وہ اپنے دوست ڈاکٹر جمال کے پاس جانے کی تیاری کررہے تھے۔ ڈاکٹر جمال ان کا بہت پرانا اور گہرا دوست تھا۔ پہلے وہ اپنا زیادہ وقت ایک ساتھ ہی گزارتے تھے مگر بعد کی مصروفیات نے انہیں گویا پابند سلاسل کر دیا تھا اور اب ملاقات مہینوں میں ہو پاتی تھی۔ درمیان میں کبھی کبھار فون پر بات چیت ہوجاتی تھی۔ اب ذرا کچھ دنوں سے پروفیسر امجد فارغ تھے ان کے ذہن میں آیا کہ جمال سے لمبی چوڑی قسم کی ملاقات کی جائے اتنے میں ان کا ماتحت ذاکر کمرے میں داخل ہوا۔

''سر! ڈاکٹر جمال آئے ہیں۔'' ان کا ماتحت ذاکر یہ کہہ کر خاموش ہوگیا اور ان کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

''جمال......؟'' امجد صاحب چونک گئے۔ ''اوہ تو وہ خود ہی آ گیا۔'' انہوں نے خود کلامی کرتے ہوئے زیر لب کہا پھر جلدی سے بولے ''ارے تو ان کو بلاؤ جلدی۔''

ذاکر فوراً باہر چلا گیا۔ پروفیسر امجد صوفے پر بیٹھ گئے اور آپ ہی آپ بڑبڑائے ''واہ! حیرت انگیز' یہ تو کمال ہی ہو گیا' اسے الہام تو نہیں ہوگیا کہ میں آج آرہا ہوں' جو خود ہی چلا آیا۔''

اتنے میں ڈاکٹر جمال اندر داخل ہوئے۔ ڈاکٹر جمال بھی پروفیسر امجد کی طرح جوان آدمی تھے۔ دونوں دوستوں نے کم عمری میں ہی اپنے اپنے شعبے میں بہت نام و شہرت کمائی تھی۔ ڈاکٹر جمال کو دیکھتے ہی پروفیسر امجد کھڑے ہوئے اور دونوں دوست گرم جوشی سے گلے ملے۔

''اس دفعہ تو کافی دنوں بعد ملاقات ہورہی ہے۔'' ڈاکٹر نے شکایتاً کہا۔

''یار تم نے تو فون کرنا بھی گوارہ نہیں کیا۔''

''اگر یہی میں تم سے کہوں تو؟'' پروفیسر امجد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر جمال ان کے برابر والے صوفے پر دراز ہوگئے۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں کو بد بخت

مصروفیات نے گھیرا ہوا تھا۔'' ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا پھر پروفیسر امجد کا سوٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے شاید؟''
''اتفاق سے تمہاری طرف آرہا تھا مگر تم بازی لے گئے اور مجھ سے پہلے یہاں آ گئے۔''
''چلو شکر ہے میں بروقت آ گیا ورنہ کچھ دیر لیٹ ہو جاتا تو تم میرے گھر ہوتے اور میں یہاں ہوتا۔ دونوں کو کوفت کا شکار ہونا پڑتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔
''یہ بات تو ہے'' پروفیسر ہنسا پھر وہاں کھڑے اپنے ماتحت سے مخاطب ہوا۔
''ذاکر جو کچھ فریج میں رکھا ہے کھانے کی ٹیبل پر لگا دو بلکہ فریج ہی ٹیبل پر رکھ دو۔ ہم خود ہی نکال کر کھالیں گے۔''
''اور سناؤ جمال آج کل کس موضوع پر لکھ رہے ہو؟'' کچھ رسمی گفتگو کے بعد پروفیسر امجد نے پوچھا۔
''بہت اہم موضوع ہے۔ سچ پوچھو تو لکھتے وقت ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ جاتی ہیں۔'' ڈاکٹر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
''کیا گرمی کے موضوع پر لکھ رہے ہو؟'' امجد نے ہنستے ہوئے کہا۔
''نہیں یار! میں سیریس ہوں' یہ موضوع میرے لیے مسئلہ بن گیا ہے۔'' ڈاکٹر بدستور سنجیدہ تھا۔
''بھئی کچھ پتا تو چلے کہ کس موضوع پر سیریس ہو؟''
''ایک لافانی جذبہ جو ہر جاندار کے وجود میں طوفان کی طرح اٹھتا ہے ''بھوک'' یقین کرو امجد میں پھنس گیا ہوں اس موضوع کو چن کر تم بھی جانتے ہو کہ بھوک کو موضوع بنا کر اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن میں ایک مختلف چیز تخلیق کرنا چاہتا ہوں تا کہ بھوک کا حقیقی مفہوم ہر پیٹ بھرا اچھی طرح سمجھ لے۔ تم جانتے ہو بھوک کیا شے ہوتی ہے؟'' ڈاکٹر جمال نے پروفیسر سے استفسار کیا۔
پروفیسر بھی الجھن میں پڑ گیا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ بھوک کے متعلق میں کچھ بھی نہیں جانتا تم نے ٹھیک کہا ہے کہ جو پیٹ بھرے ہوتے ہیں وہ اس لفظ کی گہرائی سے نا آشنا ہوتے ہیں ہمیں بھوک ستاتی ہے کہ کھا پی کر اس جذبے کو پروان چڑھنے سے قبل ہی ختم کر دیتے ہیں پھر بھلا ہم اس کے معنی و مفہوم کیسے جان سکتے ہیں۔''
''بس یہی تو میرے ساتھ مسئلہ ہے امجد! تم جانتے ہو میں اس وقت تک کسی موضوع پر نہیں لکھتا جب تک اس کے متعلق تحقیق نہ کرلوں۔ مصنف کو اگر خود کسی بات کا ٹھیک سے علم نہ ہو تو جو کچھ وہ لکھتا ہے وہ بیکار اور بے معنی ہوتا ہے اس سے بہتر ہے کہ وہ کھچڑی پکائے۔'' ڈاکٹر نے فکرمندی سے کہا۔
''تو پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟'' امجد نے سوال کیا۔
''میں اس پر تحقیق کروں گا اور اس سلسلے میں میرے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔ بہت ہی کٹھن اور دشوار آئیڈیا ہے۔'' ڈاکٹر نے پراسرار لہجے میں کہا جس میں اس کا پختہ عزم عیاں تھا۔
''سر! کھانا لگوا دیا ہے۔'' ذاکر نے کمرے میں داخل ہو کر مؤدبانہ انداز میں کہا اور بات درمیان میں رہ گئی۔
''یار! تمہارا موضوع میرے پیٹ میں مچل رہا ہے پہلے اسے ختم کر دیں پھر بات آگے بڑھائیں گے اور تم وہ آئیڈیا بھی بتانا۔'' امجد نے کہا۔
دونوں اٹھ گئے اور کھانے پینے سے فارغ ہو کر واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ ڈاکٹر نے آتے ہی پہلا سوال کیا۔ ''یہ بتاؤ کہ تم کب تک فارغ ہو؟''

''تقریباً ایک ماہ کی فرصت ہے کیوں؟'' پروفیسر اس کے سوال پر چونک اٹھا۔

''کافی ہے' تحقیقات کے لیے صرف ایک ہفتہ درکار ہے۔ سنو میرا یہ خیال ہے کہ میں خود اس تجربے سے گزروں گا۔ بھوک کے تجربے سے' ظاہر ہے کوئی اور تو اس تجربے سے گزرنے پر آمادہ نہیں ہوگا' بالفرض اگر ہو بھی گیا تو میں اس جیسے احساسات اور محسوسات قلم بند نہیں کرسکا میں تم سے اس لیے معلوم کررہا ہوں کہ اگر تم میرا ساتھ دینا چاہو تو مجھے کتاب لکھنے میں آسانی ہوجائے گی۔'' ڈاکٹر نے مطمئن ہوکر کہا۔

امجد حیران رہ گیا۔ وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔

''جمال میرا خیال ہے تم حماقت کررہے ہو اس طرح زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

''لیکن میں بھوک کا چہرہ قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ مائی ڈیئر۔ دیکھو امجد! نا تم آسانی سے پروفیسر بنے ہو اور نا ہی میں جھک مار کر ڈاکٹر بن گیا ہوں۔ ہر کام دقت طلب ہوتا ہے کوئی بھی مقصد دشواری کے بغیر پورا نہیں ہوتا' ہم انوکھے نہیں ہوں گے جو کسی مقصد کے لیے جان جوکھم میں ڈالیں گے' ایسے بہت سے دیوانے تھے' جو اپنے مقاصد کے لیے جان پر کھیل جاتے تھے۔ زہر کے ذائقے بھی یونہی معلوم نہیں ہوئے۔ اب تو خیر انسان بہت ترقی کرگیا ہے۔ شروع شروع میں باہمت لوگوں نے زہر کا ذائقہ معلوم کرنے کے لیے کسی اور کو تختۂ مشق نہیں بنایا بلکہ خود ہی زہر چکھا اور اس کا ذائقہ لکھ کر مرگئے۔ کیا آج دنیا انہیں سرپھرا کہتی ہے؟''

''ٹھیک ہے میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' پروفیسر امجد نے ہتھیار ڈال دیے۔

''اب سنو' میں نے جو کچھ سوچا ہے اس پر باریک بینی سے غور کیا۔ اس کی جزئیات پہ سوچا ہے۔ ہم جس تجربے سے گزریں گے وہ ہم یہاں شہر میں کسی طور پر نہیں کرسکتے۔''

پروفیسر متذبذب انداز میں اس کی بات کاٹ کر بولا ''کیا مطلب......؟ پھر کہاں؟''

''کسی ایسے پہاڑی مقام پر جہاں سبزہ بالکل نہ ہو' آبادیاں دور ہوں۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ بس ہم پانی لے چلیں گے۔ ٹھیک ہے؟''

''چلو یار تمہاری تحقیق کی خاطر میں اس انوکھے تجربے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک مشکل ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس تجربے کے چکر میں واقعی بھوک سے مرنہ جائیں' اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟'' پروفیسر امجد نے پوچھا۔

''فکر مت کرو' اس کے لیے بھی سوچا تھا' ہمیں ایک اور مددگار کی ضرورت ہوگی۔ ذاکر اس سلسلے میں ہمارے کام آئے گا۔ وہ ہم سے دور رہ کر ہماری نگرانی کرے گا۔ ہم تقریباً سات دن اس تجربے سے گزریں گے۔ ساتویں دن شام کو ذاکر ہمارے پاس خوردونوش کا سامان لائے گا جو پہلے ہی اس کے پاس وافر مقدار میں ہوگا...... اور ہاں ایک اہم بات میں تمہیں بتانا بھول گیا' ہم دونوں کے ساتھ ایک کتا بھی ہوگا' یہ بہت ضروری ہے' شدید بھوک کے عالم میں جانور کا کیا ردعمل ہوتا ہے' ہمیں اس کے متعلق بھی معلوم ہوجائے گا۔''

ڈاکٹر جمال کے خاموش ہونے کے بعد پروفیسر امجد کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر سوچ کے سمندر سے ابھرا۔

''آخری بات تم سے معلوم کرنا ہے۔ یہ ہمیں کیسے معلوم پڑے گا کہ ہم نے شدید بھوک کی حالت میں کیا کیا حرکتیں کیں۔ ہمیں تو اپنے آپ کا ہوش

نہیں ہوگا۔"

"اچھا پوائنٹ ہے، جب تک ہم ہوش میں رہیں گے اپنی حالت اور کیفیت خود ہی نوٹ کرتے رہیں گے اور دیگر حالات میں ذاکر ہماری کیفیات اور حرکات وسکنات نوٹ کرتا رہے گا۔ وہ ذہین آدمی ہے اس سلسلے میں ہمیں مطمئن ہی رہنا چاہیے۔" ڈاکٹر جمال نے وضاحت کی۔

دونوں کافی دیر تک اس کے متعلق گفتگو کرتے رہے اور یہ طے پایا کہ کل صبح ہوتے ہی اس منصوبے پر عمل شروع ہوجائے گا۔ انہوں نے رات کے کھانے پر ذاکر کو بھی اپنے منصوبے سے آگاہ کردیا تھا اور خاص طور پر اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ ان کے پاس کسی حالت میں نہیں آئے گا بلکہ ان کی حرکتیں نوٹ کرتا رہے گا۔ ساتویں دن شام کو وہ ان کے پاس آسکتا ہے۔ پروفیسر امجد کے پاس دو کتے بھی تھے جو رکھوالی کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ پہاڑی مقام کا بھی انتخاب کرلیا گیا تھا۔

❁......☆......❁

دوسرے دن صبح سویرے ہی وہ ایک پہاڑی مقام پر پہنچ گئے۔ اس جگہ سبزہ دور دور تک نہ تھا۔ ہر طرف چھوٹی بڑی پہاڑیاں تھیں۔ وہ اس پتھریلے علاقے میں آچکے تھے۔ ڈاکٹر جمال اور پروفیسر امجد نے پانی کے بڑے بڑے فلاسک کاندھوں پر لٹکا رکھے تھے۔ ان فلاسک کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ صرف کلائیوں پر گھڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ امجد اور جمال کے ساتھ ایک قدآور کتا بھی تھا جو دونوں سے کافی مانوس تھا اور سدھایا ہوا بھی تھا۔ کتے کو بھی اس انوکھے تجربے سے گزرنا تھا۔ ذاکر منصوبے کے مطابق ان سے الگ ہوگیا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا، نا گرمی تھی اور نا سردی، درمیانہ موسم تھا۔ جمال نے ایک قلم اور نوٹ بک ساتھ لے لی تھی تاکہ وہ اپنے احساسات قلم بند کرسکے۔

"لو بھئی تمہاری تحقیق کی ابتداء تو ہوگئی ہے۔ یار جمال! ہم سات دن تک بھوکے رہیں گے کہیں مرنا جائیں؟" امجد نے خدشہ ظاہر کیا۔

"نہیں، سات روز میں انسان بھوک کے مارے نہیں مرسکتا" جمال نے نفی کی۔

"ویسے مجھے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ اگر انسان جبراً خود کو بھوکا رکھے تو بھوک زیادہ شدت کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہے اگر مجبوری کے تحت بھوکا ہو تو اس میں صبر اور برداشت کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ مجبوری کے عالم میں تو انسان کئی روز تک باآسانی بھوکا رہ سکتا ہے، زبردستی کا معاملہ خطرناک ہے۔"

"یہ بات تم نے درست کہی ہے۔ بھوک انسان کی بنیادی ضرورت اور جسمانی تقاضہ ہے۔ سمجھو کہ کھانا انسان کا ایندھن ہے۔"

"پھر ہم تو خود کو زبردستی بھوکا رکھیں گے۔" امجد کے لہجے میں پریشانی ٹپک رہی تھی۔

"وہ تو اب کرنا پڑے گا۔ دیکھو اگر بھوک کی حالت میں انسان کا ذہن کھانے پینے کی طرف لگا رہا تو بھوک مسلسل بڑھتی جاتی ہے۔ ہم دونوں نے بھوک کو بھولنا ہوگا۔ تم مجھے کوئی قصہ سنانا اور میں تم کو قصے سناؤں گا، ٹھیک ہے؟" جمال نے کہا اور پروفیسر نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

پہلا دن تھا اس لیے آرام سے گزر گیا۔ کتا ان کے ساتھ تھا وہ بھی ابھی مطمئن تھا۔ ان کے پاس ایک پیالہ تھا جس میں وہ کتے کے لیے پانی ڈال دیتے تھے رات بھی پرسکون گزر گئی۔ دوسرا دن شروع ہوگیا۔ دوسرے دن اٹھتے ہی جمال نے مسکراتے ہوئے امجد سے پوچھا "سناؤ بھئی امجد!

ٹھیک تو ہونا؟“

”اب تک تو خیر ہے‘ آگے اللہ مالک ہے۔“ امجد نے بھی جواباً مسکرا کر جواب دیا۔

”میرا خیال ہے تم اب کوئی قصہ سناؤ۔“ جمال نے امجد سے کہا۔

”بھائی ابھی کئی دن باقی ہیں‘ ابھی تو صرف ایک ہی دن گزرا ہے قصے کہانیاں باقی دنوں کے لیے رکھ چھوڑو۔“ امجد نے کہا۔

جمال اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ کتا ان کے قریب ہی تھا۔ وہ دھیمی دھیمی آواز میں ”بخ بخ“ کرنے لگا تھا۔ وہاں ہر طرف ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ چاروں جانب پتھروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ وہ دونوں کتے کو لے کر ایک پہاڑی کٹاؤ میں بیٹھ گئے۔ یہاں دھوپ نہیں تھی۔ امجد کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے یہ تجربہ سراسر حماقت اور فضول لگ رہا تھا۔ خود کو خطرناک تجربے کی چکی سے گزارنا کہاں کی دانش مندی تھی مگر وہ اپنے دوست کو انکار بھی نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ جمال اسے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ صبح سے شام ہوگئی وہ دونوں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ مقصد صرف ذہن کو بھوک کی طرف سے ہٹانا تھا۔ وہ دونوں دوست گزرے ہوئے خوشگوار دنوں کو یاد کرنے لگے۔ اس طرح ان کے ذہنوں سے بھوک کا احساس کچھ کم ہوگیا۔ آخر یہ دوسرا دن بھی خاموشی سے گزر گیا۔ تیسرے دن صبح ہی بھوک نے دونوں کو بے چین کردیا۔ کتا الگ پریشان ہورہا تھا۔

”جمال! بھوک کے معنی و مفہوم سمجھ لو‘ تمہاری تحقیق شروع ہوگئی ہے۔“ امجد نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

جمال نے نوٹ بک نکالی تھی وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ پھر نوٹ بک بند کرکے کہنے لگا۔

”آج بھوک کا احساس زیادہ ہورہا ہے اس لیے میں نے جو کچھ اپنے اندر محسوس کیا‘ اسے لکھ لیا ہے۔“

”ابھی تو آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا‘ ویسے یار گزشتہ دنوں میں ہم نے کوئی خاص بھوک تو محسوس نہیں کی ہے‘ ہم جانتے ہیں کہ ہم دونوں ایک تجربے سے گزر رہے ہیں اپنے اس تجربے کو کامیاب بنانے کے لیے ہم دونوں نے خود کو تختہ مشق بنایا ہوا ہے کہیں ایسا نہ ہو تجربے کے جنون میں ہم باآسانی یہ سات دن جھیل جائیں؟“ امجد نے کہا۔

”نہیں امجد! بھوک تو آخر بھوک ہے‘ وہ اندھی اور بہری ہوتی ہے وہ نہیں دیکھتی کہ اس کا شکار کون ہے نا وہ فریاد سنتی ہے وہ کسی عفریت کی طرح ٹوٹ پڑتی ہے۔“ جمال نے کہا۔

”ڈراؤ تو مت یار۔“ امجد نے مصنوعی خوف زدگی کا مظاہرہ کیا۔

”حقیقت بہرحال حقیقت ہے اور اٹل ہے۔“ جمال سنجیدہ ہوگیا تھا۔

تیسرا دن بیت گیا۔ رات کو انہیں نیند نہیں آرہی تھی معدے کا حال ایسے بدنصیب علاقے جیسا ہو گیا تھا جہاں کئی سالوں سے بارش نہیں ہوئی۔ خالی پیٹ تھا تو دماغ بھی ویرانوں‘ کھنڈروں میں گھوم رہا تھا۔ امجد کا دماغ سوچ رہا تھا کہ وہ کسی محفل یا دعوت میں جانے کی تیاری کررہا ہے۔ اس محفل میں انواع اقسام کے کھانے تھے مگر وہ مجبور تھا انہیں کھانے سے۔ معاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ چہار سو اندھیرا اور سناٹا تھا۔ جمال سو رہا تھا مگر اس کی نیند کچی پکی سی لگ رہی تھی۔ وہ لیٹے لیٹے کسمسا رہا تھا۔ کتا ان سے کچھ فاصلے پہ اپنے اگلے پیروں پر تھوتھنی رکھے لیٹا تھا۔ امجد بھوک سے بے چین ہوکر اٹھ گیا۔ دماغ میں

سناٹے سرسرا رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی بھوک کا علاج کس طرح کرے۔ وہ اپنا دھیان ہٹانے کے لیے ٹہلنے لگا۔ آہٹیں سن کر کتے نے تھوتھنی اوپر اٹھائی اور نیم واز آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ تین دن کی بھوک نے اسے بھی نڈھال کر دیا تھا۔ اس میں چابک دستی اور پھرتی مفقود نظر آتی تھی۔ کتے نے امجد کو دیکھ کر ہلکی سی "بخ" کی آواز نکالی۔ سویا ہوا جمال کروٹ بدل کر رہ گیا۔ اس کے انداز پر نا جانے کیوں امجد کو غصہ آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کتے نے اسے طیش دلایا ہے یا اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ امجد کو یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ استہزائیہ انداز میں اب بھی اسے گھور رہا ہے۔ وہ اس کا پالتو کتا تھا۔ اس کی یہ مجال کہ وہ اس کا مذاق اڑائے۔ وہ کتے کی طرف بڑھا اور پیر اٹھا کر ایک زور دار لات اس کے اندر کو دھنسے ہوئے پیٹ میں دے ماری۔ کتا دل دوز آواز میں چیخ کر اچھل پڑا۔ جس طرح زخموں پر نمک مرچ چھڑکنے سے تکلیف دوبالا ہو جاتی ہے اسی طرح کتے کی کرب ناکی بھی سہ چند ہو گئی اور پھر امجد پر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ اس نے ایک ہی لات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فوراً ہی دوسری لات بھی جڑ دی۔ کتا ناقابل برداشت تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ امجد کی مزید لاتوں سے بچنے کے لیے دور چلا گیا اور مسلسل بھوں بھوں کرنے لگا۔ جمال اٹھ چکا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ امجد کی ذہنی رو پلٹ گئی تھی اس نے ایک موٹا سا پتھر اٹھایا اور کتے کی طرف پھینکا ساتھ میں وہ کتے کو گالیاں بکتا رہا۔ جمال نے آگے بڑھ کر اسے مشکل سے روکا۔

"امجد...... امجد...... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ ہوش میں آؤ۔" جمال نے اسے جھنجوڑا۔

"ہٹو۔" امجد نے اسے زور سے دھکا دیا۔ "دور ہٹ جاؤ۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ مذاق اڑاتا ہے میرا۔ مجھے کوئی کتا سمجھ رکھا ہے اس نے۔"

جمال نے دوبارہ بڑھ کر اسے پکڑ لیا "امجد...... امجد، ادھر دیکھو مجھے۔ میں جمال ہوں، تمہارا دوست، خود کو تھکاؤ نہیں، تم بھوکے ہو، تمہاری بھوک بہت بڑھ جائے گی، بیٹھ جاؤ۔"

امجد چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر شاید اسے اپنی دیوانگی کا احساس ہو گیا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں واپس اپنی جگہ آ بیٹھا۔ جمال نے فلاسک میں سے پانی نکالا اور امجد کی طرف بڑھایا۔ "لو تھوڑا پانی پی لو تمہارا حلق خشک ہو گیا ہوگا۔"

امجد نے کچھ کہے بغیر گلاس منہ سے لگا لیا اور چند گھونٹ پی لیے۔ اگلے ہی لمحے اسے قے ہو گئی، خالی پیٹ نے پانی قبول نہیں کیا تھا۔ امجد قے کرنے کے بعد ہانپنے لگا۔ جمال نے اسے مزید کچھ نہیں کہا۔ وہ کھڑے ہو کر کتے کو دیکھنے لگا۔ پالتو کتا کچھ فاصلے پر کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ جمال نے اسے پچکارا تو وہ دم ہلاتا ہوا نزدیک چلا آیا۔

"تم نے خوامخواہ اس بے زبان کو مارا ہے۔ دیکھو کتنا وفادار جانور ہے۔"

"پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ بس ایک دم ہی وحشت کا دورہ پڑ گیا تھا اور میں اسے مار بیٹھا۔" امجد نے اپنا سر تھام لیا۔

"لیٹ جاؤ اور آرام کرو۔" جمال نے اسے تسلی دی۔ امجد نے لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

اس کے لیٹتے ہی جمال نے نوٹ بک نکالی اور امجد کی کیفیت کے بارے میں تفصیلات لکھنے لگا۔ خود اس کا بھی بھوک نے برا حال کر رکھا تھا۔ لکھتے وقت نوٹ بک اسے پیزا دکھائی دے رہی تھی اور قلم اسے چاپ اسٹک کی مانند لگ رہا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا

کہ نوٹ بک کے ساتھ ساتھ قلم بھی کھا جائے شاید اس طرح بھوک کا احساس کم ہو جائے۔ نوٹ بک لکھنے کے بعد وہ خود بھی لیٹ گیا۔ نہ جانے کیسے نیند سے اس اس کی آنکھیں جڑ گئیں۔

✿......☆......✿

اگلا روز مزید وحشتیں لے آیا۔ آج تو جمال کو بھی ایسا لگ رہا تھا کہ دماغ کے ساتھ ساتھ اس کا وجود بھی گھوم رہا ہو۔ زمین کے گھومنے کی رفتار کیا ہے، آج اسے اس کا صحیح اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے قرب و جوار میں نظریں دوڑانے لگا۔ ڈاکٹر کے برابر میں پروفیسر امجد بھی وحشت زدہ انداز میں ایسے ہی تک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، بھوک نے اسے سونے نہیں دیا تھا۔ خالی پیٹ نے اس کا دماغ بھی کھنڈر کر دیا تھا۔ ان کا پالتو کتا کچھ فاصلے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا پیٹ کسی سوکھے کنویں کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے اپنے مالکوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کیسے حال ہیں امجد؟'' ڈاکٹر جمال نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''دیکھو لو تمہارے سامنے ہوں۔'' پروفیسر امجد گہری سانس لے کر بولا۔ خالی پیٹ ہونے کی وجہ سے وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ ''رات جو کچھ بھی...... میں اس پر شرمندہ ہوں۔''

''چھوڑو امجد! اس میں قطعی تمہارا قصور نہیں ہے ہم دونوں اس وقت تجرباتی دور میں ہیں۔'' ڈاکٹر جمال جبراً مسکراتے ہوئے بولے حالاں کہ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ مسکرانے پر کتنی توانائی درکار ہوتی ہے۔

امجد کی ذہنی رو سست چل رہی تھی۔ اس کو اپنا پیٹ ایسے صحرا کی مانند محسوس ہو رہا تھا جس میں ریت کے بگولے گھوم رہے ہوں اور ان کی سرسراتی آوازیں اسے اپنے دماغ میں محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ گہری سانس لیتا تو بگولے مٹ جاتے اور سانس چھوڑنے پر دوبارہ ابھر آتے اس کو ڈاکٹر جمال کی آواز جھینگر کے رینگنے کی آواز لگ رہی تھی جو بلاوجہ دبیز خاموش ماحول میں خلل پیدا کر کے انسان کے اشتعال کو ابھارتا ہے مگر اس وقت وہ ہوش مندانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ ڈاکٹر جمال کہہ رہا تھا کہ ''وقت گزارنے کے لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں قصے سناؤں گا اور تم مجھے چلو میں تمہیں قصہ سناتا ہوں بہت دلچسپ ہے۔''

''اگر تم میں کچھ سکت ہو تو سنا دو میں ہمہ تن گوش ہوں'' پروفیسر آہستگی سے بولا۔ ڈاکٹر جمال کو اس کے لہجے میں طنز کا عنصر محسوس ہوا۔ اس نے کہا۔

''بھئی! ایک دفعہ جب میں انگلینڈ میں زیر تعلیم تھا تو ہاسٹل میں میرے ایک انگریز دوست نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔''

''کھانے پر؟'' پروفیسر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''واہ...... واہ...... کیا چیزیں تھیں تلی ہوئی چھپکلیاں حرام جانور کا گوشت اور نہ جانے کیا الم غلم تھا مگر میں نہیں کھا سکا تھا۔'' ڈاکٹر جمال نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''اور نہ اب کھا سکتے ہو'' پروفیسر منہ بنا کر بولا۔

''لعنت ہو تم پر تم بھوک سے دھیان ہٹانے کے لیے قصے سنا رہے ہو یا دھیان لگانے کے لیے؟ اس سے بہتر ہے کہ تم خاموش ہو جاؤ۔''

''خاموش ہو جاؤ'' ڈاکٹر جمال سلگ اٹھا اور غصے میں اس نے جملہ دہرایا۔

''میں کیوں ہو جاؤں خاموش، مجھ پر کیوں لعنت ہو تم پر لعنت ہو۔ یو بلڈی فول۔'' ڈاکٹر جمال کے

ماتھے پر تیوریاں چڑھ آئیں۔
"جمال! ہوش کرو تمہارا ذہن بھٹک رہا ہے، اپنے غصے پر قابو پاؤ۔" پروفیسر امجد نے تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا حالاں کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے بلڈی فول کہنے والے کے دو جھانپڑ رسید کر کے بلڈ نکال دے مگر اس کے ہوش و حواس ابھی سلامت تھے۔
ڈاکٹر جمال اسے چبھتی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا۔
پروفیسر امجد نے اپنی آنکھیں موند لیں اور اپنے دماغ کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بیٹھے بیٹھے اس کا سارا جسم اکڑ گیا تھا مگر کروٹ بدلنے یا کھڑے ہونے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ احساس مسلسل ستانے لگا کہ جانے کب اسے غذا میسر آئے۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے ڈاکٹر جمال کو دیکھا۔ وہ نوٹ بک میں اپنی کیفیات قلم بند کر رہا تھا۔ ہر ہر لفظ پر اس کے منہ سے گہری سانس خارج ہوتی جیسے وہ انتہائی مشقت طلب کام کر رہا ہو۔ پروفیسر امجد نے دیکھا کہ ان کا پالتو کتا اپنے پیروں کو زبان سے چاٹ رہا تھا۔ اس کے انداز میں چابکدستی نہ تھی بلکہ واضح طور پر پژمردہ پن تھا۔ کبھی کبھی وہ دانتوں تلے اپنی ٹانگ دبا لیتا۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی غراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ اس کے انداز میں پراسراریت عود آئی تھی۔ بھوکا جانور اور خاص طور پر درندہ کتنا خطرناک ہو جاتا ہے یہ سوچ کر امجد متوحش سا ہو گیا۔ امجد نے ہلکے سے ٹھوکے سے جمال کی توجہ کتے کی جانب مبذول کرائی۔ جمال گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر سنجیدگی کی پرچھائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ کتا اپنے مالکوں کو اپنی جانب مبذول پا کر تھوتھنی اٹھائے "بخ بخ" کرنے لگا۔ رات والے واقعے کے بعد وفادار جانور نے اپنی تکلیف کو ضبط کرتے ہوئے آواز تک نہ نکالی تھی۔ وہ اشارہ سمجھتا تھا چنانچہ جب جمال اور امجد اس کی جانب متوجہ ہوئے تو اس نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔
جمال قلم اور نوٹ بک رکھ کر بمشکل چٹان کا سہارا لے کر کھڑا ہوا اور تھرماس اٹھائے جھکے جھکے انداز میں کتے کی طرف بڑھا جہاں اس کا پیالہ بھی رکھا تھا۔ اس نے تھرماس سے پیالے میں پانی بھرا اور دوبارہ اسی طرح چلتا ہوا واپس اپنی جگہ آ بیٹھا۔ چند قدم کا فاصلہ عبور کرنے پر ہی اسے دانتوں تلے پسینہ آ گیا تھا۔ کتا پانی کے پیالے پر بے تابی سے لپکا اور جلدی جلدی اپنی زبان سے پانی پینے لگا۔ ڈاکٹر جمال اور پروفیسر امجد کو افسوس ہوا کہ اپنی تکلیف میں الجھ کر وہ دو دن تک کتے کو پانی بھی نہ پلا سکے۔
ڈاکٹر جمال نے اپنی جگہ نیم دراز ہو کر تھرماس سے منہ لگا لیا۔ پانی خالی معدے میں پہنچ کر بھوک کی آگ کو بھڑکانے لگا۔ اس وقت ڈاکٹر جمال نے محسوس کیا کہ جلتی پر تیل کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اس نے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے جیسے کچھ برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پروفیسر امجد دوسرے تھرماس سے چند گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔
"کہو کیا محسوس کر رہے ہو؟"
"زندگی کی حقیقتوں کی طرح تلخ۔" ڈاکٹر جمال ہولے سے بڑبڑایا۔
"سچ کی طرح کڑوا موت کی طرح بے رحم"۔
"مجھے بھی یہ ذائقے محسوس ہو رہے ہیں۔" امجد زہر خند لہجے میں بولا۔
"چھوڑو امجد! کچھ اور بات کرو ورنہ یہ باتیں ذہن پر اثر ڈالنا شروع کر دیں گی۔" ڈاکٹر جمال نے

کسی انجانے خوف کے تحت لرز کر کہا۔

"ہمارے پاس باتیں کرنے کو ہے ہی کیا' جو ہمارا ذہن سوچ رہا ہے وہ ہم بیان کررہے ہیں" پروفیسر امجد بولا۔

"تو پھر ہم کیا کریں؟" جمال پریشان ہونے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ پیٹ میں دھچکے لگ رہے تھے اور خالی پیٹ میں پانی چلنے کی آوازیں محسوس ہورہی تھیں۔

"خاموش......" پروفیسر امجد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سرگوشی کی "فی الحال خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے۔"

اس کے بعد واقعی کوئی نہ بولا۔ ان کے درمیان نہ جانے کتنی طویل خاموشی چھائی رہی۔ عجیب عجیب طرح کے خیالات ان کے دماغ میں ہشت پا کی طرح رینگ رہے تھے۔ چوتھے دن کا سورج آہستہ آہستہ اپنی مسافت طے کر کے شام کے اندھیروں میں ڈوبنے لگا تھا۔ پروفیسر امجد سوچ رہا تھا کہ شاید وہ لوگ سورج کے ساتھ ساتھ مسافت طے کررہے ہیں اور دوڑتے دوڑتے ان کا برا حال ہوگیا ہے مگر جانے کیا وجہ ہے کہ وہ رک نہیں سکتے۔

ڈاکٹر ادھر ادھر کروٹیں بدلتے ہوئے کسمسا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان کا ماتحت ذاکر مزے سے ان کی حرکات کا جائزہ لے رہا ہوگا اور اس کے پاس کھانے پینے کی اشیاء ہوں گی۔ ایک میں ہوں کہ بھوک کے مارے مرا جارہا ہوں۔ لعنت ہو مجھ پر وہ ہمارا اسسٹنٹ ہوکر مزے کررہا ہے، خوب عیش سے کھا پی رہا ہوگا' اس گھٹیا موضوع پر عمل درآمد کرنے کی میں نے سوچا بھی کیوں ایسی کی تیسی میری ڈاکٹری کی' خالی پیٹ میں تو انسان انسان نہیں رہتا تو پھر میں کیوں یہ فالتو کے تجربات کررہا ہوں' آہ...... ذاکر کے پاس تازہ تازہ سینڈوچ ہوں گے' گرما گرم بھنے ہوئے مرغ' ممکن تھا کہ ڈاکٹر جمال کی ذہنی رو پلٹ جاتی مگر وہ اچانک خیالوں کی دنیا سے واپس آ گیا۔ ان کے پالتو کتے کو پتا نہیں کیا خبط سوار ہوگیا تھا وہ رونے کے انداز میں منہ اوپر اٹھا کر ہوکنے لگا تھا۔ پروفیسر بھی چونک کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ شام کے آنچل نے سورج کو ڈھانپ کر رات کے آنے کی خبر دی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دندناتے ہوئے ان کے گرد چکر لگا رہے تھے اور کتے کے ہوکنے کی دل دوز آواز شکستہ ماحول کی فصیل میں مزید دراڑ پیدا کررہی تھی۔ ان کے پالتو کتے کا رخ ان ہی کی جانب تھا۔ اس کا انداز فریاد کناں اور ماتمی تھا وہ مجسم التجا بن کر اپنے مالکوں سے پوچھ رہا تھا کہ انسان آخر اتنا مفاد پرست کیوں ہے کہ اپنے تجربات کی صلیب پر جانور کو چڑھا دیتا ہے اور میرا مصرف کیا اپنے مالک کی وفاداری کرنا ہے۔ انسانوں کے قانون میں ہے کہ جان پر بن آئے تو قتل بھی معاف ہوتا ہے تو کیا یہ قانون جانور پر وضع نہیں کیے گئے ہیں یا جانور کے حقوق ہی نہیں بنائے گئے ہیں؟ سائنسی لحاظ سے انسان بھی جانور ہی ہے اگر میں حیوان مطلق ہوں تو انسان نے اپنے آپ کو حیوان ناطق کہلوانا شروع کر دیا۔ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے انسان اپنے اور جانور کے بیچ ایک گہری خلیج قائم کردی مگر پھر حاکمیت پسندی نے انسانی معاشرے کے مزید بٹوارے کر ڈالے۔ ذات پات اونچ نیچ سے لے کر جس کی لاٹھی اس کی بھینس تک زمانے بدلنے کے حساب سے انسان معاشرے میں تجدید قانون کرتا چلا گیا اور پھر نئے وضع کردہ آئین میں ترمیم و اصلاح کے بعد پتا چلتا کہ حاکم و محکوم کے درمیان کتنا فاصلہ قائم ہو چکا ہے۔ چنانچہ حیوان مطلق نے انسان کے رویوں کو

دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتا تو پھر جانوروں کے حقوق کی حیثیت و وقعت اس کے سامنے ہیچ ہے۔"

وفادار جانور نے بے زبان سوز اپنی تکلیف کا اظہار کیا تھا مگر ڈاکٹر جمال کو ان کے معنی اور مفہوم کچھ اور ہی معلوم ہوئے۔ وہ دنوں اسے یوں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے جیسے وہ دہشت زدہ کرنے والی کوئی مخلوق ہو۔

اس نوحہ عبرت نے فضا کو مفلوج کر دیا تھا مگر قبائے بے حسی اوڑھے پروفیسر امجد اور ڈاکٹر جمال کو اس کی یہ گستاخی ناقابل برداشت معلوم ہو رہی تھی۔ ہر گزرنے والی ساعت پر ان کے غیض و غضب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ قبل اس کے کہ پروفیسر امجد اپنی ہمت مجتمع کر کے آگے بڑھتا کتے نے خاموشی اختیار کر لی شاید اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ گھائل ہو جانے والے جانور کی طرح چاروں ٹانگیں سیدھی کر کے زمین پر گر پڑا اور زور زور سے سانسیں لینے لگا۔ رات کے اندھیرے میں اس کا سوکھا پتلا پیٹ واضح طور پر پھولتا پچکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ تھوتھنی کے پاس سے دھول اڑاتی ہوئی زندگی کی چند بقیہ سانسیں بے ثبات وجود کے جلد ہمرنگ زمین ہو جانے کی خبر سنا رہی تھی۔

ڈاکٹر جمال دم توڑتے ہوئے کتے کی کیفیات اپنی نوٹ بک میں تحریر کرنے لگا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اتنی جلدی ایک طاقت ور کتے کی موت کیسے ہو سکتی ہے مگر ہر دم پڑتے بھوک کے سوالات نے اس کی ذہنی طور پر صلاحیتیں سلب کر لی تھیں اور اتنے آسان سوال کا جواب وہ کافی سوچ و بچار کے بعد ڈھونڈ پایا کہ ان چار دنوں میں انہوں نے کتے کو ایک دو مرتبہ پانی پلایا تھا مگر شاید وہ بھی بھوک کے مارے ٹھیک طرح سے پی نہیں پایا تھا اور وہ وفادار جانور اب صبر و ضبط کی ایک نئی مثال رقم کر کے موت سے ہم کنار ہونے جا رہا تھا۔ اس کی آخری دردناک چیخ اس سفاک عفریت کے بے رحم پنجوں تلے دب کر بلند ہوئی تھیں جسے موت کہا جاتا ہے ورنہ اس میں کچھ دم خم ہی نہ رہا تھا۔

"یہ...... یہ مر رہا ہے......" پروفیسر امجد چلایا اور پھر قوت کے ضائع ہو جانے پر ہانپنے لگا۔

"ہاں...... ہاں" ڈاکٹر جمال بے جا غصہ آ جانے پر ایک ہی الفاظ کی گردان کرنے لگا۔ "ہاں......! یہ مر رہا ہے۔ سب مریں گے سب ختم ہوں گے۔" طیش کے عالم میں وہ اول فول بکنے لگا۔

"خبیث اسے تم مار رہے ہو میرے پالتو کتے کو اور...... اور تم مجھے بھی مار دینا چاہتے ہو اپنے آپ کو مار رہے ہو۔" پروفیسر امجد لرزتے ہوئے بولا۔

"تم نے کہا تھا کہ ہم دیوانے ہیں اور اپنے اوپر تجربہ کر سکیں گے کیونکہ تم بھی دور گزشتہ کے سرپھروں کی طرح مثال قائم کرنا چاہتے ہو جو زہر کے ذائقے لکھ کر مر گئے تھے مگر تم دنیا کے سب سے بڑے زہر کو چکھ رہے ہو میرے کتے کو چکھا دیا اور مجھے بھی چکھا رہے ہو۔ تم جاننا چاہتے ہو کہ اس کا ذائقہ کتنا شدید اور تلخ ہوگا؟ میری رگوں میں لاوا دوڑ رہا ہے۔ میرا معدہ غذا سے خالی پڑا ہے لیکن اس میں آگ بھر گئی ہے جس نے میرے پیٹ کو آتش فشاں بنا دیا ہے۔ میرا دماغ کھول رہا ہے کوئی تیشہ جلاد میرے اعصاب کو چیر رہا ہے، میری ہڈیاں گل رہی ہیں۔ لگتا ہے میں مر چکا ہوں اور میرا جسم قبر کے عذاب میں جل رہا ہے۔ ہاں میں جل رہا ہوں زندہ جل رہا ہوں۔" پروفیسر امجد پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔

ڈاکٹر جمال بھی اپنے آپے میں نہ رہا تو وہ پروفیسر

امجد کی باتوں سے بے نیاز ہذیان بک رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ عالم دیوانگی میں مبتلا چلاتے رہے اور ہنکارتے رہے اور اپنی توانائیوں کے بھرپور استعمال کا نتیجہ یہ نکلا کہ پانچویں دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ سہ پہر کے وقت پروفیسر امجد کو ہوش آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ چٹان کے سائے میں لیٹے ہیں۔ اس نے جگہ کی تبدیلی پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ بے ہوشی کے دوران ان کا ماتحت ذاکر آیا تھا جس نے انہیں احتیاط کے ساتھ چٹان کے سائے میں لا کر دن بھر سورج کی تپش سے محفوظ کر دیا تھا۔ اسے اپنے بازو پر چبھن کا احساس بھی ہوا تھا جو یقیناً انجکشن کا تھا۔ ذاکر نے انہیں توانائی کا انجکشن بھی لگایا تھا کہ کہیں ان کا عالم بے ہوشی میں ہی انتقال نہ ہو جائے لیکن پروفیسر امجد بھوک کی شدت محسوس کر رہا تھا۔ توانائی کا انجکشن صرف اس حد تک کارآمد تھا کہ وہ ہوش میں آ سکیں۔

کچھ وقفے کے بعد ڈاکٹر جمال بھی ہوش میں آ گیا تھا۔ پانچ دن کی نقاہت نے اس کے جسم میں حیران کن حد تک تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ پروفیسر امجد اجنبی نظروں سے اسے یوں تک رہا تھا جیسے اس کے سامنے ڈاکٹر جمال کے بجائے کوئی سوختہ لاش پڑی ہو۔ اگر آئینہ ہوتا تو یہ خیال اپنے بارے میں بھی قائم کر لیتا۔ جو منظر اس کی نظروں نے پیش کیا وہ اسی ڈگر پہ سوچتا رہا کیوں اور کیسے کے الفاظ اس کے دماغ سے غائب ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر جمال نے رعشہ زدہ ہاتھوں کو بھرپور قوت کے بعد حرکت دی اور تھرماس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ تھرماس دوبارہ بھر چکا تھا۔ ڈاکٹر جمال نے پانی کے چند گھونٹ کے ساتھ اپنے جسم میں موجزن ہونے والے درد کو بھی انتہائی تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیا اور پروفیسر امجد سے مخاطب ہوا۔

''امجد!'' جواب میں پروفیسر امجد نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں کہ کون پکار رہا ہے۔ شاید خود نے کسی کو پکارا ہے امجد کون ہے؟'' کافی دیر سوالوں کے جواب تلاش کرتا رہا پھر مزید کئی لمحات تک اپنے حواس کو قابو میں کرنے کے بعد بولا۔

''ہاں......''

''کتا مر گیا ہے، ہم بھی مر جائیں گے، سب فنا ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر جمال کے خیالات وہیں تک مفقود ہو چکے تھے جہاں سے وہ بے ہوش ہوا تھا۔

''کتا مر گیا ہے؟ مم...... مگر ہم نہیں مریں گے۔''

''پروفیسر امجد سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

''نن...... نہیں...... یہ کیسے ممکن ہے...... ہم لافانی نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر جمال بڑبڑایا۔

''ہم لافانی نہیں ہیں مگر ایسے نہیں مریں گے، کھانا کھا کر مریں گے۔'' پروفیسر امجد نے اپنے لہجے میں وثوق پیدا کیا۔

''کھانا......؟'' ڈاکٹر جمال کے لہجے کی سراسیمگی ختم ہو گئی۔ کوئی نیا خیال اس کے دماغ میں کوندے کی طرح لپکا تھا۔

''ہاں اچھا اچھا کھانا کیوں نہیں بھئی ہم کھانا کھائیں گے۔''

''ہم...... ہم...... کتے کو کھائیں گے۔'' پروفیسر امجد سفاک انداز میں بولا۔ عام حالات میں وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن بھوک کے باعث پانچ دنوں میں پیدا ہونے والا گرداب اب طوفان کی شدت اختیار کر گیا تھا جس نے ان کے دماغ کے ہر ستون کو شکستہ کر دیا تھا اور اب ان کی قوت ارادی متزلزل ہو کر ڈھے گئی تھی۔ غلاظت سے پر خیال اس وقت انہیں ابر بہاراں کی مانند لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر جمال

کی چمکتی ہوئی نگاہوں نے اس کے خیال کی تائید کی تھی۔ بیک وقت دونوں کے حلق سے غراہٹیں بلند ہوئیں اور وہ کسی طاقت ور درندے کی طرح جست لگا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک شیطانی خیال نے ان کے اندر توانائی بھر دی تھی۔ سامنے کوئی امید اور منزل ملنے کی توقع ہو تو انسانی جسم کی پوشیدہ توانائیاں ابھر آتی ہیں اور کوئی خفیہ جذبہ اسے منزل تک پہنچنے کے لیے قوت فراہم کرتا رہتا ہے۔ وہ دونوں اس کراہیت آمیز خیال کے ابھرنے والے جذبات کے تحت آدم خوروں کی طرح کتے پر ٹوٹ پڑے۔ خود بہ خود ان کے منہ سے غیر انسانی آوازیں ابھر رہی تھیں وہ اپنے دانتوں اور پنجوں سے کتے کے مردہ جسم کے بخیے کر رہے تھے۔

سفاکی، درندگی، آدم خوری اور تذلیل انسانیت سب جائز ہوگئی تھی۔ گندگی غلاظت اور کراہیت سب عنقا ہو چکی تھی اور یہ سب چیزیں تو وہ ہیں جس کے احساس سے انسان نے خود کو پاک صاف رکھنا شروع کیا اور تہذیب و اخلاق کا علم بردار کہلانے لگا مگر یہ وہ درندے تھے جو مردار کتے کے گوشت کو اپنے پنجوں سے ادھیڑ کر اپنے شکم میں اتار رہے تھے۔ پیٹ کی آگ سرد کرنے کے لیے وہ غلاظت کی آگ کو بھڑکا رہے تھے جس سے انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے اور شیطان کا نیا روپ جنم لیتا ہے۔

فضا ساکت تھی، ماحول منجمد تھا۔ انسان کی حیوانی غراہٹوں سے کرچی کرچی ہوتی خاموشی حیران تھی۔ دور کہیں موقع کی تاک میں منڈلاتے گدھ مشتعل تھے۔ گوشت پوست کے وجود کو خس و خاشاک میں تبدیل کر دینے والے حشرات الارض الجھن کا شکار تھے۔ ذرے ذرے کی دیکھنے والی نگاہیں ششدر تھیں کہ دنیا کی سب سے مہذب ترین مخلوق یا اشرف المخلوق کیا روپ اختیار کر گئی ہے۔

ایک پتھر کے اوپر بیٹھا ہم رنگ زمین ہو جانے والا گرگٹ حسد میں مبتلا ہو گیا تھا کہ انسان نے گرگٹ کو سات رنگ بدلنے پر مشہور کر دیا تھا مگر انسان کے خود کتنے رنگ ہیں؟ اس سوال کا جواب کس کے پاس ہے؟ پل پل بدلتی کیفیت کے ساتھ روپ بدلنے میں انسان کو گرگٹ سے زیادہ مہارت حاصل ہے گرگٹ کو تو محض سات رنگ بدلنے پر بدنام کیا جاتا ہے مگر انسان کے روپ تو اتنے ہیں کہ خود حیران ہے کہ اب تک جتنے رنگ دریافت ہو چکے ہیں انسان کے روپ اتنے ہی ہیں یا اس سے بھی زیادہ؟

بھوک کی شدت کے ساتھ عفریت کا روپ بدلنے والی انسان نامی مخلوق اب آہستہ آہستہ سست پڑ رہی تھی اور پھر جب پیٹ کی آگ سرد پڑنے پر انہوں نے اپنی حالت پر نظر ڈالی تو بہت حواس باختہ ہوئے۔ وہ حیران اور متوحش تھے۔ پانی ان کے سر سے گزر چکا تھا اور وہ حیران تھے کہ وہ اس طوفانی درندگی کی لہروں کے زیر آب کب آگئے۔ پشیمانی سے وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے خون کے چھینٹے ان کے پورے جسم پر پھیل گئے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیاں جو پنجے کی صورت اختیار کر گئی تھیں خون کی سیاہی اور گوشت کے پارچوں سے لبریز تھیں۔ غلاظت کی ناگوار بو ان کے وجود میں رچ بس گئی تھی اور حلق...... انسانی ڈگر پر لوٹ آنے سے جب یہ کراہیت آمیز احساس برپا ہوا تو ان کا جی متلانے لگا اور کتے کے گوشت کے پارچے قے کی صورت میں باہر آگئے۔ وہ نڈھال ہو کر گر پڑے۔ انہیں اپنے وجود سے گھن آنے لگی۔

بھوک کے عفریت نے انہیں انسانی جہت کی ایک نئی جہت متعارف کرائی تھی۔ وہ آزردہ نظروں

سے کتے کے کٹے پھٹے اجزاء کو دیکھ رہے تھے جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے چیرا پھاڑا اور چبایا تھا۔ کتے کا کٹا پھٹا جسم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ "دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو اور سنو میری جو گوش نصیحت نویش ہو۔ مجھے حیوان ناطق اور درندہ کہہ کر تمسخر اڑانے والا انسان کس حد تک گر گیا ہے۔ میں وہ جانور ہوں جس کی سرشت میں وفاداری پنہاں ہے۔ آج میں نے اپنے مالک سے وفاداری کی خاطر بھوک برداشت کی اور مر گیا مگر میرا مالک انسان بھوک پر مرا جا رہا ہے۔ افسوس کہ بھوک نے انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑا......

ایک غیر مرئی آواز کی بازگشت ان کے کانوں میں گونجنے لگی۔ وہ ایسے لرزنے لگے جیسے ان کے کانوں میں کسی نے نقارہ بجایا ہو ہر گزرتے پل کے ساتھ ان کی سانس رک رک جاتی تھی۔ بارِ ندامت تلے وہ دبے چلے جا رہے تھے اور بھوک کا عفریت منہ پھاڑے اپنی تباہ کاریوں کا مزید خراج وصول کرنے ان کے اذہان پر بار بار حملہ آور ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے فلسفیوں اور دانش وروں نے کہا کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہے مگر ادھر تو جیسے جیسے وقت دے رہا ہے ویسے ویسے تکلیف دے رہا تھا اور پھر وقت تو گزرنے سے ہی گزرتا ہے۔ انسان کے اختیار میں کہاں کہ وہ لمحہ گزراں سے فرار ہو سکے گا یا مزید تکلیف دے گا۔

پروفیسر امجد اور ڈاکٹر جمال اپنی اپنی جگہ منہدم برج کی طرح پڑے محو خیال تھے۔ رنج و ملامت سے ان کی روحیں تک پشیمان تھیں اور بھوک کے الاؤ سے ان کا وجود دہک رہا تھا۔

"پپ...... پروفیسر...... یہ کیا کر دیا ہم نے؟" ڈاکٹر جمال نے اپنی حالت زار کے خیال سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"کیا کر دیا ہم نے؟" پروفیسر امجد نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ...... یہ دیکھو......" ڈاکٹر جمال نے کتے کی باقیات کی جانب اشارہ کیا۔ اسے کراہیت سے ابکائی آ گئی۔

"میرے پالتو کتے کے چیتھڑے کس نے کیے؟" پروفیسر چلایا۔

"ہم دونوں نے' بھوک کے عفریت کے پنجوں تلے بے بس ہو کر۔" ڈاکٹر تلخی سے بولا۔

"ہم نے......؟ نہیں نہیں ہم نے نہیں صرف تم نے۔" پروفیسر نے گھبرا کر کہا صدمے نے اس کی ذہنی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں اور وہ اس متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"اسے میں نے نہیں کھایا۔ صرف تم نے کھایا ہے۔ تم وحشی درندے ہو' تم میرے پالتو کتے کو کھا گئے۔ اب مجھے بھی کھا جاؤ گے۔"

پروفیسر سراسیمہ انداز میں کانپتا ہوا ڈاکٹر جمال کے پاس سرکنے لگا۔

"امجد ہوش میں آؤ' کیا کہہ رہے ہو تم؟" ڈاکٹر جمال بدحواسی سے بولا۔

"ہاں میں صحیح کہہ رہا ہوں۔" پروفیسر دہاڑا پھر اس نے جانے اپنی حالت دیکھی تو کانپنے لگا۔ اسے اپنے حلق میں بھی خون کی تلخی محسوس ہوئی۔ وحشی احساس حقیقت نے اس کے ذہن میں چپکے سے آ کر ڈرایا۔

"کتے کا خون' پروفیسر امجد...... مالک...... وحشی...... درندگی...... بربریت...... آدم خوری۔" بے ربط لفظوں کے ٹکڑے اس کے ذہن میں چکرانے لگے مگر ان کے معنوں نے اسے خوف زدہ کر ڈالا تھا۔

خیالوں کا یہ انتشار ڈھیرے ڈھیرے غیظ و غضب کا آتش فشاں بن رہا تھا جو کسی بھی لحظہ پھٹ پڑنے کو بے چین تھا۔ جنوں کو خرد یا خرد کو جنوں کا نام دے دیا

جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پروفیسر امجد کا معدہ صدائے بھوک کی بازگشت تھا اور ذہن منتشر الخیال کی آماجگاہ تھا۔ چنانچہ اس کے حواس جنوں وخرد کے زیر بار آ گئے تھے۔ وہ شروع ہی سے اس بے سروپا تجربے کا قائل نہ تھا اب جب کہ وہ اپنی ہی نگاہوں میں شرمسار ہو رہا تھا۔ تو اس کے دماغ میں ڈاکٹر جمال کا نام ابھرا جو ان تمام واقعات کا ذمہ دار تھا اور جس کی وجہ سے اسے بھی اس تلخ تجربے میں ملوث ہونا پڑا۔ پروفیسر امجد اپنے ہی خیالات میں گرفتار جب کہیں بھی جائے فراریت اختیار نہ کر سکا تو وہ یکایک چلانے لگا۔

''کمینے ڈاکٹر! وحشی تو نے مجھے مردار اور حرام جانور کھلا ڈالا۔ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ مجھے بھی وحشی درندہ بنا دیا۔ ظلم اور بربریت کی نمائندگی دے دی۔ مجھے بھوک کے بے رحم عفریت کے حوالے کر دیا...... آہ...... میں نام کا اشرف المخلوق بن گیا۔ حرام خور بن گیا...... مم...... میں حرام خور ہوں۔ کمینے جمال میں تجھے بھی نہیں چھوڑوں گا...... کچا کھا جاؤں گا۔'' پروفیسر کسی وحشی کی طرح ہنکارنے لگا۔

پروفیسر امجد جنونی انداز میں ڈاکٹر جمال پر پل پڑا۔ جس دہشت کی بنا پر چند سیکنڈ پیشتر وہ ڈاکٹر جمال سے دور ہوا تھا وہ اشتعال کے بڑھانے کی وجہ سے ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ خود کوئی خوفناک بلا کی طرح ڈاکٹر سے گتھم گتھا ہو گیا تھا۔ چھٹے دن کا سورج مزید وحشتوں کی ابتداء کے ساتھ ڈوبنے لگا تھا۔ رات کی ہولناک تاریکیاں ہویدا ہو کر انسانیت سوزی کے مزید پہلو اجاگر کر رہی تھیں۔

ڈاکٹر جمال اس اچانک پڑ جانے والی افتاد پر بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ پروفیسر امجد کو دھکیل سکتا مگر اسے اپنے چہرے پر پڑنے والے پروفیسر امجد کے گھونسے جاندار معلوم ہو رہے تھے۔ پروفیسر امجد طیش میں آنے کی وجہ سے اپنی تمام بچی کھچی توانائیوں کا بھرپور استعمال کر رہا تھا۔ ڈاکٹر جمال کے چہرے پر جب تواتر سے مکے برسے تو اس کا پارہ بھی ایک دم چڑھ آیا اور وہ بھی جواباً پروفیسر امجد پر حملے کرنے لگا۔ ان میں طاقت تو تھی نہیں چنانچہ ان کے ہاتھ پیر ڈھیلے ڈھالے انداز میں پڑتے تاہم جب وہ ایک دوسرے پر پڑتے تو اس کا اثر انہیں بہت شدید محسوس ہوتا۔ دونوں کا جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہے تھے اور حملے کر رہے تھے۔ دونوں لڑتے لڑتے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑے ہو گئے۔ کمزوری کے باعث ان کے ہاتھ نیچے کی جانب جھول رہے تھے اور ان کی کمر بھی جھکی ہوئی تھی۔ وہ منظر بالکل کسی پتھر کے دور کا منظر پیش کر رہا تھا۔ دو وحشی درندے انسانی روپ میں کھڑے پتھروں اور چٹانوں کی پناہ میں ڈوئل لڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے کے رقیب روسیاہ بنے رات کی تاریکی میں ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ وہ کئی بار لڑھکے اچھل اچھل کر دھپ سے گرے اور نوکیلے پتھروں سے ٹکرائے۔ ان کے لباس شکستہ اور کٹے پھٹے ہو گئے تھے اور جسم لہولہان ہو گئے تھے۔ خون کی بو اور سرخی نے انہیں مزید وحشت زدہ کر دیا۔ ڈاکٹر جمال کی باچھوں اور دانتوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھی خون اتر آیا۔ دونوں کے لڑنے کا انداز بالکل درندوں کی طرح تھا جس میں سے کسی نے بھی دفاعی انداز اختیار نہ کیا تھا حتیٰ کہ تھپڑ منہ پر پڑتے تو اس سے بچاؤ کے لیے بھی نہ جھکتے۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر جمال نے پروفیسر امجد کے منہ پر زوردار قسم کا مکا رسید کیا تو اس کا ہونٹ پھٹ گیا۔ وہ مکے کی شدت سے دھپ سے پتھروں پر جا گرا۔ درد

نے اسے سر پٹخنے پر مجبور کر دیا تھا ڈاکٹر جمال نے پروفیسر امجد کو زیر ہوتا دیکھا تو وہ مزید حملے کی نیت سے اس کے اوپر چڑھ دوڑا۔ اس نے ایک طرف پڑا موٹا سا چکنا پتھر اٹھالیا اور پروفیسر امجد کے منہ پر دے مارا۔ درد کی شدت سے پروفیسر امجد کا جسم ایک پھڑا کے کے ساتھ اچھل پڑا۔ اسی دوران ڈاکٹر جمال کا ہاتھ پروفیسر امجد کے چہرے کے نزدیک آیا۔ بھوک کے باعث جنم لینے والی پروفیسر امجد نامی مخلوق اپنی دیوانگی کی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اس نے پتھر کی ضربوں سے شکستہ ہوجانے والے لہولہان چہرے کو اپنے جبڑے میں دبالیا اور اپنے جسم کی تمام تر قوت صرف کردی۔ ڈاکٹر جمال نے اپنے ہاتھ کو زوردار جھٹکا مارا تو مزید درد کے ریلے اس کے وجود میں امڈ آئے۔ تکلیف کی زیادتی سے اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا۔ پروفیسر امجد اس کی کلائی کو جھنجوڑنے میں مصروف تھا۔ خود بخود اس کے حلق سے غیر انسانی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ڈاکٹر جمال نے غیر ارادی طور پر اپنے آزاد ہاتھ پیر چلائے اور اپنے دوسرے ہاتھ سے تواتر سے کئی گھونسے پروفیسر کے پیٹ میں رسید کیے۔ ایک زوردار کراہ کے ساتھ پروفیسر امجد نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور تڑپنے کے انداز میں ہاتھ پیر زمین پر مارنے لگا۔ گھونسوں نے براہ راست اس کے پلپلے پیٹ سے گزر کر معدے کو نقصان پہنچایا تھا۔ تڑپتے ہوئے کئی بار پروفیسر نے اپنے پیٹ کو بے یقینی سے دیکھا۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ گویا اس کا پیٹ پھٹ گیا ہو اور اس کے معدے کے اندر کسی نے بھاری بھاری خاردار گرز رکھ دیے ہیں جو اس کے دماغ میں پیدا ہونے والی دھمک کے ساتھ برس رہے تھے۔ اس کا پیٹ سلامت تھا مگر اندرونی طور پر درد کا طوفان اسے

زلزلہ زدگان کی یاد میں

ان دنوں
میرا یہ حال ہے
کہ
میں اپنے دکھوں پر
اکتفا نہیں کرسکتا
کیونکہ
یہ قناعت پسندی
کا وقت نہیں
یہ وقت مسلسل
سوگواریت کا ہے
میرے چارسُو بکھری پڑی ہیں
انسانوں کی بے گوروکفن لاشیں
ان پر سوچنے کے علاوہ
مجھ سے کچھ بھی نہیں سوچا جارہا
میری آنکھوں کے
ہاتھوں میں
احساس کی سلائیاں ہیں
غم کے دھاگے سے
جو منٹوں میں
لقمہ اجل بن گئے ہیں
ان کے کفن
سینے جارہا ہوں
پکڑا جب سے ہاتھ میں
قلم ہے
اوراق کی ہر لائن
بنی ہوئی الم ہے
نہیں رہیں جن بچوں کی مائیں
نہیں رہے جن کے باپ
ان بچوں کے آنسوؤں کو
پیمانہ درد میں ملاکر
میخانہ ذات میں
خود کو بٹھا کر
سارے جہاں کے دکھ
پیئے جارہا ہوں
ان دنوں بس
ایسے ہی جیئے جارہا ہوں

سرور شاذ، منچن آباد

اٹھا چیخ رہا تھا۔ ڈاکٹر جمال بھی کراہتا ہوا اور لرزتا ہوا پھٹی پھٹی نظروں سے اپنی کٹی پھٹی کلائی دیکھ رہا تھا۔ جس میں سے خون بھل بھل کر بہہ رہا تھا اور ایک جانب سے کلائی کی ہڈی نظر آ رہی تھی۔

بھوک کے عفریت نے تباہی کے مزید پہلو عیاں کر دیئے تھے۔ اس کی پراسرار قوت نے انسان کے کردار و افعال کو مغلوب کر کے انہیں شکستہ اور ریختہ کر ڈالا تھا اور آج کے انسان کی فطرت کے کئی رخ طشت ازبام کر ڈالے تھے۔

وہ دونوں آج کی مہذب دنیا کے تعلیم یافتہ انسان تھے اور پھر ایک دوسرے کے سچے پکے دوست تھے۔ ایسے دوست جو ایک دوسرے کی جان کو اپنی جان کی طرح عزیز سمجھتے تھے اور وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی مجبوری انہیں یوں آپس میں لڑنے پر آمادہ کرے گی۔

آخر لڑتے لڑتے وہ بے حال ہو گئے اور وحشتوں کی انتہا پر ہی ان کی لڑائی اختتام پذیر ہوئی۔ بھوک کے نام پر بچھنے والی بساط پر وہ پٹے ہوئے مہروں کی طرح ڈھے گئے اور تاریکی کی تند و تیز آندھیاں انہیں بے ہوشی کے طوفانوں میں لے گئیں۔

☆

ہوش آنے کے بعد احساس سکون و آرام نے انہیں یہ باور کرایا کہ ان کے وجود پتھروں کی سیج پر نہیں ہیں۔ فوم کے گدوں پر تکیوں کی نرمی نے انہیں فرحت بخش احساس لوٹا دیا تھا۔ ڈاکٹر جمال کے برابر والے بیڈ پر ہی پروفیسر امجد لیٹا تھا اور وہ عیادت کے لیے آنے والے کسی دوست سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں کے جسموں پر ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ توانائی بحال کرنے والے محلول بوند بوند ان کے جسم میں شامل ہو رہا تھا۔ احساس درندگی اور بربریت فنا ہو چکا تھا کیوں کہ ان کی بھوک کا احساس بھی مر چکا تھا۔ اس وقت وہ دونوں اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں زیر علاج تھے۔ سامنے والی دیوار پر ان کا ماتحت ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کا سر بار ندامت سے جھکا ہوا تھا۔ پروفیسر امجد سے باتیں کرنے والا دوست بھی ان کے طبقے کا پروفیسر تھا۔ ڈاکٹر جمال کو اٹھتا دیکھ کر وہ اس کے بیڈ کے سرہانے آ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر تفکر اور جھنجلاہٹ کے آثار تھے۔

''آخر اس قسم کے جان لیوا تجربات کرنے کی کیوں کر سوجھی تمہیں؟ پتا ہے تمہارے اس اقدام پر ہم پیشہ طبقے میں اور دوستوں، عزیزوں میں کتنی تشویش پھیل گئی تھی۔ اخبارات والوں نے تمہارے اس تجربے کو ایشو بنا لیا ہے کہ یہ سراسر حماقت اور اقدام خودکشی ہے۔ بھلا بھوک کا مفہوم جاننے کے لیے کون اپنی جان جوکھم میں ڈالے گا؟ اور تم نے یہ تیر مار کر کون سا سبق یا مقصد حاصل کر لیا ہے اور پھر آخر اس مفہوم سے کون سبق سیکھے گا' کون قدر کرے گا؟ معلوم ہے تم پورے چھتیس گھنٹوں کے بعد ہوش میں آئے ہو۔ دونوں کی حالت ایک جیسی مرنے کے قریب تھی۔ ان تمام باتوں سے میں کتنا پریشان ہوا' تمہیں کچھ احساس ہے؟ اپنے ساتھیوں اور اپنے دوستوں کی پریشانی کا؟''

وہ محبت اور اپنائیت سے انہیں ڈانٹتا رہا اور پروفیسر امجد اور ڈاکٹر جمال احمقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگے۔ انہیں اس کی محبت دیکھ کر کچھ احساس ہوا کہ ابھی دنیا میں مروت باقی ہے۔

کافی دیر تک ان کی عیادت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا پھر جب کچھ فرصت میسر آئی تو پروفیسر امجد نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا۔

''تجربے کی شروعات کے حساب سے آج

آٹھواں دن ہے۔"

"ہاں...... ہمارا تجربہ ادھورا رہ گیا" ڈاکٹر جمال نے حسرت سے کہا۔

"مگر پھر بھی ہم نے کچھ مقصد تو پالیا۔" پروفیسر امجد نے کہا۔

"کچھ مقصد......؟" ڈاکٹر جمال اس جملے کی جزئیات پر غور کرتا ہوا بڑبڑایا۔

"اس تجربے سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا یعنی انسانی فطرت کے لحاظ سے بھوک کیا معنی رکھتی ہے؟"

"بھوک وہ عفریت (بلا) ہے۔" پروفیسر امجد نے کہنا شروع کیا۔

"سب سے بڑی عفریت جس کا دوسرا نام ہوس ہے۔ بھوک تو پیسے کی بھی ہوتی ہے اس کی اشتہا غذائی بھوک کے برابر ہوتی ہے۔ حرص، طمع، لالچ اور حسد یہ بھوک کے پیدا کردہ عناصر...... وہ عناصر جس کے اثرات انتہائی تباہ کن ہوتے ہیں۔ منافقت، دروغ گوئی، دہشت گردی اور رشتوں کی پامالی سے لے کر آدمی کے اپنے آپ بکنے تک اور جفا کاری کی لہو رنگ داستانوں تک اور دنیا میں بربریت کا فروغ پانے تک۔ سب بھوک کی پیداوار ہیں کوئی ایک روٹی کے پیچھے جان دیتا ہے، کوئی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کے لیے۔ روپے کی ہوس میں بھائی نے بھائی کا گلا کاٹ دیا یا پھر زمین کے کسی ٹکڑے کے لالچ میں دو گھرانے فنا ہو گئے۔ پستول، بندوق، مشین گن، گرنیڈ، ایٹم بم اور دوسرے تباہ کار عناصر کا تصور کتنا دہشت ناک ہوتا ہے مگر اسے بناتے وقت انسان دہشت زدہ کیوں نہ ہوا؟ اور دہشت کی ان علامتوں کا وجود کس طرح عمل میں آیا؟ ہم سب نے ایک عام مقولہ پڑھ رکھا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ انسان بھوکا ہے روٹی کے ٹکڑے کا، روپے پیسے اور جائیداد کا اور ان کے حصول کے لیے وہ طاقت ور ہونا چاہتا ہے۔ ان تباہ کار عناصر کی ایجاد بھی اس لیے پیش آئی تاکہ طاقت کے بل بوتے پر اپنی خواہشوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے اور اپنی بھوک مٹا سکے۔ چنانچہ اس حساب سے بھوک تو ان سب ہتھیاروں اور تباہ کاریوں کی ماں کہلائی جس کی ضرورت اور اشتہا نے ان سب عناصر کو جنم دیا۔"

"مجھے بھی ان خیالات کا احساس ہوا تھا۔ مگر میں نے ایک اور بھی تجزیہ کیا ہے کہ آخر بھوک سے بچاؤ کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"وہ کیا صورت ہے؟" پروفیسر نے تجسس سے کہا۔

"ایک ہی جذبہ ہے جو بھوک نامی عفریت کے جذبے کو زیر کر دیتا ہے......" ڈاکٹر نے چند لمحے کے توقف میں سسپنس پیدا کیا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گویا ہوا۔

"جذبۂ ایمان، وہ عظیم جذبہ جو بھوک کے عفریت کو مار دیتا ہے۔ خواہ بھوک کسی بھی صورت میں کیوں نہ ہو۔ تم نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ صاحب ایمان لوگ کس طرح بھوک کی شدت کو برداشت کرتے ہیں۔ اس لیے ہم پر روزے فرض ہیں کہ صبر و استقامت کا امتحان بھی ہو اور بھوک میں اپنے اشتعال اور نفس پر قابو بھی ہو مگر دیکھو کہ حضور اکرم ﷺ کے تین دن کے روزے پھر غزوہ خندق کے موقع پر آپ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کا صبر، عفو در گزر، ایمان پر ثابت قدمی، دنیا پر نظر ڈالو کہ ایک طرف صومالیہ کا غذائی بحران اور روس میں جنگ کا وہ منظر جس میں غذائی بحران کے موقع پر فوجیوں نے روٹی کے ٹکڑوں کے بدلے اپنا اسلحہ فروخت کرنا شروع کر

دیا تھا اور دوسرا جنگ کا وہ منظر جو صاحب ایمان نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ پانی پلانے والا لب جاں زخموں سے چور اور پیاس سے بے دم ہوتے ہوئے مجاہد کی پانی کی پکار پر پانی پلانے جاتا مگر جاں بلب مجاہد کے پانی پینے سے قبل دوسرے مجاہد کی پیاس میں تڑپتی ہوئی آواز سنائی دیتی اور وہ پانی پلانے والے کو آگے بڑھا دیتا کہ پہلے میرے بھائی کو پانی پلا دو خود اپنے دل پر صبر کر لیتا۔ اس طرح ایک ایک کر کے مجاہدوں نے تحمل اور صبر کا وہ عظیم مظاہرہ پیش کیا کہ سپاہی پیاسے جام شہادت نوش کر گئے اور پھر بنگال کا وہ خوف ناک قحط جہاں بھوک کے عفریت کے پنجوں تلے مجبور و بے بس ہو کر ماؤں نے چند مٹھی چاولوں کے عوض اپنی اولادوں اور اپنے پیارے بچوں کو فروخت کر ڈالا تھا اور دوسری طرف واقعۂ عظیم کربلا کے مقام پر خدا کے پیاروں نے اسلام کو پھر زندہ کیا تھا ادھر تو ماؤں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے نہ صرف خود بڑے حوصلے سے بھوک و پیاس کو برداشت کیا بلکہ اپنے لخت جگروں کو بھوک و پیاس میں مبتلا تپتے ہوئے ریگزار میں ظلم کے خلاف لڑتے ہوئے دیکھا۔ بربریت کو ڈھا دینے کی کوششوں میں مصروف دیکھا اور اسلام کے نام پر شہید ہوتے دیکھا اور کربلا کی فضا نے شہید اعظمؓ کا وہ سجدہ دیکھا جو سر قلم ہوتے وقت خدا کے حضور جھکا ہوا تھا آج تک اس کی صدا پکار پکار کر کہتی ہے کہ خدا کی راہ میں لڑتے وقت ہر قسم کے ظلم و ستم، آلام و مصائب اور عفریتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ بھوک و پیاس کا تپتے ہوئے صحرا کا اور اسلام دشمن عناصر کا۔" جذبات کی شدت سے ڈاکٹر جمال پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ پروفیسر کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے تھے۔

"کوئی مقابلہ ہی نہیں کہاں مٹھی بھر چاول کے عوض ماؤں نے بچوں کو فروخت کر دیا تو کہاں ایمان کی قوت سے لبریز ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں نے بھوک و پیاس اور تمام مظالم کو بڑے حوصلے سے برداشت کیا۔"

"اور ہم جیسے مسلمانوں سے ذرا بھی بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ پیسے اور روٹی کی بھوک، حرص و ہوس آج کل ہم سب میں عام برائیاں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم میں ایمان نہ رہا کہ اپنی بڑھتی ہوئی بھوک پر قابو پا سکیں یا پھر ہمارے اندر ایمان ہے بھی تو وہ قدرے کمزور پڑ چکا ہے۔" پروفیسر نے تاسف سے کہا۔

"ایک بات اور رہ گئی اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ہم شادی بیاہ اور تقریبات میں کھانا لٹاتے ہیں اور آج کل ایک نیا کھیل کھیلتے ہیں کہ کیک، کسٹرڈ، پیسٹریاں اور انڈے وغیرہ ایک دوسرے پر مار کے محظوظ ہوتے ہیں، ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ یہ کھانا اور یہ غذا ان غریبوں کے کام آ سکتی ہے جو بھوک کے عفریت میں جکڑے ہوئے ہیں۔" ڈاکٹر جمال نے کہا۔

"ہم اپنی اصلاح کر کے ایمان کو پختہ کر سکتے ہیں۔" پروفیسر امجد نے کہا۔

"ہم اپنے بھوک کے تجربے سے حاصل ہونے والے مقصد کو پوری دنیا میں پھیلا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر جمال نے کہا۔

پروفیسر امجد کی آنکھوں میں بھی عزم کے جگنو چمکے۔ "بھوک کے عفریت سے نجات کی اوّلین شرط پختہ ایمان کا ہونا ہے۔"

شب حیرت

محمد حنیف قادری

یہ دنیا عجائبات سے بھری ہوئی ہے اک حیرت کدہ ہے اک معمہ ہے سمجھ میں نہ آنے والا اس پر جتنا بھی غور کریں آپ اس میں الجھتے چلے جائیں گے لیکن اگر آپ کا ایمان پختہ ہے تو یہ دنیا آپ کے لیے اک کھلونے سے زیادہ نہیں جس سے آپ کچھ وقت کے لیے کھیلیں گے اور اصل دنیا کی طرف بڑھ جائیں گے۔

ایک نوجوان کا قصہ حیرت اس کی محبوبہ کو اس کے سامنے جلا دیا گیا تھا مگر وہ پھر بھی زندہ تھی۔

میری نظروں کے سامنے زندہ جلا دیا ظالموں نے اسے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اسے ایسی حالت میں دیکھ کر میرے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔ میرے سامنے سسک سسک کے ایڑیاں رگڑتے ہوئے اس نے جان دے دی۔ اس دوران میں چیختا رہا چلاتا رہا مگر کسی نے میری ایک نہ سنی حالانکہ یہ سبھی لوگ میرے پتا پرتاپ سنگھ کے ملازم تھے۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے۔ میرے پتا نے خود ہی تو انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ بے چارے ایسا نہ کرتے تو خود رائے پرتاپ سنگھ کے عتاب کا شکار ہو جاتے ایک لمحے کے لیے مجھے ان پر ترس آیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا کہ جیسے پرتاپ سنگھ کو ظالم بنانے میں وہ بھی برابر کے حصہ دار تھے اور وہ بھی اتنے ہی ظالم تھے جتنا کہ خود رائے پرتاپ سنگھ۔

مجھے اس وقت انہوں نے ایک مضبوط درخت کے ساتھ زنجیروں سے باندھ رکھا تھا چاروں طرف پھیلے اس وسیع وعریض جنگل میں ظلم کی انتہا کی جا رہی تھی اور انہیں روکنے والا یا ان کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک میں تھا جو اونچی آواز میں چیخ رہا تھا چلا رہا تھا انہیں واسطے دے رہا تھا۔ ان کی منت سماجت کر رہا تھا مگر وہ تھے کہ ان پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک آگ کے جلتے ہوئے الاؤ پر میری نظر پڑی تو وہاں کا منظر دیکھتے ہی میرے وجود کو جھٹکا لگا۔ حواس باختہ نظروں سے میں نے الاؤ میں موجود کلدیپ کور کے وجود کو دیکھا۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ چند لمحے پہلے وہ زندگی بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور آگ کے الاؤ کے گرد موجود رائے پرتاپ سنگھ کے گرگے تیز ترشول ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے اور جونہی وہ معصوم آگ سے بچنے کے لیے کسی طرف بڑھتی، وہ تیز دھار ترشول سے اس کے وجود کو دوبارہ آگ کی طرف دھکیل دیتے۔ ظلم کی اسی آنکھ مچولی میں جانے کب وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ آگ کے دہکتے ہوئے کوئلوں پہ پڑا اس کا وجود عجب ہیبتناک اور دل کو لرزا دینے والا منظر پیش کر رہا تھا۔

میرے پاؤں کی انگلیوں کی پوروں سے ایک لاوا سا اٹھا اور میرے جسم کے نچلے حصے سے ہوتا ہوا اوپر دل و دماغ کی شریانوں تک پہنچا ایک زوردار دھماکے سے میرے وجود کی دیواریں لرز اٹھیں مجھے ایک جھٹکا لگا اور لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا میرا وجود بے جان ہوتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی میری روح بھی شاید قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

رائے پرتاپ سنگھ ظلم اور سفاکیت میں اتنا آگے نکل گیا تھا کہ اس نے اپنی سگی اولاد کو بھی نہیں بخشا۔ ہرنام سنگھ اس کا اکلوتا بیٹا تھا جو کہ اپنی یونیورسٹی فیلو کلدیپ کور سے پیار کر بیٹھا تھا۔ کلدیپ کور ایک

متوسط خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور وہ بھی ہرنام کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ یونیورسٹی کے بعد جب ہرنام سنگھ نے اپنے پتا سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو پرتاپ سنگھ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اس سلسلے میں کسی اور سے وعدہ کر چکے ہیں اور وہ اس کی شادی اپنے دیرینہ دوست رائے مکھن سنگھ کی بیٹی ششما رائے سے کرنا چاہتے ہیں۔ بیٹے نے ان کو منانے کے لیے منت سماجت بھی کی مگر ٹھاکر صاحب اپنی ضد اور انا کے پکے تھے وہ نہ مانے۔ آخر کار تنگ آ کر بیٹے نے کورٹ میرج کی دھمکی دی تو راجہ صاحب نے پینترا بدلا اور کچھ وقت مانگا اور اسی مہلت کے دوران راجہ صاحب نے کلدیپ کور کو بمبئی سے اغوا کروالیا اور اس کے گرگے کلدیپ کور کو لے کر اسی کی جاگیر میں موجود ایک خطرناک جنگل میں آ پہنچے۔ کلدیپ کے اغوا کی خبر جونہی ہرنام سنگھ تک پہنچی تو وہ پاگل سا ہو گیا۔ کلدیپ تو اس کی زندگی، اس کی روح تھی اور اسے جانے کس نے اور کیوں اغوا کر لیا تھا؟ یہی سوچتے ہوئے اس نے گیراج سے گاڑی نکالی اور بمبئی کی طرف بڑھا۔

میں بمبئی پہنچا تو وہاں کی صورت حال انتہائی عجیب تھی۔ اغوا کاروں اور کلدیپ کے رشتہ داروں میں گھمسان کی جنگ ہوئی تھی اور اس جنگ میں دونوں طرف سے کئی بندے مارے گئے تھے اور کئی لوگ زخمی بھی ہوئے جو کہ ابھی تک اسپتال میں موجود تھے۔ مرنے والوں میں سے ایک بندے کی شکل دیکھ کر مجھے شک سا ہوا اور پھر جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو حیرت کی وجہ سے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ بندہ تو میرے پتا کے وفادار ملازموں میں سے تھا۔ میں نے پاس کھڑے شخص سے اس بندے کے بارے میں پوچھا کہ یہ کن کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا تو اس کے جواب نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور میرا شک یقین میں بدل گیا۔ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر میں نے انتہائی عجلت میں واپسی کی راہ لی۔

راستے ہی میں میں نے جاگیر پر موجود اپنے ایک وفادار کو کال کی اور اسے مناسب ہدایات دیں جس کا اس نے تھوڑی ہی دیر میں مثبت جواب دیا۔ کلدیپ کور کو واقعی میرے پتا نے اغوا کرایا تھا اور وہ اس وقت ہماری جاگیر میں موجود خطرناک جنگل سے ملحقہ فارم ہاؤس پر موجود تھی۔ اف میرے خدا۔ یہ سب کیا کر دیا میرے پتا نے۔ انہوں نے اپنی جھوٹی ضد اور انا کی خاطر کئی بے گناہوں کی جان لے لی تھی۔ فارم ہاؤس پہنچتے ہی میں نے اپنے پتا کے دست راست اودھم سنگھ کو بلایا اور اس سے کلدیپ کور کے بارے میں پوچھا مگر وہ مکر گیا۔ وہ مجھ سے عمر میں بھی بڑا تھا اور باپو کا خاص ملازم ہونے کی وجہ سے میں اس کی بہت عزت کیا کرتا تھا مگر آج اس کا وجود مجھے زہر لگ رہا تھا وہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ اچانک جانے مجھے کیا ہوا کہ میں اس پر پل پڑا۔ وہ خاموشی سے مجھ سے پٹتا رہا مگر اس نے میری کسی بھی بات کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا۔ میں اس کی ٹھکائی کر ہی رہا تھا کہ جانے کب میرے پتا رائے پرتاپ سنگھ عین میرے سر پر آن پہنچے۔ وہ انتہائی غصے کے عالم میں مجھ پر دہاڑے۔

''ہرنام سنگھ یہ کیا کر رہے ہو، تمہیں چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں رہی؟''

اس وقت میرا غصہ بھی آسمان کو چھو رہا تھا کلدیپ کی محبت نے مجھے ہر چیز سے بے نیاز کر دیا تھا اور اسی بے نیازی میں مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں اس وقت

جس سے بات کر رہا تھا وہ میرا باپو ہی نہیں ایک ظالم اور سفاک انسان بھی تھا جو اپنی جھوٹی انا کی خاطر ہر حد سے گزر سکتا تھا۔ میری بدتمیزی نے ان کے اندر کے درندے کو جگا دیا۔ انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور میرے سامنے یہ تسلیم کرلیا کہ کلدیپ کور کا اغوا انہی کے حکم پر ہوا تھا اور اسی غصے کی حالت میں انہوں نے مجھے زبردستی لوہے کی زنجیروں سے بندھوایا اور کلدیپ کو میری نظروں کے سامنے زندہ جلانے کا حکم صادر فرما کے چلتے بنے۔

⁂⁂⁂

رائے پرتاپ سنگھ کا بیٹا اپنی محبت کو اپنی نظروں کے سامنے راکھ ہوتے دیکھ کر پاگل ہو گیا اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ رائے پرتاپ سنگھ اپنی جھوٹی انا کے چکر میں آ کر وہ نقصان کر بیٹھا تھا جس کا اب کوئی ازالہ نہیں تھا۔ اس نے بیٹے کے علاج کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہایا مگر لا حاصل۔ ہر جگہ سے اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب وہ پچھتا رہا تھا مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج سے مایوس ہو کر اس نے پنڈتوں اور گرو گیانیوں سے رابطہ کیا مگر ان کے در پر ماتھا ٹیکنے اور ناک رگڑنے کے باوجود اس کی مراد بر نہ آئی۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر اس نے بیٹے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

بیٹے کے پاگل پن نے رائے پرتاپ سنگھ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے تمام مظالم بند کر دیے اور بندگان خدا سے اچھا سلوک کرنے لگا بیٹے کی صحت یابی کے لیے بھوکوں کو کھانا کھلانا شروع کیا اور غریبوں، ناداروں کی بے لوث مدد کرنا شروع کی۔ ہرنام سنگھ کو آزاد کر دیا گیا۔ اب وہ اپنی جاگیر میں سارا دن جہاں چاہے گھوم پھر سکتا تھا۔ ٹھاکر صاحب کی جاگیر کا ایک بڑا حصہ خطرناک جنگلات پر مشتمل تھا ان جنگلات میں اور تو اور خود ٹھاکر صاحب بھی داخل نہیں ہوتے تھے۔ اس جنگل کے حوالے سے اس علاقے میں مختلف کہانیاں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ جنات کا مسکن ہے تو کوئی کہتا تھا کہ یہاں پریاں رہتی ہیں۔ بہر حال سچائی یہ تھی کہ اس جنگل میں آج تک جو بھی داخل ہوا واپس نہیں آیا۔ یہی وجہ تھی کہ ٹھاکر صاحب کے بڑوں نے اس وسیع و عریض جنگل کے ایک بڑے حصے کو چاروں جانب سے خاردار تار لگوا کر بند کر دیا اور لوگوں کا وہاں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا ایک عرصہ ہوا کوئی بھی ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔

جنگل کے اس خطرناک حصے سے پاگل بیٹے کو بچانے کے لیے ٹھاکر صاحب نے کچھ بندوں کی ڈیوٹی لگا دی تھی اور وہ سارا دن ہرنام سنگھ کی نگرانی کرتے تھے اور کبھی وہ جنگل کے اس خطرناک حصے کی جانب بڑھنا چاہتا تو وہ اسے روک دیتے۔ آہستہ آہستہ دن گزرنے لگے اور ہرنام سنگھ کی ڈیوٹی دینے والے لوگ اس سے بے پروا ہونے لگے۔ ایسے ہی ایک دن وہ گاؤں سے نکلا اور خطرناک جنگل کی جانب بڑھا۔ آج اس کی رکھوالی کرنے والے جانے کہاں مر کھپ گئے تھے۔ جونہی وہ جنگل کے قریب پہنچا تو اس نے جنگل میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر خاردار تار نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ خاردار تار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ آخر کار دوپہر ہو گئی۔ ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے وہ کچھ دیر بے سدھ لیٹا رہا پھر اٹھا اور جنگل کی مخالف سمت بڑھنے لگا۔ شام ہو گئی وہ چلتا رہا شاید وہ اپنی جاگیر سے نکل آیا تھا رات کے پہلے پہر کا آغاز ہو گیا مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز چلتا رہا دور ویرانے میں

کہیں اسے روشنیاں نظر آئیں اور وہ روشنیوں کی سمت مڑتا چلا گیا۔

.......✿✿✿.......

سائیں صابر شاہ کا عرس زوروں پر تھا دور دور سے لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ ایسے میں جانے کہاں سے عجیب وغریب مفلوک الحال سا بندہ مزار کی چوکھٹ پر آن بیٹھا۔ یہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا اور کسی کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ یہاں پر اکثر ایسے لوگ آتے رہتے تھے۔

عرس کی تقریبات کا آغاز ہوا تو وہ شخص وہیں چوکھٹ پر ایک سائیڈ پر ہو کر سو گیا اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر کے منزل مقصود پر پہنچ کر پرسکون گہری نیند سو گیا ہو۔

محفل سماع اپنے عروج پر تھی دور ونزدیک سے بلاامتیاز مذہب وملت لوگ اس محفل میں شریک تھے گو کہ مسلمان بھی کافی تعداد میں موجود تھے مگر ہندو اور سکھ بھی کچھ کم نہ تھے۔ سبھی آپس میں گھل مل کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت انہیں دیکھ کر قطعاً یہ نہیں لگتا تھا کہ یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں کئی مذاہب کے لوگ ہیں یوں لگتا تھا کہ جیسے مختلف رنگ ونسل اور مذہب وملت کے لوگوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا گیا ہو اور یہی برصغیر پاک وہند میں موجود اولیائے کرام کا طرۂ امتیاز رہا ہے مگر افسوس کہ جس مذہب کے اولیائے کرام کی تعلیم وتربیت کے سائے تلے دوسرے مذاہب کے لوگ متحد ہو کر بھی فرق مٹا دیتے ہیں اسی مذہب کے علمائے کرام اپنی ہی قوم کے لوگوں کو ایک جگہ جمع نہیں کر پاتے۔

''افسوس صد افسوس۔'' ہرنام سنگھ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے حیران وپریشان نظروں سے چاروں جانب دیکھا۔ محفل سماع اس وقت جانے کس رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ہرنام سنگھ کے وجود کو ایک جھٹکا لگا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مزار کے اندر داخل ہو گیا۔ پائیں مزار اس نے ٹیک لگائی اور منہ ہی منہ میں کچھ دیر بڑبڑاتا رہا۔ تھوڑی دیر وہ اسی کیفیت میں رہا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور محفل سماع میں شامل ہو گیا۔

.......✿✿✿.......

اس وقت میری کیفیت عجب سی ہو رہی تھی۔ اچانک جانے میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا تھا۔ میرے اپنے ہی وجود پر میرا کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ گزشتہ زندگی سے متعلق تمام باتیں ایک ایک کر کے مجھے یاد آتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میری موجودہ صورت حال کا ذمہ دار کون تھا اور یہ سب یاد آتے ہی میرے دل پر جیسے چھریاں سی چلنے لگیں۔ میرے اپنے لوگ ہی میرے قاتل نکلے۔ کلدیپ کی آخری وقت کی چیخ وپکار۔ اس کا آگ سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگنا۔ آگ میں جھلستا ہوا اس کا مرمریں بدن۔ مدد کے لیے انتہائی پر اذیت اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجھے پکارنا۔ اف خدا کی پناہ۔ میری حالت ایک بار پھر سے غیر ہونے لگی۔ میں اس وقت خطرناک جنگل کے کنارے لگے خاردار تار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے خاردار تار کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بے اختیاری کے عالم میں جھنجوڑا اور دوسرے ہی لمحے مایوسی اور قنوطیت مجھ پر چھاتی چلی گئی اور میں وہیں گر گیا۔ جانے کب کا میرے اندر رکا ہوا آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا مگر جانے کیوں آنسو میری آنکھوں سے پانی کی صورت نکلنے کو ترستے رہے۔ میری آنکھوں پر دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے میری آ

نکھیں نکال کے آگ کے جلتے ہوئے الاؤ میں پھینک دی ہوں مگر یہ کیفیت بھی زیادہ دیر نہیں رہی اور میں ایک بار پھر سے نارمل ہوتا چلا گیا۔

اچانک ہی ایک نامانوس مسحور کن خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ میں نے سامنے خاردار تار کے پار خطرناک جنگل کی سمت دیکھا۔ وہاں مجھے جھاڑیوں میں ہلچل سی نظر آئی۔ یہ کون تھا؟ اور جنگل کے اس خطرناک حصے میں کیا کر رہا تھا۔ کیا وہ کوئی درندہ ہے یا پھر کوئی انسان؟ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں اٹھ بیٹھا اور غور سے جھاڑیوں کی جانب دیکھا اف خدا کی پناہ! یہ تو کوئی لڑکی تھی۔ لڑکی اور اس جنگل میں؟ اس جنگل میں تو مرد بھی ڈر کی وجہ سے داخل نہیں ہوتے تو پھر یہ لڑکی؟ وہ شاید دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے چہرہ پیچھے کی جانب کیا اور میری طرف دیکھا۔ جونہی اس کا چہرہ میری طرف ہوا مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

کیا مرنے کے بعد کوئی زندہ بھی ہوسکتا ہے؟ کیا یہ وہی ہے؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اسے تو میں نے اپنی آنکھوں سے موت سے ہم کنار ہوتے دیکھا تھا تو کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ میں نے زور سے اپنے آپ کو چٹکی کاٹی۔ تکلیف کے احساس نے میری سوچ کو درہم برہم کر کے رکھ دیا یہ وہی تھی سو فیصد وہی، وہی نین نقش۔ وہی مسکراہٹ۔ وہ مجھے دیکھ کر میری طرف بڑھی مگر وہ ابھی خاردار تار سے کچھ دور ہی تھی کہ ایک زبردست دھچکے سے پیچھے کی جانب گری اور آگ آگ پکارتے ہوئے یکلخت اٹھی اور دوبارہ سے جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہوگئی۔ میں نے پاگلوں کی طرح اسے پیچھے سے پکارا مگر وہ تو جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہوچکی تھی۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ خاردار تار کو ہاتھوں سے تھاما اور ان کے اوپر سے ہوتا ہوا دوسری جانب کود گیا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں خاردار تار سے زخمی بھی ہوئے مگر مجھے اس وقت اس کی پرواہ ہی کب تھی۔ وہ میری زندگی میری کائنات اور میرا سبھی کچھ تھی۔ جانے کتنی صدیوں کے بعد میں نے اسے دیکھا' تھا اب میں اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ میں اس طرف بھاگا جس طرف جھاڑیوں میں کلدیپ کور غائب ہوئی تھی۔ میں اسے کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جھاڑیاں بہت گھنی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ان میں سے راستہ بنایا اور دوسری طرف نکلا۔ دوسری طرف ایک قدرتی سی پگڈنڈی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ ہی دور کلدیپ مجھے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ اسے پکارتے ہوئے میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ میری جسمانی حالت ہرگز ایسی نہ تھی کہ میں اس وقت دوڑ لگا سکتا مگر کلدیپ کور کی محبت نے مجھے اپنے آپ سے بے نیاز کر دیا تھا۔ کلدیپ کور جانے کیوں میری آواز نہیں سن رہی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ میں جو پہلے ہی اپنی قوت سے زیادہ دوڑ لگا رہا تھا کچھ اور بھی تیز دوڑنے لگا جانے پھر بھی کیوں میں اس تک پہنچ نہیں پایا۔ کلدیپ اتنا تیز دوڑ رہی تھی کہ جیسے وہ دوڑ نہ رہی ہو تیر رہی ہو اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ ایک درخت کی اوٹ میں ہوتی نظر آئی اور پھر اس کا کہیں نام ونشاں نہ رہا اسے زمیں کھا گئی یا آسماں نگل گیا کچھ پتہ نہ تھا۔

شام کا گہرا ہوتا دھندلکا اب رات کی ہولناک اور دل کو دہلاتی گہری سیاہی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ اندھیرے کی چادر نے کچھ ہی دیر میں جنگل کے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر طرف سے مختلف قسم کے حشرات الارض کی آوازیں سنائی

دینے لگیں۔ تھوڑی دیر پہلے ہر سو بپا ہونے والا پرندوں کا شور تھم گیا۔ میں اس وقت ایک بڑے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ میرے سانسوں کی رفتار نارمل ہو چکی تھی۔ میرے ہاتھوں اور پاؤں سے خون اب بھی رس رہا تھا جس کی وجہ سے مجھے بے حد نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی چیتھڑا ہوتی قمیص پھاڑ کر پٹیاں بنائیں اور زخموں پر جنگل کی نم آلود مٹی لگا کر باندھ دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔

آج کتنے عرصے کے بعد میں نے اسے دیکھا اور پھر کھو دیا۔ کیا اس کا وجود حقیقت تھا؟ کیا یہ سب میرے ذہن کا واہمہ تو نہیں؟ اور پھر میری ذہنی رو بھٹکتی چلی گئی اور میں جانے کیا کیا سوچتا چلا گیا۔

✿✿✿

رات کو درندوں سے بچنے کے لیے میں شیشم کے ایک پرانے، مضبوط اور تناور درخت کے اوپر چڑھ گیا گو کہ ہاتھ اور پاؤں زخمی ہونے کی وجہ سے میرے لیے یہ ممکن نہ تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق بڑی مشکل سے میں شیشم کے درخت کے دوشاخے میں پھنس کر بیٹھ گیا مغرب سے ٹھنڈی ہوا ؤں کے جھونکے آ رہے تھے گرمیوں کے موسم میں یہ بہت بڑی نعمت تھی مگر میرے لیے یہ بہت خطرناک چیز تھی کیونکہ اس وجہ سے مجھے اونگھ سی آنے لگی تھی۔ بہر حال رات کا پہلا پہر کسی نہ کسی طرح گزر گیا مگر نیند کی وجہ سے میرا برا حال تھا۔ بارہ بجے کا وقت ہوگا جب میرے کانوں سے ایک عجب سی آواز ٹکرائی۔ میں نے آنکھیں جھپکیں اور اس آواز پر کان لگا دیے۔ ڈھول کے ساتھ شادیانے بجنے کی واضح آواز سنائی دے رہی تھی۔

رات کے اس سمے یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر سے آنکھوں کو زور زور سے ملا اور جنگل میں چاروں جانب نظر دوڑائی۔ جنوب کی سمت کافی دور جنگل کا ایک پورا علاقہ تیز روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ اف خدا کی پناہ یہ سب؟ اس جنگل میں؟ مجھے ان روشنیوں میں گھرا ایک پورا شہر وہاں آباد دکھائی دیا جس میں عجیب پر ہیبت اور خوفناک سی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ درخت کے اوپر موجود دوشاخے میں بیٹھے بیٹھے اس منظر کو دیکھنے کے بعد میری نیند ہوا ہو گئی۔

اف میرے خدا! یہ سب کیا تھا۔ جنگل میں منگل والا محاورہ تو سنا تھا مگر یوں ہو بھی سکتا ہے یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اور پھر جب رات کو میں درخت پر چڑھا تھا تو میں نے چاروں جانب دیکھا تھا مگر اس وقت تو یہاں کچھ بھی نہ تھا اب اچانک یہ روشنیوں کا شہر کہاں سے اگ آیا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں درخت سے نیچے اترا اور آہستہ روی سے روشنیوں کے مرکز کی طرف بڑھا۔

آخر کار پندرہ بیس منٹ کی تگ و دو کے بعد میں اس مقام تک پہنچ گیا جہاں سے اس اچانک اگ آنے والے روشنیوں کے شہر کو قریب سے دیکھا جا سکتا تھا۔ شادیانے اور ڈھول بجنے کی واضح آواز سنائی دے رہی تھی۔ موسیقی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کوئی خوشی کی تقریب ہے۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ہو نہ ہو یہ کسی ماورائی اور مافوق الفطرت مخلوق کا شہر ہے اور یہ تقریب بھی انہوں نے سجائی ہوگی۔ ابھی تک میرا اس مخلوق سے سامنا نہیں ہوا تھا اور درخت پر بیٹھے ہوئے جو میں نے شکلیں دیکھی تھیں وہ غیر واضح تھیں اب میں انہیں قریب سے دیکھنا چاہتا تھا اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ کلدیپ کو بھی انہیں میں کہیں

موجود ہوگی۔ کہاں؟ اور کس حال میں؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ بہرحال مجھے اس کا کھوج لگانا تھا اور اسے یہاں سے نکالنا تھا چاہے مجھے اس کے لیے اپنی جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔

میں ابھی آگے بڑھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میری کیفیت عجب سی ہوتی چلی گئی اور یہ وہی کیفیت تھی جو کہ سائیں صابر شاہ کے مزار پر ہوئی تھی۔ میرے اندر روح کی گہرائیوں میں کہیں لفظِ اللہ کا ورد جاری ہوا اور اس ورد کے جاری ہوتے ہی میرے دل و دماغ اور وجود کے روئیں روئیں میں ایک سکوں سماتا چلا گیا اور مجھ پر ایک عجب سا خمار آلود نشہ طاری ہوگیا جس نے مجھے اردگرد کے حیران کن، خوفناک اور ڈراؤنے ماحول سے بے نیاز کردیا اور میں اسی بے نیازی کے عالم میں تمام خطروں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے دھڑک روشنیوں کے شہر کی جانب بڑھا مگر میں ابھی شہر سے کچھ دور ہی تھا کہ وہ عجیب و غریب مخلوق تیزی سے میری جانب بڑھی۔ شاید مجھے دیکھ لیا گیا تھا۔

قریب پہنچتے ہی انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا اور عجب بے ڈھنگی، خوفناک اور کریہہ آواز میں ہنسنے لگے۔ عجب خوفناک اور دل کو لرزا دینے والا ماحول تھا۔ اگر مجھ پر تھوڑی دیر پہلے وارد ہونے والی بے نیازی کی کیفیت طاری نہ ہوئی ہوتی تو جانے ڈر اور خوف کی وجہ سے میرا کیا حال ہوتا مگر میں ان کے درمیان اسی بے نیازی اور لاتعلقی کی سی کیفیت میں کھڑا رہا۔ میں نے ایسی عجیب و غریب مخلوق کبھی نہ دیکھی تھی۔ البتہ ایسی مخلوق کے بارے میں قصے کہانیوں میں جو سنا تھا اس کے مطابق میرا اندازہ تھا کہ یہ مخلوق نسل جنات میں سے ہے۔ انتہائی ہیبتناک کریہہ چہرہ جس سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ بڑے بڑے سے کان، عجب چپٹی سی ناک اور اس ناک کے دونوں جانب دہکتی ہوئی انگارہ آنکھیں۔ سر پر جھاڑ جھنکار کی مانند اگے ہوئے کالے لمبے بکھرے ہوئے بال، لمبی بدہیئت داڑھی جوان کے موٹے ڈرم نما پیٹ سے بھی نیچے لٹکتی ہوئی شاید ان کی ٹانگوں تک پہنچ رہی تھی۔ ان کے عجیب و غریب قد کے بارے میں فی الحال میں کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھا کیونکہ وہ مسلسل حرکت میں تھے اور مجھے دیکھ کر خوب ہلا گلا کررہے تھے۔ کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا کہ ان کے قد آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہوں اور کبھی یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ بالکل میرے قد کے برابر ہوں۔ ابھی میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ان میں سے ایک نے مجھے اپنے ہاتھوں میں یوں اٹھایا جیسے کوئی بچہ ہلکے پھلکے کھلونے کو ہاتھوں میں اٹھاتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا وجود آندھیوں کی زد میں ہو مگر دوسرے ہی لمحے میرا وجود زبردست ہواؤں کے شور میں گم ہو گیا۔

روشنیوں کے شہر کے عین وسط میں ایک بہت بڑی تقریب جاری تھی۔ وہی عجب بدہیبت مخلوق جو میرے اندازے کے مطابق جن ہی تھی، ہر طرف موجود تھی۔ ایک جانب اونچی جگہ پر اسٹیج سجا ہوا تھا اور اسٹیج کے عین سامنے منقش کرسیوں پر زرق برق لباس پہنے کچھ جنات بیٹھے ہوئے تھے۔ انہی منقش کرسیوں کے درمیان انتہائی خوبصورتی سے سجے ہوئے ایک تخت پر ان تمام جنات کا سردار جس کا نام مجھے بعد میں جنگو معلوم ہوا، براجمان تھا۔ انتہائی حیران کن اور عجب بات یہ تھی کہ اسی تخت پر میرے دل کی ملکہ کسی اور کی ملکہ بنی بیٹھی تھی۔ خوبصورت زیورات سے لدی پھندی سرخ عروسی جوڑا پہنے وہ

واقعی ملکہ لگ رہی تھی۔ کسی اور کے پہلو میں اسے یوں بیٹھے دیکھ کر میرے دل پر چھریاں سی چل گئیں۔

⁂

اسٹیج کے سامنے اونچے چبوترے پر مجھے ایک ستون کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اس وقت رقص و سرود کی محفل عروج پر تھی۔ تمام جنات عجب سے آہنگ میں رقص کناں تھے۔ ہاؤ ہو کا شور بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا ڈھول اور شادیانے سے بلند ہونے والی بے ہنگم سی موسیقی کان پھاڑے دے رہی تھی اچانک ڈھول پر ڈھم کی آواز سے آخری ضرب لگی اور فضا میں ایک بار سکوت چھا گیا مگر یہ سکوت تادیر قائم نہ رہ سکا کچھ ہی لمحوں بعد جنات اٹھے اور جنگو سردار کو شادی کی مبارک باد دینے لگے تھوڑی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا ایسے میں کسی نے شاید جنگو سردار کو میری گرفتاری کے بارے میں بتا دیا۔ جنگو سردار نے چبوترے کی طرف دیکھا۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے فوری طور پر اپنے ساتھیوں کو کچھ کہا۔ جلد ہی مجھے جنگو سردار کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس وقت جنگو سردار کے ساتھ ہی کلد یپ کو ر بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے انجان سی نظروں سے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا؟

جنگو سردار نے بنظر غور میرا جائزہ لینے کے بعد انتہائی غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہرنام سنگھ کب پیچھا چھوڑو گے تم میرا۔ بہت ہی ڈھیٹ ہو تم۔ تمہیں تو اب تک مر کھپ جانا چاہیے تھا۔ جانے تمہیں کیا خار ہے مجھ سے؟ مگر تم ہو کہ ہر بار جب میں اپنی منزل کے قریب پہنچنے والا ہوتا ہوں تو تم کالی بلی کی طرح میرا راستہ کاٹنے آ جاتے ہو مگر اس بار تم انتہائی غلط وقت اور غلط جگہ پر آ گئے ہو۔ شاید تمہاری موت ہی تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے مگر ان سب باتوں سے قطع نظر تم یہ بتاؤ کہ آج کی رات جبکہ میری شادی نیلم پری سے ہونے والی ہے تو تم یہاں کیا کرنے آئے ہو کیا اسے پھر سے چھیننے آئے ہو مجھ سے؟'' یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ بلند کیا اور اس کے قہقہے کے ساتھ ہی ایک طوفان بدتمیزی شروع ہو گیا۔ جنگو سردار کی تمام رعایا اس کے قہقہے میں اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔

میں گنگ سا کھڑا حیرانی کے عالم میں اسے تکنے لگا۔ ''نیلم پری'' اس نے کسے کہا تھا؟ کیا کلد یپ کو ر کو؟ اف میرے خدا! تو کیا جسے میں کلد یپ کو ر سمجھ رہا تھا وہ نیلم پری تھی؟ اور میں اسے اپنی کلد یپ کو ر سمجھ بیٹھا تھا یہ سوچتے ہی میں نے سامنے ملکہ بنی بیٹھی کلد یپ کو ر یا نیلم پری کی جانب بنظر غور دیکھا شکل تو سو فیصد کلد یپ کو ر ہی کی تھی تو پھر یہ نیلم پری کیسے ہو گئی؟ اور پھر پریوں کا انسانوں میں کیا کام۔ کالج سے لے کر یونیورسٹی کا عرصہ ہم نے ساتھ گزارا تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا وہ آدم زاد اور میری طرح ایک انسان ہی تھی مگر سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کون تھی نیلم پری یا کلد یپ کو ر؟ اف خدا کی پناہ۔ جنگو سردار کے اس فقرے کا مطلب کیا ہے کہ......

''کیا اسے پھر سے چھیننے آئے ہو مجھ سے؟''

تو کیا میں نے پہلے بھی چھینا تھا اسے؟ کس سے چھینا تھا میں نے اسے۔ یونیورسٹی اور کالج میں تو کئی رقیب تھے میرے۔ ایسا کون سا رقیب تھا کہ جس کی رقابت سب سے زیادہ تھی اور جو کلد یپ کو ر کو اس حد تک چاہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کلد یپ واقعی اتنی حسین تھی کہ جس نے بھی اسے دیکھا وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا رہ گیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ مجھ پر دل و جان سے مرمٹی تھی اور میرے علاوہ اس معاملے میں

کسی کسی کا نام سننا تو درکنار کسی کے بارے میں سوچنا بھی پاپ سمجھتی تھی۔ ایسے میں کون ایسا تھا جس کا پیار اتنی شدت اختیار کر گیا کہ اس نے کلدیپ کور کو مجھ سے چھین لیا؟ وہ صرف اور صرف ایک ہی شخص ہو سکتا تھا راج سنگھ عرف راجو ملہوترا۔ یہ وہی تھا جو ہر میدان میں مجھ سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ کلدیپ کور کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے انتہائی تیز جلتے ہوئے آگ کے الاؤ پر جلتے ہوئے دیکھا تھا اور اتنی تیز جلتی ہوئی آگ پر کون زندہ رہ سکتا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ بے ہوشی کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے آگ کے تیز الاؤ کو دھوئیں کے مرغولوں میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر تب تک تو کلدیپ کور کی چیخیں بھی تھم گئی تھیں اور وہ شاید اس دنیا سے گزر گئی تھی یا پھر اسے کسی نے بچا لیا تھا مگر یہ سب کیسے ممکن تھا؟ یہ سب باتیں میرے دماغ کو پاگل کیے دے رہی تھیں۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ میرے لیے فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہو گیا تھا۔ بے ہنگم قہقہوں کا شور اچانک تھم گیا۔

''کن سوچوں میں گم ہو گئے ہو ہرنام سنگھ۔'' یہ کہتے ہی وہ تخت سے اٹھا اور اس نے عجب سی زبان میں اپنے سامنے کھڑے جم غفیر سے کچھ کہا جسے سنتے ہی سبھی جنات اپنی اپنی جگہوں پر آرام سے بیٹھ گئے اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور تخت کے پیچھے بنے ایک اندھیرے کمرے میں لے گیا۔ اسی لمحے وہاں ایک ملازمہ داخل ہوئی جس نے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی روشنی دیتی ہوئی موم بتی سنبھال رکھی تھی۔ ملازمہ نے موم بتی ایک اوطاق میں رکھی اور جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے واپس چلی گئی۔

اس نے مجھے ایک کرسی پر بٹھایا اور خود وہیں پڑے ایک تخت پہ براجمان ہو گیا۔

''شاید تم سوچ رہے ہو کہ یہ سب کیا ہے؟ میرا تو خیال تھا کہ تم بہت ذہین ہو مگر افسوس کہ تم تو بالکل ہی سمجھ نہیں پائے اور ابھی تک ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہو حالانکہ بات انتہائی سیدھی اور آسان ہے۔ تمہاری معشوقہ کلدیپ کور واقعی پریوں کی نسل سے تعلق رکھتی ہے اور میں جنوں میں سے ہوں۔ مگر تم اس کے پیار میں اتنے اندھے تھے کہ تم نے کبھی سنجیدگی سے اس کی کئی عادتوں کا نوٹس نہیں لیا وہ تمہارے ساتھ کسی بھی پبلک مقام پر جانے سے گھبراتی تھی۔ اپنے مذہبی اور روحانی اجتماع میں تم نے اسے کئی بار لے جانا چاہا مگر وہ تمہاری لاکھ ضد کے باوجود نہیں گئی آخر کیوں؟ صرف اور صرف اس لیے کہ وہ کسی بھی روحانی علوم کے جاننے والے کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھی کیونکہ وہ تمہارے سامنے اس کی اصلیت کی پول کھول سکتا تھا اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو وہ اس سے کئی مسائل کا شکار ہو سکتی تھی اور اس کا وہ خواب ادھورا رہ سکتا تھا جو انسانوں کے کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا اس نے دیکھ رکھا تھا۔ بہرحال وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی کہ وہ تمہیں تمام حقائق سے آگاہ کر دے مگر وہ سب سے پہلے اپنا دوسرا خواب پورا کرنا چاہتی تھی اور وہ تھا اس کا تم سے شادی کا خواب اور وہ اسے ہر حال میں پورا کرنا چاہتی تھی مگر شاید وہ نہیں جان پائی کہ راج سنگھ ملہوترا عرف راجو بن کر کالج میں آنے والا آدمی کے روپ میں ایک خطرناک جن تھا۔ اصل کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ سراسر پراسرار اور خفیہ علوم میں برتری کا معاملہ ہے۔ جس میں پریوں کی نسل اپنی معصومیت کی وجہ سے

ابھی تک ہم سے پیچھے ہے۔ اس میدان میں جتنی ہماری قوم نے ترقی کی ہے اتنی ترقی کا شاید یہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ بہر حال مجھے جونہی اس کے پری ہو نے کا علم ہوا تو میں نے اس کی کھوج نکالی اور اس کے بارے میں سبھی راز جان لیے۔ اس کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد میں نے کلدیپ کور کے سامنے اس کے سبھی راز کھول کر اسے تنگ کرنا چاہا مگر جانے کیوں میں ایسا نہ کر سکا کیونکہ شاید اس وقت تک مجھ پر بھی کلدیپ کور کے حسن کا جادو چل چکا تھا اور میں بھی اس مرض لا دوا میں مبتلا ہو چکا تھا جس نے بڑے بڑے طرم خانوں کو محبوب کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس سلسلے میں میں نے کئی بار کلدیپ کور سے بات کرنا چاہی مگر اس نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی۔ بہت سی مخفی اور پراسرار طاقتوں کا مالک ہونے کے باوجود مجھ پر ایسی کئی پابندیاں تھیں جن کی وجہ سے میں کلدیپ کور کے خلاف کھل کر کوئی بھی کارروائی کرنے سے قاصر تھا۔ یہ پابندیاں میرے اپنے بڑوں نے لگائی ہوئی ہیں اور ہم میں سے جب بھی کوئی ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے انتہائی کڑی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس سے وہ مخفی اور پراسرار قوتیں بھی چھین لی جاتی ہیں جن کا وہ غلط استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انسانوں اور دوسری مخلوقات کے ساتھ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ نہیں کر سکتے جو ہم کرنا چاہتے ہیں اور اگر کبھی ایسا ہو کہ ہم اپنی مرضی کر سکیں تو یہ دنیا جس میں حضرت انسان اور دوسری مخلوقات رہائش پذیر ہیں وہ ہماری غلامی پر مجبور کر دیے جائیں مگر جانے کیوں یہ بات ہمارے بڑوں کو سمجھ نہیں آتی اور وہ ہمیں ایسا کرنے سے روکتے رہتے ہیں۔ بہر حال جب میں نے دیکھا کہ تمھارے ہوتے ہوئے میں کسی بھی صورت کلدیپ کور کو ماسوائے اپنی طاقت کا غلط استعمال کرنے کے حاصل نہیں کر سکتا تو میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں ہر حال میں کلدیپ کور یعنی نیلم پری کو حاصل کرنے کے لیے اپنی مخفی اور پراسرار قوتوں کا استعمال کروں گا، اس کے لیے چاہے مجھے اپنے بڑوں سے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے اور وہ میں نے کی اور یہ سب میرے لیے انتہائی آسان تھا کیونکہ میرے پتا گپت سنگھ ہی ہماری اس راجدھانی کے حکمران تھے ان کے چند لالچی اور ہوس پرست وزیروں اور مشیروں نے میرے لیے اپنے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اور بھی آسان کر دیا۔ ایک رات سوتے میں میرے وفاداروں نے اسے قتل کر دیا۔ راجدھانی کا مکمل کنٹرول سنبھالتے ہی میں نے اپنے پتا کے سبھی غداروں کا خاتمہ کروا دیا اور اہم عہدوں پر اپنے ہمنواؤں کی فوج بھرتی کر لی۔ اب اس راجدھانی میں سبھی لوگ میرے تابع فرماں ہیں اور وہ میری حکم عدولی نہیں کر سکتے۔ اب میں صحیح معنوں میں خفیہ اور پراسرار قوتوں کا استعمال کرنے کے لیے بالکل آزاد تھا۔ میں نے ایک پلان بنایا اور تمھارے پتا اور اس کے وفادار نوکروں کے دماغوں پر قبضہ جما کر کلدیپ کور کو اغوا کرایا جو کہ حقیقت میں نیلم پری تھی جب ہم نے اسے اغوا کیا تو ہمیں بھی اپنے کئی بہترین ساتھیوں سے ہاتھ دھونے پڑے کیونکہ نیلم پری بھی اپنے ملک کی شہزادی تھی اور اس کے ساتھ ہمہ وقت اس کے کئی وفادار موجود رہتے تھے۔ وہ سبھی بے جگری سے لڑے اور انہوں نے حق نمک ادا کر دیا اور میرے کئی وفاداروں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمھارے پتا کے کئی وفادار نوکر بھی مارے گئے مگر اس وقت تک ہم نیلم پری کو اغوا کر چکے تھے۔

بالکل انسانوں کی طرح اور تمھارے باپ کے وفادار نوکروں کے جسموں کا استعمال کرتے ہوئے ہم نے گاڑی میں راہ فرار اختیار کی۔ میں نے اس وقت تمھارے باپ کے وفادار نوکر اودھم سنگھ کے دماغ پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ ادھر تمھارے بیٹا اور تمھارے ایک وفادار دوست کے دماغ کو ہم پہلے ہی قابو میں کر چکے تھے۔ سب کچھ میرے پلان کے مطابق ہوا اور ہم تمھیں وہاں تک لانے میں کامیاب رہے جہاں ہم لانا چاہتے تھے۔ نیلم پری کے ہونٹوں کو ایک پراسرار ٹیپ لگا کر بند کر دیا گیا جسے تم نہیں دیکھ سکتے تھے اور وہ چاہتے ہوئے بھی تمھیں کچھ نہ بتا سکی اور تم یہی سمجھے کہ تمھاری محبت تمھارے اپنوں ہی کی سازش کا شکار ہو کر آگ میں جل مری حالانکہ آگ کا وہ الاؤ خفیہ اور پراسرار قوتوں کا ایک نادر نمونہ تھا۔ وہاں جو کچھ بھی ہوا وہ تمھاری نظر کا دھوکا تھا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ حتیٰ کی کلدیپ کور کا چیخنا چلانا اور تمھیں مدد کے لیے پکارنا بھی ہمارے ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔ میں صرف اور صرف یہ چاہتا تھا کہ تم اس کا پیچھا چھوڑ دو پھر جب میں نے دیکھا کہ تم شدت غم کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس کھو رہے ہو تو میں نے اپنے ایک ساتھی کو تمھارے دماغ میں داخل ہونے کا اشارہ کیا تمھارے ڈوبتے ہوئے دماغ کو اس نے ایک زبردست جھٹکا لگایا اور یہ جھٹکا کچھ زیادہ ہی لگ گیا جس کی وجہ سے تم مکمل طور پر پاگل ہو گئے۔ رہی بات نیلم پری کی تو اسے میں یہاں لے آیا اور اپنے پراسرار اور خفیہ علوم کی مدد سے اس کے دماغ سے پرانی زندگی کی تمام یادیں کھرچ ڈالیں مگر اسی دوران اس کے دماغ کے کچھ خلیے متاثر ہو گئے اور وہ اپنی یادداشت مکمل طور پہ کھو بیٹھی۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ مکمل طور پہ میری دسترس میں تھی مگر نیلم پری کے وجود میں نیلم پری نہیں رہی وہ ایک روبوٹ بن گئی میرے اشاروں پہ ناچنے والا ایک روبوٹ اور یہی میں چاہتا تھا اور آج جب میں اس سے شادی کرنے جا رہا ہوں تو جانے کہاں سے تم ٹپک پڑے ہو۔ شاید تمھاری موت ہی تمھیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ اب کی بار میں تمھیں یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔ زندگی کے ہر موڑ پر تم نے مجھے نیچا دکھایا مگر میں اب یہ نہیں ہونے دوں گا۔ اس وقت میں مجبور تھا کیونکہ میرے بڑوں نے مجھے اپنی خفیہ اور پراسرار قوتوں کو انسانوں کے خلاف استعمال کرنے سے منع کر رکھا تھا مگر اب یہ بات قصہ پارینہ بن چکی ہے اور اب میں اپنے معاملات کا خود ذمہ دار ہوں۔ مجھے زندگی میں تم نے کئی دکھ دیے ہیں جس کا اب میں تمھیں سود سمیت جواب دوں گا۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے تمھیں یہ سب کیوں بتایا۔ صرف اور صرف اس لیے کہ مرتے ہوئے تمھیں پتہ ہو کہ تمھیں کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔ میرے خیال میں باتیں بہت ہو چکی ہیں۔ آؤ باہر چلو اور اپنی آنکھوں سے اپنی بربادی کا تماشہ دیکھو اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

❁❁❁

جنگو سردار کے باہر نکلتے ہی شادیانے بج اٹھے اور ایک دفعہ پھر سے وہی طوفان بدتمیزی شروع ہو گیا۔ بڑے چبوترے پر مجھے پھر سے وہیں لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ عجب پراسرار اور حیران کن کہانی تھی جس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں مگر ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ میرے سامنے ملکہ بنی بیٹھی وہ ہستی واقعی میری محبت تھی اب وہ کلدیپ کور تھی یا نیلم پری مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اسی چبوترے پر

کھڑے کھڑے میں نے خدا کو دل سے یاد کیا اور میری حالت ایک بار پھر سے غیر ہونے لگی۔ اسی غیر ہوتی بے اختیاری حالت میں جانے مجھے کیا ہوا کہ میں ایک جذبے اور جنون کی سی کیفیت میں جنگجو سردار کے تخت کی جانب بڑھا مگر ابھی میں چبوترے سے اترنے بھی نہ پایا تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے سے چھا ڈال کر وہیں ساکت و جامد کر دیا۔ میں نے گردن گھما کر پیچھے کی جانب دیکھا تو مجھ پہ جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

اس وقت ایک سبز پوش فقیر مجھے اپنی پناہ میں لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میرا سارا جوش و جذبہ اور جنوں کسی اور ہی رنگ میں ڈھلتا چلا گیا۔ میرے دل کی حالت پھر سے میری سمجھ سے باہر ہونے لگی۔ بے جان سے ہوتے وجود کے ساتھ میں نیچے گرنے لگا تو انہوں نے مجھے سنبھالا دیا۔ اتھل پتھل ہوتی سانسیں ایک بار پھر سے بحال سی ہونے لگیں۔ فقیر نے میرے گرد اپنی چھپی کا شکنجہ کچھ اور بھی کس دیا۔ میرے وجود میں ایک بھونچال سا اٹھا جس سے میرے وجود پہ لرزہ سا طاری ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب میری کیفیت کچھ سنبھلی تو فقیر نے مجھے اپنی پناہ میں لیے ہوئے فرمایا۔

''بیٹا! پتھروں سے سر ٹکراؤ گے تو خود زخمی ہو جاؤ گے۔ جس مخلوق کے درمیان تم آن پھنسے ہو یہ دنیا کی انتہائی خطرناک ترین مخلوق ہے۔ اس پراسرار اور مافوق الفطرت مخلوق سے ٹکرا کر فتح یابی چاہتے ہو تو آ ؤصدق دل اور یقین کامل سے محمد عربی ﷺ کا کلمہ پڑھ لو پھر دیکھنا کہ تمھارے اندر وہ طاقت آ جائے گی جس کے مدمقابل دنیا کی سبھی طاقتیں ہیچ ہوں گی۔ تم کل جب سے سائیں صابر شاہ کے مزار سے لوٹے ہو تمھارے اندر شکست و ریخت کا عمل جاری ہے۔ مجھے تمھاری مدد اور راہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اگر دین و دنیا کی فلاح چاہتے ہو تو سچائی کو اس کی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ دل و روح کی گہرائیوں سے مان لو۔'' یہ کہہ کر بزرگ پراسرار انداز میں خاموش ہو گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ مذہب کے حوالے سے میں کالج اور یونیورسٹی کے دنوں ہی سے مسلمانوں سے متاثر تھا مگر اپنے آپ میں حق کو تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا اور اب شاید وہ وقت آ گیا تھا کہ مجھے اسلام کو اس کی حقانیت سمیت دل و جان سے تسلیم کر لینا چاہیے تھا۔

''بیٹا! تمھارے دل کی صفائی کا عمل کل سے جاری ہے مگر دل کا ایک کونہ ایسا ہے جو کہ محمد عربی ﷺ کے نور کے علاوہ کسی بھی قسم کے نور سے پاک نہیں ہو سکتا اور اس کونے کی پاکیزگی کے بنا تم کسی بھی میدان میں فتح یاب نہیں ہو سکتے۔ فیصلہ کر لو۔ میں جانتا ہوں کہ وقت بہت کم ہے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے مگر......''

اور پھر اس سے پہلے کہ فقیر کچھ اور کہہ پاتا میری آنکھوں میں صدیوں سے رکا پانی کا سیلاب اُمڈ آیا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور سچ تو یہ ہے کہ ان آنسوؤں کا سرور آگیں مزہ میں آج تک نہیں بھول پایا۔ اسی کیفیت میں جانے کب میری زباں سے ادا ہوا۔

''کلمہ طیبہ پڑھائیے حضور'' ! میں نے روتے روتے اٹک اٹک کر کہا۔

اور پھر وہ لمحات میری زندگی کا خوبصورت ترین حصہ بن گئے۔

❀❀❀

سبز پوش فقیر نے میرے گرد ایک انتہائی چھوٹا سا

حصار کھینچا اور فرمایا۔

''بیٹا! کچھ بھی ہو جائے جب تک میں نہ کہوں اس حصار سے باہر مت نکلنا ورنہ یہاں کے حالات تمھاری سوچ سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر تم نے میری اس بات پر عمل کیا تو میرا وعدہ ہے کہ تمھارا یہ مخلوق بال بھی بیکا نہیں کرسکتی اور اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو نتائج انتہائی خطرناک بھی ہو سکتے ہیں اور تم کوئی بھاری نقصان بھی اٹھا سکتے ہو۔''

تمام جنات بشمول جنگو سردار کو بالکل بھی یہ علم نہ ہوسکا کہ ان کے درمیان کھڑے بے حیثیت آدم زاد میں بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی اور یہ وہ تبدیلی تھی جو کہ ان کو تہس نہس بھی کرسکتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جنگو سردار تخت سے اٹھا اور اس نے عجب نامانوس سی زبان میں تقریر شروع کی۔ اس تقریر کی تو مجھے سمجھ نہ آئی مگر تقریر کے اختتام پر کچھ جنات جلدی سے میری طرف بڑھے ایک مناسب فاصلے سے انہوں نے میرے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد لمبی سی داڑھی والا ایک جن میری طرف بڑھا اور اس نے اسی عجب نامانوس سی زبان سے کچھ پڑھتے ہوئے مجھ پر پھونکا اور میرے گرد چاروں جانب قوس کی شکل میں اپنے ہاتھ کی کھردری انگلیوں سے دائرہ کھینچ کر اس پر پھونک ماری۔ پھونک مارتے ہی ایک زبردست کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور میرے چاروں جانب قوس کی شکل میں آگ بھڑک اٹھی۔ یہ آگ اتنی تیز اور تباہ کن تھی کہ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ جیسے اس آگ میں میرا وجود بھی دھواں بن کر اڑ جائے گا مگر اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہوئی کہ دوسرے ہی لمحے میرے چاروں جانب جلتی ہوئی تیز آگ اچانک زمین

سے دوفٹ اوپر اٹھی اور آہستہ آہستہ آگ اور زمین کا یہ فاصلہ بتدریج بڑھتا گیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ تیز آگ کا الاؤ قوس کی شکل میں میرے سر سے کافی بلندی پر رک گیا۔ چاروں جانب کھڑے جنات نے انتہائی حیرانی سے مجھے دیکھا۔ میں بالکل صحیح سلامت، تیز آگ کے الاؤ کے نیچے آرام سے کھڑا یہاں بپا ہونے والا تماشہ دیکھ رہا تھا اور پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ جس نے مجھے بھی دہلا دیا اور میں سرتا پا لرز کر رہ گیا۔

تیز آگ کا الاؤ جو کہ میرے سر سے کافی فاصلے پر رکا ہوا تھا اچانک ایک لہر کی صورت میں میری طرف بڑھا مگر مجھ تک پہنچنے سے پہلے وہ تیز اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی دودھیا روشنی کی موٹی لکیر میں تبدیل ہوا اور میرے منہ کی طرف بڑھا۔ بے اختیاری طور پر میرا منہ کھلا اور تمام آگ دودھیا روشنی کی لکیر میں تبدیل ہو کر میرے وجود میں سماتی چلی گئی۔ چند لمحوں کے لیے تو میں گنگ سا ہو کر رہ گیا کیونکہ یہ سب اتنا حیران کن اور ناقابل یقین تھا کہ جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا مگر آج کی رات تو شاید حیرتوں کی رات تھی۔

جنات کے مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ میرے گرد حصار بنا کر کھڑے ہوئے جن سراسیمگی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے تو شاید وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں ان کے آگ والے جال سے نکل سکتا ہوں۔ لمبی داڑھی والا جن جس نے میرے گرد حصار کھینچ کر پھونک مار کے ایک دھماکے سے آگ لگائی تھی وہ حیران و پریشان کھڑا اپنی داڑھی کھجا رہا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو گا کہ ایک بے حیثیت آدم زاد نے اسے اتنی آسانی سے شکست کیسے دے دی تھی۔

جنگو سردار نے معاملہ الٹ ہوتے دیکھا تو وہ یکلخت چلایا اور اس نے اسی نامانوس سی زبان میں اپنے لوگوں سے انتہائی غصے میں کچھ کہا۔ جسے سنتے ہی جنات کا مجمع یکلخت چونکا اور ایک جم غفیر کی شکل میں ہاؤ ہو کرتے اور چنگھاڑتے ہوئے میری جانب بڑھا۔ اسی وقت پوری فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی۔ تیز آندھی اور دھوئیں کا شور کرتا اور چنگھاڑتا ہوا سیاہی مائل مرغولہ دھڑم سے زمین سے اٹھا اور چند ہی لمحوں میں اوپر آسمان پر جا کر پھٹا۔ بجلی تیزی سے چمکی اور دوسرے ہی لمحے پورا آسمان جیسے دھماکوں سے پھٹ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی بجلی ایک بار پھر تیزی سے چمکی اور اس کی چمکتی ہوئی لہریں میری جانب بڑھیں۔ یہ سب اتنا خوفناک اور دل کو دہلا دینے ناقابل یقین منظر تھا کہ اف اللہ کی پناہ۔ ایک بار تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اب کی بار میرا بچنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے بجلی کی لہریں میری سوچ سے بھی زیادہ تیزی سے میری جانب بڑھ رہی تھیں۔ ان جاں گسل لمحات میں میں صرف اتنا کر پایا کہ اپنی آنکھیں بند کر کے زمین پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھ پر ایک بار پھر سے وہی بے نیازی کی کیفیت طاری ہوتی چلی گئی اور پھر مجھے نہیں علم کہ مجھے کیا ہوا میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک اور ناقابل یقین منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ کڑکتی ہوئی بجلیاں میری طرف لپکتیں مگر مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر ساکت و جامد ہو کر رک جاتیں اور پھر میرے چاروں جانب کڑکتی ہوئی بجلیاں ساکت ہونے لگیں۔ ان کڑکتی ہوئی بجلیوں کے درمیان صحیح سلامت شکل میں کھڑا میرا وجود بھی مجھے ان بجلیوں کا حصہ نظر آنے لگا۔ میں نے اوپر آسمان کی جانب دیکھا۔ آسمان کی وسعتوں میں

مجھے وہ سبز پوش فقیر مسکراتا نظر آیا۔ یکلخت میرے وجود میں اسم الٰہی کا ورد شروع ہوا اور میرے چاروں جانب کڑکتی بجلیاں معدوم ہوتی چلی گئیں مگر اس کے ساتھ ہی پورا آسمان چیخ وپکار اور آہ وبکا کی صداؤں کی آماجگاہ بن گیا۔

بجلیاں معدوم ہوتے ہی میں نے چاروں جانب دیکھا۔ ہر سو گھپ اندھیرا اور دلوں کو چیرتا ہوا سناٹا پورے ماحول پر چھا چکا تھا۔ روشنیوں کا شہر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ جنگو سردار اور اس کے ساتھیوں کا جم غفیر جیسے ہواؤں میں کہیں تحلیل ہو کر قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرے کی دبیز چادر تن گئی۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہر سو اندھیرے کا راج تھا۔ ایسے میں مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں کیا کر بیٹھا ہوں۔ سبز پوش فقیر نے میرے گرد جو حصار کھینچا تھا میں اس سے بے اختیاری میں نکل گیا اور یہی میری غلطی تھی۔

اتنے میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے زمین پر کوئی چیز رینگتے ہوئے میری طرف بڑھی ہو۔ مکمل اندھیرے کی وجہ سے مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کوئی چیز میرے بالکل سامنے پھنکاری اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا وہ مجھ سے لپٹتی چلی گئی۔ یہ انتہائی موٹا اور خوفناک اژدھا تھا جس نے میرے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر مجھے بے بس کر دیا۔ میں بہت برے طریقے سے پھنس چکا تھا۔ پہلے دو حملوں میں تو قدرت نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا اور یہ ماورائی اور مافوق الفطرت مخلوق میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں پائی تھی مگر اب جو میں حصار سے نکلا تو اس بلا نے انتہائی تیز رفتاری سے مجھ پر حملہ کر کے مجھے بے بس کر دیا۔ سبز پوش فقیر نے کہا تھا کہ میں کسی بھی صورت میں اس کی اجازت کے بغیر حصار سے نہ نکلوں مگر میں یہ غلطی کر چکا تھا۔ اب جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

بلا کا یہ وار انتہائی کاری اور مہلک تھا جس نے مجھے مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے کر بے بس کر دیا اژدھا میرے سارے جسم کے گرد لپٹ گیا تو میرے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا اور شاید یہی اس بلا کا خطرناک وار تھا۔ اسی لمحے ماحول میں مجھے کسی کی غرور اور تکبر میں لتھڑی ہوئی آواز سنائی دی۔

''تم کیا سوچ کر آئے تھے ہرنام سنگھ۔ شاید شہزادی نیلم پری کے بڑوں نے تجھے کچھ پراسرار قوتیں دے کر بھیجا تھا جن سے تم نے میرے پہلے دو بہترین حملوں کو ناکام بنا کے مجھے بھی حیران اور خوف زدہ کر دیا مگر میرا نام بھی جنگو سردار ہے ہرنام سنگھ۔ آخر کار تم میرے قابو میں آ ہی گئے ناں! اب بتاؤ کون بچائے گا تمہیں میرے عتاب سے؟''

''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے جنگو! تم کون ہوتے ہو مجھے بچانے یا مارنے والے۔ جس نے مجھے پہلے بچایا ہے وہی اب بھی میری حفاظت کرے گا۔'' آخری الفاظ بھی میں نے بڑی مشکل سے ادا کیے کیونکہ میرا سینہ بھنچتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے مجھے سانس لینے میں انتہائی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

اژدھے نے مجھے بہت بری طرح سے اپنی لپیٹ میں لیا تھا پاؤں سے لے کر کندھوں تک میرا سارا جسم اس کی لپیٹ میں تھا۔ آہستہ آہستہ اژدھے کا شکنجہ میرے گرد کسنے کی وجہ سے میرے لیے سانس لینا مشکل سے مشکل ترین ہوتا جا رہا تھا۔ جنگو سردار خود مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا البتہ اس کی آواز سنائی دی تھی اور اب اس کے خاموش ہوتے ہی فضا میں ایک بار پھر سے سکوت چھا گیا۔ اژدھا میرے

جسم کے گرد لپٹنے کے بعد عین میرے چہرے سے کچھ فاصلے پر سانس لے رہا تھا اور اس کی گندی بد بو دار اور زہر آلود سانسوں کی ہوا تیزی سے میرے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ جسم کے گرد گھیرا تنگ ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ مجھے پسلیوں میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی مجھے لگتا تھا کہ اگر بتدریج میری پسلیوں پر دباؤ ایسے ہی بڑھتا رہا تو میری پسلیاں جلد ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں گی۔ یہ دوطرفہ حملہ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بھی متاثر کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن پر تاریک سی دھند چھاتی جا رہی تھی اور اس سے پہلے کہ جنگو سردار اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو جاتا مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ شل ہوتے اعصاب کے ساتھ میں نے سوچا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کر پاتا ایک انہونی ہوئی۔ میں نے دیکھا اندھیرے میں کوئی چیز چمکی اور میرے چہرے سے کچھ ہی دور پھن پھیلائے اژدھے کی جانب لپکی۔ دوسرے ہی لمحے اژدھے کا پھن اس کے دھڑ سے جدا ہو کر نیچے گرا۔ خون کی ایک تیز پھوار میرے چہرے اور گردن پر گری اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک دھاڑ گونجی جس سے اردگرد کا ماحول لرز کر رہ گیا۔ اس دھاڑ کے ساتھ ہی میرے وجود کے گرد لپٹے ہوئے اژدھے کی مجھ پر گرفت ختم ہوگئی اور وہ ایک رسے کی صورت میرے پاؤں اور ٹانگوں میں آن گرا۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں اتنا ہی دیکھ پایا اس کے ساتھ ہی میں دھڑام سے زمین پر آ رہا اور کچھ لمحوں کے لیے مجھے اردگرد کی کوئی خبر نہ رہی۔

شاید کوئی مجھے انتہائی محبت اور پیار سے پکار رہا تھا اور اس آواز کو سننے کے لیے جانے کتنی صدیوں سے میرے کان ترسے ہوئے تھے۔ جی ہاں یہ کلدیپ کور ہی تھی جس نے بروقت کارروائی کر کے مجھے موت کے منہ میں سے نکال لیا تھا۔ جنگو سردار نے جب اژدھے کا روپ دھار کر مجھ پر حملہ کیا تھا تو وہ اس کے ساتھ ہی تھی اور ساری کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور اس سے بھی پہلے جب انہوں نے مجھ پر دو زبردست حملے کیے اور ناکام رہے تو اچانک ہی اسے میرے اور اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سب کچھ یاد آ گیا اور یہ کسی کرامت سے کم نہ تھا اور پھر جو نہی اس نے جنگو سردار کو میری جانب بڑھتے دیکھا تو وہ اس کے پیچھے چلی آئی مگر مجھے فنا کرنے میں جنگو سردار نے اتنی تیزی دکھائی کہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ مجھے قابو کر چکا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگ کر گئی، جنگو سردار کی تلوار اٹھائی اور واپس آ گئی مگر یہ سب کچھ کرنے میں اسے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے جنگو سردار پر کاری وار کیا اور اس کا خاتمہ کر دیا جنگو سردار کے خاتمے کے ساتھ ہی وہاں کا نقشہ ہی تبدیل ہو گیا۔ چٹیل میدان کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ البتہ ایک مردہ اژدھے کی باقیات مجھ سے کچھ ہی دوری پر موجود تھیں۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ میرے کانوں سے میری رگ جاں کلدیپ کور کی آواز ٹکرائی۔

''صبح کا اجالا پھیلنے والا ہے اور اس سے پہلے کہ اس شیطانی جنگل میں پھر کسی بلا سے واسطہ پڑے آؤ اپنی دنیا میں لوٹ چلیں۔''

کسی معصوم اور فرمانبردار بچے کی طرح میں نے اس کی انگلی پکڑی اور اس کے ساتھ ہو لیا۔

دہشت زدہ

عمیر عادل

خوف اک احساس کا نام ہے اور یہ احساس انسان کی رگ و پے میں خون بن کر دوڑتا ہے اور پھر اچانک انسان پر حاوی ہو کر اسے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ وہ سب کچھ کرنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں کرسکتا۔
ایک ابھرتی عمر کے بچے کا احوال' خوف نے اسے عضر معطل بنا کر رکھ دیا تھا۔

ایک طویل سسکاری اس کے حلق سے خارج ہوگئی، وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ اس کی کنپٹیوں سے پسینے کی بوندیں بہہ بہہ کر ٹھوڑی کے نیچے جمع ہونے لگیں۔ گرمی کی حدت اسے اس حد تک محسوس ہورہی تھی جیسے اس کے قریب آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن ہو اور وہ اس کی تپش سے بری طرح جھلس رہا ہو۔

آج موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں مگر اس کا وجود جیسے پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ موٹی شاخ پر مضبوطی سے جما لیا اور دوسرے ہاتھ کے بازو سے ماتھے پر ابھرنے والی ننھی ننھی بوندوں کو صاف کیا پھر اپنی ہتھیلی کا جائزہ لیا جو نوکدار ٹہنیوں میں الجھنے کے باعث چھل گئی تھیں اور اس میں سے ہلکا ہلکا خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ایک نظر اوپر ڈالی۔ گیند اوپر ٹہنیوں میں اٹکی ہوئی تھی اور اسے اتار لانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ناصر کا چیلنج اس نے دوسرے دوستوں کے سامنے قبول کیا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے نیچے دیکھا سارے ہی دوست منہ اٹھائے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کاشف، فہیم، سمیع، جنید اور ناصر۔ اس نے نفرت زدہ انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے ناصر کو ترچھی نگاہوں سے گھورا اور اوپری شاخ پر چڑھنے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ ناصر نے اس کی چبھتی ہوئی نگاہوں کے مفہوم کو سمجھ لیا تھا اور اس لیے اس سے خاموش نہ رہا گیا وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ماجد! بچے کیا ہوا' چوٹ تو نہیں لگ گئی کہیں؟ یا ڈر لگ رہا ہے؟''

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے بمشکل اپنی آواز پرسکون بناتے ہوئے کہا مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو پایا۔

''ارے دیکھو تو ذرا' چہرے کا رنگ خوف کے مارے کیسا پیلا پڑ گیا ہے۔ بچے نیچے اتر آؤ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے زیادہ ڈر لگ رہا ہے تو سیڑھی لے آؤں؟'' ناصر استہزائیہ انداز میں بولا۔

''نہیں میں گیند لے کر ہی آؤں گا۔'' ماجد نے مضبوط لہجے میں کہا حالانکہ اس وقت اس کے جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا مگر اس نے اپنے لہجے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''آپ لوگوں نے دیکھی ماجد مرغی کی بہادری؟ کیسے عزم کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ گیند لے کر اتروں گا مگر دیکھو تو سہی' بہادر کی ٹانگیں تو نہیں کپکپایا کرتیں۔'' ناصر کی باتیں سن کر دیگر لڑکے بھی ہنسنے لگے۔

ماجد ساکت رہ گیا اور حتی الامکان اپنے وجود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

''ماجد مرغی' درخت پر چڑھی بانگ لگانے۔'' اچانک ایک تیز آواز ابھری سارے لڑکے قہقہے لگانے لگے۔

وہ تلملا کر رہ گیا خوف کے احساس پر غصہ غالب آنے لگا۔ ''خاموش...... میں ماجد صدیقی ہوں۔ میرا نام کیوں بگاڑ رہے ہو۔'' اس نے چلا کر کہا۔

''لیکن تمہارے کام سارے مرغیوں والے ہیں ڈرپوک مرغی۔'' ناصر نے تحقیر آمیز انداز میں منہ بنایا، ماجد دانت پیس کر رہ گیا۔

ایک عرصے سے وہ ان کی بکواس سنتا آیا تھا۔ وہ اس کے دوست تھے، مگر دوستوں میں مذاق برابر سے ہوتا ہے اور وہ صرف اور صرف اسے ہی نشانہ بناتے تھے۔ خاص طور پر ناصر اسے چھیڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اسے ان سب سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

''ماجد مرغی۔'' کوئی دوبارہ چلایا اور پھر سب کے قہقہے گونجنے لگے تمسخر اڑاتے قہقہے۔ ماجد نے شدت سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ اسے ناصر کی آواز سے ہی نفرت محسوس ہونے لگی تھی اگرچہ وہ اس کا پرانا دوست تھا اور کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ پڑوسی بھی تھا مگر پھر بھی بہترین دوست ثابت نہیں ہوا بلکہ ماجد کا تو کوئی بھی بہترین دوست نہ تھا اور اب وہ سب دوست اس کے دشمن بنتے جا رہے تھے جو نیچے کھڑے طرح طرح کی آوازیں کس رہے تھے۔

''ماجد! کب تک لٹکے رہو گے ٹارزن کی طرح۔ گیند اتارنا تمہارے بس کی بات نہیں۔'' فہیم نے آواز لگائی۔

''لو بھئی لو ماجد مرغی ترقی کر کے ٹارزن بن گیا۔ ڈیڑھ پسلی کا ٹارزن۔'' سمیع نے قہقہہ لگایا۔

''تم لوگوں نے اسے پہچاننے میں غلطی کر لی۔ ماجد تو ٹارزن کا بندر ہے' منکو بندر۔'' ناصر کی کاٹ دار آواز اس کے کانوں میں چبھنے لگی۔

''ارے واقعی ہم نے تو غور ہی نہیں کیا۔'' جنید مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''خاموش......'' ماجد کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ طیش کے عالم میں خود بہ خود ٹہنیوں پر سے اس کے ہاتھوں کی گرفت چھوٹی اور وہ اپنے دوستوں کو مکا دکھاتے ہوئے بولا۔

''خاموش ہو جاؤ ورنہ......''

عالم اشتعال میں پہلے ہی اس کے وجود میں لرزہ طاری تھا اور پھر وہ اس وقت پتلی سی جھولتی ٹہنی پر قدم جمائے ہوئے تھا۔ ہاتھوں کی گرفت چھوٹ جانے کے باعث وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کے پیر ٹہنی پر سے پھسلے اور وہ شاخوں اور ٹہنیوں سے الجھتا ہوا دھپ سے زمین پر آ گرا۔ اس طویل چھلانگ نے اس کے پیروں کی قوت چھین لی ان میں اتنی سنسنی پیدا ہوگئی کہ وہ بے حس ہو کر گر گیا۔ اس کی پینٹ گھٹنوں کے پاس سے پھٹ چکی تھی اور اس کی قمیض بھی درخت کے کانٹوں کے باعث جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور ان جگہوں سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔

''واہ بھئی واہ......'' سارے دوست یوں اچھلے جیسے اس کے کرتب سے محظوظ ہوئے ہوں۔

''ماجد بچے مزہ آ گیا۔ کیا شاندار چھلانگ لگائی تم نے۔''

''ذرا دوبارہ لگا کر دکھانا چھلانگ۔'' ناصر شوخی سے بولا۔

اس کے بدن میں جلن اور ٹیسیں اس شدت کے ساتھ اٹھ رہی تھیں کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آنے کو تھے اور کراہیں بلند ہونے کو تھیں مگر اس نے کمال ضبط

کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی کراہوں کو دبالیا۔ ورنہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ایک کراہ پر ڈرپوک مرغی کی آوازیں اور استہزائیہ قہقہے پھر بلند ہو جائیں گے اس نے مشتعل نظروں سے ناصر کو گھورا اور بولا۔

''مجھے سہارا دو۔''

مگر وہ کھڑا طیش دلانے والی مسکراہٹ سجائے ماجد کی بے بسی کا تماشا دیکھتا رہا۔ وہ تھا ہی ایسا کم ظرف اور تنگ نظر جس کی شہہ پا کر دوسرے دوست بھی ماجد کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ ماجد پڑھائی میں بس مناسب تھا اور ناصر بالکل کورا تھا اور ماجد کرکٹ میں اپنی ٹیم کا بہترین بیٹسمین تھا تو ناصر خطرناک باؤلر تھا۔ جب ہی ایک ہی کرکٹ ٹیم میں ان کی موجودگی چل جاتی تھی۔

ناصر ہمیشہ اس سے طرح طرح کے چیلنج کیا کرتا تھا اور دوسرے دوستوں کے سامنے ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ کتنا بہادر ہے اور ماجد بے وقوف اور ڈرپوک ہے۔ ماجد ہمیشہ اس کی بدتمیزی کو نظر انداز کر دیا کرتا تھا اور تمسخر اڑانے والی باتوں کو ضبط کر لیا کرتا تھا۔ اسے ناصر کے رویے پر افسوس اور دکھ بھی ہوتا تھا۔ وہ ناصر کو سمجھانے کی کوشش کرتا مگر ناصر اپنے آپ کو رستم زماں سمجھنے لگا تھا۔ وہ ماجد کے خلوص کو مذاق میں اڑا دیا کرتا تھا۔ نہ جانے اسے کس بات کا زعم تھا۔

سب دوست اس کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ نہ جانے کتنی دیر تک زخم خوردہ جانور کی طرح زمین پر پڑا ستاتا رہا مغرب ہو چلی تھی شام کے دھندلکے رات کے اندھیرے میں ڈھل رہے تھے۔ اس وقت وہ گراؤنڈ کے آخری کونے پر درخت کے نیچے پڑا تھا اور طیش کے عالم میں بڑبڑا رہا تھا وہ یہ بات فراموش کر چکا تھا کہ اس کے دوست اسے تنہا کیوں چھوڑ گئے تھے؟

کرکٹ کے اس میدان سے آگے لکڑیوں کی ٹال کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا پھر اس کے بعد جنگل بیابان اور میدانی علاقہ تھا کیونکہ اس سے آگے فوجی چھاؤنی لگتی تھی۔ لکڑیوں کی ٹال کا یہ سلسلہ کچی آبادی کہلاتا تھا اور اس طرف بجلی کی سہولت نہ ہونے کے برابر تھی۔

دور پکے علاقے کی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی تو اسے کچھ ہوش آیا۔ پیروں میں سنسنی ختم ہو گئی تھی اور وہ چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت ہوا کے شوریدہ سے جھونکے اس کے چہرے سے ٹکرائے۔ اس کے بال ادھر ادھر بکھر گئے اور کٹی پھٹی قمیض ہوا کے زور پر پھڑ پھڑانے لگی۔ یہ رات کا طلسم تھا جس نے تاریکی کی قبا اوڑھ کر موسم کو گستاخی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ درخت زور زور سے جھوم کر ہوا سے چیخ چیخ کر باتیں کرنے لگے۔ ماحول کے اچانک تیور بدلتے دیکھ کر ماجد سہم گیا۔ اس نے ایک نظر میدان میں ڈالی طویل و عریض میدان میں درختوں کے خشک پتے اور خاک و دھول ہوا کے دوش پر اڑتے پھر رہے تھے۔ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں اپنے اوپر نگاہ ڈالی۔ درخت کی شاخیں کسی زہریلے سانپ کی دوشاخہ زبان کی طرح ادھر ادھر لپک رہی تھیں پتے اور ببول کے کانٹے آپس میں ٹکرا کر آوازیں پیدا کر رہے تھے پھر اچانک درخت کی اوپری شاخ سے زن کی تیزی سے کوئی چیز نیچے کی طرف لپکی اور اس کے چہرے سے ٹکرائی۔

ماجد کا دماغ گھوم گیا اس کے حلق سے ایک دہشت ناک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی اور وہ اندھا دھند ایک جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے کمزور وجود

پر خوف نے غلبہ پایا تو وہ اپنی تکلیف بھول گیا۔ وہ بھاگتا رہا خالی اور پرتاریک وسیع گراؤنڈ میں ہر قدم پر ایک آواز گونجتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے پیچھے کوئی نادیدہ لشکر دوڑا چلا آرہا ہے۔ خوف اگر اپنی پوری قوت سے انسان پر حاوی ہوجائے تو وہ اپنے قدموں کی چاپ سے بھی دہشت زدہ ہوجاتا ہے۔ سراسیمگی کے ان لمحات میں وہ غلط سمت کا رخ کرچکا تھا۔ اب وہ کچی آبادی کی طرف دوڑا جارہا تھا۔ غلط وقت پر غلط سمت کا انتخاب اسے حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھا اور جب وہ کچی آبادی میں داخل ہوا تو پرپیچ اور تاریک گلیوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ سخت ہراساں ہوگیا مگر اپنی رفتار میں کمی نہ کی۔ ان تاریک گلیوں میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ وہ مزید دہشت سے ایک کے بعد دوسری گلی میں بھاگتا رہا اسے یہ کچی آبادی کسی شہر خموشاں کی مانند لگ رہی تھی جس کے مکین آرام گاہوں میں ابدی نیند سو رہے ہوں۔ اس کی نظریں کسی انسان کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں اس کا دماغ چلا چلا کر مسلسل خطرے کا احساس دلا رہا تھا۔ دوڑو اور دوڑو رکنا نہیں۔ موت سے فرار نہیں لیکن جب تک دم میں دم ہے ہمت نہیں ہارنی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اور گئے۔

یہ آواز دہشت موت کی پیامبر بن کر اس کے شعور میں بھٹکتی رہی، وہ بھاگتا رہا۔

اچانک ایک گلی کا موڑ کاٹتے ہی وہ کسی سے پورے زور سے جا ٹکرایا۔ مخالف سمت سے آنے والے کے ہاتھ میں لالٹین تھی جو اچھل کر دور جاگری۔ ایک چھناکے کے ساتھ اس کے بیچ میں لگے کانچ کے ٹکڑے ہوگئے مگر اس کی لو نہیں بجھی وہ ایک بوڑھا پٹھان جو خود جھٹکے سے لڑکھڑایا مگر گرا نہیں جبکہ ماجد وہیں ڈھیر ہوگیا اور منہ کھولے بری طرح ہانپنے لگا۔

''اوہ بیڑا غرق یہ کیا کیا؟'' بوڑھے کی اشتعال انگیز آواز ابھری وہ لالٹین کی طرف لپکا جس کی ٹمٹماتی لو بجھنے کو تھی۔ شیشے کی کرچیوں کی کھنک ابھری وہ لالٹین کی لو تیز کرکے ماجد کے قریب آیا۔ ماجد خوف زدہ نظروں سے اپنے عقب میں دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کی حالت دیکھ کر بوڑھے پٹھان نے نسبتاً نرم لہجہ اختیار کیا۔ ''کس کو دیکھ رہے ہو؟''

''پتا نہیں۔'' ماجد نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا اپنے سامنے کسی شخص کو دیکھ کر اس کا خوف کسی قدر کم ہوا تھا۔

''پتا نہیں......!'' بوڑھے پٹھان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ماجد نے گلی کی نکڑ کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا اور بولا۔

''وہ دیکھو۔''

بوڑھے نے الجھن بھرے انداز میں لالٹین کا رخ آگے کی جانب کیا مگر اسی وقت کسی سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی طرح ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور لالٹین بجھ گئی۔

ٹھپ ٹھپ ٹھپ وہاں دوڑتے قدموں کی آوازیں ابھریں بوڑھے پٹھان کی آنکھوں میں الجھن اتر آئی مگر ان میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا ''کون ہے وہاں؟'' وہ کڑک کر چیخا ''ٹھک'' وہی چیز ماجد کی پسلیوں سے شدت سے ٹکرائی ماجد گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا اس دفعہ وہ چیز اسے مانوس سی لگی۔

''کرکٹ کی بال......'' اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔

پھر یکا یک اسے ناصر اور فہیم کے قہقہے سنائی دیئے۔ ''ماجد ڈرپوک مرغی۔'' وہ ہنستے ہوئے فرار ہوگئے۔

خوف زدہ لمحات کے اس ڈراپ سین پر ماجد کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہوگیا۔

''مم...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' ماجد دانت کچکچا کر آگے بڑھا مگر کسی چیز سے پھسل کر گر پڑا۔ کرچ کی بال اس کے پیروں میں پڑی تھی۔

''ٹھہر جاؤ۔ وہ بھاگ گئے ہیں اور تمہیں پہلے ہی چوٹ لگی ہوئی ہے۔'' بوڑھے نے اس کا باوز تھام کر سہارا دیا۔

''مم...... میں ان کو جان سے ماردوں گا۔'' ماجد نے لاچارگی سے اندھیرے کو گھورا۔

''کون تھے وہ لوگ؟'' بوڑھے نے دیا سلائی جلا کر لالٹین کو روشن کیا اور اسے لے کر ایک جانب چلنے لگا روشنی کی لو کو ہوا کی شدت سے بچانے کے لیے اس نے ایک ہاتھ سامنے رکھ لیا تھا۔

''میرے دوست' کلاس فیلو اور پڑوسی بھی۔'' ماجد لڑکھڑا کر چلنے لگا۔ اس کے دائیں پیر میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ شاید پتھروں کی رگڑ سے گھٹنے کے پاس سے دوبارہ خون رسنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ بولا۔

''مگر اب یہ سب میرے بدترین دشمن ہیں۔ میں ایک ایک کو مزہ چکھا کر رہوں گا۔''

چند قدم چلنے کے بعد بوڑھا اسے لے کر ایک گھر میں داخل ہوا۔ یہ ایک پکی اینٹوں کا گھر تھا لیکن کافی شکستہ حال تھا۔ اس کے صحن میں ساٹھ واٹ کا نحیف و نزار بلب زرد روشنی پھینک رہا تھا ماجد صحن میں پڑی ایک جھلنگا سی چارپائی پر نیم دراز ہوگیا اس کی خود اعتمادی بحال ہوگئی تھی اور پھر اس بوڑھے کا رویہ بھی نرم و شفیق تھا اس لیے وہ ایک اجنبی گھر میں خوف محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''کافی بدتمیز اور شیطان لڑکے تھے۔''

بوڑھے پٹھان کا وجود زرد روشنی کی زد میں آیا تو ماجد اس کا جائزہ لینے لگا۔ بوڑھے پٹھان کا جھریوں زدہ چہرہ بہت سفید تھا لیکن کسی لاش کی طرح سفید اس کی بے نور آنکھوں میں بے حسی اور سفاکی جھلک رہی تھی اس کا جسم متناسب تھا اور محنت و مشقت کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

''ہاں انتہائی بدتمیز۔'' ماجد نے نفرت زدہ انداز میں ہونٹ سکیڑے۔

''تم ان کے خراب کردار اور رویے کا انتقام لوگے؟'' بوڑھے نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' ماجد نے کہا۔

''یعنی کہ تم ان سے لڑائی جھگڑا کرو گے؟'' بوڑھا اسی انداز میں بولا۔

''ہاں'' ماجد نے تائید طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''آپ نے دیکھا انہوں نے مجھے کس طرح ہراساں کیا تھا۔''

''اور تم ان سے جھگڑا اور مار پیٹ کر کے ثابت کر دو گے کہ تم بھی بدتمیزوں کی صف میں شامل ہو۔'' بوڑھے کے غیر متوقع جواب نے اسے چونکا دیا۔

''مگر میں ان سے بدلہ لوں گا'' ماجد نے کہا۔

''سب سے اچھا بدلہ معاف کر دینا ہوتا ہے۔'' بوڑھے نے ناصحانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''میں اب تک ان کی ہر غلطی اور بدتمیزی کو برداشت کرتا آیا ہوں۔ ہر دفعہ میں یہ سوچ کر درگزر کر دیا کرتا تھا کہ وہ سب میرے دوست ہیں مگر وہ ہر دفعہ مجھے ہی مذاق کا نشانہ بناتے رہے اور آج تو انہوں نے شرارت کی انتہا کر دی بہت تکلیف پہنچائی ہے انہوں نے مجھے۔'' ماجد نے اسے اپنی ظاہری حالت پر توجہ دلائی اس کی قمیض اور پینٹ جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی اور خراشیں اور نیل بھی پڑ گئے تھے۔

''ٹھیک ہے مگر وہ سب پھر بھی تمہارے دوست ہیں۔'' بوڑھا سر کو جھٹکتے ہوئے بولا اور ماجد کو پہلی بار محسوس ہوا کہ بوڑھے کے لمبے لمبے بالوں کی لٹیں اس کے شانوں تک سنپولیوں کی طرح کلبلا رہی تھیں۔

''دوست کا مطلب جانتے ہو تم؟''

''پھر...... پھر میں کیا کروں؟'' ماجد نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''ان کو ایسا سبق سکھاؤ کہ نہ صرف وہ تمہارے دوست بن جائیں اور انہیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جائے۔'' دور کہیں سے گیدڑوں کے ہوکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے پل پل کے حساب سے گزر رہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ میرا دوست ناصر ہی اکڑتا پھرتا ہے دوسرے تو محض اس کی شہہ پا کر آگے بڑھتے ہیں۔''

''ناصر کو ہی سبق سکھانا ہوگا۔''

''مگر میں کیا کروں' کس طرح اسے سبق سکھاؤں؟''

''بہت سے طریقے ہیں۔'' بوڑھے کا جھریوں بھرا چہرہ سپاٹ تھا۔

''ایک طریقہ ہے میرے پاس۔''

معاً قریب ہی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز ابھری ماجد اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا چند ثانیے کے لیے اس کے چہرے پر ہراسیت کے آثار ابھر آئے۔ خوف کی ان اچانک آن پڑنے والی ساعتوں نے اس کے حواس معطل کر کے رکھ دیے تھے۔

''یہ...... یہ پیچھے کون سا علاقہ ہے؟'' اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''پیچھے......؟'' بوڑھے نے استفہامیہ نظروں سے گھورا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔

''تم کتے کی آواز سے ڈر گئے تھے؟''

''ہاں۔'' ماجد نے اعتراف کیا وہ بہت متذبذب ہو رہا تھا۔

''انسان ہمیشہ جب خوف محسوس کرتا ہے تو خوف زدہ ہوتا ہے۔ یہ اس کے حواس خمسہ کا کمال ہے کہ اسے خطرے اور خوف سے مطلع کرتی ہے مگر جو دہشت زدہ کرنے والی چیزیں انسانی حواس کی گرفت میں نہیں آتیں تو آدمی ان سے ڈر محسوس نہیں کرتا۔'' بوڑھے نے کہا نہ جانے ان باتوں کے پس پردہ کیا مفہوم پوشیدہ تھا مگر جو کچھ بھی تھا نہایت بھیانک تھا۔

''پیچھے کیا ہے؟'' ماجد نے سوال دھرایا۔ اس کی دماغی پیچیدگیوں میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔

بوڑھے نے اسے سپاٹ نظروں سے گھورا اور پھر اس کے لب ہلتے نظر آئے ''قبرستان۔''

اس کے سرسراتے لہجے میں ایک بھیانک دھمکی پوشیدہ تھی کہ ماجد کا وجود یکلخت دہشت کے بارِ گراں کی زد میں آ گیا۔ ٹھنڈے پسینے کی دھاریں اس کے ماتھے سے پھوٹ پڑیں۔

''قبرستان......؟'' اس کی کنپٹی کی نسیں دھڑ دھڑ بجنے لگیں۔

''ہاں......'' بوڑھا ہنسا اس کی ہنسی میں یاسیت اور تشنگی تھی اور سرد مہری اور درشتگی بھی۔

''پیچھے قبرستان ہے اور میں اس کا گورکن ہوں۔''

☆......☆......☆

اس کی آنکھ کھلی تو معلوم ہوا وہ کافی دیر سے بیدار ہوا ہے۔ صبح کا وقت گزر چکا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں ساڑھے بارہ سے تجاوز کر چکی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آج اتوار کا دن تھا۔ لہٰذا اسکول جانے کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ بہت ڈٹ کر سویا تھا۔ گزشتہ روز کی ساری تھکن اور کسلمندی دور ہوگئی تھی۔

رات کے واقعات ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھے اور اس کے تخیل کے پردے پر کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ اسے جب علم ہوا کہ وہ ایک گورکن کے گھر میں بیٹھا ہے تو اس کے لیے ایک سیکنڈ ٹھہرنا بھی دوبھر ہوگیا۔ ہلکی سرسراتی ہوا بھی اس کی سماعت میں شور وغلغلہ برپا کررہی تھی بوڑھے نے بھی اس کے خوف کو محسوس کرلیا تھا۔ بوڑھے گورکن نے ہی اسے گراؤنڈ کے پار پہنچایا تھا کیونکہ کچی آبادی کا راستہ اسے معلوم نہ تھا وہ بھول چکا تھا کہ وہ کن راستوں سے ہوتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔ مگر واپسی پر وہ راستوں کو نوٹ کرتا ہوا آیا۔

سہ پہر کے وقت ہی سب لڑکے گراؤنڈ میں جمع ہوگئے آج کسی ٹیم سے میچ نہ تھا چنانچہ سب آپس میں ہی پریکٹس کرنے لگے۔ ناصر اور دیگر لڑکوں کی استہزائیہ نظریں ماجد کو گھور رہی تھیں۔ میچ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے اسے کئی بار مختلف حیلے بہانوں سے چھیڑا بھی تھا اور ہر دفعہ ماجد خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔

جب وہ بیٹنگ کرنے کے لیے آیا تو ناصر اوور کرانے لگا۔

''ڈرپوک مرغی بچ کر رہنا۔ آج میں تمہارے دانت توڑ کر ہی رہوں گا۔'' ناصر نے ٹیپ بال کو انگلیوں پر گھماتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر شیطانیت ناچ رہی تھی۔

ماجد نے اس کے سنگین عزائم کے جواب میں بیٹ گھمایا گویا وہ اس کی دھمکی سے مرعوب نہیں ہے۔ ناصر دانت پیستے ہوئے اسٹارٹنگ پوائنٹ پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے چیلنج کے سے انداز میں دوبارہ اپنے عزائم کا اظہار کیا ماجد نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے بیٹ ٹھونک کر اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ ناصر نے پہلی بال باؤنسر پھینکی جو زناٹے سے ماجد کے کان کے پاس سے گزر گئی۔ ناصر کے گیند کرانے کا انداز جارحانہ تھا۔

''بچ گئی مرغی مگر اب کے اپنی چونچ سنبھال لینا۔'' اس نے ایک قہر آلود نظر ماجد پر ڈالی۔

اس کی طوفانی باؤلنگ سے ماجد واقعی گھبراہٹ کا شکار ہوگیا تھا۔ اس نے گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں زمین پر قدم جمائے اور بیٹ پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کرلی۔ وہ پوری توجہ سے ناصر کی گیند پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ناصر کی دوسری گیند سرعت سے اس کے کندھوں تک آئی اور ماجد نے بیٹ کو اس کے متوازی رکھ کر لیگ پر اس طرح گھمایا کہ اس کا پورا وجود بھی گھوم گیا اور اسی انداز میں اس کی ایک ٹانگ اٹھ گئی تھی' یہ ایک بھرپور قسم کا شاٹ تھا۔ گیند گولی کی رفتار سے گراؤنڈ کی حد پار کرگئی اس طرف درختوں کی بہتات تھی اور اس کے پیچھے کچی آبادی کا علاقہ تھا۔

اس شاندار چھکے پر زوردار قسم کا شور بلند ہوا۔ دوسرے لڑکے ناصر کو طیش دلانے کے لیے چھکے کی تعریفیں کررہے تھے۔ اس طرف کاشف گیند لینے گیا ہوا تھا۔ ناصر جھنجلا کر ماجد سے کچھ کہنے والا تھا کہ یکایک کاشف کی دلخراش چیخ ان کو سنائی دی۔ سب ایک دم بوکھلا گئے۔

''کاشف......!'' ماجد بلا پھینک کر درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگا۔ سب کے چہرے کسی انجانے خدشے کے تحت دھواں ہوگئے تھے۔ وہ ماجد کے پیچھے بھاگے ناصر اپنا غصہ بھول گیا وہ بھی ماجد کے ساتھ ساتھ بھاگ کر درختوں کے جھنڈ کی جانب

پہنچا۔ وہاں کاشف ایک جگہ منجمد کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''کاشف...... کاشف! کیا ہوا تمہیں...... تم ٹھیک تو ہو؟'' ناصر نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''نن...... وہ...... وہ......'' کاشف کی آواز میں خوف کی لرزش تھی اس نے کپکپاتے ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کیا۔ وہاں کسی آدمی کا ساکت وجود پڑا تھا بالکل بے حس وحرکت۔

''لاش...... لاش......'' مختلف قسم کی دہشت زدہ آوازیں ابھریں لاش کو دیکھ کر سب پتھر کے بتوں کی مانند جامد رہ گئے۔

خزاں رسیدہ پتوں کے ڈھیر میں اس آدمی کی لاش بالکل سیدھی پڑی تھی۔ اس کے اعضاء اکڑے ہوئے تھے اور بظاہر اس کے جسم سے زندگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

''کک کیا یہ زندہ ہے؟'' ناصر حواس باختہ لہجے میں بولا۔

''نہیں......'' ماجد نے جھرجھری لے کر کہا۔

''یہ ایک لاش ہے۔''

''ہنہ...... ڈرپوک مرغی تم واقعی بہت بزدل ہو۔'' ناصر نے حقارت سے کہا۔

''اچھا' تم کتنے بہادر ہو۔ لاش کے پاس جو گیند پڑی ہے وہ اٹھا کر لاؤ ذرا۔'' ماجد بولا۔

ناصر کے کہنے سے پہلے ہی ماجد نے اسے چیلنج کر دیا۔

''گیند ہی لانی ہے ناں۔'' ناصر اپنے حواس پر قابو پانے لگا۔

''کیا بات ہے ناصر؟ تم تو اس طرح کپکپا رہے ہو جیسے میں نے تمہیں لاش اٹھا کر لانے کو بولا ہو۔'' ماجد نے اس کے انداز میں چیلنج کیا۔

ناصر اسے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''ذرا خاموشی اور احتیاط سے۔'' ماجد نے لہجے کو گمبھیر بناتے ہوئے اسے تنبیہہ کی۔

''تمہارے قدموں تلے پیدا ہونے والے پتوں کی چرچراہٹ سے کہیں وہ لاش جاگ نہ جائے۔''

''اور کہیں تمہارے اس دخل در معقولات پر مردہ آدمی اچھل کر تمہارا گلا نہ پکڑ لے۔'' دوسرے لڑکوں کی بھی رگ شرارت جاگ اٹھی۔

''اے خاموش ہو جاؤ۔ اب کوئی بولا تو میں اسے کچا چبا جاؤں گا۔'' دہشت کے مارے ناصر کے لیے آگے قدم بڑھانا دوبھر ہو گیا۔

''اچھا' تم آدم خور ہو مگر تمہاری دھونس نہیں چلے گی ناصر۔'' ماجد تیز لہجے میں بولا۔

''ڈرپوک مرغی میں تمہیں اس جرأت کا مزہ چکھاؤں گا۔'' ناصر بڑبڑایا۔

''پہلے لاش سے تو بچ جاؤ بچے۔'' ماجد طنزیہ لہجے میں بولا اور ناصر تلملا کر آگے بڑھ گیا۔

ماحول کی نزاکت کے باعث سب نے خاموشی اختیار کر لی۔ کھلے میدان میں ہوا مکمل آزادی سے تیز تیز چل رہی تھی نیچے زرد پتے لاش کے اردگرد دیدہ دلیری سے اڑتے پھر رہے تھے کبھی کبھی لاش کے لمبے لمبے بال اس کے چہرے پر بکھر جاتے اور کبھی اس کا بالکل سرد و سفید چہرہ نمایاں ہو جاتا۔

ناصر آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاش کے قریب پہنچ گیا۔ سب دم سادھے اسے دیکھ رہے تھے گیند لاش کے پہلو میں پڑی ہوئی تھی۔ صرف چند قدم کی مسافت میں ناصر کی سانسیں بے قابو ہو گئی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں اس کا وجود ڈھیلا ڈھالا لاغر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے انداز و اطوار میں ضعیفی عود آئی تھی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے گیند کی طرف لاش کے پہلو

میں ہاتھ بڑھایا۔ ان جاں گسل ساعتوں میں اس کا دم لبوں پر آ گیا تھا۔ اس کے لرزتے ہاتھ گیند سے ٹکرائے تو لاش کے اکڑے ہوئے ہاتھ کو بھی چھو گئے اور پھر اس ثانیے وہ کچھ ہوا جس کے اندیشے اور اوہام اس کے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ دفعتاً اس آدمی کے مردہ جسم میں حرکت ہوئی اور اس کے سرد ہاتھوں نے ناصر کو جکڑ لیا۔

خوف اور صدمے سے ناصر کا دل گویا دھڑکنا ہی بھول گیا۔ اس کی قوت گویائی جیسے معطل ہو کر رہ گئی تھی وہ بے ربط آواز میں پوری قوت سے چلایا۔

''بب...... بچاؤ...... موت...... لاش......'' یہ اس کے ذہن میں دہشت کی چند حالتیں تھیں جو زبان خطر بن کر اس کے منہ سے ادا ہوئی تھیں۔ ڈر کے مارے وہ بے جان لاش کی طرح وہیں گر گیا۔

اس اچانک افتاد پر سب دوستوں میں بھگدڑ مچ گئی وہ سب سراسیمہ حالت میں چلاتے ہوئے وہاں سے فرار ہو گئے صرف ماجد اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

''مم...... ماجد...... مجھے بچاؤ...... خدا کے لیے۔'' ناصر گھگھیاتے ہوئے بولا۔ ماجد کو یوں محسوس ہوا جیسے ناصر کا جسم موت کی یخ بستگی کے باعث کانپ رہا ہو۔ ٹھنڈی سرد دہشت کی لہریں، جو اس کے وجود کو اکڑا رہی تھیں ماجد یک ٹک اسے گھورتا رہا۔

''ماجد! مجھے بچاؤ۔'' ناصر دوبارہ چلایا۔

''میں تو ڈرپوک ہوں، ڈرپوک مرغی، میں کیوں بچاؤں۔ مجھے تو خود ڈر لگ رہا ہے۔'' ماجد خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتا ہوا بولا۔

''نہیں ماجد! رک جاؤ۔ مجھے بچالو تم واقعی بہادر ہو، میرے دوست بزدل نکلے جو یوں جان بچا کر بھاگ نکلے ہیں۔'' ناصر تقریباً رونے لگا۔

''دہشت زدہ کرنے والی چیزوں سے آلام ومصائب سے خوف کھانا ہر انسان کا فطری عمل ہے مگر کچھ لوگ مخلص اور ہمت والے ہوتے ہیں جو نہ صرف خود ان مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی پریشانیوں کے چنگل سے بچانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر ماجد آگے بڑھا اور ناصر کا ہاتھ تھام لیا۔ ''چلو ہمت کرو۔'' ماجد اسے کھینچنے لگا مگر لاش کی گرفت ناصر کے ہاتھ پر کافی سخت تھی ماجد نے ناصر کا ہاتھ چھوڑ کر لاش کا ہاتھ دبوچ لیا اور اس کی گرفت ختم کرنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ لاش کے ہاتھ اس قدر ٹھنڈے تھے کہ ان کو چھونے سے کسی برف کی سل کا گمان ہو رہا تھا۔ ماجد خوف سے پھریری لے کر رہ گیا اس کا ذہن متضاد سوچوں کا شکار ہونے لگا۔

اس نے پوری قوت صرف کر کے آخر کار گرفت ڈھیلی کر ہی دی اس کی گرفت سے ناصر جیسے ہی آزاد ہوا مردہ آدمی کے حلق سے یکا یک خوف ناک دہاڑ برآمد ہوئی، اس کی آواز میں نہ جانے کیسا کٹیلا پن تھا کہ ماجد کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اسے کان کے پردوں کو برچھی سے زخمی کر رہا ہو۔ ناصر ایک جھٹکے سے آگے گر کر اوندھے منہ زمین بوس ہو گیا۔

ماجد نے گھبرا کر لاش کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''بس اتنا ہی سبق کافی ہے۔ اب آپ چلے جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ لڑکے اپنے بڑوں کو لے کر یہاں آجائیں۔'' اس کی آواز پر مردہ آدمی خاموش ہو گیا اس نے اثبات میں سر کو ایک جھٹکا دیا اور بالوں کی لٹوں کو شانوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ بوڑھے گورکن کا سفید اور سپاٹ چہرہ اس کے سامنے زیر لب مسکرا رہا

تھا پھر وہ تیزی کے ساتھ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔

ماجد نے ایک گہری سانس لی اور ناصر کی طرف متوجہ ہوا ''ناصر......ناصر......تم ٹھیک تو ہونا؟''

''ہاں......ہاں......'' صدمے کی شدت سے ناصر نے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔

''ماجد! تم بہت اچھے ہو۔ تم نے مجھے بچالیا۔ ماجد مجھے یہاں سے لے چلو۔''

''پہلی بار اس کے منہ سے ماجد کا لفظ سن کر اسے خوشی محسوس ہونے لگی وہ اب اپنے آپ کو پرسکون محسوس کر رہا تھا کہ اس نے نہ صرف ایک مغرور لڑکے کو اس کے غرور پر سبق سکھایا تھا بلکہ اپنی دوستی کو بھی مستحکم کرلیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب سب لڑکے اپنے اپنے گھروں میں جا دبکے تو ماجد نے کچی آبادی کا رخ کیا وہ بوڑھے گورکن کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ اس نے ماجد کی مدد کی تھی اور دوستی کے معاملے میں رہنمائی کی تھی۔ بوڑھا گورکن واقعی بہت اچھا آدمی تھا۔ جس نے اسے انتقام لینے سے گریز کرنا سکھایا تھا اور دوسرے طریقے سے معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کی تلقین کی تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بوڑھے گورکن کے گھر کی جانب جا رہا تھا۔ رات کو بوڑھے گورکن کے گھر سے واپس آتے وقت اس نے راستہ ذہن نشین کرلیا تھا۔

وہ خوشی خوشی گنگناتا ہوا بوڑھے گورکن کے گھر کے سامنے پہنچا مگر یکلخت ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس گھر کے باہر کئی آدمی موجود تھے۔ ان سب کے چہروں پر سوگواری چھائی ہوئی تھی اور گھر کے اندر سے رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں ماجد سخت الجھن کا شکار ہوگیا۔

''بھائی صاحب کیا ہوا ہے یہاں؟'' اس نے ایک آدمی سے دریافت کیا۔

''ارے بھئی کیا بتاؤں۔ بے چارہ گورکن مرگیا۔'' وہ آدمی پژمردہ لہجے میں بولا۔

''مر گیا......! کب انتقال ہوا؟'' غیر متوقع خبر سے ماجد ٹھٹک کر رہ گیا۔

''کل رات کو۔'' اس آدمی نے گویا لفظوں کا بم دے مارا۔ حیرت اور دہشت کی شدت سے ماجد چکرا کر رہ گیا۔

''کل رات کو......؟ گویا جب میں ملا تو وہ مر چکا تھا اور پھر ابھی کچھ دیر قبل ناصر کے ساتھ......؟'' ماجد کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

''بے چارہ بہت نیک دل اور سادہ لوح آدمی تھا۔ قصبے کے قبرستان کا اکلوتا گورکن تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر قبل نئے گورکن کا بندوبست ہوا ہے۔'' وہ شخص متاسفانہ لہجے میں بولا۔

''واقعی بہت نیک اور اچھا آدمی تھا۔'' ماجد کے چہرے پر رنج سے زیادہ دہشت کے آثار نمایاں ہونے لگے وہ سراسیمہ انداز میں واپس مڑ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بوڑھے گورکن کا سفید اور سرد سپاٹ چہرہ گھوم رہا تھا اور اس کی ہذیانی چیخیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

دور کہیں مغرب کی اذان کی آواز آنے لگی تھی۔ اندھیرے نے چپکے چپکے اس کے گرد حصار قائم کرلیا تھا۔ وہ دہشت کے مارے تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اس کے اپنے قدموں کی چاپیں اس کے تعاقب میں تھیں۔

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

کوثر عظمیٰ سعید...... لاہور

جواب:۔ آپ کے ساتھ صحت اور بے سکونی کے مسائل شادی سے پہلے کے ہیں مزید شادی کے بعد خراب ہوئے۔ جو وظائف آپ کرتی ہیں وہ بند کردیں۔ بعد نماز فجر سورۃ یسین اور سورۃ مزمّل ایک مرتبہ پڑھ کر اپنے معاملات کے لیے رکاوٹیں ختم ہونے کے لیے۔

بعد نماز مغرب سورۃ فلق' سورۃ الناس 21,21 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔ بچوں اور شوہر کو تصور میں لا کر دم کریں۔ ہو سکے تو ایک گلاس پانی پر دم کر کے خود بھی پئیں۔ بچوں اور شوہر کو بھی پلائیں۔

بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ معاشی حالات ٹھیک ہونے کے لیے۔

مریم عارف...... سیالکوٹ

جواب:۔ مسئلہ نمبر 1:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمّل پڑھ کر دم کریں اول و آخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔ چینی سب کے استعمال میں آئے۔ گھر میں لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔

مسئلہ نمبر 2:۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ روزگار اور برکت کے لیے۔ قرض کی ادائیگی کا بھی تصور رکھ کر پڑھیں۔ وظیفہ مستقل رکھیں ان شاءاللہ معاشی حالات اچھے رہیں گے۔

مسئلہ نمبر 3:۔ ہر چاند کی پہلی' دوسری اور تیسری تاریخ کو بعد نماز عشاء یہ وظیفہ کیا کریں مستقل۔

"یالطیف یا ودود" 313 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھتے وقت شوہر کے دل میں اپنی محبت بٹھانا ہو۔ پھر ایک گلاس پانی پر دم کر کے صبح نہار منہ پلائیں۔ تینوں دن' ان شاءاللہ ایک ہو کر رہیں گے۔ صدقہ خیرات دیتی رہیں۔

مسعود ایوب...... نشتر روڈ

جواب:۔ اگر آپ کو شوق ہے تو کسی استاد سے سیکھیں ورنہ نقصان تو آپ اٹھا رہے ہیں آگے بھی کسی کام کے نہیں رہیں گے۔ پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کریں روزگار کی طرف دھیان دیں۔ ہر نماز کے بعد آیتہ الکرسی' سورۃ الفلق' سورۃ الناس' 7,7 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔

بعد نماز عشاء سورۃ عبس 3 مرتبہ پڑھ کر 7 لونگوں پر دم کریں۔ پھر اس کی دھونی لیں (6 ماہ تک)۔

F.F...... ضلع چکوال

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ رشتے کے لیے دعا کریں۔ بعد نماز مغرب اور عشاء۔ سورۃ الفلق' سورۃ الناس 11,11 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔

عائشہ رحمت علی...... گوجرانوالہ

جواب۔ مسئلہ نمبر 1:۔ بھائی کی طرف سے جو پریشانی تھی اگر ختم ہوگئی ہے تو ٹھیک ورنہ ختم ہونے تک جاری رکھیں۔

مسئلہ نمبر 2:۔ والدہ کو صبح نہار منہ اور شام سورۃ طحہٰ کی شروع کی 5 آیات 21 مرتبہ پانی پر دم کر کے پلائیں۔ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔

گھر کی خیر و برکت کے لیے سورۃ قریش ہر نماز کے بعد 21 مرتبہ پڑھیں۔

نازیہ بی بی...... ضلع جہلم

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ شمس' سورۃ الفلق' سورۃ الناس 21,21 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔

پڑھتے وقت مقصد ذہن میں ہو۔ بعد میں تصور میں لا کر پھونک ماریں۔ ایک گلاس پانی پر دم کر کے ابو کو پلائیں۔

معاشی حالات کے لیے سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف بعد نماز عشاء سب افراد بھی پڑھ سکتے ہیں۔ دعا بھی کریں۔

ط ج...... گجرات

جواب:۔ بعد نماز عشاء 313 مرتبہ آیتہ کریمہ پڑھیں اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔

اللہ سے دعا کریں معافی مانگیں جو آپ کے حق میں بہتر ہے اللہ تعالیٰ وہ فیصلہ فرمادے۔ آمین۔

مسئلہ نمبر 4,3:۔ پڑھائی شروع کر دیں اور دماغ کے لیے معجون استعمال کریں۔

مسئلہ نمبر 5:۔ "المذل" بعد نماز فجر 101 مرتبہ۔ اول و آخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔ (جس نے روپے دیے ہیں وہ پڑھے) مقصد بھی ذہن میں ہو اور دعا بھی کریں۔

ت س...... کوہاٹ

جواب:۔ مسئلہ نمبر 1:۔ سورۃ انعام ایک مرتبہ اول و آخر 7,7 مرتبہ درود شریف۔ بکریوں کو نمک پر پڑھ کر کھلائیں...... چارے میں ملا دیں۔

بعد نماز فجر 41 مرتبہ پڑھیں اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ سورۃ قلم آیت نمبر 52,51 پڑھتے وقت نظر بد کا تصور ہو کہ ٹوٹ رہی ہے۔ پڑھنے کے بعد پانی پر دم کر کے بکریوں اور پودوں پر چھڑکیں یہ وظیفہ مستقل رکھیں ان شاء اللہ پریشانی نہیں ہوگی۔

مسئلہ نمبر 2:۔ "یا عزیز" 101 مرتبہ فجر کی سنت اور فرض کے درمیان اول و آخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔ آپ کے ذاتی مسئلہ کے لیے۔ دعا بھی کریں۔

صباء...... ٹنڈو الہیار

جواب:۔ بعد نماز فجر اور عشاء سورۃ فاتحہ 41 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔

والدہ خود پڑھیں اپنے اوپر دم کریں۔ شفاء کے لیے دعا کریں۔ پانی پر دم کر کے بھی پئیں۔ ان شاء اللہ تندرست ہو جائیں گی۔

شہناز اختر...... راج گڑھ

جواب:۔ "یا سلام" کا ورد کیا کریں۔ جب فارغ ہوں۔ مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 11,11 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کریں۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے نومبر 2014ء

نام........................ والدہ کا نام........................ گھر کا مکمل پتا........................

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں........................

خوشبوئے سخن

عمر اسرار

جو میرے جیسا ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو
نہ ہو فرشتہ نہ فرشتوں جیسا ہو
نہ دور دیس کا شہزادہ ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو
نہ ہو وقت کا امام
نہ پرستان کا راجہ ہو
میں انسان ہوں جیسی
وہ میرے جیسا ہو
میرے دکھ کو جانتا، میرے خلوص کو پہچانتا ہو
وہ میری ذات کی سب گہرائیوں سے واقف ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو
منافقتوں کے پردے میں وہ نہ لپٹا ہو
وہ میری حساسیت سے آشنا ہو
وہ دلداریوں کے سب ہنر سے واقف ہو
وہ میرا اہم سفر وہ میرا ساتھی وہ میرا رہبر ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو

ریحانہ سعیدہ......لاہور

بارہواں کھلاڑی

خوشگوار موسم میں
ان گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
میں الگ تھلگ سب سے
بارہویں کھلاڑی کو
ہوٹ کرتا رہتا ہوں
بارہواں کھلاڑی بھی
کیا عجیب کھلاڑی ہے
کھیل ہوتا رہتا ہے
شور مچتا رہتا ہے
داد پڑتی رہتی ہے
اور وہ الگ سب سے
انتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا
جس میں سانحہ ہو جائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کے جھرمٹ میں
ایک جملہ خوش کن
ایک نعرہ تحسین
اس کے نام پر ہو جائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہو جائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے

انتخاب: جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

غزل

ہاتھ خالی وہ گر چلا ہی گیا
تجھ کو دے کر مگر دعا ہی گیا
جان کا پیش کر کے نذرانہ
کوئی قرض وفا چکا ہی گیا

رات چپکے سے وہ چلے آئے
دل کو آخر قرار آ ہی گیا
ہم فقیروں کو اس سے کیا مطلب
کس طرح کس کا تخت شاہی گیا
ہم بضد تھے جدا نہ ہونے پر
وہ مگر فیصلہ سنا ہی گیا
ہم تو تانے ہوئے تھے سینے کو
پر نشانہ تیرا خطا ہی گیا
دل کو عاطر ہزار سمجھایا
اس کے پیچھے یہ پھر بھی راہی گیا

رانا حنیف عاطر......راولپنڈی

غزل

پھول مہکے تھے بہاروں کے زمانے آئے
یاد بھی آخر پھر دل جلانے آئے
جن سے تھی امید وفا پھر سے ہمیں
نقش یادوں کے وہ بھی مٹانے آئے
ہم وہی ہیں یوں بدل گیا زمانہ
زخم دل کے پھر سے تجھے دکھانے آئے
جل اٹھے ہیں تیری وفاؤں کے چراغ
گزرے دنوں کے بعد پھر موسم سہانے آئے
پاس رہتے تھے جو میرے دل کے قریب
پھولوں میں آج وہ بھی کانٹے بچھانے آئے
کسی کی زلفوں سے رہائی نہ پائی جاوید

محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

دل یہ تسکین حال مانگے ہے
تیری زلفوں کے جلا مانگے ہے
کیا یہ دل پامال مانگے ہے
پھر تیری مست چال مانگے ہے
ان کی نظریں ہیں کیوں میرے دل پر؟
دل یہ ایسے سوال مانگے ہے
کیوں نا آئینہ کمال میں رکھو
مجھ سے اپنی مثال مانگے ہے
چپ ہے وہ آئینہ دیکھ کر شاید
داد عکس و جمال مانگے ہے
جو قفس کو چمن سمجھتا ہو
پر وہ مانگے نہ بال مانگے ہے

ادیب سمیع چمن......حیدرآباد

غزل

جب اس کے دل سے درد کا احساس مٹ گیا
انسان مخلوقات میں اشرف کہاں رہا
مرجھا گئی کلی کلی زردائے سب درخت
گلشن میں اتنی دیر تک دور خزاں رہا
جب تک دلوں میں موجزن عزم جواں رہا
یہ کارواں بھی جانب منزل رواں رہا
نمرودیت، یزیدیت، فرعونیت گئی
ان ظالموں کا کب یہاں نام ونشان رہا
بالائے طاق رکھ دیے ہم نے تکلفات
جب اپنے سر پر دھوپ ہی کا سائبان رہا
دیکھی ہیں ہم نے عمر بھر وہ آزمائشیں
ہر دور اپنے واسطے ایک امتحان رہا
اپنے پروں کی تیلیوں کو دیکھ کر قمر
طائر قفس میں دیر تک محو فغاں رہا

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

ذوقِ آگہی

عفان احمد

دو سوال

حضرت علیؓ کے پاس ایک عیسائی اور یہودی آئے اور آپ کو لاجواب کرنے کے لیے دو سوال کیے۔

یہ بتائیں وہ کون سی چیز ہے جو ہم تو دیکھتے ہیں لیکن اللہ نہیں دیکھتا؟

آپ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر چیز موجود ہے تو وہ کیا ہے جو قرآن میں موجود نہیں ہے؟

حضرت علیؓ نے چند لمحے توقف کیا اور پھر مسکرائے اور جواب دیا کہ

اللہ تعالیٰ ''خواب'' نہیں دیکھتا کیونکہ اسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔

دوسرا یہ کہ قرآن حکیم میں سب کچھ لکھا گیا ہے لیکن ''جھوٹ'' نہیں لکھا۔

اسی طرح کسی نے پوچھا کہ وہ کیا ہے جو انسان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے پھرتا ہے مگر اللہ کا نہیں ہے۔

ان بزرگ نے جواب دیا کہ بھلے لوگ انسان ٹھوس مٹی سے بنا ہے اس لیے اس کا ''سایہ'' ہوتا ہے جیسے ہر ٹھوس چیز سایہ رکھتی ہے اور اللہ کریم کا سایہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تو نور ہی نور ہے، روشنی کا سایہ دیکھا؟ نہیں نا، اسی طرح اس خالق کائنات کا سایہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی ...... راولپنڈی

زندگی کیا ہے؟

- زندگی بند کلی ہے جسے کھلنے اور مرجھانے میں دیر نہیں لگتی۔
- زندگی کتاب ہے جس کے ورق پلٹنے اور بند ہونے میں وقت نہیں لگتا۔
- زندگی شمع ہے جو جلتے جلتے آخرکار بجھ جاتی ہے۔
- زندگی قلم ہے جس کی سیاہی ختم ہو جاتی ہے۔
- زندگی چاند ہے جو موت کی آغوش میں چھپتی ہے۔
- زندگی سایہ ہے موت کا۔
- زندگی امانت ہے خدا کی۔

فیاض اسحاق مہانہ ...... سلانوالی

انمول موتی

- موت سے ڈرو کیونکہ موت ہی اصل زندگی ہے۔
- تین چیزیں انسان کو کھا جاتی ہیں، حسد، غرور اور حرص۔
- خواہشوں کی پیروی حق سے روک دیتی ہے اور امیدوں کا پھیلاؤ آخرت کو بھلا دیتا ہے۔
- جو اچھی بات سنو لکھ لو جو لکھو اس کو حفظ کر لو جو حفظ ہے اس کو بیان کرو۔
- میں نے ایسا شخص نہیں دیکھا ہے کہ گفتگو کرنے سے پہلے جس کی ہیبت مجھ پر چھا گئی ہو البتہ وہ شخص اگر صحیح ہے تو میرے دل میں اس کی عظمت ہوتی ہے ورنہ وہ میری نظروں سے گر جاتا ہے۔
- جب بادشاہ کی صحبت میسر ہو تو اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو جس طرح عاقل عورت بے وقوف شوہر کو راضی کرتی ہے۔

رابعہ چوہدری ...... فیصل آباد

تین چیزیں

- تین چیزیں پاک رکھو، جسم، لباس، خیالات۔
- تین چیزیں قابو میں رکھو۔ زبان، نفس، غصہ۔

- تین چیزیں یاد رکھو۔ موت' احسان' نصیحت۔
- تین چیزیں برداشت نہ کرو۔ ظلم' جھوٹ' فحاشی۔
- تین چیزیں باقاعدگی سے پڑھتے رہو۔ نماز' قرآن' درود۔
- تین چیزیں دھیان سے اٹھاؤ۔ قلم' قدم' قسم۔
- تین چیزیں چھوٹی نہ سمجھو۔ قرض' فرض' مرض۔
- تین چیزیں ایک بار ملتی ہیں۔ والدین' وقت' زندگی۔
- تین چیزیں حاصل کرو۔ علم' دعا' اعتماد۔
- تین چیزیں کبھی نہ توڑو۔ دل' عہد' قانون۔
- تین چیزیں ذلیل کرتی ہیں۔ چوری' چغل' چاپلوسی۔

فائزہ فاروق......کراچی

کہیں بھول تو نہیں گئے

آج کے اس جدید دور کے انسانوں کو فلموں' ڈراموں کے ہر سین کا علم ہے کبھی فلموں کی بات نکلے تو لمبی بحث چل نکلتی ہے کسی ڈرامے کا تذکرہ ہو تو ایک نا ختم ہونے والی گفتگو شروع ہو جاتی ہے' سالوں پرانے ڈرامے ان کے کردار' افسانوی باتیں ایسی یاد ہوتی ہیں کہ جیسے ابھی رٹا لگایا ہو۔ کہیں قرآن شریف کا ذکر غلطی سے ہو جائے اور کوئی چند ایک باتیں کرنے لگے تو چہرے سے تھکن کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ تو جمائیاں تک لینے لگتے ہیں اور آخر میں تنگ آ کر باتیں کرنے والے کو سختی سے منع کر دیتے ہیں' آج کے دور کے لوگ تو گانوں اور دوسرے امور میں پڑ کر قرآن شریف کو بھی بھولنے لگے ہیں۔ قرآن پاک کو بھولنے والے کے بارے میں حضرت سعد بن عبادؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص نے قرآن پاک پڑھا اور پھر اسے (غفلت اور سستی کی وجہ سے) بھلا دیا' وہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اجذم ہو گا۔" (مشکوۃ شریف)

اجذم یعنی کوڑھ ہو گا' اس کے ہاتھ کی انگلیاں گری ہوئی ہوں گی اور بعض اکابرین کے نزدیک اس کے دانت گرے ہوئے ہوں گے' بظاہر یہ آخری معنی ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں کیونکہ قرآن پڑھتے رہنے سے یاد رہتا ہے اور پڑھتے رہنا زبان اور دانتوں کا عمل ہے لہٰذا اس کی سزا دانتوں کا ندارد ہونا ہی بہتر ہے (واللہ علم)۔

ایک حدیث میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کیے گئے تو میں نے کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں دیکھا کہ کسی کو قرآن کی کوئی آیت یا سورۃ آتی ہو اور پھر وہ اسے بھول جائے۔" (ترمذی)۔ قرآن پڑھ کر بھولنے کی ایسی سزائیں ہیں لیکن آج کے مسلمان نے تو دھیان دینا ہی ترک کر دیا ہے کہ اسے قرآن یاد بھی ہے یا وہ بھول گیا ہے' دنیا عارضی ٹھکانہ ہے' آخرت کی تیاری کریں۔

شازیہ فاروق احمد......خان بیلہ

قسط نمبر15

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے...... جوروجبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔
"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گائوں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

انہوں نے شیخو پورہ اسٹیشن کے سامنے والے ہوٹل میں قیام کیا۔ بال بچے دار اچلا ساتھ ہونے کی وجہ سے ڈاکوؤں کی جانب کسی کی توجہ نہیں ہوئی۔ جگت اور بچن کو بہت زیادہ ہوشیار رہنا تھا۔ ہنگاموں میں الجھی ہوئی پولیس کی نظر میں آ گئے تو تباہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اب پکڑے گئے تو فرار بھی مشکل تھا۔ حکومت بدل چکی تھی۔ گروہ ٹوٹ چکا تھا۔ پولیس انہیں زندہ پکڑ کر کہیں رکھنے کی دردسری مول لیے بغیر انہیں شوٹ کردے گی۔ حفاظت خود اختیاری کی وجہ سے وہ باہر نہیں نکلے۔ جگت نے ہوشیار سے کہا۔
"تم اچلا کو لے کر اسٹیشن پر چکر لگا آؤ۔ برابر میں دھرم شالا ہے۔ وہاں بھی مہاجر بھرے ہوئے ہیں۔ ماں یا چندن کور نظر آ ئیں تو اچلا انہیں جلدی پہچان لے گی۔"
ان کے جانے کے بعد جگت کافی دیر تک بچن کو دیکھتا رہا۔ وہ کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخر اس کی سوچ زبان پر آ گئی۔ "بچن! مجھے تم سے ایک بات معلوم کرنی ہے۔" بچن جگت کے سنجیدہ چہرے کو متجسس نظروں سے دیکھنے لگا۔ "تم نے اچلا کے لیے کچھ سوچا؟" اس اچانک سوال نے بچن کو ہلا دیا۔
"میں سمجھا نہیں جگت! اچلا کے لیے کیا سوچنا ہے؟"
"اچلا اور اس کے بیٹے کو اس حالت میں تمہارے سہارے کی بہت ضرورت ہے۔" بچن سمجھ گیا' اس نے نظریں پھیر لیں۔
"مجھے اس سے کتنا پیار ہے یہ تو تم جانتے ہو جگت۔"
"ہاں...... مگر اچلا کو پیار کے ساتھ سہارا بھی دینا پڑے گا۔" بچن نے سر اٹھایا' جگت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "اس کے لیے تمہیں قربانی دینی پڑے گی۔"

''کیسی قربانی؟''

''مجھے وچن دو کہ جو میں کہوں وہ کرو گے۔'' جگت نے ہاتھ بڑھایا۔ ''یقین رکھنا۔ یہ تمہارے اور اچلا دونوں کے فائدے کی بات ہے۔'' بچن نے اپنا ہاتھ جگت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس کے لیے وچن کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری بات میں نے کبھی ٹالی ہے؟'' اسی وقت اچلا اور ہوشیار واپس آ گئے' جگت نے جو سوچا تھا وہی سننے کو ملا۔

''سب جگہ تلاش کیا مگر تمہارے گھر والے نظر نہیں آئے جگت! مجھے یقین ہے کہ وہ سب چلے گئے ہیں۔ اس وقت گاڑی بھری ہوئی ہے۔ ممکن ہے اس میں ہوں۔'' جگت نے آہ بھری' بچن اور اچلا کو غور سے دیکھا اور دل مضبوط کر کے بولا۔

''اچلا! اب ہم جدا ہوں گے۔ تم بچوں کو لے کر اسی گاڑی میں بیٹھ جاؤ! بچن تمہارے ساتھ جائے گا۔'' بچن نے جھٹکا محسوس کیا۔

''جگت! تم مجھ اکیلے کو دھکیل دینا چاہتے ہو؟ تم یہاں کیوں رکنا چاہتے ہو؟'' بچن غصے میں آ گیا۔

''بچن! گرم نہ ہو۔ ابھی تم نے مجھے وچن دیا تھا اور اب اس سے انحراف کرو گے؟'' جگت نے سختی سے کہا مگر اس کی آواز بھرا گئی۔

''انحراف کی بات نہیں۔ مگر ہم جدا کیوں ہوں؟''

''کیونکہ میں اچلا کو اس خطرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں ابھی نہیں جا سکتا۔'' جگت نے سخت آواز میں کہا۔ ''ویرو کی تلاش ابھی باقی ہے۔'' بچن چپ ہو گیا۔ ویرو ابھی اس کے ذہن سے نہیں نکلی تھی۔ بچن نے کافی بحث کی۔

''ویرو ابھی تک بیٹھی نہیں رہی ہو گی۔ وہ وطن چھوڑ چکی ہو گی۔ تم اسے کہاں تلاش کرو گے؟'' مگر جگت نے ضد نہیں چھوڑی۔ ''تم کہو گے تو ہم بھی رک جائیں گے۔'' مگر یہ بات بھی جگت نے نہیں مانی۔

''تم لوگ ابھی روانہ ہو جاؤ! میں اور ہوشیار بعد میں آ جائیں گے۔'' آخر بچن کو جگت کی بات ماننا پڑی۔ جدا ہونے کے خیال نے سب کو گم صم کر دیا۔ جگت مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بچن منہ پھلا کر ٹہل رہا تھا۔ ''ہوشیار! تھوڑی رقم رکھ کر باقی سب کچھ بچن کو دے دو۔'' پھر بچن سے کہا۔ ''دیکھو! امرتسر پہنچ کر سیدھے الور جانا ہے۔ وہاں کچھ دن رہنا۔ میرے گھر والوں سے کہنا کہ ہم تھوڑے دنوں میں آ جائیں گے۔ سب کو اطمینان دلانا۔'' بچن کچھ نہ بولا۔ جگت سے جدا ہونے کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے چھوڑ کر جانے کو دل نہیں مانتا تھا۔ وہ کوئی خطرہ مول لے بیٹھے گا اس وقت اس کے ساتھ کوئی نہیں ہو گا۔ بہت سے خیالات بچن کو ستا رہے تھے۔ آخر جدا ہونے کی گھڑی آ پہنچی..... تب دل میں دبائے ہوئے محبت کے آنسو باہر نکل آئے۔ اچلا بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اچلا کے بیٹے کو بھی جگت سے پیار تھا۔

''جگت چاچا! تمہارے بغیر گھڑ سواری کا مزہ نہیں آئے گا۔''

ہوشیار انہیں گاڑی میں بٹھانے جا رہا تھا۔ جگت اسٹیشن نہیں جائے گا۔ یہ طے ہو گیا تھا۔ اچلا جانے سے پہلے جگت کے پیر چھونے کے لیے جھکی۔ جگت نے اس کے دونوں رخسار پیار سے تھپتھپا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ''سکھی رہو۔'' اچلا بھیگی پلکوں سے آگے بڑھنے لگی تو جگت نے اسے روک لیا۔ ''ذرا میری بات سنتی جاؤ۔'' وہ نزدیک آ گئی۔ بچن دور تھا۔ جگت نے دھیمے لہجے میں اچلا کے کان میں کہا۔

"اپنا دوست اب تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھنا......!" جگت کچھ دیر رکا۔ پہلی بار اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "میں نے اس سے نہیں کہا' مگر تم سے کہتا ہوں' یہاں سے جانے کے بعد تم لوگ دور دور چلے جانا۔ اچلا! تم جانتی ہو کہ بچن تمہارے پیار میں مایوس ہو کر گھر سے فرار ہوا تھا اور ملٹری میں بھرتی ہو گیا تھا' ہم وہاں ملے' وہ میرے ساتھ ڈاکو بن گیا۔ اب تمہارا ساتھ اسے ملا ہے لہٰذا اسے اس راستے سے لوٹانا تمہارا کام ہے۔"

"بہتر ہے۔" یہ کہہ کر اچلا جگت کے سامنے دیکھنے لگی۔ جگت نے کھنکار کر اس کی گود میں بیٹھے ہوئے ڈیڑھ سالہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"اور سنو! جیسا تم نے اپنے سگے بیٹے کا نام بچن رکھا ہے اسی طرح اس بچے کا نام جگت رکھنا۔ اس طرح میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔" پھر وہ آگے نہ بول سکا۔ اچلا بھاری دل سے نیچے اتر گئی۔ جگت نے باہر راستے پر نظر ڈالی۔ بچن نے بھی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظر ٹکرائی۔ بچن کا ہاتھ بلند ہوا۔

"سلام پیارے دوست! سلام پیارے وطن......!"

جگت نے بھیگی آنکھوں سے ہاتھ بلند کر کے انہیں وداع کیا۔ "نئی زندگی مبارک ہو دوست۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ دوسرے لمحے بچن بھیڑ میں گم ہو گیا مگر ایک اور شخص راستے سے ہوٹل کی کھڑکی میں کھڑے ہوئے جگت کو دیکھ رہا تھا۔ جگت کو اس کی خبر ہی نہیں تھی......!

☐......♥......☐

بچن کو وداع کرنے کے بعد جگت کو بہت دیر تک سب کچھ خالی خالی نظر آیا۔ وہ ہوٹل میں کچھ دیر تک ٹہلتا رہا مگر چین نہیں آیا تو چارپائی پر لیٹ گیا۔ چھت پر نظر جمائی تو یادوں کی کتاب کے ورق پھڑپھڑانے لگے۔ ہنومان چلا گیا۔ ویرو کا پتہ نہیں اور بچن جدا ہو گیا...... اب صرف ہوشیار رہ گیا تھا...... آہستہ آہستہ سب کا ساتھ چھوٹ رہا تھا۔ جلد یا بدیر یہ وطن بھی چھوڑنا پڑے گا۔ تقدیر اس کی زندگی کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلے گی؟ باہر شور ہو رہا تھا۔ ابھی گاڑی کی سیٹی نہیں ہوئی تھی۔ بچن' اچلا' چھوٹا بچن اور چھوٹا جگت اب گاڑی میں بیٹھ چکے ہوں گے۔ ہوشیار نے انہیں جگہ دلا دی ہوگی۔ لمحہ بھر کے لیے جگت نے سوچا کہ میں بھی ان سے جاملوں' وطن کو سلام کر کے چلا جاؤں۔ وہ اٹھ بیٹھا مگر ویرو کی یاد آ گئی۔ "نہیں......نہیں...... ویرو کی تلاش ادھوری چھوڑ کر کس طرح جا سکتا ہوں؟ یہ کانٹا زندگی بھر دل میں محسوس ہوگا۔ وہ چین سے جی نہیں سکے گا۔ مگر ویرو کو کہاں تلاش کرے گا؟ کس سے پوچھے گا اور اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ ذہن سے خیالات نکلتے ہوئے کچھ دیر لگی۔ پھر دستک ہوئی...... اب جگت چونکا۔ ہوشیار اتنی جلدی واپس نہیں آیا ہوگا۔ اس نے کمرے میں چاروں سمت نظریں گھمائیں' وہ لوگ کچھ بھول تو نہیں گئے؟ ابھی گاڑی چلی بھی نہیں' پھر یہ کون ہوگا؟ ہوشیار نہیں تھا کیونکہ انہوں نے تین بار دستک دینے کی نشانی رکھی تھی۔ اب دروازے کو کسی نے زور سے ہلایا۔ جگت نے بستر کے نیچے سے گن نکالی۔ کمرے کے دروازے نہ کھولے تو شور ہوگا۔ مضبوط مگر چوکنے قدموں سے وہ دروازے کے قریب گیا۔ دائیں ہاتھ میں گن تھام کر بائیں ہاتھ سے زنجیر گرائی۔ سانس روک کر اس نے ایک پٹ آہستہ سے کھولا۔ آنے والے نے اندر جھانکا۔

"جگا......!" پہچاننے میں پانچ دس لمحے گزر

گئے۔ "کون؟ علی بخش......!" یہ کہہ کر جگت نے گن ہٹالی۔ اس نے علی بخش کو اندر لا کر دروازہ بند کر دیا۔ جگت کئی سالوں سے جس سے ملنے کا مشتاق تھا وہ اس طرح اچانک آ گیا' اس لیے اسے مسرت کے ساتھ حیرت بھی تھی۔ دونوں پیار سے گلے ملے۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟"

"تمہارے جیسے چالاک ڈاکو بھی حماقت کر بیٹھے اس صورت میں مجھ جیسے آدمی کو پتہ چل ہی جاتا ہے۔" علی بخش نے مسکرا کر کہا۔ "افسوس اس بات کا ہے کہ میں پولیس والا نہیں' ورنہ پانچ ہزار کما لیتا۔" جگت اس کا مذاق سمجھ گیا۔

"اگر تمہیں روپے کی اتنی ضرورت ہے تو ابھی دیر نہیں ہوئی۔ جاؤ جا کر پولیس کو اطلاع کر دو۔ ایک بار تم نے مجھے موت کے پنجے سے نکالا تھا اس کا قرض بھی صاف ہو جائے گا۔" پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "مگر زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ انہیں میری لاش ہی ملے گی اور تمہیں انعام۔" علی بخش کو اس کا آخری جملہ کھٹک گیا۔

"جگا ڈاکو بڑا مخیر ہے یہ میں جانتا ہوں اور میں اتنا مطلبی نہیں یہ تم جانتے ہو۔ پھر فلم کے ڈائیلاگ کیوں بول رہے ہو؟"

جگا ہنس دیا۔ "اب بتاؤ! میں نے کیا حماقت کی؟"

"راستے والی کھڑکی میں کھڑا ہو کر ہاتھ بلند کر رہا تھا' یہ میری بجائے پولیس دیکھ لیتی پھر؟"

"پھر جان گنواتا اور کیا؟" جگت نے بے پروائی سے کہا۔ "علی بخش! تم مجھے پہچان گئے یہ بھی بڑی بات ہے وہاں راستے پر کیا کر رہے تھے؟"

"اپنے تانگے پر بیٹھا تھا۔ اب میں تانگے والا ہو گیا ہوں۔" وہ دو ہاتھوں سے گھوڑے کی لگام کھینچنے کی اداکاری کرتا ہوا بولا۔ "تمہیں جلدی پہچان گیا کیونکہ آخری بار میں نے اخبار میں تمہاری تصویر دیکھی تھی۔ پھر کچھ دنوں بعد خبر پڑھی کہ ارجن سنگھ کو گولی مار کر تمہارے ساتھی تمہیں رہا کرا کر لے گئے ہیں۔ دوست اس وقت میں بہت خوش ہوا تھا۔ سارے گاؤں کے تانگے والوں کو پیڑے کھلائے تھے۔"

"مگر تم چوکیدار سے تانگے والے کیسے بن گئے؟"

"تمہیں پتہ نہیں؟ ارجن سنگھ کے آدمی تمہیں بری طرح مار کر نیم مردہ حالت میں میرے گھر چھوڑ گئے تھے اور میں نے نانا کو خبر پہنچائی تھی۔ اس کی پول کھل گئی اس لیے ارجن سنگھ کو مجھ سے بیر ہو گیا۔ میری نوکری چھڑا کر مجھے کہیں بھی کام نہ ملے۔ وہ اس کے چکر میں رہنے لگا' مگر یہ شکر ہے کہ سنہا صاحب نے ہاتھ تھام لیا۔ ان کی رقم سے تانگہ لیا۔ اب تو قرض بھی ادا کر چکا ہوں اور کچھ رقم جمع بھی کر لی ہے۔"

جگت کو سنہا صاحب یاد آ گئے۔ اور ان کی خاندانی شرافت بھی یاد آ گئی۔ انہوں نے پولیس چیف ہونے کے باوجود چندن کور کو اکھنڈ سوبھا گیہ وتی کی دعا دی تھی۔ ہنگامے کے دوران ہنومان کی گولی سے پیر زخمی ہوا اور اپاہج ہونے کے باوجود علی بخش کو قدم جمانے کے لیے مدد کی۔ اس کے مقابلے میں ارجن سنگھ کی کم ظرفی کا احساس ہو گیا اور ارجن سنگھ کے خیال کے ساتھ جگت کے دل کو جھٹکا لگا۔

"علی بخش! اچھا ہوا تم مل گئے۔ تمہیں میرا ایک کام کرنا پڑے گا۔"

"بولو کیا؟ بندہ ہر کام کے لیے حاضر ہے۔" علی بخش جھوم کر بولا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی

اور وہ گھبرا گیا۔ جگت نے اطمینان دلایا۔
"یہ تو اپنا ساتھی آیا ہوگا' ہوشیار۔" دراوزہ کھولتے ہوئے جگت نے پوچھا۔ "کیا گاڑی چلی گئی؟"
ہوشیار انجانے شخص کے ساتھ جگت کو دیکھ کر کچھ ہچکچایا۔ وہ غور سے علی بخش کو دیکھنے لگا۔
"ہوشیار! یہ ہمارا دوست ہے۔ اسی کی وجہ سے مجھے ایک بار نئی زندگی ملی تھی۔" جگت نے تعارف کرایا۔ "تمہیں یاد ہے جب میں پولیس کے تابع ہوا تھا تب مجھے ختم کردینے کی ارجن سنگھ نے کوشش کی تھی اور میری لاش ٹھکانے لگانے کے لیے علی بخش کے گھر چھوڑ دی تھی۔ اس وقت موت کے پنجے سے بچانے والا یہی علی بخش تھا۔" پھر مزید کہا۔ "اب یہ تانگہ چلاتا ہے۔ مجھے آسانی سے دریافت کرلیا۔"
ہوشیار دوستانہ انداز میں مسکرایا' پھر جگت کو جواب دیا۔
"دلاور خان پھر یہاں کا پولیس چیف بن گیا ہے۔"
جگت سوچ میں ڈوب گیا۔ پولیس کو شبہ ہوگا کہ وطن چھوڑنے کے لیے جگا کے گروہ کو یہاں آنا پڑے گا' ممکن ہے اس لیے اسٹیشن پر انتظام رکھا گیا ہو۔
"جگا! پولیس کی فی الحال تم فکر نہ کرنا۔ کیونکہ فی الحال ہنگامے اور بلوے ہو رہے ہیں اس سچویشن میں تمہیں گرفتار کرنے کی کسی کو فرصت نہیں۔" علی بخش نے اطمینان دلایا۔ "مگر تم مجھے کیا کام سپرد کرنا چاہتے تھے؟"
ہوشیار سمجھ گیا کہ اس کے آنے سے پیشتر دونوں کے درمیان بہت سی باتیں ہوئی ہیں۔ جگت کو خیالات میں غلطاں وخاموش دیکھ کر اسے کہنا پڑا۔
"جگا! میری غیر حاضری میں بات کرنی ہو تو......"
"ہوشیار! تم نے یہ کیا کہا؟" جگت نے کہا۔ "تمہاری موجودگی ضروری ہے تبھی تمہیں روکا ہے۔" پھر علی بخش سے بولا۔ "تم ارجن کے گھر جاسکتے ہو؟"
"ارجن کے گھر......؟" علی بخش چونکا۔ "وہاں تمہیں کیا کام ہے؟ اس کی بیوہ اور جوان بیٹا دونوں ہی گھر میں ہیں۔"
"علی بخش! ارجن سنگھ نے ایک بار کہا تھا کہ ویرو اس کے قبضے میں ہے۔ ممکن ہے اس کی بیوہ سے ہی اطلاع مل جائے۔ اگر تم یہ کام نہ کرسکو تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرکے اس عورت سے اطلاع حاصل کرنی پڑے گی۔"
"نہیں جگا! تمہیں خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" علی بخش نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "ارجن سنگھ کی تعزیت کرنے اس کی بیوہ کے پاس میں گیا تھا۔ اس کے بعد ضرورت پڑنے پر وہ میرا تانگہ منگواتی ہے۔ سب پولیس والے میرے تانگے کا استعمال کرتے ہیں مگر ویرو کے متعلق کس طرح اطلاع حاصل کی جائے؟"
"کوئی ترکیب کرنی پڑے گی۔" جگت داڑھی کھجاتا ہوا بولا۔ "کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا کرو تم رات کو آؤ۔ تمہارے تانگے میں بیٹھ کر ہم تفریح کریں گے۔"
علی بخش کے جانے کے بعد جگت سوچ میں گم ٹہلنے لگا۔ ہوشیار بچی ہوئی رقم گننے لگا۔

□......♥......□

ارجن سنگھ کی بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ دہلی جانے کے لیے سامان بندھوا رہی تھی۔ پنشن یافتہ سرکاری افسران کے خاندانوں کے لیے ہندوستان جانے والی ہر گاڑی میں ایک دو بوگیوں کا انتظام رکھا جاتا تھا۔ نیز ان کا سامان بحفاظت پہنچ

جائے ایسا انتظام بھی تھا۔

"علی ...... سامان ٹھیک طرح پہنچا دینا۔ کہتے ہیں کل شام گاڑی چلی جائے گی۔" ارجن سنگھ کی بیوہ امیتا کور نے علی بخش کے تانگے میں رکھے ہوئے سامان کی گنتی کرتے ہوئے کہا۔ "قوم کے اس جھگڑے میں وطن چھوڑنا پڑے گا' ایسا کس نے سوچا تھا؟"

"تم فکر نہ کرو بھابی! سامان ٹھیک طرح پہنچ جائے گا۔ پربھودھن بھائی ساتھ ہیں' ان کی نظر کے سامنے لگیج وین میں رکھوادوں گا۔"

"یہ تو بچہ ہے علی! میں تم پر اعتماد کرتی ہوں یہی وجہ ہے کہ کسی سکھ کو نہیں بلایا۔" امیتا نے میٹھے لہجے میں کہا۔ وہ جانتی تھی کہ سکھ تانگے والے ہجرت کر گئے' پھر بولی۔ "جاتے ہوئے تمہیں بخشش دینا نہیں بھولوں گی' سمجھے؟"

"بخشش تو بھابھی! جانے سے پہلے مانگ لوں گا۔" علی بخش نے مذاق کرنے والے انداز میں بات بڑھائی۔ "گاڑی کی روانگی کے وقت کافی چکر لگانے پڑیں گے۔ تمہیں دینے کی فرصت نہیں ہوگی اور مجھے لینے کا وقت نہیں ہوگا۔" اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ ارجن سنگھ کا بیٹا پربھودن علی بخش کے برابر بیٹھا تھا۔

اس نے رات جگت سے کہا تھا کہ کل دوپہر تک میں تمہارا کام کردوں گا۔ شام تک کام میں مصروف رہوں گا لہٰذا رات کو آ کر تمہیں بتادوں گا۔ اب ارجن سنگھ کی بیوہ پر بات ہے کہ وہ کس قدر جانتی ہے۔

"نہیں علی بخش! تم اس سے کس قدر معلومات حاصل کر سکتے ہو یہ تم پر منحصر ہے۔" جگت نے اسے پانی پر چڑھایا تھا۔

"وہ جس قدر جانتی ہوگی میں معلوم کرلوں گا۔"

علی بخش کے جانے کے بعد جگت ویرو کے خیال میں دوسرے دن کا انتظار کرنے لگا۔

❒......♥......❒

"اب بولو علی بخش! کتنی بخشش چاہیے؟" علی بخش نے لسی کا پیالہ ختم کیا تو امیتا بولی۔ "کیا شادی وغیرہ کی تیاری کررہا ہے؟ آج کل تو تمہاری چاندی ہوگی۔"

"شادی اور کمائی تو الگ بات ہے بھابی!" علی بخش نے سنبھل کر بات کی۔ "ایک شخص کا کام کرنا ہے' کام ہو تو اچھا معاوضہ ملے گا۔ بس آپ کی تھوڑی مدد چاہیے۔"

"کیسی مدد؟" امیتا کا تجسس بڑھا۔ "پربھودھن کے باپو زندہ تھے تو بہت سے لوگ سفارش کے لیے آتے تھے۔ مگر اب میں کیا مدد کرسکتی ہوں؟"

چند لمحے خاموش رہ کر علی بخش نے کہا۔ "بھابھی آپ کو ایک بات بتانی ہے۔ چیف صاحب آپ کو تمام باتیں بتاتے تھے اس لیے اس بات سے بھی آپ واقف ہوں گی۔"

"کون سی بات؟" امیتا اب فکر مند نظر آنے لگی تھی۔

"ویرو کے متعلق ......" علی بخش جلدی سے بولا۔ "اس کانی بدنام عورت کے رشتے دار مجھے اسٹیشن پر مل گئے۔ بے چارے ہجرت کرکے جانے سے پہلے ویرو کا پتہ معلوم کرنے کے لیے ترس رہے ہیں۔ کہتے تھے چیف صاحب زندہ ہوتے تو ہم خود جاکر پوچھ لیتے۔"

ارجن سنگھ کی بیوہ ہوشیار ہوگئی۔ بہت دیر تک غور سے علی بخش کو دیکھتی رہی۔ اس کے بات کرنے کے انداز سے چالاکی کی بو آرہی تھی۔ ویرو کا نام آتے ہی اسے جگا یاد آ گیا۔ شوہر سے دونوں کی محبت کے

متعلق اسے بہت ساری باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ جگا ویرو کی تلاش میں ایک بار گرفتار ہونے سے بمشکل بچا تھا' یہ یاد آیا۔ کیا جگا نے ویرو کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے علی کو اس کے پاس بھیجا ہے؟ یہ بھی ممکن ہے' ایک بار اس نے جگا کو بچالیا تھا۔ وہ سوچنے لگی' اپنا سہاگ چھیننے والے ڈاکو سے انتقام لینے کا یہ موقع تھا۔ امیتا کا خون کھول گیا۔ علی بخش دل کا راز نہ جان لے اس لیے وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔

''علی! جانے سے پہلے بتا دینے میں حرج بھی نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ ''مگر پربھودھن گھر میں ہے۔ اپنے باپو کی ایسی بات وہ سنے یہ ٹھیک نہیں۔ لہٰذا میں اسے باہر بھیج کر پھر بتاتی ہوں۔''

علی بخش خوش ہوگیا...... کام ہو چکا تھا۔ بیٹے کے کان میں کچھ کہہ کر امیتا واپس لوٹی۔

''تم کسی سے کہنا نہیں۔''

''اس کی فکر نہ کریں۔'' یہ کہہ کر علی بخش نے کان لگا دیے۔

''ایک دن پربھودھن کے باپو ایک عورت کو گھر میں لے آئے اور کہا ویرو کو سمجھانے لایا ہوں۔ یہ مان جائے تو ہم جگا کو پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ مگر میں ان کی عادت سے واقف تھی' پھر بھی کچھ نہ بولی۔ میرے اچھے نصیب سے کسی قتل کے کیس میں انہیں باہر جانا پڑا' مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ویرو سے کہا تم سچ بتاؤ تو میں تمہیں فرار ہونے کا موقع دوں گی۔ وہ بیچاری بلک بلک کر رونے لگی' مجھ سے کہنے لگی تمہارے شوہر مجھے گھر میں داشتہ بنانے کے لیے لائے ہیں میں مرجاؤں گی مگر ایسا نہیں ہوسکتا۔ زبردستی کرے گا تو خودکشی کرلوں گی۔ مجھے اس پر رحم آیا اور پربھودھن کے باپ پر غصہ بھی آیا۔ بس خاموشی سے پچھلے دروازے سے اسے فرار کرادیا۔''

غور سے سنتے ہوئے علی بخش نے پرمسرت آواز میں پوچھا۔ ''مگر وہ گئی کہاں؟''

اسی لمحے دروازے میں وزن دار جوتوں کی آواز سنائی دی۔ دونوں کی نظریں اس جانب اٹھیں۔ امیتا طنزیہ لہجے میں ہنسی۔ ''علی! تمہیں اس کا جواب یہ پولیس چیف صاحب دیں گے۔''

علی بخش نے جھٹکا سا محسوس کیا۔ وہ تیزی سے کھڑا ہوگیا۔ دلاور خان کے پیچھے ارجن سنگھ کے بیٹے کو کھڑے دیکھا تو سب سمجھ گیا۔ اسے امیتا بے وقوف بنا گئی تھی۔ دلاور کی تیز نظروں نے علی بخش کو کپکپا دیا۔ ''کیوں تانگے والے کے بچے! ابھی جگا سے دوستی کم نہیں ہوئی۔'' وہ دانت پیس کر بول رہا تھا۔ ''اس کی معشوقہ کی اطلاع حاصل کرنے آیا تھا؟'' علی بخش کے کچھ بولنے سے پہلے اس کے جبڑے پر چیف کا بھاری ہاتھ پڑا۔

''چل تھانے۔''

علی بخش نے رخسار سہلاتے ہوئے دعا کی۔ ''پروردگار! مجھے ہمت دینا اور جگت کو سلامت رکھنا۔''

□......♥......□

سہنا صاحب تانگے میں بیٹھے اور گھر کی جانب آخری بار نظر ڈالی۔ بہار چھوڑ کر یہاں آباد ہوئے کتنے سال بیت گئے تھے۔ آج یہ سب چھوڑ کر جانا تھا۔ آدمی سامان باندھ کر ساتھ لے جاسکتا تھا مگر زمین اور دیوار کس طرح ساتھ لے جاسکتا ہے؟ اسی جگہ ان کی بیوی نے آخری سانس لیا تھا اور انہوں نے بھی اپنی زندگی کا بڑا حصہ یہاں گزارا تھا اور باقی زندگی یہیں گزارنے کی خواہش تھی مگر اس دھرتی سے اب ان کا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ ان کا وطن اب پرایا ہو چکا تھا۔ سہنا صاحب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

سامنے بیٹھی ہوئی سولہ سال کی رانی بیٹی کی

حالت ان سے زیادہ افسوسناک تھی۔ وہ یہاں پیدا ہوئی' اس مٹی میں پل کر جوان ہوئی۔ اس کی آنکھیں بھی پرنم تھیں۔ جیسے وہ میکہ چھوڑ کر سسرال جارہی ہو۔

''تانگہ چلاؤ بھائی۔'' یہ کہتے ہوئے سنہا کا دل ڈوبنے لگا پھر ذہن کو دوسری جانب متوجہ کرنے کے لیے تانگے والے سے پوچھا۔ ''میاں تم نئے معلوم ہوتے ہو' پہلے نہیں دیکھا۔''

''جی ہاں صاحب! تانگہ میرے چاچا کا ہے۔ وہ کچھ دن سے بیمار ہوگئے ہیں اس لیے تانگہ میں چلا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو چابک لگائی۔ سنہا صاحب کو افسوس ہو رہا تھا' وہ جانے سے پہلے علی بخش کو رہا نہ کرا سکے۔ دلاور خان نے انہیں تھانے بلایا تھا۔

''تم اپنے اس علی بخش کو سمجھا دو! ہمیں سچ سچ بتا دے' ورنہ ناحق مارا جائے گا۔''

علی بخش کے چہرے پر ابھرے ہوئے نشانات سے پتہ چلتا تھا کہ کافی مار لگی ہے۔

''علی! جو کچھ تجھے پتہ ہے سچ بتا دے۔ تو جانتا ہے جگا کہاں ہے؟'' علی بخش نے سر جھکا لیا۔ سنہا اس کا مطلب سمجھ گئے۔ علی کبھی ان کے سامنے جھوٹ نہیں بولے گا۔

''بابو جی! آپ کو اور بہن کو اسٹیشن تک چھوڑنے نہیں جا سکا' اس کا مجھے افسوس زندگی بھر رہے گا۔'' وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھے پتہ دے جانا...... خط لکھتا رہوں گا۔''

''مگر تم دوسروں کی خاطر اتنا دکھ کیوں برداشت کرتے ہو؟''

''بابو جی! یہ ایمانداری کی بات ہے۔ اس لیے برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

سنہا نے دیکھا جب وہ جا رہے تھے علی بخش بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ان کا دل رکنے کو چاہا مگر سامان ایک دن پہلے گاڑی میں پہنچ چکا تھا۔ بلوے بڑھتے جا رہے تھے۔ انہیں اپنی فکر نہیں تھی' مگر ساتھ جوان بیٹی تھی۔ صحیح سلامت نکل جانا بہتر تھا۔

''بابو جی! اسٹیشن آ گیا۔'' رانی نے باپ کو خیالات سے بیدار کیا۔ ''آپ پہلے اتر جائیں' میں پیسے دیتی ہوں۔'' تانگے کی کھڑکی کھول کر لکڑی کی گھوڑی زمین پر رکھ کر سنہا نیچے اترنے لگے۔ رانی پرس کھول کر پیسے نکال رہی تھی۔

تانگے والے نے سیٹ پر بیٹھے ہوئے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کی نظریں لڑکی کے سینے پر تھیں۔ دوسری آنکھ سنہا کے لنگڑے پیر کی جانب۔ سنہا نے اپنا دوسرا صحیح پیر زمین پر رکھا ہی تھا کہ اس نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی کی...... ''ارے! مجھے اترنے دو تو۔'' لڑکی نے کہا اور اسی وقت لڑکی کی گردن کے گرد تانگے والے کے ایک ہاتھ کا گھیرا تنگ ہو گیا...... سنہا چونک گئے' گھوڑا آگے نہیں بڑھ رہا تھا اس لیے تانگے والے نے چابک مارا۔

''اے...... اے......'' سنہا کی آواز پھٹ گئی۔ مگر گھومتے ہوئے گھوڑے کو دیر لگی۔ سنہا بیساکھی پر اچھلتے ہوئے تقریباً دوڑنے لگے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ چیخ مارتی جوان بیٹی کا اغوا کرنے والے پر جھپٹ پڑنے کی خواہش ہوئی مگر وہ لاچار تھے۔ پھر بھی انتہائی کوشش کی لیکن تانگے تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ بائیں بغل میں دبائی ہوئی لکڑی کی گھوڑی بڑھائی اور تانگے کے پیچھے والی ہک میں گھوڑی کا پھیلا ہوا حصہ اٹک گیا۔ سنہا نے دونوں ہاتھوں سے گھوڑی تھام کر زور لگایا مگر گھوڑے کی قوت کے سامنے ان کا کتنا زور چلتا؟ تانگے والے نے جنونی

انداز میں گھوڑا دوڑایا۔ سنہا نے مضبوطی سے لکڑی کا گھوڑا تھام رکھا تھا مگر وہ دوڑ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے تانگے کے پیچھے گھسٹنے لگے' دس پندرہ گز گھسٹنے کے بعد ان کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے بیٹی کو اغوا کرنے والے تانگے کو دیکھ کر چلائے۔ ''کوئی تو میری بچی کو بچاؤ......!''

شور مچ گیا۔ لوگ دوڑ کر آ گئے۔ سنہا کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے آدمی سے بولے۔ ''ارے میری فکر نہ کرو......اس بیوقوف کو پکڑو' میری بیٹی......'' مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ تانگے والے کو روکتا۔

ہوٹل کی کھڑکی سے جگت آنے جانے والے تانگوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ علی بخش کی تلاش میں تھا۔ اسی دوران راستے کا منظر اس کی آنکھوں میں آ گیا۔ ''ہوشیار دوڑو......کوئی بدمعاش تانگے والا کسی کی لڑکی کو اغوا کر رہا ہے۔'' پھر وہ طوفان کی طرح کمرے سے باہر جھپٹا۔ بندوق اس کی پشت پر تھی مگر اسے استعمال کرنا مناسب نہیں تھا۔ سامنے تانگا تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ ''کیا کرنا چاہیے؟ تانگے والے کو کس طرح روکا جائے؟ چند لمحے کے لیے اس کا دماغ چکرا گیا۔ اسی لمحے نزدیک سے گزرتے ہوئے مزدور کی ہاتھ گاڑی پر اس کی نظر گئی۔ اس نے دھکا دے کر مزدور کو دور پھینک دیا اور ہاتھ گاڑی قبضے میں کر لی۔ گاڑی دھکیلتا ہوا وہ تانگے کی طرف جھپٹا۔ تیز رفتاری سے دوڑ کر آتے ہوئے گھوڑے کے راستے میں اس نے ہاتھ گاڑی ڈال دی۔ گھوڑا بھڑک گیا۔ تانگے والے نے گندی سی گالی دے کر لگام کھینچی۔

''سالی......کباب میں ہڈی کہاں سے آ گئی؟''

چکنی سڑک پر گھوڑے کے پیر پھسلے۔ گھوڑے کی نعل گھسنے کی وجہ سے چنگاریاں بکھریں اور گھوڑا زمین پر گرا۔ تانگے والا دور جا گرا۔ اندر بیٹھی ہوئی رانی بے ہوشی کی حالت میں آدھی اندر' آدھی باہر بری طرح بل کھاتی ہوئی لٹک رہی تھی۔ جگت دوڑا' لڑکی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اسٹیشن کی جانب لے جانے لگا۔ اسی لمحے جمع ہونے والے لوگوں میں سے ایک غنڈہ چھری لے کر اس کی پشت پر جھپٹا۔ ہوشیار نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھ میں جگت کی لاٹھی تھی۔ جگت کی پشت میں چھری مارنے کے لیے جیسے ہی اس نے ہاتھ بلند کیا' ہوشیار کی لاٹھی اس کے سر پر پڑی۔ جگت چونکا' اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ ہوشیار نے غنڈے کو لٹا دیا تھا۔

''ہوشیار...... جلدی کر معاملہ خراب ہو جائے گا۔ پولیس کا دھیان ادھر ہوا تو پکڑے جائیں گے۔'' وہ جوان لڑکی کا وزن اٹھا کر تیزی سے دوڑ رہا تھا۔

''رانی! میری بیٹی رانی!'' سنہا نے رانی کے جسم کو ہلایا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ جگت نے مشورہ دیا۔

''اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارو' اسے ہوش آ جائے گا۔'' سنہا صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بیٹی کی عزت بچانے والے شخص کو وہ احسان مندانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ''بھائی' تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔'' پھر غور سے دیکھنے لگے آہستہ آہستہ ذہن میں روشنی ہوئی مگر پہل جگت نے کی۔

''کون سنہا صاحب؟''

''جگا......!'' سنہا کے ہونٹ ہلے مگر آواز باہر نہ آ سکی۔ ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ دور سے پولیس کی سیٹی سنائی دی۔ سنہا نے جگت کے شانے پر ہاتھ رکھا' پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولے۔ ''علی بخش گرفتار

ہو گیا ہے۔ جلدی سے فرار ہو جاؤ، بھگوان کے لیے چلے جاؤ۔" ہوشیار نے سن لیا۔ اس نے جگت کا بازو پکڑ لیا۔ لمحے بھر کا معاملہ تھا۔ اسی لمحے آوازیں آنے لگیں۔ "گاڑی آ گئی...... پلیٹ فارم پر گاڑی آ گئی۔" تماشہ دیکھتے ہوئے لوگ دوڑے۔ جگت اور ہوشیار بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ بوگی میں داخل ہونے کے لیے انسان جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ کھڑکی، دروازے، جہاں سے موقع ملا دھکیل کر، ٹکریں مار کر دوسرے کو گرا کر اندر داخل ہونے کی دھکم پیل ہونے لگی۔ کچلتے ہوئے بچے رو رہے تھے اور دبتی ہوئی عورتوں کی چیخوں سے اسٹیشن گونج رہا تھا۔ جو اندر نہ جا سکے وہ چھت پر چڑھ گئے۔ انہیں کسی طرح بھی گاڑی نہیں چھوڑنی تھی۔ کسے پتہ دوسری گاڑی پکڑنے کے لیے وہ زندہ بھی رہیں گے یا نہیں؟ دو گھنٹے کی بے چینی، گھبراہٹ اور دردناک شور آخر انجن کی سیٹی میں دب گیا۔ پٹریوں پر پہیے سرکنے لگے۔ گاڑی پلیٹ فارم سے باہر نکلی۔ اس وقت اندر بھرے ہوئے انسانوں نے آزادی کی سانس لی۔ جگت نے آہ بھری۔ کام نامکمل چھوڑ کر اچانک اسے وطن کو الوداع کہنا پڑا تھا۔ یہ بات اسے کھٹک رہی تھی۔ "کیا ویرو اب کبھی نہیں ملے گی......؟"

"جگت! ہماری رقم اور گن تو ہوٹل میں رہ گئی۔" ہوشیار نے جگت کے کان میں کہا۔ جگت نے پھر سرد آہ بھری۔ "یہاں بہت کچھ رہ گیا ہے دوست، افسوس کرنے سے فائدہ بھی کیا؟"

اسی گاڑی کی دوسری بوگی میں سہنا صاحب اپنی بیٹی سے پوچھ رہے تھے۔ "تمہیں کس نے بچایا یہ خبر ہے؟" رانی آنکھیں پھیلائے متجسس نظروں سے باپ کو دیکھنے لگی۔ اس کے کان میں باپ نے صرف اتنا کہا۔ "جگا ڈاکو۔"

"اچھا......؟" رانی نے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ رہ رہ کر سنہا صاحب کے دل میں یہ سوال جاگ رہا تھا۔ "میں نے جگا کو فرار کرا کر اچھا کیا؟" دل جواب دے رہا تھا۔ "احسان کا بدلہ اسی طرح دیا جاتا ہے۔" مگر ذہن نے کہا جب تک پنشن کھا رہے ہو تم حکومت کے وفادار ہو گے۔ نمک حرامی نہیں کر سکتے۔ آخر انہوں نے ذہن اور دل میں یہ کہہ کر مصالحت کرا دی۔ "ابھی کہاں فرار ہوا ہے؟ امرتسر آنے پر دیکھیں گے۔"

❐......♥......❐

مہاجروں کو لے کر شیخوپورہ سے چلی ہوئی ٹرین لاہور تک سلامت پہنچ گئی۔ بوگیوں میں انسان اس طرح بھرے ہوئے تھے جیسے جانور ہوں۔ بچوں کے رونے کی آوازیں، بیماروں کی آہیں، گونج رہی تھیں۔ جن بہنوں نے اپنے رشتے دار کھوئے تھے ان کے رونے کی آوازوں سے عجیب سا ماحول ہو گیا تھا۔ ہر ایک کے چہرے پر لاچاری نظر آ رہی تھی اور آنکھوں میں بے چارگی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ سانسوں کی بدبو سے پوری بوگی کی ہوا پراگندہ تھی اور آہوں سے عجیب سماں بندھ رہا تھا۔ وہ سب جیسے کسی جہنم سے فرار ہوئے تھے۔ ان کے چہرے جھلسے ہوئے تھے پھر بھی انہیں یقین نہیں تھا کہ ہندوستان کی دھرتی پر قدم رکھنا نصیب ہو گا یا نہیں؟

تین چار گھنٹے کے اس سفر میں جگت خاموش بیٹھا رہا۔ صاحب کی موجودگی نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ ہوشیار کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا مگر اب اسے عجیب سے خیالات ستانے لگے۔ علی بخش کی گرفتاری کی فکر، ویرو کی ادھوری تلاش کا افسوس، اس حالت میں سفر کرنے کی ناراضگی اور امرتسر پہنچنے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعد پولیس کے پنجے میں پھنس جانے کی بے چینی الگ تھی۔ ان سب خیالات کو ذہن سے نکالنے کے لیے وہ بار بار گردن کو جھٹکے دینے لگا مگر برابر بیٹھے ہوئے ہوشیار سے سر ٹکرانے کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو جگت؟'' ہوشیار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔''بار بار گردن ہلاؤ گے تو جھٹکا آ جائے گا۔''

''ہوشیار! ہمارے لیے یہ سفر اچھا نہیں رہے گا۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔''میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

''یار اس وقت انسانیت بے چین ہے۔ خدا نے خیر کی ہم نکل آئے۔''

برابر والے سردار جی نے ہوشیار کے منہ سے خدا کا لفظ سن کر آنکھیں نکالیں جیسے اسے بھگوان کے نام سے نفرت ہوگئی ہو۔ ہوشیار نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ہنس کر کہا۔

''ست سری اکال سردار جی۔'' جگت نے پھیکی ہنسی کے ساتھ آہ بھری۔ دیس کی تقسیم نے بھگوان کو تقسیم کر دیا تھا۔

گاڑی آہستہ ہوئی اور آوازیں آنے لگیں۔

''لاہور آ گیا...... لاہور آ گیا۔'' مسافر ہوشیار ہوگئے پھر اچانک ہی یہ شور خاموشی میں بدل گیا...... سناٹا چھا گیا' بوگی کی کھڑکیاں بند ہونے لگیں۔ مردوں کے ہاتھ ہتھیاروں پر جم گئے۔ عورتیں دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی تھیں۔ بچے ماؤں کی گودوں میں دبک گئے۔ لاہور کا اسٹیشن سب سے زیادہ خطرے کی جگہ تھی۔ آگے گئی ہوئی ایک گاڑی میں سے مسافروں کو باہر کھینچ کر بری طرح مارا گیا تھا۔ اس قتل عام کی وجہ سے خون کے دھبے اب بھی اسٹیشن پر نظر آ رہے تھے اور اب دوسری گاڑی آ کر جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ جگت کھڑا ہوگیا۔ وہ بھیڑ میں سے راستہ کر کے دروازے کے قریب پہنچا۔ اسی لمحے کسی نے تنقید کی۔''سردار جی دروازہ کھولنے میں جلدی نہ کرنا۔ بدمعاش وار کرنے کے لیے تاک میں ہوں گے۔''

''فکر نہ کیجیے۔ اس بوگی کے کسی مسافر کا بال بیکا نہیں ہوگا۔'' اب تک کسی نے غور سے جگت کی جانب نہیں دیکھا تھا مگر اب اس کی موجودگی سب کو غنیمت نظر آنے لگی۔ جگت نے آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

''اے...... دروازہ بند کرو......'' پلیٹ فارم سے ایک تحکمانہ آواز گونجی۔''اگر کوئی بھی باہر نکلا تو اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔'' ایک نظر ڈال کر جگت نے دروازہ بند کر دیا۔

''باہر ملٹری کھڑی ہے۔ پورا پلیٹ فارم گھرا ہوا ہے۔''

''اچھا ہوا......'' ایک بوڑھے نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔''اب بدمعاش ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

گھنٹہ...... دو گھنٹے اور پھر چار گھنٹے بیت گئے۔ نصف شب ہوگئی مگر گاڑی چلنے کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ انجن بھی الگ کر دیا گیا تھا۔ مسافر اب بے چین ہونے لگے۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ چھت پر بیٹھے ہوئے لوگ نیچے آ کر زبردستی بوگیوں میں گھس رہے تھے۔ فوج کے افسران کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''آگے لائن خراب ہوگئی ہے۔ ٹھیک ہونے کے بعد گاڑی چلے گی۔ اس وقت تک سب لوگ اندر رہیں۔'' مسافروں کے دل پھر دھڑکنے لگے۔

''کیا قدرت بھی ہم سے روٹھ گئی؟ ایسے وقت میں لائن خراب ہوگئی؟'' وہ سوچ رہے تھے مگر ان بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ امرتسر سے جب تک مہاجروں کی گاڑی نہیں چھوٹتی اس وقت تک لاہور سے ان کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ گاڑی کے مقابلے میں گاڑی کا تبادلہ ہوتا تھا۔ رات سب نے جھونکے کھا کر گزاری۔ مگر صبح بھوک اور پیاس کی وجہ سے شور ہونے لگا۔ بہت تھوڑے لوگ کھانا ساتھ لائے تھے جہاں جان بچانے کی دوڑ ہو رہی ہو وہاں کھانا پینا کسے سوجھتا ہے؟ بھوکے لوگ ان کے سامنے اپنا سا منہ لیے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ جگت سے یہ برداشت نہیں ہوا۔

''نہیں اس طرح نہیں چلے گا۔'' وہ گرجا۔ ''ایسی مصیبت میں سکھ دکھ بانٹنا چاہیے۔''

''مگر آدمی بہت سارے ہیں اور کھانا بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔'' کسی نے کہا۔ ''اس میں سے تقسیم کریں تو ایک کے حصے میں ایک نوالہ بھی نہیں آئے گا۔''

جگت اس کی بدمعاشی سمجھ گیا۔ جینے کی تڑپ انسان کو کیسا مطلبی بنا دیتی ہے۔ اس نے درمیان کی راہ نکالی۔ ''ایسا کرو جو کچھ ہے عورتوں، بچوں اور بیماروں میں تقسیم کردو، ہم مرد بھوکے رہیں گے۔'' یہ ترکیب سب کو پسند آئی۔ ایک دو مرد تو فوراً بیماری کی اداکاری کرنے لگے۔

جوں توں کر کے دوپہر ہوئی۔ جگت کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ''ہوشیار! ہم اس تکلیف سے بہتر ہے باہر نکل جائیں۔ کسے خبر گاڑی کب روانہ ہوگی؟'' ہوشیار نے کسی قسم کے جوش کا اظہار نہیں کیا۔ اسے ڈر تھا کہ جگت ابھی پاکستان چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہے۔ اب نئی مصیبت کہاں مول لیں؟ پولیس کے پنجے میں پھنسے تو زندگی یہیں ختم ہوجائے گی۔ اس نے اپنے اختلاف کا دوسری طرح اظہار کیا۔

''جگت یہاں سے کسی کو باہر نکلنے نہیں دیا جاتا۔ ملٹری کے مقابلے میں ہمارا زور نہیں چلے گا۔ اور کسی نے پہچان لیا تو مصیبت آجائے گی۔'' جگت خاموش رہا۔ اس کا ذہن باہر نکلنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد بوگی کی کھڑکی کھول کر اس نے سر باہر نکالا۔

''اے بھائی...... یہ گاڑی کب چلے گی؟''

''تم کون ہو پوچھنے والے؟'' ایک فوجی افسر نے اس کو جھڑک دیا۔ ''یہاں سے تمہارا جلدی چھٹکارا نہیں ہوگا۔ اب اگر باہر سر نکالا تو پھونک دوں گا۔'' جگت کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے سوچا گن چلا کر اسے یہیں لٹا دے مگر ضبط کر گیا۔

پھر جگت نے کھڑکی بند کرلی۔ وہ بڑبڑایا۔ ''بری طرح پھنس گئے، کسے پتہ کب تک اسی طرح پڑا رہنا پڑے گا؟ اتنی دیر میں بیمار بوڑھے کی حالت بگڑنے لگی۔ اس کا کوئی رشتے دار بھی ساتھ نہیں تھا۔ کسے خبر کتنے دنوں سے بیمار ہوگا؟ جگت اس کے قریب گیا۔ دیکھا تو جسم جھلس رہا تھا۔ پیٹ سے گھٹنے اڑا کر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں کون اس کا علاج کرتا؟ پندرہ بیس منٹ میں بوڑھے نے آنکھیں بند کرلیں۔

''بے چارہ نصف راستے میں مرا۔'' کسی نے افسوس کا اظہار کیا۔

''اب مردے کا کیا کرنا ہے؟'' ایک شخص نے ناک پر کپڑا لگالیا۔ ''مردے کے ساتھ سفر کس طرح کیا جائے؟ بوڑھے نے سب کو مصیبت میں ڈال دیا۔''

''کھڑکی کھول کر اس کی لاش باہر پھینک دو۔ ملٹری والے خود نمٹ لیں گے۔'' سب کو بوڑھے

کی موت پر افسوس کرنے کی بجائے اس کی لاش ٹھکانے لگانے کی زیادہ فکر تھی۔

"تم جلد بازی نہ کرو، میں راہ نکالتا ہوں۔" جگت نے اتنی دیر میں سوچ لیا۔ اس نے ہوشیار کو آنکھ ماری۔ "ہم دونوں لاش کو باہر پھینک آئیں گے۔"

"ارے بھائی! تمہارے جیسا کوئی نہیں۔" اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کئی آدمی بولے اور ایک شخص نے ان کا ساتھ دیا۔ "زندہ لوگوں پر رحم نہ کھائیں تو کچھ نہیں، مردے پر رحم کریں۔ ان سے اتنا تو کہو۔"

جگت نے آدھی کھڑکی کھولی۔ بہت ہوشیاری سے کام کرنا تھا۔ فوجی لباس میں رائفل بردار سپاہی اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے۔ کچھ دیر تک جگت چپ چاپ ان کے چہرے دیکھتا رہا جیسے ہی ایک سکھ سپاہی نظر آیا اس نے پوری کھڑکی کھول دی۔ "ارے سردار جی سنیے۔" سکھ سپاہی قریب آیا' جگت نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرے چچا نے آدھے سفر میں دم توڑ دیا ہے۔ دوسرے مسافر کہہ رہے ہیں کہ لاش بوگی سے باہر نکالو۔" پھر اندر اشارہ کرکے بولا۔ "بیچارے کا علاج بھی ہم نہ کر سکے۔" سکھ سپاہی کے دل میں ہمدردی جاگی۔

"ارے ابھی گاڑی رات بھر یہیں رہے گی۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ مہربانی کریں گے تو ہم لاش کو باہر نکال کر اسے اشنان کرادیں؟" سپاہی سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے رسٹ واچ میں دیکھا۔

"نصف گھنٹے میں کرفیو لگ جائے گا۔" اس نے جگت کی رونی صورت کی جانب دیکھا' پھر بولا۔ "ٹھہرو، میں اپنے افسر سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے چلا گیا۔ جگت نے کھڑکی آدھی بند کر رکھی تھی۔

"تم لوگ میری بات کی تائید کرنا۔" اس نے مسافروں کو سمجھا دیا۔ "میں اور میرا دوست اس کی لاش کو باہر لے جاکر جلادیں گے۔ یہ بوڑھا میرا چچا ہے، میں نے ان سے یہی کہا ہے۔"

وہ سپاہی پانچ منٹ میں واپس لوٹا' اس کے ساتھ ایک بڑا افسر تھا۔ اسے دیکھ کر جگت کو امید بندھی۔ جگت بمشکل اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ وہ سپاہی گورے افسر کو انگریزی میں کچھ بتا رہا تھا۔ درمیان میں جگت نے ایک دو سسکیاں بھی بھرلیں۔

"دروازہ کھولو۔" سپاہی نے جلدی سے کہا۔ "صاحب اندر آکر دیکھنا چاہتے ہیں۔" جگت نے ہوشیار کو اشارہ کیا' تیار رہنا' اب امتحان کی گھڑی ہے۔ گورے صاحب نے اندر آکر دیکھا۔ بدبودار لاش کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر اسے رحم آ گیا۔

"اسے یہاں سے فوراً نکالو۔" سکھ سپاہی نے سفارش کی۔

"صاحب! یہ شخص مرنے والے کا بھتیجا ہے۔ ہمارے رواج کے مطابق آگ مرنے والے کے رشتے دار کو دینی پڑتی ہے۔ آپ اسے اجازت دیں تو مرنے والے کی روح کو شانتی ہوگی۔" جگت ہاتھ جوڑے اترے ہوئے چہرے سے صاحب کے سامنے عاجزی دکھا رہا تھا۔ صاحب نے رسٹ واچ میں دیکھا۔

"اجازت دیتا ہوں مگر پندرہ منٹ میں انہیں واپس لوٹنا پڑے گا۔ کرفیو کا ٹائم ہونے والا ہے۔" پھر وہ جگت کے شانے پر دلاسے کے لیے ہاتھ رکھ کر بولا۔ "لاش کو جیپ میں رکھ کر کچھ دور لے جاؤ اور پٹرول سے جلادو۔ میں جیپ کا انتظام کردیتا ہوں۔" سکھ سپاہی نے صاحب کا حکم پنجابی میں ترجمہ

کر کے جگت کو بتا دیا۔
مسرت کو دل میں دبا کر جگت کام میں لگ گیا۔ اس نے لاش اٹھانے کے لیے ہوشیار کی مدد مانگی۔ گورا صاحب نیچے اتر گیا تو وہ سکھ سپاہی کے سامنے گڑگڑایا۔ ''سردار جی میں اس گاؤں والے کو ساتھ لے جاؤں؟'' سپاہی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ پھر بوڑھے کی لاش کو کپڑے میں لپیٹ کر اگلا سرا اس نے تھاما اور دوسرا سرا ہوشیار نے تھام لیا۔ پلیٹ فارم پر سے گزرتے ہوئے وہ پہچانا نہ جائے اس لیے جگت نے سوگ کے اظہار میں گردن جھکا لی تھی۔ بندوق اس نے اپنے لباس میں چھپائی ہوئی تھی۔ ہوشیار اونچی سانس سے پیچھے گھسیٹ رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جگت کس طرح فرار ہونا چاہتا ہے؟ ذرا سی غلطی ہوگئی تو دونوں کو بھاری پڑ جائے گی۔ اس فکر میں وہ اداس ہوگیا تھا۔ جیپ کی پچھلی نشست میں لاش کو لٹا دیا گیا تو جیپ چلانے والے سپاہی نے منہ بگاڑ لیا۔

''یہاں ہزاروں مر رہے ہیں اور ایک مردے کی اتنی حفاظت کرنے کی گورے صاحب پر دھن سوار ہوگئی۔'' جیپ اسٹارٹ کر کے اس نے برابر بیٹھے ہوئے جگت کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔ ''ہماری جیپ ناپاک کر دی۔ اب اسے دھونا پڑے گا۔''

راستہ سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر رہ جانے والے چند لوگ بھی کرفیو لگنے سے پہلے گھر جانے کے لیے دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ جگت کے چہرے پر فکر کے آثار تھے۔ آہستہ آہستہ اس کی رگیں ابھرنے لگیں۔ جیپ چلانے والے کے شانے پر لٹکتی ہوئی بندوق پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔

''چلو..... مردے کو یہیں جلا دو۔'' ایک آدھ میل کے فاصلے پر جا کر جیپ روکتے ہوئے ڈرائیور نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ جگت نے آس پاس نظر گھمائی۔

''بھائی صاحب! ذرا اس طرف لے جائیں۔ اس جھاڑی کے پیچھے مردے کو جلا دیں گے۔''

منہ بنا کر اس نے جیپ چلا دی' جگت کو اس وقت خیال نہیں تھا کہ سپاہی کے ذہن میں بھی کوئی سازش جنم لے رہی تھی۔ ان دو سکھوں کو گولی سے اڑا دینے کا لالچ اس کے ذہن پر سوار ہوگیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جیپ کو تنہائی میں لے جانے کو تیار ہوگیا تھا۔ مزید نصف میل کا فاصلہ طے کر کے جھاڑی کے عقب میں جیپ کھڑی ہوگئی۔

''چلو..... جلدی کرو! جلدی واپس لوٹنا ہے۔''

جگت اور ہوشیار بوڑھے کی لاش اٹھا کر کچھ دور گئے' جگت نے ہوشیار کو آہستگی سے سمجھا دیا۔

''تم ہوشیار رہنا۔ اب پانچ منٹ میں ہم اسے بے وقوف بنا کر جیپ پر قبضہ کر لیں گے۔'' جگت جیپ کے پاس جا کر پٹرول کا ڈبا لے آیا۔ ڈرائیور نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اس مردے کے لیے زیادہ پٹرول خراب نہ کرنا۔'' جگت خاموشی سے کام کر رہا تھا۔ اس سپاہی نے شانے سے رائفل اتار دی۔ جگت لاش پر پٹرول چھڑک رہا تھا تو اس نے رائفل کی شست باندھی۔ جگت کن انکھیوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اب اسے جلد سے جلد سب کچھ کرنا تھا۔

''ارے..... ارے..... یہ مردہ تو ہلتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ہاتھ میں تھامے ہوئے ڈبے کے ساتھ گھبرائے ہوئے انداز میں جیپ کی جانب کھسکنے لگا۔ سپاہی چونک گیا۔ رائفل اس نے اس طرح گھمائی جیسے اس سے کھیل رہا ہو پھر وہ جگت کو دھمکانے لگا۔

"کیا بکواس کرتا ہے؟" مگر اپنے تجسس کو روک نہیں سکا۔ "چل! میں اسے جلاتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا وہ جیب سے ماچس نکال کر جیپ سے نیچے اتر گیا۔ جگت خوفزدگی کی اداکاری کرتا ہوا اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اس نے آنکھ مار کر ہوشیار کو اشارہ کر دیا۔ سپاہی آنکھیں پھیلا کر مردے کو دیکھنے لگا۔ "ارے تم لوگ ڈرپوک ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دیا سلائی جلائی۔ وہ مردے کو آگ لگانے جیسے ہی جھکا جگت نے پوری قوت سے اس کے سر پر پٹرول کا ڈبا مارا۔ اس کے ہاتھ سے دیا سلائی نکل گئی۔ ایک طرف شعلہ بھڑکا اور دوسری جانب سپاہی تین چار فٹ دور گرا۔ اس کی رائفل بھی شانے سے نکل کر دور جا گری جو ہوشیار نے جلدی سے اٹھالی۔ سپاہی بل کھا کر بیٹھنا چاہتا تھا مگر ہوشیار نے رائفل سے نشانہ باندھا۔

"نہیں ...... گولی نہ چلانا۔" جگت نے اس کا بازو تھام کر کھینچا۔ "ہمیں جلدی فرار ہونا ہے۔" ہوشیار نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ جگت برابر میں بیٹھ گیا۔ جیپ کا انجن شور مچانے لگا۔ اس سے پیشتر کہ وہ سپاہی کھڑا ہو کر قریب آئے، جیپ سرسراتی ہوئی دوڑنے لگی، عقب سے وہ چیخ رہا تھا۔

"پکڑو...... روکو...... بدمعاشوں کو روکو......!"

جگت گن تھام کر عقب میں دیکھ رہا تھا۔ راستہ صاف تھا البتہ کہیں کہیں پولیس کے سپاہی نظر آرہے تھے جو فرار ہوتی جیپ کو حیرت سے دیکھنے لگتے۔ تین میل تو بغیر کسی رکاوٹ کے طے ہو گئے۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کے گھیرے میں سورج چھپ گیا تھا۔ ہوشیار نے جیپ کے ہیڈ لیمپ روشن کر دیئے۔

"ہمیں کون سا راستہ پکڑنا ہے؟"

"نہر والا۔" جگت نے ذہن میں پلان ترتیب دے لیا تھا۔ "پل پار کرنے کے بعد خطرہ نہیں۔ کیونکہ آگے جنگل آجاتا ہے۔" ہوشیار جوش میں آگیا۔ رفتار کی سوئی چالیس، پچاس کے ہندسے کے درمیان تھرک رہی تھی۔ مزید دو میل طے کرنے کے بعد مخالف سمت سے ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ جگت ہوشیار ہو گیا۔ "شاید ملٹری کی جیپ ہے ہوشیار! تم ہیڈ لیمپ جلائے رکھنا۔ چاہے ان کی آنکھیں چندھیا جائیں۔"

مخالف سمت سے آنے والی جیپ کی رفتار کم ہونے لگی۔ جگت نے گن تیار رکھی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ بغیر کسی ہنگامے کے خاموشی سے فرار ہو جائیں۔ دونوں جیپیں قریب آگئیں۔ مخالف جیپ سے کسی نے ہاتھ بلند کیا مگر ہوشیار نے نہ ہی جیپ کی رفتار کم کی نہ ہی روشنی بجھائی۔ ان کی جیپ سرسراتی ہوئی آگے نکل گئی۔ جگت نے عقب میں دیکھا، ملٹری جیپ کھڑی ہو گئی تھی۔

"انہیں شک ہو گیا ہے۔ ہمارے سادے لباس میں ملٹری جیپ کو بھگاتے دیکھ کر وہ سوچ رہے ہوں گے ہوشیار اور تیز رفتاری سے چلو۔"

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ جگت نے کچھ دیر بعد پھر عقب میں دیکھا، روشنی کی دو لکیریں نظر آئیں۔ "وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ تم آگے نظر رکھو! پیچھے میں سنبھال لوں گا۔"

نہر قریب آرہی تھی اور ساتھ دوسری جیپ سے ان کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ موڑوں پر بھی ہوشیار نے رفتار کم نہیں کی تھی۔ جگت نے عقب میں دیکھا جیپ نظر نہیں آرہی تھی۔ پھر بھی اس کی آواز آرہی تھی۔ موڑ کی وجہ سے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ جگت کچھ بولے، ہوشیار چیخا۔ "مارے گئے۔" اور دل کو چیرنے والی آواز کے

ساتھ بریک کی چیخ سنائی دی۔ جگت بمشکل سنبھل سکا۔ جیپ کی روشنی کچھ دور تک گھسٹتی ہوئی ٹھیک پل کے قریب رک گئی۔

''کیا ہوا؟'' جگت غصے میں چیخا۔

''سامنے دیکھو......'' ہوشیار ہانپتا ہوا بولا۔ ''پل آگے ٹوٹا ہوا ہے۔'' جگت نیچے کودا آگے جاکر دیکھا تو پل درمیان سے دو ٹکڑے ہوگیا تھا۔ اگر ہوشیار دو سکینڈ بھی غفلت میں رہتا تو اس صورت میں وہ جیپ سمیت نہر میں ڈوب جاتے۔

''ہوشیار! تم نے عین موقع پر بچالیا۔''

''مگر اب کیا کرنا چاہیے؟'' ہوشیار کو عقب سے آنے والی جیپ کی فکر تھی۔

''ایک کام کر...... جیپ کو اسٹارٹ کرکے نہر میں دھکیل دے۔ جلدی۔'' جگت نے کہا۔ ہوشیار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر ہر لمحہ قیمتی تھا جسے ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہوشیار نے انجن اسٹارٹ کیا' پھر جیسے ہی جیپ حرکت میں آئی وہ جیپ سے کود گیا۔ ''نہر میں کود جاؤ۔'' جگت نے کہا۔ پلک جھپکتے ہی سب کچھ ہوگیا۔ ایک طرف خالی جیپ پل کے درمیان سے اچھل کر نہر میں گری اور دوسری جانب جگت اور ہوشیار نے نہر میں چھلانگیں لگادیں۔ ایک دھما کہ ہوا' پرسکون پانی دائرے بنانے لگا۔ درخت پر بیٹھے ہوئے پنچھی اپنی اپنی آواز میں چیخنے لگے۔

''ہوشیار! چپ چاپ اس پار پہنچ جانا ہے۔ فوجی جیپ کی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

جیپ پل کے پاس آکر رک گئی۔ دو افسر پستول ہاتھوں میں تھامے نیچے اتر آئے۔ وہ اس جگہ تک پہنچے جہاں سے پل ٹوٹا ہوا تھا۔ ایک کی آواز سنائی دی۔ ''بے وقوف آنکھیں بند کرکے بھاگ رہے تھے۔ جیپ کے ساتھ پانی میں غرق ہوگئے۔''

''مگر وہ تھے کون؟ کیوں بھاگ رہے تھے؟'' دوسرے نے پوچھا۔ نہر کے پانی میں دائرے اب بھی پھیل رہے تھے۔ ان میں سے ایک ان دائروں پر نظر جما کر بولا۔

''ان کی لاشیں تلاش کرنا چاہئیں۔ آؤ جیپ کی روشنی میں انہیں تلاش کریں۔'' ایک افسر پھر جیپ میں بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کرکے جیپ پل پر لے آیا' ہیڈ لیمپس کی روشنی اندھیرے کا سینہ چیرنے لگی۔ اس کے اجالے میں دوسرا پانی کے اوپر انہیں تلاش کرنے لگا۔ مگر کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ''سالے ......تہہ میں ڈوب گئے شاید۔''

انہوں نے جیپ کو آگے پیچھے کرکے پل کے دونوں جانب روشنی دوڑائی مگر کچھ نظر نہیں آیا تو ایک بور ہوکر بولا۔ ''چھاؤنی میں جاکر خبر کرتے ہیں۔ فائر بریگیڈ والے خود تلاش کرلیں گے۔''

جب وہ جیپ کو پل سے ریورس کررہے تھے' اسی لمحے ان میں سے ایک نے دوسرے کنارے پر کچھ حرکت دیکھی۔ اس نے اپنے ساتھی کا شانہ دبایا۔ ''دوسرے کنارے پر کوئی ہے۔'' اسی لمحے ہوشیار اور جگت نہر کی دیوار چڑھ کر دوسری جانب کود رہے تھے۔ سنسناتی ہوئی گولی ہوشیار کے سر کی جانب لپکی۔ جگت نے اس کا ہاتھ کھینچ کر نشانہ خطا کردیا۔ دوسرے فائر سے پہلے دونوں آڑ میں ہوگئے۔ جگت نے گن چلائی اور گولی سنسناتی ہوئی لپکی اور جیپ کے ایک ہیڈ لیمپ پر لگی۔ دونوں افسر جیپ کی آڑ سے پستول چلارہے تھے۔

''ہوشیار! تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ تمہارے کچھ دور جانے کے بعد میں بھی تم سے آملوں گا۔ اس وقت تم بندوق سے فائرنگ کروگے۔''

اسی طرح دونوں باری باری پیچھے ہٹتے گئے اور

فائرنگ کا جواب دیتے رہے۔ پل ٹوٹا ہوا تھا اس لیے دوسرے کنارے والے اس طرف نہیں آسکتے تھے۔ کچھ دیر تک گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اس دوران بارش ہونے لگی۔ پھر جگت اور ہوشیار کو کارتوس ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں نے گھرے اندھیرے اور بارش کا فائدہ اٹھا کر دوڑ لگائی۔ سر پر برستے پانی اور پیٹ میں بھڑکتی ہوئی بھوک کی آگ کی پروا کیے بغیر دونوں دوڑتے رہے انہیں بہر حال رات ہی میں سرحد پار کرنا تھی۔ کبھی کبھی کیچڑ میں گھٹنوں تک پیر دھنس جاتے تھے پھر بھی ان کے ارادے مضبوط تھے۔ اب وہ دھان کے کھیتوں میں دوڑ رہے تھے۔ نصف شب تک انہوں نے آدھا راستہ طے کرلیا۔ انہوں نے درمیان میں کچھ دیر آرام بھی کرلیا۔

''ہوشیار! اب جلوانا کی سرحد پانچ سات میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوگی۔'' جگت نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''ہمیں صبح ہونے سے پہلے سرحد پار کر جانا ہے۔'' ہوشیار اس قدر ہانپ رہا تھا کہ اس نے صرف گردن ہلا کر ''ہاں'' کہا۔ اسے یہ سفر سخت دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ ایک بار وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''یہ تکلیف اٹھانے سے بہتر تھا کہ ٹرین میں آرام سے بیٹھ کر امرتسر پہنچ جاتے۔''

تب جگت بولا۔ ''اس تکلیف سے وہ خطرہ بڑا تھا کہ امرتسر اسٹیشن پر کوئی ہمارا شناسا ہمیں دیکھ لیتا۔ اس صورت میں ہمارا ہتھکڑی سے ہی استقبال ہوتا، سمجھے؟'' تاروں کی روشنی میں راستہ طے کرنے کا جگت کو خاصا تجربہ تھا۔ صبح ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے اس وقت ایک سرحدی چوکیدار ان سے آٹکرایا۔

''اے...... کون ہے؟'' آواز سن کر دونوں گھبرا گئے۔

بغاوت کا پہلا بیج

سولہ برس کی عمر میں نیلسن منڈیلا نے ایک بڑی تقریب میں ایک قبائلی سردار کی تقریر سنی جسے کبھی فراموش نہ کیا جاسکا۔ سردار کا کہنا تھا۔ ''ہم ژہوسا اور سارے جنوبی افریقی ایک مفتوح قوم ہیں، اپنے ہی ملک میں غلام اور اپنی ہی زمین پر مزارعے ہمارے پاس کوئی قوت، کوئی طاقت نہیں، اپنی جنم بھومی میں ہمیں اپنی قسمت پر کوئی اختیار نہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں ایسے سردار ہیں جو کبھی حکومت نہیں کریں گے، ایسے سپاہی ہیں جو کبھی نہیں لڑیں گے، ایسے عالم فاضل ہیں جو کبھی تعلیم نہیں دیں گے۔ ان نوجوانوں کی فطری صلاحیتیں اس لیے رائیگاں جاتی ہیں کہ ہم انہیں سب سے بڑا تحفہ نہیں دیتے اور وہ ہے آزادی اور حریت کا۔'' قبائلی سردار ایک بیج بو رہا تھا، جس نے ایک عرصہ بعد نیلسن کے ذہن میں کونپل نکالی پھر پودے کی صورت اختیار کی اور ایک مضبوط درخت بنا۔

انتخاب: محمد حسان ندیم...... نارتھ کراچی

''ہوشیار، اپنی رائفل پیچھے چھپادو۔'' جگت نے معاملہ سنبھالنا شروع کردیا۔ گھڑ سوار چوکیدار نے قریب آکر ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ ہوشیار نے بندوق درخت کے پیچھے چھپادی۔ ٹارچ کی روشنی میں دونوں کے چہرے دیکھ کر چوکیدار گرجا۔

''تم مفرور معلوم ہوتے ہو۔ چپ چاپ سرحد پار کرنی ہے کیا؟'' پھر بندوق ہاتھ میں تھام کر بولا۔ ''اس طرح آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔ تمہارے پاس کتنا مال ہے؟''

جگت نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈالا۔ ''ہم تو سب کچھ چھوڑ آئے ہیں۔ گاڑی چھوٹ چکی تھی اس لیے یہ راستہ اختیار کیا۔'' پھر پانچ کا نوٹ باہر نکال کر بولا۔ ''لو یہ کل رقم ہے۔'' جگت کے بڑھے

ہوئے ہاتھ پر وہ بندوق کی نال مارتا ہوا بولا۔

''جاجا...... یہ نوٹ جیب میں رکھ لے۔ فی کس سو روپے لوں گا۔ ورنہ......'' باقی دھمکی اس نے بندوق کی نال سے سمجھادی۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹرائیگر پر انگلی رکھے' جگت نے جست لگائی اور دونوں ہاتھوں سے بندوق کی نال تھام لی۔ چوکیدار گھوڑے کی پیٹھ پر تھوڑا گھوما اور ٹرائیگر دبادیا۔ دھماکہ ہوا' جگت کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ وہ دور جا گرا۔ مگر گولی زمین میں دھنس گئی۔ ہوشیار نے اتنے وقفے میں بندوق پر قبضہ کرلیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بندوق کی نال تھام کر چوکیدار کے سر پر ضرب لگائی وار سخت تھا وہ گھوڑے سے نیچے گرا۔ اس کے ہاتھ سے بندوق نکل گئی۔ جگت کود کر چوکیدار کی پشت پر سوار ہوگیا۔

''بے وقوف! تمہیں روپے چاہئیں تو لو۔'' یہ کہتے ہوئے جگت اس کی مرمت کرنے لگا۔ چوکیدار بے چارہ زیادہ دیر تک مار برداشت نہ کرسکا اور بے ہوش ہوکر گر گیا۔ اس کے گرتے ہوئے کسی قسم کی آواز سنائی دی۔ اس کی پشت پر روپے کی پوٹلی تھی جگت نے وہ پوٹلی کھول لی۔

''چلو...... خرچ کے لیے رقم بھی مل گئی۔'' اس کی بندوق اٹھا کر دونوں گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ دوڑ دوڑ کر پیر تھک گئے تھے۔ اب سفر اچھا کٹے گا وہ سوچنے لگے۔

جب انہوں نے سرحد پار کی تو پو پھٹنے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ جگت مسرت بھرے لہجے میں چیخا۔ ''دوست' ہمارا ملک آ گیا۔''

ہوشیار نے بھی اطمینان کی گہری سانس لی۔ ''جگت! آخر ہم پہنچ گئے۔''

ہندوستان کی دھرتی پر قدم رکھتے ہوئے انہیں عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔ جگت نے گردن گھما کر یک بارگی عقب میں دیکھا' دونوں سرحد کے اس پار کیا کچھ نہیں چھوڑ آئے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس زمین پر ان کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟ طلوع ہوتی ہوئی صبح کی روپہلی روشنی میں دونوں فیروز پور اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی کی روانگی میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ جگت نے جیب سے پیسے نکال کر بکنگ آفس پر رکھے۔ ''دو ٹکٹ امرتسر۔''

ٹکٹ کلرک اس اجنبی شخص کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

□......♥......□

فیروز پور سے چلی ہوئی ٹرین اب گھنٹے بھر بعد امرتسر پہنچنے والی تھی۔ اسٹیشن پر اتر کر جگت اور ہوشیار کھانے میں مصروف ہوگئے۔ دو دن کی بھوک مٹانے کے لیے پیٹ کی بھٹی میں کچھ ڈالنا ضروری تھا۔ اب یہاں انہیں پکڑے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ اسٹیشن پر کسی پولیس مین کو دیکھ کر دونوں عادت کی وجہ سے ہوشیار ہوجاتے تھے پھر انہیں یاد آتا کہ اپنے جرائم وہ دوسرے ملک کی دھرتی پر چھوڑ آئے ہیں اس لیے بے پروا ہو کر ٹہلنے لگتے تھے۔ اتنے سالوں بعد دونوں کو اس طرح عام جگہوں پر گھومنے کا موقع ملا تھا۔

دوپہر کے وقت گاڑی چلی۔ کرپان اور تلوار والے چار پانچ سکھ ست سری اکال کا نعرہ لگاتے ہوئے بوگی میں چڑھ آئے۔ گاڑی کی روانگی تک وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے مگر روانگی کے بعد زور سے بولے۔

''لاہور سے پوری گاڑی کٹ کر آئی ہے۔ امرتسر کے اسٹیشن پر ہمارے لوگوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ ماں بہنوں کو ننگا کر کے غنڈوں نے زخم لگائے ہیں۔ سینے' پیٹ اور رانوں پر بے رحموں نے چاقو

چلائے ہیں۔'' سننے والے دم سادھے سب کچھ سن رہے تھے۔ ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ بولنے والے کی زبان سے جنون ٹپک رہا تھا۔ ''ہم لوگ اس کا بدلہ لیں گے۔ ہم لاہور جانے والی پوری گاڑی کاٹیں گے۔'' جگت نے ہوشیار کی جانب دیکھا۔

''یہاں بھی آگ بھڑک گئی ہے۔''

ہوشیار کچھ اور سوچ رہا تھا۔ لاہور سے آنے والی اپنی گاڑی کٹی ہوگی' تب جگت کو خیال آیا کہ اس میں سہنا صاحب بھی تھے' ان کا کیا ہوا ہوگا؟ ان کی جوان بیٹی ...... مگر وہ آگے نہ سوچ سکا۔ اس کے سینے سے ایک آہ نکل کر رہ گئی۔

''ارے جوان! اس طرح آہ بھرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ سکھ جگت سے کہنے لگا۔ گرو گوبند کا نام لے کر قتل کرو! یاد ہے مغلوں نے ہمارے گرو کے معصوم بچوں کو قتل کیا تھا؟'' جگت جواب دینا چاہتا تھا مگر ہوشیار نے اس کا پیر دبا دیا۔

''بحث کر کے جھگڑا مت مول لینا! سب جگہ آگ لگ رہی ہے اس میں ہم کیا کر سکیں گے؟ جگت خود بھی تکرار کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کا دل رکھنے کے لیے کچھ بولنا چاہتا تھا' اس نے گرو گوبند کے بیٹوں کا نام لیا تھا جسے سن کر اس کا خون گرم ہو گیا تھا۔ ان سکھوں میں سے ایک تگڑا جوان کھڑا ہو گیا۔

''اس بوگی میں تو کوئی دشمن نہیں ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے مسافروں کی جانب نظریں گھمائیں۔ پھر اس کی نظریں کونے میں بینچ پر بیٹھے ہوئے شخص پر جم گئیں۔ اس کی پیشانی پر ترچھی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ وہ سردار جی کی نظر کی تاب نہ لا سکا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''سالے نے ہندو کا ڈھونگ رچایا ہے۔'' سردار جی اس کی جانب بڑھا' سب اس مسافر کو دیکھنے لگے۔ اب وہ جھولی سے مالا نکال کر اس کے دانے گھمانے لگا۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔ اس کی دائیں کلائی میں کڑا چمک رہا تھا۔ کہیں بلوے میں انہیں غیر' ہندو سمجھ کر سکھ مار نہ دیں اس وجہ سے ہندو ایسے کڑے پہنتے تھے۔

''تم ہندو ہو؟'' سردار جی گرجا۔

''جی ہاں ...... برہمن ہوں۔'' وہ تیزی سے مالا گھماتا ہوا بولا۔ ''شیو...... شیو......'' وہ رٹنے لگا۔

''تم سب لوگوں کو یہ سچا ہندو نظر آتا ہے؟'' اس نے بوگی میں موجود مسافروں کی رائے لی۔ سب کو اس میں لطف آنے لگا۔ مگر اس کی جان آدھی ہو رہی تھی۔

''ارے اس کا پاجامہ اتار کر دیکھ لو۔'' ایک نے مذاق کیا۔ سب ہنس دیئے۔ مگر ایک شخص نے اختلاف کیا۔ ''نہیں بھئی ...... بوگی میں عورتیں بھی بیٹھی ہیں۔ ان کا احترام کرو۔''

سردار جی کا ہاتھ لٹکتی ہوئی کرپان پر گیا' تب وہ شخص ہاتھ جوڑ کر رونے لگا۔ ''شنکر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سچ بول رہا ہوں۔''

سردار جی کا جنون ختم ہو گیا۔ وہ جا کر پھر سیٹ پر بیٹھ گیا' پھر بھی وہ سکھ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بینچ کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ شاید اس کے دل کو یقین نہیں تھا۔ جگت کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں اس نے ہوشیار سے کہا۔ ''امرتسر آئے تو مجھے بیدار کر دینا۔ میں کچھ دیر سوتا ہوں۔''

گاڑی نے پانچ میل کا سفر طے کیا ہوگا کہ پھر سردار جی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے برابر والے کے کان میں کچھ کہا۔ دوسرے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ارے شنکر کے بھگت! آج کون سا دن ہے؟''

ابنِ صفی کے پرستاروں کے لیے ایک نادر و نایاب تحفہ
ایشیاء کے واحد عظیم جاسوسی ناول نگار، شاعر، مصور کی یادوں باتوں کا احوال
ابنِ صفی کے قریبی ساتھی اور شاگرد مشتاق احمد قریشی کی ایک تاریخی دستاویز
شائع ہو گئی
یادِ بخیر
ایک ایسی دستاویز جس میں آپ ایشیاء کے سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار
ابنِ صفی کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے روشناس ہوں گے جو
اس سے پہلے کبھی آپ کی نظروں سے نہیں گزرے ہوں گے۔
کیا آپ جانتے ہیں کہ ابنِ صفی مصور بھی تھے۔ ان کی قلمی تصاویر اور ان کی
تحاریر کا عکس پہلی بار ان کے چاہنے والوں کے لیے۔
قیمت معہ ڈاک خرچ 500 روپے
اپنی کاپی کے حصول کے لیے رابطہ کریں
القریش پبلی کیشنز سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور فون: 042-37652546/37668958
نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز، 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔ 0213-5620771/2

سردار جی نے اچانک پوچھا۔ اس کا مالا گھماتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

"سردار جی! آج برھس پت وار (جمعرات) ہے۔"

"اور کل......؟" سردار جی نے یونہی پوچھا اور اس شخص کی زبان سے شکروار کی بجائے "جمع" نکل گیا۔ بس اس لفظ کے سنتے ہی سکھ نوجوان کھلی کرپان لے کر اس کی طرف جھپٹا اور پلک جھپکنے میں اس کے جسم میں کرپان گھسادی۔ "سالا برہمن بن کر ہمیں بے وقوف بناتا تھا۔" سب پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ وہ شخص کچھ دیر تڑپ کر لیٹ گیا۔ اس کے منہ سے صرف "یا خدا" نکل سکا۔

"دیکھا...... آخر اس کی اصلیت ظاہر ہوگئی۔" سردار جی نے اس شخص کے جسم سے کرپان نکال کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ خون کے چھینٹے اڑے۔

"شاباش" کچھ لوگوں نے داد دی۔ "ہمیں اسی طرح بدلہ لینا چاہیے۔" اس شخص کی آواز میں جیسے شیطان بول رہا تھا۔

"اس کی لاش کو باہر پھینک دو ورنہ امرتسر کے اسٹیشن پر مغز ماری ہوگی۔" اس کے ایک شاگرد نے پہلو بدل کر کہا۔ چلتی گاڑی سے باہر اس مردے کو دھکیل دیا گیا۔ قتل کرنے والا سردار جی خون سے بھرے ہوئے ہاتھوں کی جانب دیکھ کر بولا۔

"سالے کے خون سے بھی بدبو آرہی ہے۔" یہ کہہ کر نل پر ہاتھ اور ہتھیار دھونے چلا گیا۔ ہوشیار نے جگت کو سونے ہی دیا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ مفت کا جھگڑا مول لے کر مار دھاڑ کر بیٹھے گا۔ بوگی میں سناٹا چھا گیا تھا۔ کسی کو یاد آ گیا وہ بولا۔

"ارے وہ بائیں ہاتھ سے مالا گھما رہا تھا اس پر ہمارا دھیان ہی نہیں گیا۔" دوسرے نے اس کے سامان کی تلاشی لی۔ کپڑے کے دو چار جوڑوں کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ "سالا مفلس تھا" کہہ کر اس پوٹلی کو بھی کھڑکی سے باہر پھینک دیا گیا۔

"مگر سردار جی نے دن پوچھ کر اسے خوب پھنسایا۔" تیسرے شخص نے مسکا لگایا۔

"ایسا نہیں کریں گے تو وہ لوگ اپنے ملک سے ہمارے بھائیوں کو زندہ نہیں آنے دیں گے۔" کسی نے ماسٹر کی طرح انہیں سبق پڑھایا اور گاڑی امرتسر کی حد میں داخل ہوگئی۔

"جگت! بیدار ہو جاؤ...... امرتسر آ گیا۔" ہوشیار نے جگت کو ہلایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"آ گیا......" اس کی آواز میں جوش جھلک رہا تھا۔

"دیکھو...... وہ مہاجروں کی چھاؤنی نظر آ رہی ہے۔" ایک مسافر کھڑکی کے باہر ہاتھ کے اشارے سے دوسرے کو بتا رہا تھا۔ جگت بھی اسی جانب متوجہ ہوا۔ یہیں چھاؤنی میں اس کے گھر کے لوگ بھی رہتے ہوں گے۔ پھر تو بچن اور اچلا بھی مل جائیں گے اور ویرو؟ اس سے ملاقات ہونے کا اب یہ آخری موقع ہے۔ جگت سوچنے لگا اور گاڑی جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ پلیٹ فارم پر اتر کر جگت چاروں سمت نظریں گھمانے لگا، کوئی شناسا نظر تو نہیں آتا؟ جیسے اسے کوئی اسٹیشن پر لینے آیا ہو۔ باہر نکل کر ہوشیار نے پوچھا۔

"کہاں جائیں گے؟"

"چھاؤنی میں چلیں گے۔" جگت نے دونالی بندوق شانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر اس سے پہلے ایک جوڑا کپڑے خریدنے پڑیں گے۔ کسی ہوٹل میں یہ بندوق رکھ کر جائیں گے۔"

جیب میں سو روپے کی رقم تھی جو احتیاط سے خرچ کرنا تھی۔ کسے پتہ کہاں تک نباہنا پڑے؟ تانگہ پکڑ کر دونوں چلے۔ تین ہوٹلوں سے ''جگہ نہیں ہے'' کا جواب ملا۔ آخر ایک معمولی ہوٹل مل گیا۔ ایک کمرہ بک کر لیا۔ ''دو دن رہنا ہے۔'' انہوں نے یہ کہہ کر کرایہ پیشگی ادا کر دیا۔ جگت جانتا تھا کہ سامان کے بغیر گاہکوں پر ہوٹل والے زیادہ اعتماد نہیں کرتے۔
شام کو وہ مہاجروں کی چھاؤنی کی جانب چلے۔ دونوں بندوقیں ہوٹل میں رکھ دی تھیں۔ اپنی گن جگت نے پشت پر چھپا رکھی تھی۔
''ہوشیار! ہم ایک ساتھ اندر نہیں جائیں گے۔ تھوڑے فاصلے سے رہنا اچھا ہے تاکہ خطرہ ہونے پر ایک دوسرے کو بتایا جاسکے۔''
''اب یہاں کون سا خطرہ ہے؟'' ہوشیار سمجھ رہا تھا کہ پاکستان چھوڑنے کے بعد یہاں انہیں کوئی نہیں ستائے گا۔ ہزار ہا لوگ روزانہ آرہے ہیں' کون کسی کو پوچھتا ہے؟
''تم سمجھے نہیں ہوشیار! چھاؤنی میں کوئی بھی شناسا ہوسکتا ہے۔ ڈاکو کے نام سے لوگ بھڑکتے ہیں اس لیے بے پروائی اچھی نہیں ہے۔''
ایک بڑے میدان میں جگہ جگہ ڈیرے لگے ہوئے تھے۔ بنجاروں کا پڑاؤ معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹے بڑے شامیانے تنے ہوئے تھے۔ کل جن کے پاس رہنے کے لیے چھوٹے بڑے مکان تھے' تھوڑی کھیتی باڑی کے علاوہ تھوڑی جمع پونجی تھی' اور چھوٹا سا کنبہ تھا وہ سب آج بے سہارا اور لاچار بن کر سخاوت کے سہارے جی رہے تھے۔ ان کے سوکھے ہوئے چہرے اور خشک آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔ ''ہمارا کیا ہوگا؟ ہم نے جو گنوایا ہے وہ واپس ملے گا؟ ہم کو اطمینان نصیب ہوگا؟''

اپنے رشتے داروں کی تلاش میں ہوشیار اور جگت جیسے بہت سے لوگ چکر لگا رہے تھے۔ میدان کے درمیان ایک میز کے گرد دو سرکاری آدمی کاغذات کے بنڈلوں سے نام پڑھ کر سنا رہے تھے۔
''فلاں نمبر کی چھاؤنی میں جاؤ' اس نام کا کوئی مہاجر یہاں نہیں ہے۔ تم کالج والی چھاؤنی میں دیکھو۔''
''ہوشیار! ہمیں ایسی کوئی پوچھ گچھ نہیں کرنی ہے۔'' جگت اب بھی چوکنا رہنا چاہتا تھا۔ ''تم اس طرف چکر لگاؤ' میں اس جانب دیکھتا ہوں۔ اگر ویرو دکھائی دے تو مجھے بلانا۔ پھر جان پہچان والے چہروں کی تلاش ہونے لگی۔ گھنٹہ بھر دونوں خواہ مخواہ چکر لگاتے رہے کہ اچانک پشت کی جانب سے جگت کے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ عادت کے مطابق کمر پر ہاتھ گیا پھر گردن گھمائی۔ وہ چونکا۔
''ارے تایا آپ؟'' یہ کہہ کر وہ مسرت بھرے انداز میں ان سے لپٹ گیا۔
''تمہیں صحیح سلامت دیکھ کر آنکھیں اور دل ٹھنڈا ہوگیا۔'' تایا بھرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔ ''تم دور سے نظر آئے تو آواز دینا چاہتا تھا مگر پھر یاد آیا کہ تم ظاہر ہو جاؤ گے۔''
''ہمارے گھر کے سب لوگ ٹھیک تو ہیں؟'' جگت نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔ ''میں رتیا گیا تو ہمارے مکان جل رہے تھے۔''
''بیٹا! بھگوان نے عقل دی جو جلدی نکل آئے۔ بعد میں آنے والے بے حال ہو کر پہنچے ہیں۔ آج تو پوری گاڑی کٹ آئی ہے۔'' تایا نے آہ بھر کر کہا۔ ''ہمیں تمہاری فکر تھی۔ تمہاری ماں فکر میں بیمار ہوگئی ہے۔''
''وہ سب کہاں ہیں؟'' جگت نے جلدی سے

کہا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ لوگ راجستھان چلے گئے ہوں گے۔''

''راجستھان کیسے جائیں؟ زمین کے بدلے زمین لینے کے لیے یہاں رہنا ضروری تھا مگر تمہارے نانا اور باپو کو چھاؤنی کی روٹی کھانے میں لت دکھائی دے رہی تھی اس لیے ایک مل کی نوکری کرلی۔''

''مل کی نوکری......؟'' جگت کو یہ بات کھٹک گئی۔ اس عمر میں باپو کو مزدوری کرنا پڑے گی؟ مگر وہ باپو اور نانا کے اصولوں سے واقف تھا۔ جب تک ہاتھ پاؤں چلیں وہ خیرات کی نہیں کھائیں گے۔ جگت کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر تایا نے مزید کہا۔

''میں نے بہت سمجھایا مگر ضد کر کے چلے گئے۔''

''کس مل میں ہیں؟ میں ابھی وہاں جاتا ہوں۔'' جگت اب جلد بازی کر رہا تھا۔

''ایسے کیسے جانے دوں گا؟ پہلے اپنی تائی اور بچوں سے مل کر جاؤ۔'' تایا بولے۔

''نہیں تایا! میں پھر آؤں گا۔ ابھی عام جگہوں پر گھومنا خطرے سے خالی نہیں۔ نظروں میں آ گیا تو پھر مشکل میں پڑ جاؤں گا۔'' جگت نے آس پاس نظر گھمائی ہوشیار کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے جانے دیں...... ماں سے جلدی ملنا ہے۔''

''اچھی بات ہے۔ جاؤ مگر پھر ملنے آنا۔ ممکن ہے دو چار دن میں کہیں اور جانا پڑے۔'' پھر تایا کو یاد آیا کہ مل کا پتہ تو دیا نہیں۔ ''اسٹیشن کے پاس کمبلوں کی مل ہے۔ ایک انگریز کی مل ہے۔ کسی سے پوچھ لینا۔'' تایا کے پیر چھو کر جگت وہاں سے چل دیا۔ اس کی چال میں اب پھرتی تھی۔ اس نے گردن گھما کر تایا کی جانب دیکھا۔ ہوشیار بھی اسی طرف آ رہا تھا۔

''پتہ چلا؟ وہ کون تھے؟'' باہر نکلنے کے بعد ہوشیار نے پوچھا۔ ''تم جلدی کیوں نکل آئے؟''

''باپو نے مل میں نوکری کرلی ہے۔ تایا نے یہ سب کچھ بتایا ہے۔'' پھر جگت نے سوال کیا۔ ''تمہیں کوئی نظر آیا؟ بچن، اچلا ویرو؟'' ہوشیار نے انکار میں سر ہلایا۔

''جگت! میں نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا مگر......!''

''مگر کیا......؟'' ہوشیار کے چہرے پر ہچکچاہٹ نے جگت کو چونکا دیا۔

''کیا گھر والوں کی کچھ غلط خبر ملی ہے؟''

''نہیں جگت جب تم تایا سے بات کر رہے تھے تو دو آدمی تمہیں پہچان گئے تھے۔'' ہوشیار نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''میں ان کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ دو میں ایک غصہ ور شخص نظر آتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا بدمعاش ادھر آ گیا ہے۔ دوسرے نے پوچھا کون بدمعاش؟ تو کہنے لگا وہ جگا جو تمہارے رشتے دار موہن سنگھ کی بیوی کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ وہ ڈاکو......!'' جگت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے ہوشیار کو بولنے دیا۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ اب میرا بیٹا پنجے میں آیا ہے۔''

''کون ہوگا؟'' جگت بڑبڑایا۔ ''ایک تو موہن سنگھ کا رشتے دار ہوگا مگر اس دوسرے غصہ ور شخص کو پہچاننا پڑے گا۔''

''تم فکر نہ کرو اس سے میں سمجھ لوں گا۔ میں اس پر نظر رکھوں گا۔ تم جاؤ ماں، باپو اور چندن بھابی سے اطمینان سے مل آؤ۔''

مگر جگت کا دل نہیں مانا۔ ''ممکن ہے وہ ہمارا تعاقب کرے، پھر؟''

''ارے اس کی ایسی تیسی...... میں یہاں بیٹھا ہوں۔'' ہوشیار جنون میں آ گیا۔ ''ضرورت پڑنے

پر اسے جہنم رسید کردوں گا۔''

''نہیں......ایسی جلد بازی نہ کرنا۔ اس سے میل ملاپ کر کے معلومات حاصل کرلو' پھر میں دیکھ لوں گا۔'' یہ کہہ کر جگت نے مل کا پتہ دیا۔ ''اگر کوئی ضروری کام ہو تو وہاں آ جانا۔ باپو کا نام لینا' نہیں تو صبح ہوٹل میں ملیں گے۔''

□......♥......□

دولن مل کے بڑے گیٹ کے سامنے آ کر جگت رک گیا۔ گیٹ بند تھا مگر چھوٹی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کسے پوچھا جائے؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد ہمت کر کے وہ کھڑکی میں داخل ہوا۔

''اے کون ہو؟ کس سے کام ہے؟'' چوکیدار کی سخت آواز نے اسے روکا۔ جگت کہنا چاہتا تھا کہ سوہن سنگھ سے ملنا ہے مگر شانے پر رائفل رکھے خاکی وردی میں کھڑے ہوئے چوکیدار کو پہچانتے ہی وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ چوکیدار نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ چند لمحے دونوں بے حس وحرکت کھڑے رہے پھر دونوں کے چہروں پر ایک ساتھ روشنی آ گئی۔ ''کون؟ جگت بیٹا......؟''

''باپو تم؟'' دونوں نے ایک دوسرے سے کہا اور اس کے ساتھ ہی باپ بیٹے سینے سے سینہ ملا کر لپٹ گئے۔

مل کی دوسری شفٹ شروع ہو چکی تھی۔ اس لیے باپ بیٹے کا ملن دیکھنے والا کوئی نہیں تھا پھر بھی سوہن سنگھ نے جلدی سے بھیگی ہوئی آنکھیں خشک کرلیں۔ ''چلو' تمہیں گھر لے جاؤں۔ پیچھے ہی رہتے ہیں۔'' باپو مل میں چوکیدار ہوں گے جگت کو یہ اندازہ نہیں تھا' ممکن ہے تایا نے جان بوجھ کر نہ بتایا ہو پھر بھی جگت نے محسوس کیا کہ باپو نے اچھا ہی کیا۔ خیرات کی روٹی کھانے سے شانے پر رائفل رکھ کر مل کے گیٹ کی چوکیداری کرنا لاکھ درجے بہتر تھا۔ سوہن سنگھ تیز قدموں سے چلتے ہوئے بیٹے کو مل کے پچھلے حصے میں لے گئے' پھر کوارٹر ٹائپ کی کوٹھڑیوں کی قطاروں کی جانب اشارہ کر کے بولے۔ ''آخری کوٹھڑی ہماری ہے۔ باہر چھاؤں میں تمہارے نانا سوئے ہوئے ہیں۔''

جگت کا دل اپنوں کے ملاپ کے سبب زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ماں کیا کرتی ہوں گی؟ چندن اسے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ اگر وہ چھوٹا بچہ ہوتا تو دوڑ کر پہنچ جاتا۔ ماں سے لپٹ جاتا۔ اس کی بجائے وہ چوکھٹ سے پانچ قدم دور رک گیا۔ سوہن سنگھ اس سے پہلے پہنچ گئے۔

''جگت کی ماں! دیکھ تو کون آیا ہے؟''

کپڑے سیتی ہوئی ماں کی آنکھیں اوپر اٹھیں' چوکھٹ سے کچھ دور دروازے کے درمیان کھڑا ہوا کیم شیم بیٹا نظر آیا۔ وہ کپکپا کر رہ گئیں۔ ماں کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا سوئی انگلی میں چبھ گئی مگر اس کی تکلیف بھی اسے راحت لگی۔ ''کون؟ جگت؟'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔ اتنی دیر میں چارپائی پر سوئے ہوئے نانا اٹھ کر بیٹھ گے۔ ''نواسہ آ گیا؟''

جگت نے نانا کے پیر چھوئے۔ نانا نے اسے بانہوں میں لیا' رخسار چومے۔ ''جیتے رہو! مجھے یقین تھا کہ تم سلامت آ جاؤ گے۔''

ماں جی چوکھٹ پار کر کے باہر آ ئیں۔ چندن کور بھی باورچی خانے سے دوڑ کر باہر آ گئی۔ جگت کبھی ماں کو اور کبھی چندن کو دیکھ رہا تھا۔ ماں جی کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ پھر جگت سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا۔ ''بہت انتظار کرایا بیٹا!'' ماں کے ہاتھ اس کے کیم شیم جسم پر گردش

کرنے لگے۔ ''کیا ماں کو دکھی کرنے کے لیے ہی پیدا ہوا تھا؟'' وہ سسکیاں بھرنے لگیں پھر پیار بھرے انداز میں ڈانٹ کر بولیں۔ ''گھر چھوڑ کر چلا گیا اور یہ بھی نہیں دیکھا کہ ماں کے دل پر کیا گزرے گی؟''

دوپٹے سے خوشی کے آنسو پونچھتی ہوئی چندن ماں بیٹے کا ملن دیکھ رہی تھی۔ ماں جی کی پشت پر گردش کرتے ہوئے جگت کے ہاتھ کی قوت دیکھ کر اس کا سینہ فخر سے تن گیا۔ اسے پھر جیسے کچھ یاد آ گیا اور وہ پانی کا لوٹا بھرنے کے لیے اندر چلی گئی۔

دونوں ہتھیلیوں میں بیٹے کا چہرہ دبا کر ماں جی غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ''اب تو تمہارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا؟'' یہ کہتے ہوئے ان کا گردش کرتا ہوا ہاتھ جگت کی پشت پر رک گیا۔ لباس کے نیچے چھپائی ہوئی بندوق کا لمس پاتے ہی جھٹکے سے ہاتھ واپس ہٹ گیا۔ انہیں اب یاد آیا کہ بیٹا ڈاکو ہے۔

''اب اسے اندر تو لے جاؤ۔'' سوہن سنگھ نے تنگ ہو کر کہا۔ برابر والے لوگ جھانک کر دیکھ رہے تھے یہ انہیں اچھا نہیں محسوس ہوا۔ ''میں کھانے کے وقت آ جاؤں گا۔''

چندن نے کمرے میں چارپائی بچھا دی تھی۔ جگت اور ماں جی اندر آ گئے تو دونوں کے ہاتھوں میں پانی کا لوٹا دے دیا۔ لوٹا لیتے ہوئے چندن کی انگلیوں کو دبا کر جگت مسکرایا۔ چندن کو شرما گئی۔ اس کی رگوں میں سنسنی سی ہونے لگی۔ نانا کھنکھارتے ہوئے اندر داخل ہوئے اس لیے اسے باورچی خانے میں جانا پڑا۔

☐......♥......☐

چار دن ہنسی خوشی گزر گئے۔ جگت دوپہر کے بعد باہر نکل جاتا تھا اور سورج غروب ہونے تک ہوشیار کے ساتھ رہتا۔ نانا سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

''جگت اس انجانے شہر میں تم کہاں بھٹکتے ہو؟'' تو جگت نے بہانہ بنایا۔

''نانا! ہم جدا ہوئے تھے تو ایک ساتھی کو سارا مال سپرد کیا تھا۔ وہ ہم سے پہلے والی ٹرین سے چلا تھا۔ جمع ہو کر حصے کرنے ہیں مگر بچن سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔''

''اس کی نیت خراب ہوگئی ہوگی۔ سب مال لے کر فرار ہوگیا ہوگا تمہارا بچن۔'' نانا نے کہا تو جگت ناراض ہوگیا۔

''ایسا نہ کہیں! میرے ساتھی بے ایمان نہیں ہیں۔ میں نے اسے الور جانے کو کہا تھا۔ شاید وہ وہاں گیا ہو۔''

''نہیں......وہ وہاں نہیں گیا۔'' نانا نے کہا۔ ''تمہارے آنے سے پہلے چار پانچ دن قبل ہزارہ ہم سے ملنے آیا تھا۔ اگر بچن وہاں گیا ہوتا تو وہ ضرور یہ بات بتاتا۔''

''اچھا!'' جگت کے پاس جواب تیار تھا۔ ''ممکن ہے ماما یہاں آئے ہوں اور وہ وہاں پہنچا ہو۔ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے۔'' پھر بات کو مختصر کرنے کے لیے بولا۔ ''مجھے مال کی فکر نہیں، اس کی جان کی سلامتی چاہتا ہوں۔''

ہوشیار روز صبح مہاجروں کی چھاؤنی میں تین چار گھنٹے چکر لگا کر آتا تھا اس بہانے کہ اس کا کوئی رشتے دار آیا ہے یا نہیں؟ وہ ان دو آدمیوں سے میل بڑھانے لگا۔ چوتھے دن جب وہ جگت سے ملنے ہوٹل آیا تو اس نے بتایا۔

''وہ غصہ ور شخص تمہارے گاؤں والا ہے۔ کہتا تھا میرے باپو رتیا کے چوہدری تھے۔ حالات سے مجبور ہو کر یہاں رہتے ہیں۔''

''اس کا نام رنبیر سنگھ تو نہیں؟'' جگت نے کڑی ملائی۔

''ہاں...... رنبیر سنگھ ہے۔ کہتا ہے ویرو کے شوہر سے گہری دوستی تھی۔'' ہوشیار کہتا رہا۔ ''آج میں اسے باہر شراب پینے لے آیا۔ نشے میں بکواس کرتا رہا۔ میں نے بھی نشے میں ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے عورتوں کے دو ایک بناوٹی قصے سنا ڈالے تو وہ بھی کھل گیا۔

''کیا......؟'' جگت نے پوچھا۔

''بڑی گندی بکواس کر رہا تھا۔'' ہوشیار منہ پھیر کر بولا۔ ''ویرو کو شکنجے میں لینے کی تیاری کر لی تھی......'' وہ بولا۔ ''مگر درمیان میں جگا ڈاکو آ ٹپکا۔ وہ بدمعاش اس کو اغوا کر کے لے گیا ورنہ اس کا شوہر اور چاچی طلاق دینے کے لیے راضی تھے۔'' جگت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ویرو نے اسے رنبیر سنگھ کی حرکتوں سے متعلق بتایا تھا پھر بھی آج یہ بات سن کر اسے آگ لگ گئی۔ رنبیر اس بار اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا مگر اب اس کی موت اسے سامنے لے آئی تھی۔ نتھنے پھلا کر جگت نے پوچھا۔

''ہوشیار! وہ کمبخت اور کیا کہہ رہا تھا؟''

''میں نے اس سے پوچھا کہ جگا ڈاکو تو اب جیل میں ہے تو وہ قہقہہ مار کر ہنستا ہوا کہنے لگا کہ تقدیر بھی ایسے بدمعاشوں کی موافقت کرتی ہے۔ پکڑا گیا تھا مگر وہاں سے فرار ہو گیا۔ اب یہاں پہنچ گیا ہے مگر اسے گرفتار کرا کر بدلہ لوں گا۔'' ہوشیار رنبیر کی نقل کرتا ہوا بولا۔ ''مجھے اس وقت اس پر اتنا غصہ آیا کہ جی چاہا اسے لٹا دوں مگر جگت، تم نے منع کر دیا تھا اس لیے ضبط کر گیا۔''

''اچھا کیا...... وہ میرا شکار ہے۔ مگر اسے ختم کرنے سے پہلے ویرو کے متعلق اطلاع حاصل کر لینی چاہیے۔ اس کے ساتھ موہن سنگھ کا رشتے دار بھی ہے وہی کچھ جانتا ہو گا۔'' ویرو کی بات آتے ہی جگت بے چین ہو گیا۔ ''ہوشیار! تم دماغ پر قابو رکھ کر اس کی بکواس سنتے رہو...... چاہے اسے پلانے میں روزانہ پیسے خرچ کرنے پڑیں۔''

''اور ہاں...... جگت...... وہ مجھ سے قرض مانگ رہا تھا، کہنے لگا مجھے سو روپے ادھار دے دو، میرے ہاتھ میں پانچ ہزار آئیں گے تو میں سو کے دگنے لوٹا دوں گا۔ سالا مجھے بے وقوف بنا کر سو روپے اینٹھنا چاہتا تھا۔ مگر اسے پتہ نہیں کہ میں کون ہوں؟''

''تم اسے سو روپے دینے کے آسرے میں رکھو۔''

''مگر جگت! ہمارے پاس رقم کم ہوتی جا رہی ہے اسے روز پلانا ممکن نہیں ہے۔'' ہوشیار جیب سے پیسے نکال کر گننے لگا۔ ''پھر ہوٹل کا خرچ بھی چڑھ رہا ہے۔''

''کوئی فکر نہیں...... دو چار دن چلا لو، پھر کہیں ہاتھ ماریں گے۔'' جگت نے یہاں آنے کے بعد پہلی بار ڈاکے کی بات کی۔ ''مل میں چنا سنگھ نامی ایک شخص سے جان پہچان ہو گئی ہے۔ وہ مجھے جگا کے نام سے نہیں پہچانتا مگر کہیں ہاتھ مارنے کی بات کر رہا تھا۔ اس کے دھیان میں کوئی ٹھکانہ ہوا تو میں معلوم کر لوں گا۔'' رات الگ ہونے سے پہلے جگت نے تاکید کی۔ ''ہوشیار! رنبیر کے پاس سے جلدی اطلاع حاصل کر لو...... وہ کوئی چال بازی کر جائے اس سے پہلے ہی اسے ختم کرنا ہے۔''

☐......♥......☐

ماں جی دو دن سے جگت کے نانا سے کہہ رہی تھیں۔

''باپو! تم لڑکے کو سمجھا لو وہ پرانے دھندے چھوڑ

دے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے جب یہ روز بھٹک رہا ہے تو یہاں بھی کچھ کر گزرے گا۔" نانا بات کو ٹال دیتے تھے۔

"ابھی یہ گھر میں اطمینان سے چار دن نہیں رہا۔ اسے چھیڑنا ٹھیک نہیں گھر کی محبت بڑھے گی تو وہ خود بخود ٹھکانے آ جائے گا۔" نانا سے یہ جواب ملا تو ماں جی نے بہو کو سمجھایا۔

"چندن کور! تم ذرا اس سے پوچھ گچھ کرتی رہو۔ کہنا کہ اب گھر کی ذمہ داری اٹھا لے۔ اس کے باپو کب تک محنت کریں گے؟" پھر بہو کو ایک ترکیب بتائی۔ "تمہیں یہ بات مضبوطی سے کہنی ہے کہ آپ کو یہاں سے نہیں جانے دوں گی اور جانا ہی ہے تو مجھے ساتھ لے جاؤ۔"

دوسرے دن ماں جی نے چندن کور سے نتیجہ جاننے کے لیے پوچھا۔ "رات کیا بات ہوئی وہ کچھ بولا۔"

"ماں! تم ان کا مزاج جانتی ہو۔" چندن سر جھکا کر ساس سے کہنے لگی۔ "وہ کہہ رہے تھے کہ میں سب کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہوں مگر میرے راستے میں کوئی نہ آئے' میرا کچھ بھی ہو' میں تم کو دکھ نہیں پہنچاؤں گا۔"

"اس کا مطلب ہے وہ اپنی ضد چھوڑنے کو تیار نہیں۔" ماں جی بلند آواز میں بولیں۔ "اس کے نصیب میں پھانسی پانا لکھا ہی ہوگا۔" وہ جذبات میں بول گئیں مگر بہو کی رونی صورت دیکھ کر پچھتائیں۔ "غصے میں زبان پر قابو نہیں رہتا بہو! ماں کا دل بیٹے کی بھلائی ہی کے لیے دعا کرتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں ماں جی!" چندن کور ساس کو اطمینان دلانے لگی۔ "اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ جہاں جائیں گے میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ گرو بابا کی دعا ہوئی تو انہیں اس راستے سے واپس لے آؤں گی۔" رات کے کھانے کے بعد ماں جی نے بات چھیڑی۔

"جگت بیٹے...... اب کوئی کام دھندا کرنا ہے۔"

نانا نے کھنکھار کر انہیں آگے بولنے سے روک دیا۔ وہ جگت سے یہ گھڑی ٹالنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آخر اس بات پر تکرار ہوگی۔ "ماں! مجھے ایک دھندا آتا ہے وہ تم جانتی ہو۔" پھر نانا کی جانب دیکھ کر مزید بولا۔ "دوسرا دھندا کرنے جاؤں تو اس صورت میں اپنی اصلی شخصیت چھپانی پڑے گی۔ ایسا کب تک چل سکتا ہے؟"

"پھر پولیس کے سامنے پیش ہو جاؤ۔" ماں جی دانت پیس کر بولیں۔

نانا انہیں گھورنے لگے۔ "مایا! بیٹے کو پھانسی پر لٹکائے بغیر تمہیں اطمینان نہیں ہوگا۔" نانا کی آنکھوں میں غصہ ٹپک رہا تھا۔ ایک بار پیش کر کے ہم پچھتائے۔ وہ تو سرجن صاحب جیسے کی سفارش تھی اس لیے پانچ سال کی سزا پر بات ختم ہوگئی مگر یہاں کون مدد کرے گا؟" وہ کچھ دیر سانس لینے کے لیے رکے۔ ان کی کافی عمر تھی' غصے میں ان کا سانس پھول جاتا' آواز لڑکھڑانے لگتی۔ سفید مونچھوں کے پسینے صاف کرتے ہوئے بولے۔ "مجرم ہاتھ میں آنے کے بعد پولیس قصائی بن جاتی ہے۔ اس سے رحم کی امید رکھنا فضول ہے۔"

"ملک بدل گیا حکومت بدل گئی۔ کچھ دن چہرہ چھپائے' پھر پرانے جرائم خود بخود دفن ہو جائیں گے۔" جگت کے باپو نے پہلی بار مداخلت کی۔ "بہتر یہ ہے کہ الور جا کر اپنے ماما کے ساتھ کھیتی کرے' وہاں کون اسے چھیڑنے والا ہوگا؟"

"سوہن سنگھ' یہ خیال مجھے بھی آیا تھا مگر وہاں بھی خطرہ ہے۔" نانا نے کہا۔ "ہزارہ آیا تھا تو مجھے راز

دارانہ انداز میں بتا گیا تھا کہ وہاں رام سنگھ چوہدری نام کا پولیس چیف جگا کی تلاش میں ہے۔"

"رام سنگھ چوہدری......" جگت نے ہونٹ کاٹے۔ وہ یہاں میرا تعاقب کر رہا ہے؟"

"ہاں...... میں نے جان بوجھ کر تمہاری ماں اور باپو سے یہ بات چھپائی تھی کہ انہیں بے چینی نہ ہو۔" نانا نے کہا۔ "ابھی وہ دہلی میں ہے اس لیے فکر کی بات نہیں۔ تم ابھی پاکستان سے نہیں آئے ہو یہ سمجھ کر وہ خاموش ہے۔" نانا یہاں بیٹھے بیٹھے اتنی خبر رکھتے ہیں یہ جان کر جگت کو حیرت ہوئی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ نانا نے آتے ہی کان میں کہا تھا کہ ہوشیار رہنا' اپنی اصلیت کو چھپانا' بات الجھ گئی ہے یہ سمجھ کر ماں جی خاموش ہو گئیں۔

"جو تم سب کو ٹھیک لگے وہ کرو! مگر میں اس میں بھلائی نہیں دیکھتی۔"

پھر سب سونے کی تیاری کرنے لگے مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ غیر یقینی اور فکروں میں گھرے ہوئے وہ لوگ رات گزارنے کی کوشش کرنے لگے۔ تنگ باورچی خانے میں جگت اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی چندن کور سے پوچھ رہا تھا۔

"میں جہاں جاؤں' میرا ساتھ دینے کا تمہارا فیصلہ اٹل ہے؟"

"بالکل......!" چندن کور پیار سے بولی۔ "جیل میں بھی مجھے ساتھ لے جانا پڑے گا۔"

"ارے پگلی!" جگت نے اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔ "جیل والے قیدی کو ایسی سہولت کہاں دیتے ہیں؟"

□......♥......□

دو دن اور گزر گئے۔ جگت نے چنا سنگھ سے ڈاکہ ڈالنے کا ٹھکانہ معلوم کر لیا۔ وہ بھی ساتھ دینے کو تیار تھا۔ جگت ہوشیار کو بلانے ہوٹل گیا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ ہوشیار آیا اور چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔

"جگت! غضب ہو گیا' رنبیر ہمارے اندازے سے زیادہ چالاک نکلا ہے۔"

"کیا ہوا......؟" جگت نے جھٹکا محسوس کیا۔

"وہ مجھ سے سو روپے کیوں مانگ رہا تھا تم جانتے ہو؟" ہوشیار بری طرح ہانپ رہا تھا۔ "اسے دہلی جانا تھا۔ شیخوپورہ کا صوبیدار رام سنگھ چوہدری اس کا رشتے دار ہے اور وہ دہلی میں ہے۔"

"وہ میری تلاش میں ہے' اس کا مجھے بھی پتہ چل گیا ہے۔" جگت نے بنیادی بات جاننے کی خاطر کہا۔ "مگر رنبیر اس طرح ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

"کیوں؟ رام سنگھ کو یہاں بلانے کے لیے اس نے خط لکھا ہے۔ یہ جاننے کے لیے میں نے اسے خوب پلائی۔ وہ بکتا رہا کہ رام سنگھ چاچا کے آنے کے بعد پانچ ہزار ٹکے۔ پھر چھاؤنی میں خیرات کا نہیں کھاؤں گا۔ بھگوان دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"ہوں......!" جگت کے جبڑے سخت ہو گئے۔ "میں اسے چھپر پھاڑ کر نہیں' سینہ پھاڑ کر مت بخشوں گا۔" جگت کچھ دیر سوچ میں گم ہو گیا۔ پروگرام طے ہو گیا تو وہ بولا۔ "ہوشیار! ہمارے پاس ایک فالتو رائفل ہے' یہ تم فروخت کر دو' اس کے پیسے سے ایک اچھی گھوڑی خریدیں گے۔ کچھ کارتوس بھی لے آؤ' ہم آج شام ہی کام نمٹا کر یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔"

"کہاں جائیں گے؟"

"یہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" جگت اب جوش میں آ گیا۔ "پنج گوریا کے قریب کا دیہ گاؤں ہے۔ وہاں چھپنے کے لیے چنا سنگھ نے ٹھکانہ تلاش

کرلیا ہے۔ میں کل رات وہ جگہ بھی دیکھ آیا۔'' رائفل صاف کرتے ہوئے جگا نے کہا۔ ''پھر شروع ہو جائیں۔''

ہوشیار نے کھانا کھایا اور رائفل لے کر چلا گیا۔ رنبیر کو ختم کرنے کا جگت نے پلان بنالیا۔ ہوشیار کو چھاؤنی بھیج کر کسی بہانے رنبیر سنگھ کو باہر بلانے کے بعد کسی تنہا جگہ لے جا کر شوٹ کر دینا۔ مگرا کیلے کو ہی کیوں؟ موہن سنگھ کا رشتے دار بھی تو ہے۔ اسے بھی ختم کرنا ضروری تھا۔ یہ ممکن ہے کہ رنبیر سنگھ نے اسے بھی اب تک یہ بات بتادی ہو اور وہ رام سنگھ چوہدری کو بتادے۔ ویسے بھی موہن سنگھ کا رشتے دار اس کا دشمن ہوتا تھا۔ ''ایک کی جگہ دو قتل......!'' رائفل کی نال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ ''ایک کے ساتھ دوسرے کو بھی شوٹ کیا جاسکتا ہے۔''

رائفل لے کر گیا ہوا ہوشیار شام کو لوٹا۔ ''گھوڑی لے آیا؟'' جگت پوچھنا چاہتا تھا مگر ہوشیار کے عقب میں دو جوانوں کو اس نے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ ''ست سری اکال۔'' کی بلند آواز سنائی دی۔ جگت پہچان گیا۔

''ارے کرتارے تم؟'' یہ کہہ کر وہ ایک جوان سے لپٹ گیا۔ ''ہوشیار! تمہیں کہاں ٹکرایا؟''

''ہماری رائفل کا یہی گاہک نکل آیا۔'' ہوشیار نے صافہ دور پھینک کر کہا۔ ''مجھے کسی صورت میں گھوڑی خریدنے نہ دی۔''

''رائفل کی قیمت میں بوتل سے ادا کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے کرتار نے جیب سے ایک بوتل نکالی۔ ''تم ہمارے مہمان ہو لہٰذا آج محفل جمائی جائے۔'' جگت' کرتار کے ضدی پن سے واقف تھا۔ شراب کے سلسلے میں انکار کرنے پر وہ جھگڑا کرنے سے بھی نہ چوکتا۔ اسے برا لگ جاتا۔ ایک آدھ سال پہلے وہ شیخوپورہ آیا تھا تو جگت نے اس کی معرفت اسلحہ خریدا تھا۔ کچھ سال ملٹری میں رہا ہوا کرتار سکھ گھر کا بیٹا تھا۔ باپ کی بہت ساری زمین تھی پھر بھی کچھ کارنامہ کرگزرنے کی اسے عادت تھی۔

''تمہیں رائفل کی کیا ضرورت پڑگئی کرتار؟'' جگت کو تجسس ہوا۔ ''میری طرح ڈکیتی شروع کرنی ہے؟'' شراب کی بوتل کا کارک اڑا کر جام بھرتا ہوا کرتار مسکرایا۔

''جگت! اپنے دوست سے تعارف کرانا بھول گیا۔'' تو جگت کو یاد آیا کہ کرتار کے ساتھ آیا ہوا جوان اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب کا طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ بیس اکیس سال کی عمر' پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر کر وہ جگت کے سامنے ہنسا۔

''یہ زخمی ہے۔'' کرتار نے جگت کے ہاتھ میں پیالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''سچا سنگھ زخمی۔ آج کل یہاں اس کا بول بالا ہے۔'' نوجوان نے شرما کر نظریں جھکالیں۔ جگت کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ پہلی بار اس کا نام سن رہا تھا۔ وہ یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ کس کا زخمی؟ عشق کا؟ اس نے سوچا' اس کے علاوہ دوسری گنجائش نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر پہلی ملاقات تھی اس لیے وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے بات بدل کر پوچھا۔

''شاعر معلوم ہوتے ہو۔''

''معلوم ہوتے ہیں؟'' کرتار شراب کا جام گٹکٹا کر بولا۔ ''ارے شاعر ہے۔ مگر قلم کی جگہ تلوار اٹھالی ہے۔ جان جوکھم میں ڈال کر انسانوں کی حفاظت کررہا ہے۔'' جگت اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بھیگی بھیگی آنکھیں جگت کو پسند آئیں۔ ''نئی ٹولی

جمانے میں یہ نوجوان بڑا کام آئے گا' وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ مگر کرتار ابولا۔ ''تمہاری رائفل اسی کے لیے خریدی ہے۔ پھر تمہارا نام سنا تو اس نے ضد کی کہ تمہیں دیکھے گا۔''

''رائفل چلانی آتی ہے؟'' جگت پوچھ بیٹھا اور کرتار قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ جگت جھینپ گیا۔ کرتار بری طرح قہقہے لگاتا رہا۔

''ارے جگا! نشانے بازی میں تو اس نے اچھے اچھوں کو مات کر دیا ہے۔ ملٹری میں بڑے کارنامے کیے ہیں۔'' پھر زخمی کی جانب دیکھ کر مزید بولا۔ ''ارے یار! تم بھی کچھ بولو۔ مجھے کب تک تمہاری تعریف کرنی پڑے گی؟''

سچا سنگھ مسکرایا۔ چھندری داڑھی پر انگلیاں پھیر کر بھوری آنکھیں جھپکاتا ہوا بولا۔ ''جگت سنگھ! مہاجروں کی ایک گاڑی آج رات امرتسر سے روانہ ہونے والی ہے پاکستان جانے کے لیے......'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر رکا۔ ''اس سے پہلے کہ وہ سرحد پار کریں' راستے میں......''

''اسے اڑا دینا چاہیے۔ یہی کہنا چاہتے ہو؟''

''نہیں......'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''ہم تمام مسافروں کو قتل کر دیں گے۔'' شراب کا گھونٹ اب جگت کو کڑوا محسوس ہوا۔ آج کل ہر جگہ یہی ہوا چل رہی ہے بحث سے فائدہ بھی کیا تھا؟

''مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔'' جگت نے چند لفظوں میں کہا مگر کرتار اور سچا اس جواب سے چونکے۔ زخمی اسے گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''ڈاکو ہو اور مہاتما گاندھی جیسی بات کرتے ہو۔''

''زخمی! کہیں ڈاکہ ڈالنا ہو تو مجھے بتانا۔'' جگت نے مطلب کی بات کی۔ ''قتل سے بھی مجھے اختلاف نہیں مگر اس کی وجہ دشمنی ہونی چاہیے۔'' پھر کرتار سے بولا۔ ''ابھی دو دو دشمن ختم کرنے تھے اور تم آ گئے۔''

''تمہارے دشمن میں ماروں گا جگت سنگھ۔'' زخمی جوش میں بولا۔ ''تم گاڑی کاٹنے میں ہمارا ساتھ دو۔''

''میرے سامنے پھر یہ بات نہ کرنا۔'' جگت کی آواز میں اب کچھ سختی تھی۔ ''دشمن کو اپنے ہاتھوں مارنے میں اور مزہ آتا ہے۔ جگا میں ابھی اتنی طاقت ہے۔'' یہ کہہ کر جگت نے کرتے کی آستینیں چڑھائیں' کرتار نے محسوس کیا کہ بات بڑھ جائے گی اور جھگڑا ہو جائے گا۔

''ختم کرو یار...... بول جگا' گھوڑی دوں یا جیپ چلے گی؟''

''جیپ کو کہاں سنبھالوں گا؟''

''تمہیں رکھنے کے لیے تھوڑی دے رہا ہوں؟ کام نمٹا کر واپس دے دینا۔''

''قتل کر کے مجھے دو ایک ڈاکے ڈالنے ہیں۔ ہم تو یہاں خالی ہاتھ آئے ہیں۔'' شراب کی بوتلیں خالی ہو چکی تھیں' سچا سنگھ جانے کے لیے پہلو بدل رہا تھا۔ کرتار نے جگت کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''اچھا...... ہم جا رہے ہیں۔ کل دوپہر تک تمہیں جیپ مل جائے گی۔ چابی میں خود دے جاؤں گا۔'' جگت اور ہوشیار کرتارا سے گلے ملے۔ زخمی نے صرف مصافحہ کیا۔ جدا ہوتے ہوئے دونوں کی خواہش تھی کہ اب نہیں ملیں گے مگر دونوں میں سے کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ کیسے عجیب حالات میں ان کی پھر ملاقات ہوگی...... جاتے ہوئے کرتار کو یاد آیا۔

''جگا! اب تک ہمارے علاقے میں ایک ڈاکو کا راج تھا...... گنگا کا' اب تم دوسرے ہو۔'' پھر آہستہ سے بولا۔ ''مگر خیال رکھنا' گنگا بڑا خطرناک ہے۔ مدتوں سے پولیس کو ناکوں چنے چبوا رہا ہے۔ اس کی جھڑپ میں نہ آنا۔'' جگت بے پروائی سے ہنسا۔

''تم فکر نہ کرو ایک ڈاکو دوسرے ڈاکو سے نہیں ڈرتا۔ گنگا کا نام تو میں نے بھی سنا ہے۔ ملاقات کا موقع ضائع نہیں کروں گا۔'' کرتارا اور زخمی چلے گئے تو ہوشیار نے کہا۔

''جگت! ہم ٹھکانہ بدل ڈالیں۔ وہ جوان تمہیں کس طرح گھور رہا تھا؟ تم نے ساتھ نہیں دیا' لہٰذا ممکن ہے......''

''نہیں ہوشیار سچا سنگھ ایسا نہیں ہے۔ آدمی دلیر ہے۔ مگر اس وقت ذہن میں قومی عصبیت کا زہر سرایت کر گیا ہے۔ اسے اس کے راستے جانے دو۔''

قتل میں دیر ہوئی اس کا جگت کو افسوس تھا۔ رام سنگھ چوہدری سے رنبیر کی ملاقات نہیں ہونی چاہئے' نہیں تو بازی الٹ جائے گی۔ جگت رام سنگھ سے بہت پرانی دشمنی تھی۔ پہلی بار جگت پولیس کے حوالے ہوا تھا تو اسے ختم کرنے کے سلسلے میں ارجن سنگھ کے ساتھ اسی رام سنگھ نے دیا تھا۔ بچن نے ارجن سنگھ کو گولی مار کر جگت کو چھڑایا تو رام سنگھ بڑ مار رہا تھا۔ ''میں ان ڈاکوؤں کو ختم کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ ایک ایک کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالوں گا۔''

جگت چاہتا تھا کہ پہلے یہاں اپنے قدم جمالے تب تک وہ رام سنگھ کو ہوا نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ اس کے باپو کو ابھی مل میں نوکری کرنی تھی۔ رتیا کی زمین کے بدلے سرکاری زمین لینی تھی۔ رام سنگھ ہر کام میں رکاوٹ بن کر پریشان کر سکتا تھا۔

''ہوشیار! کل دوپہر ہم ان دونوں کو ٹھکانے لگا دیں گے۔'' جگت اچانک سوچتے سوچتے چونکا' پھر بولا ''کرتارے کی جیپ نہ آئے تو بھی وقت ضائع نہیں کرنا ہے۔'' پھر کچھ سوچ کر کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ چندن کو بھی ساتھ لے جاؤں' پھر کوئی مسئلہ نہیں۔'' ہوشیار کی پلکوں پر نشے کا بوجھ نظر آ رہا تھا۔

''جگت! ہمیں جلد ہی کہیں ہاتھ مارنا ہوگا' جیب خالی ہو رہی ہے۔''

جگت ہنسا' پیسے کی کمی انہوں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ملک بدل گیا ہے' اس لیے ہوشیار کو زیادہ فکر ہو رہی تھی۔ اسے اس وقت بچن یاد آ گیا۔ ''کیا اب کبھی اس سے ملاقات نہیں ہو گی؟'' وہ سوچنے لگا۔

❐......♥......❐

چندن کور' جگت کے برہنہ سینے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ کئی دن بعد شوہر کا قرب نصیب ہوا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ اسے جانے نہیں دے گی چاہے اس کے لیے اسے کتنے ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑے۔ متحرک ہاتھ آہستہ آہستہ جگت کی گردن میں تعویذ کو چھونے لگا۔ دل کو ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ الور میں ملاقات کے دوران اس نے جگت کی گردن سے خاموشی کے ساتھ تعویذ نکال لیا تھا۔ اسے یاد آیا۔ آنکھیں بند کیے ہوئے جگت نے چندن کور کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''چندن جب میں آخری بار گرفتار ہوا تھا تم مجھے بڑی صفائی سے تعویذ واپس کر گئی تھیں۔''

چندن! کور کا دل دھڑکنے لگا۔ ''موقع ہے تو سچ بات کہہ دوں۔ وہ سوچنے لگی۔ مگر الفاظ زبان پر آنے سے پیشتر آنکھوں نے آنسو چھلکا دیئے۔ جگت نے پلکیں کھول دیں۔

''تم رو رہی ہو؟'' وہ آہستگی سے اس کے رخسار پر کھردری ہتھیلی پھیرتا ہوا بولا۔ ''ڈاکو سے شادی کر کے اب پچھتا رہی ہو؟'' چندن نے شوہر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے کچھ بولنے سے روک دیا۔ وہ جگت کے مضبوط سینے پر سر رکھ کر بولی۔

"ہاں...... پچھتاوا ہو رہا ہے۔" پھر کچھ رک کر بولی۔ "مگر دوسری غلطی کے لیے۔ آپ کی گردن سے میں نے تعویذ اتار لیا تھا۔ دوسرے دن آپ گرفتار ہو گئے تو میرے ضمیر نے ملامت کی۔ دراصل بات یہ تھی کہ ماں جی محسوس کر رہی تھی کہ تعویذ کی وجہ سے آپ کا دماغ گھوم گیا ہے۔ مگر میں سمجھ گئی کہ ویرو نے آپ کو سچے دل سے تعویذ دیا تھا۔"

"یہی وجہ تھی کہ تم ملاقات کے بہانے تھانے میں تعویذ لوٹانے آئی تھیں؟ کیوں؟" جگت نے اس کے رخسار پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ "تم بڑی چالاک ہوتی جا رہی ہو۔" دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر جگت نے بات شروع کی۔ "چندن تمہیں کل تیار رہنا ہے، شام کو ہمیں یہاں سے جانا ہے۔"

چندن نے جھٹکے سے سر اٹھا لیا۔ "کل ہی......؟"

ساس سسر کو چھوڑنے کا خیال اسے بے چین کر رہا تھا۔ "اتنی جلدی کیا ہے؟" جگت جانتا تھا کہ چندن کو دکھ ہوگا۔

"یہاں رہ کر میں ماں جی اور باپو کو تکلیف میں گرفتار کرنا نہیں چاہتا۔" پھر آہستگی سے بولا۔ "تمہارا دل نہ مانتا ہو تو میں اکیلا......"

"نہیں، نہیں، نہیں...... میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گی۔" چندن جلدی سے بولی۔ "ماں جی کو میں منا لوں گی مگر...... ہمیں جانا کہاں ہے؟" جگت نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ قتل کر کے فرار ہونے کے بارے میں وہ چندن کور کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"سورج ڈوبتے وقت عقبی دروازے پر تم تیار کھڑی رہو گی۔"

"اس کا مطلب ہے آپ ماں جی سے ملے بغیر باہر سے ہی چلے جائیں گے؟" چندن کو خوف محسوس ہوا۔

"یہی کرنا پڑے گا۔" جگت نے آہ بھری۔ "ملنے آؤں گا تو انہیں دکھ ہوگا۔ تم کہہ دینا کہ کچھ دن بعد انہیں چہرہ دکھا جاؤں گا۔" پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

باورچی خانے کی دیوار کے دوسری طرف کمرے میں پہلو بدلتی ہوئی ماں جی جگت کے باپو سے کہہ رہی تھیں...... "سفارش کر کے جگت کو مل میں کام پر لگوا دو! بیکار ہوگا تو پھر کوئی مصیبت کھڑی کر لے گا۔" دو چار دن میں وہ کئی بار یہ بات دہرا چکی تھیں۔ سوہن سنگھ کو بھی یہی فکر تھی۔

"چار دن ٹھہر جاؤ...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ماں جی نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ الفاظ انہیں پھیکے معلوم ہوتے تھے۔

❑......♥......❑

"جگت! جیپ آ گئی۔" ہوٹل پہنچتے ہی ہوشیار نے خبر دی۔ "کرتارا کچھ کارتوس بھی دے گیا ہے۔"

جگت نے دونالی بندوق میں کارتوس بھر لیے۔ اسے گھر سے نکلنے میں دیر ہو گئی تھی۔ شاید ماں جی کو کچھ شک ہو گیا تھا، وہ کہہ رہی تھیں۔

"آج باہر نہ جاؤ! تمہارے باپو شام کو مل کے منیجر سے بات کریں گے۔ تمہیں رات کی شفٹ میں کام مل جائے گا۔" اس نے بہانے بنائے، مگر ماں ٹس سے مس نہ ہوئی تو اسے کہنا پڑا۔

"ماں! مجھے مل میں مزدوری نہیں کرنی۔ میں باہر دوسرا کام تلاش کر لوں گا۔"

"میں جانتی ہوں...... تمہیں کام نہیں کرنا۔" ماں جی نے ناراض ہو کر کہا۔ "لوٹ کھسوٹ کرنے کے علاوہ تمہیں آتا بھی کیا ہے؟ مگر کہے دیتی ہوں کہ تمہارے یہ دھندے نہیں چلیں گے۔ پکڑے گئے تو

پھر......!'' اتنا کہہ کر ان کا گلا رندھ گیا۔

''پھر کیا؟ میں پھانسی پا جاؤں گا' یہی کہنا چاہتی ہو؟'' جگت کا دماغ سنک گیا۔

''میرے کیے کی مجھے سزا ملے گی۔ تم کو کچھ نہیں ہونا۔'' ماں جی آنکھیں پھاڑے بیٹے کو دیکھنے لگیں۔ ماں کی ممتا غصے میں بدل گئی۔

''تمہارے کیے کی سزا تم بھگتو یہ بعد کی بات ہے...... فی الحال تو ہم دکھی ہو رہے ہیں۔'' پھر وہ کیا کیا بول گئیں اس کا انہیں ہوش نہیں رہا۔ ''پھانسی پا جاتا تو ہمارا ابھی چھٹکارا ہو جاتا۔''

چندن کور کو ساس کے الفاظ سے بہت دکھ ہوا۔ جگت گھر سے باہر چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے دیکھا ماں جی دیوار سے سر ٹکرا کر رو رہی تھیں۔

ہوشیار نے جیپ اسٹارٹ کی...... سورج مغرب کی جانب جھک رہا تھا۔ جگت کو اداس دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''کیوں...... بھابھی نے ساتھ آنے کو منع کر دیا؟''

''نہیں...... وہ تو آنے والی ہے۔'' جگت نے حلق کا تھوک نگل کر کہا۔ ''مگر ماں جی قدم قدم پر رکاوٹ کھڑی کر رہی ہیں۔''

جیپ چھاؤنی سے کچھ دور کھڑی رہی۔

''ہوشیار! ان دونوں کو تم باہر لے آؤ۔ ان کو ذرا آگے لے جانا' پھر میں جیپ لے کر آؤں گا۔''

ہوشیار پندرہ منٹ بعد اکیلا واپس آیا۔ جگت بے چین ہو گیا۔ ''کیوں...... کیا ہوا؟''

''ابھی چھاؤنی میں مہاجروں کو کپڑا تقسیم کیا جا رہا ہے۔ وہ دونوں قطار میں کھڑے ہیں۔'' ہوشیار نے ہونٹ کاٹ کر کہا۔ ''سالے مفت کا مال چھوڑ کر باہر نہیں آئیں گے۔''

''چلو! جیپ میں بیٹھ جاؤ۔'' جگت نے فوراً دوسرا منصوبہ تیار کر لیا۔ ''ہم چھاؤنی کے گرد چکر لگائیں گے۔'' میدان کے گرد دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس کے برابر دونوں نے چکر لگایا۔ ''ذرا جیپ کھڑی رکھو۔'' یہ کہہ کر جگت جیپ سے نیچے کود گیا۔ دیوار کے قریب ایک درخت تھا اس کی آڑ میں اوپر چڑھ کر اس نے اندر دیکھا' لوگ قطار میں کھڑے نظر آئے۔

''ہوشیار! میری بندوق لے آؤ! یہاں سے فائر کرنے کا اچھا موقع ہے۔'' قطار میں کھڑا ہوا رنبیر اور اس کا ساتھی لالچی نظروں سے مفت دیے جانے والے کپڑوں کو دیکھ رہے تھے تاکہ کپڑا ملے تو اسے باہر فروخت کر کے شراب پی سکیں۔ ہوشیار' جگت کے برابر جا کر کھڑا رہا۔

''جگت! اب ان کی باری آنے میں دیر نہیں۔ ذرا جلدی کرو۔'' ہوشیار نے کہا۔

جگت نشانہ لینے لگا۔ ''تم آگے پیچھے دیکھتے رہو' ہمیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا؟''

وہ دونوں قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ جگت نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دونوں برابر کھڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے ٹھیک نشانہ رہے گا۔ اس سے پہلے کہ کوئی درمیان میں آئے' ٹرائیگر دبا دیتا ہوں۔''

درخت پر بیٹھا ہوا ایک کوا آسمان کی جانب پرواز کر گیا۔ دو دھماکے ہوئے' آواز ختم ہونے سے پہلے دونوں گولیاں نشانے پر لگ چکی تھیں۔ شور ہو گیا۔ ''بھاگو...... بھاگو......'' کی آوازیں آنے لگیں۔ جگت اور ہوشیار لمحے بھر میں جیپ میں سوار ہو گئے۔ انجن کے شور کے درمیان جگت کہہ رہا تھا۔ ''مل کی جانب......'' جیپ سرسراتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ پولیس کی سیٹیوں کی وجہ سے ماحول میں سنسنی پھیل گئی۔

آج صبح لاہور جاتی ہوئی گاڑی کٹی ہے۔ معلوم

ہوتا ہے کسی نے اس کا انتقام لینے کے لیے گولیاں چلائی ہیں۔ لوگ یہی سوچ رہے تھے۔ رنبیر کی روح فوراً نکل چکی تھی مگر موہن سنگھ کا رشتے دار پانی مانگنے تک زندہ رہا۔ دو گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد اس کی آنکھیں گردش کرنے لگیں، وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ گھومتی ہوئی نظر ایک چہرے پر جم گئی۔ وہ جگت کے تایا تھے۔ خون میں لت پت شانہ پکڑے، ہانپتے سینے سے بمشکل وہ بول سکا۔

''جگا...... '' پھر ہچکی لے کر گردن ڈال دی۔

''بے چارہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بول نہیں سکا۔'' کسی نے افسوس کیا۔ جگت کے تایا مجمع سے باہر آ گئے۔ وہ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ مرنے والے سے جگت کی دشمنی سے واقف تھے، وہ سوچ رہے تھے انہوں نے جو کچھ سنا ہے، وہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو اچھا ہے۔ انہیں جگت پر کچھ غصہ بھی آیا۔

''آتے ہی پھر شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ دوسرے بھی پریشان ہوں گے۔'' وہ سوچنے لگے۔ قتل کا پنچ نامہ ہو رہا تھا، تب جگت کے تایا چھاؤنی سے باہر نکل کر تیزی سے مل کی طرف جا رہے تھے ''سوہن سنگھ کو خبر دے آؤں۔ اس سے پہلے کہ پولیس آئے اسے ہوشیار کر دوں۔''

□......♥......□

''کیوں...... تم خاموش کیوں ہو چندن؟'' جیپ میں بیٹھنے کے بعد بہت دیر تک چندن خاموش رہی تو جگت نے پوچھا۔ ''آتے وقت ماں جی نے تو کچھ نہیں کہا؟''

''انہوں نے دعائیں دیں۔'' چندن راستے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کہنے لگیں اتنے سال تم نے ہماری خدمت کی اب اس کے ساتھ رہ کر اسے صحیح راستے پر لگانا۔''

''اس کا مطلب ہے تم مجھے ٹھیک کرنے آئی ہو؟'' جگت نے مذاق کیا، مگر چندن ہنس نہ سکی۔ ساس سسر کو چھوڑ کر اس کا دل دکھ رہا تھا۔

''صحیح یا غلط کرنا تقدیر کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ جب تک زندگی ہے، جینے کو تیار ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ سنجیدہ ہو گئی۔

ہوشیار جیپ چلا رہا تھا چندن کور کے الفاظ میں چھپا ہوا درد اس نے محسوس کر لیا۔ جگت کو یہ خاموشی گراں گزرنے لگی۔ ''ہوشیار! تمہاری بھابھی کے ہاتھ کی روٹی کھانے کے بعد باہر کھانے کی عادت چھوٹ جائے گی۔''

''مجھے تو ابھی سے بھوک لگی ہے۔'' ہوشیار کی زبان چلنے لگی۔ ''چنا سنگھ نے اگر ساری تیاری کر لی ہو تو پھر آج سے بھابھی کے ہاتھ کا پکا کھانا مل جائے گا۔''

چندن چونکی، چنا سنگھ کا نام اس نے پہلے بھی سنا تھا۔ پھر یاد آیا وہ مل والا چنا سنگھ ہی ہو گا۔ وہ گھر آتا جاتا رہا تھا۔ ساس نے بھی اس کی توجہ اس جانب دلائی تھی۔ وہ لڑکا جگت سے سرگوشیاں کرتا رہتا ہے۔ وہ ضرور جگت سے کوئی غلط کام کرائے گا۔

''یہ جیپ کس کی لے آئے ہیں؟'' چندن نے پوچھا۔ چندن کے سوال پر جگت مسکرایا۔

''ہے ایک دوست کی۔ کچھ دن استعمال کرنے کے لیے ملی ہے۔''

بہت زیادہ پوچھ گچھ کر کے سر کھانے کی چندن کی عادت نہیں تھی۔ وہ اتنا سمجھتی تھی کہ غلط وقت پر پوچھی ہوئی سچی بات بھی غلط ماحول پیدا کر دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چنا سنگھ والی بات نگل گئی۔ اسے بہت سنبھل کر جگت کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ تو ابھی ابتدا تھی۔

□......♥......□

گادیہ گاؤں میں ''نیا گھر'' بنانے کی تیسری شب جگت پہلا ڈاکہ ڈالنے کے لیے روانہ ہوا۔ آج تک چالیس پچاس کے گروہ کے ساتھ بڑے بڑے ڈاکے ڈالنے والے جگا ڈاکو کے لیے یہ ڈاکہ عجیب سا تھا۔ اس کے ساتھ ہوشیار اور چنا سنگھ صرف دو ساتھی تھے اور دو تین ہزار سے زیادہ ملنے کی توقع نہیں تھی۔ بے چارہ چنا سنگھ اونچا نیچا ہو رہا تھا۔

''جگت سنگھ! ہمیں سنبھلنا پڑے گا۔ یہ رائفل آپ صرف ڈرانے کی حد تک رکھنا بھائی صاحب! ہمیں قتل نہیں کرنا۔ اس لیے تو میں آسان ٹھکانہ تلاش کر کے آیا ہوں۔''

اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کس کے ساتھ ڈاکہ ڈالنے جارہا ہے۔ جگت اور ہوشیار نے اپنی اصلیت اس لیے چھپائی تھی کہ ابھی اس پر پورا اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنا کو انہوں نے یہ سمجھایا تھا کہ کچھ دن وہ ملٹری میں رہ چکے ہیں۔ اس لیے وہ رائفل کے بغیر کام نہیں کرسکتے۔ چنا سنگھ نے ٹھکانہ بھی عجیب تلاش کیا تھا۔ کرتار پور گاؤں کے ایک جوہری کا کسی عورت سے معاشقہ تھا' روزانہ نصف شب کو وہ عورت جوہری کے گھر آتی اور سحر کے وقت چلی جاتی تھی۔ چنا سنگھ جب یہ خبر لے آیا تب جگت نے اسے یقین کرنے کے لیے اگلی رات کرتار پور بھیجا۔

''تم جوہری کے گھر کے سامنے چھپے رہو گے۔ یہ معلوم کرو گے کہ وہ عورت کس طرح گھر میں داخل ہوتی ہے؟'' سحر کے وقت چنا واپس لوٹا۔

''میرے یار نے پورا انتظام رکھا ہے۔ پچھلے دروازے سے عورت کو اندر داخل کرتا ہے۔''

''پھر آج رات عورت کی بجائے ہم اس گھر میں داخل ہوں گے۔'' جگت نے ہوشیار کو آنکھ مار کر کہا۔ ''عشق کرنے کا جرمانہ وصول کریں گے۔''

کرتار پورہ پہنچنے تک رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ جیپ گاؤں کے باہر چھپائی تھی۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے تینوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ نئے ملک میں یہ پہلا ڈاکہ تھا۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوشیار نے دونالی بندوق شانے پر رکھی تھی۔ جگت کے پاس گن تھی۔ چنا سنگھ کے پاس کرپان تھی۔ وہ جوہری کی گلی میں داخل ہوئے تو چنا نے دور سے گھر بتایا۔

''سامنے فانوس والا کھمبا ہے' وہی دروازہ ہے۔''

''کون ہے......؟'' مدھم آواز سنائی دی۔ جگت نے ناک پر انگلی رکھ کر چنا کو اشارہ کیا۔ پھر اندر سے پوچھا گیا۔ ''کون ہے......؟'' جگت کو یہ اندازہ نہیں تھا' نہ ہی چنا نے ایسا کبھی دیکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دستک دیتے ہی کھڑکی کھل جائے گی۔ جوہری کو شک ہوگیا تو چیخ کر ہنگامہ کردے گا۔

''کیا آج وہ عورت آنے والی نہیں تھی؟ یا پھر کھڑکی پر دستک دینے کا اس کا الگ انداز تھا؟'' جگت الجھن میں پڑگیا مگر اب گھبرانے کی بجائے دماغ سے کام لینا تھا۔ وہ عورت جیسی باریک آواز میں بولا۔

''میں ہوں...... جلدی سے کھولیں۔'' اندر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ جگت دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر دروازے کی زنجیر کھولنے کی آواز آئی۔

''تم تو آج آنے والی نہیں تھیں؟'' جوہری نے دھیمی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے باہر جھانکا۔ چیتے کی سی پھرتی سے جگت نے زوردار پنجہ جوہری کی گردن پر مارا۔ وہ گھبرا کر سر اندر کرلینا چاہتا تھا مگر جگت نے گردن کی رگ دبا دی۔ جوہری نے چیخنے کے لیے

پولیس حل نہیں کرسکی تھی۔ وہاں رام سنگھ چوہدری نے رنبیر کا خط دکھایا۔

''دونوں قتل جگا نے کیے ہیں اس کا یہ ثبوت ہے۔''

''جگا......؟'' پولیس چیف پورن سنگھ چونک گئے۔

''یہ نام اس کیس میں کہاں آیا تھا؟ کس کی زبان سے نکلا تھا؟'' پھر پنچ نامے کے کاغذات پر نظر گھمائی۔ ''ارے ہاں! مقتول کی زبان سے آخری لمحے یہ نام سنا گیا تھا۔ تب یہی سوچا گیا تھا کہ بیچارے نے بیٹے کو یاد کیا ہے۔''

''بیٹے کو نہیں، دشمن کو یاد کیا تھا۔'' رام سنگھ چوہدری نے دانت پیسے۔

''وہ اجیت سنگھ موہن سنگھ کا قریبی رشتے دار تھا۔ ان کے ساتھ جگا کے باپ دادا کے وقت کی دشمنی تھی۔ اسی کی وجہ سے وہ ڈاکو بنا۔''

''مگر اس نے رنبیر کو نشانہ کیوں بنایا۔'' پورن سنگھ مطلب کی بات پر آ گئے۔ ''اجیت سے زیادہ اسے رنبیر سے دشمنی ہوگی۔''

''رنبیر میرا دور کا رشتہ دار تھا۔'' رام سنگھ نے آواز میں نرمی پیدا کر کے کہا۔ ''اور وہ موہن سنگھ کا دوست بھی تھا۔ جگا کو گرفتار کرنے کے لیے اس نے مجھے فوراً اطلاع بھیجی۔'' پھر آہ بھر کر بولا۔ ''مجھے پہنچنے میں ایک دن دیر ہوگئی، ورنہ......''

''میں جگا کو گرفتار کر لیتا۔'' وہ کہنے جا رہا تھا کہ اسی لمحے پورن سنگھ کا ماتحت سلیوٹ کر کے کھڑا ہوگیا۔ ''صاحب! کرتار پور سے ڈاکے کی خبر ملی ہے۔ جوہری کو زخمی کر کے ڈاکو اس کی تجوری خالی کر گئے۔ چار پانچ ہزار کا سونا تھا۔''

''لوگ کس کا نام لے رہے ہیں..... گنگا سنگھ کا؟'' پورن سنگھ، رام سنگھ کی جانب دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو! یہ گنگا سترہ سال سے پریشان کر رہا ہے۔''

''نہیں صاحب! اس ڈاکے میں گنگا کا ہاتھ معلوم نہیں ہوتا۔'' ماتحت جلدی سے بولا۔ ''صرف تین آدمی تھے، جیپ میں آئے تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے تعاقب کیا پھر بھی انہوں نے فائرنگ نہیں کی۔ گنگا تعاقب کرنے والوں کو شوٹ کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔''

''پھر کون پیدا ہوگیا؟'' پورن سنگھ پوچھ رہا تھا مگر اس کے ذہن میں روشنی ہوگئی۔

''وہ لوگ جیپ میں تھے یہی تم نے کہا تھا......؟ چھاؤنی میں دو آدمیوں کو قتل کرنے والوں کے پاس بھی جیپ تھی۔ بس تو وہ پھر جگا ہی ہے۔ شیخو پورہ کا ڈاکو جگا...... اب ہماری نیندیں حرام کرنے آ گیا ہے۔''

''نہیں پورن سنگھ! یہ کہو کہ ہمیں ترقی دلانے آیا ہے۔'' رام سنگھ نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''وہاں تو بڑا گروہ تھا اس لیے کامیاب رہا۔ یہاں ابھی نیا ہے اسے ابتدا ہی میں دبا دیں گے۔'' یہ کہہ کر رام سنگھ نے پورن سنگھ سے مصافحہ کیا۔ ''مجھے تو اس سے حساب صاف کرنے کی جلدی ہے۔''

امرتسر کے پولیس دفتر میں دو قتل اور ایک ڈاکے سے جگا کے نام کا کھاتہ شروع ہوگیا......!

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

❁

منہ کھولا مگر آواز حلق میں پھنس گئی۔ چنا نے اس کا منہ بند کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا' اسے موقع مل گیا۔ اس نے چنا کی کلائی پر دانت گاڑ دیے۔ جگت نے محسوس کیا چنا گھبرا گیا ہے۔

''میرا ہاتھ چھڑاؤ! سالا کاٹ رہا ہے۔'' ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جگت بپھر گیا۔ چنا کی کمر پر لٹکتی کرپان پر اس کی نظر گئی۔ ایک ہاتھ سے جوہری کی گردن دباتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس نے کرپان نکالی۔ کرپان کی دھار اندھیرے میں چمکی۔

''بے وقوف کاٹ رہا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے جگت نے کرپان اس کے جبڑے میں گھسیڑ دی۔ ایک ہنکار سے جوہری کا منہ پورا کھل گیا۔ چنا کا ہاتھ اس کے دانتوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ جگت نے کرپال نکال لی۔ جوہری کے جبڑے سے خون بہنے لگا' یہ دیکھ کر جوہری بیہوش ہو گیا۔ دروازے سے جگت اندر داخل ہوا۔ تجوری کی چابی تلاش کرنے میں کچھ وقت خراب ہوا' آخر بستر کے نیچے چابی مل گئی۔ کیش رقم کم تھی مگر سونا بہت ملا۔ چنا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد جوہری کے دھڑکتے سینے کو دیکھ رہا تھا۔ جگت کو غصہ آ گیا۔

''ارے اس کی فکر کہاں کر رہا ہے؟ یہ بیوقوف نہیں مرے گا۔ چل جلدی کر۔'' دونوں مال لے کر باہر آئے۔ ہوشیار بندوق تھام کر ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''اس کی آواز یہاں تک سنائی دی تھی۔ جلدی کرو۔''

گلی پار کرتے ہی' چور چور...... پکڑو پکڑو' کی آوازیں آنے لگیں۔ چنا گھبرایا جگت نے ہوشیار سے کہا۔ ''رائفل سے فائر نہ کرنا۔ ہم جلد ہی جیپ تک پہنچ جائیں گے۔''

پندرہ بیس آدمیوں کا گروہ پیچھے دوڑ رہا تھا۔ کسی نے ایک پتھر بھی پھینکا مگر جگت نے پروا نہیں کی۔ جلد ہی وہ جیپ تک پہنچ گئے۔ ہوشیار نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ وہ گروہ اب دس گز کے فاصلے تک پہنچ چکا تھا۔ جیپ حرکت میں آ گئی اور دو منٹ میں دور نکل گئی۔ چنا نے اطمینان کی سانس لی۔ ''میری جان آدھی ہو گئی تھی۔''

''ابھی نئے نئے ہو اس لیے گھبرا رہے ہو۔'' جگت نے کہا۔ چنا چونک کر اسے دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو اگر میں نیا ہوں تو تم لوگ......؟ جگت نے اس کی توجہ بٹانے کے لیے کہا۔ ''اندازے سے زیادہ مال ملا ہے۔'' مگر چنا! ابھی تک جگت کو دیکھ رہا تھا۔ ضرور اس شخص کے پیچھے کوئی بڑا راز ہے۔ کس بے پروائی سے اس نے جوہری کے جبڑے میں کرپان گھسیڑ دی تھی۔ اس کا ہاتھ تک نہیں لرزا تھا...... چنا سنگھ سوچ رہا تھا۔

❐......♥......❐

رام سنگھ چوہدری گھنٹہ بھر لیٹ رہا۔ امرتسر پہنچا تو اس وقت تک رنبیر سنگھ کی لاش جل چکی تھی۔ دہلی سے امرتسر آتے ہوئے اس نے کئی بار رنبیر سنگھ کے خط کو پڑھا تھا۔

''جگا یہاں آیا ہے۔ ایک بار چھاؤنی میں دیکھا ہے۔ تم یہاں آؤ' تب تک میں اس کا صحیح پتا معلوم کر لوں گا۔'' پھر آخری جملوں میں لکھا تھا۔ ''جگا کے سر کا انعام اب بھی جاری ہوگا؟ وہ بھی معلوم کر کے آنا۔ بات چھپا کر رکھنا۔'' سچ بات تو یہ تھی کہ آخری جملے نے اسے آنے میں دیر کر دی تھی۔ جگا کو گرفتار کرنے کی تیاری سوچ سمجھ کر کرنی تھی۔ دو مہاجروں کو کس نے اور کیوں قتل کیا؟ یہ مسئلہ ابھی امرتسر کی